وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ

اختلافِ اُمّت اور صراطِ مستقیم

فروعی مسائل میں مسلکِ اعتدال

حصہ اوّل ○ مع ضمائم



مرتبہ

محمد یوسف لدھیانوی



مکتبہ مدنیہ

۱۷۔ اُردو بازار لاہور

فون ۷۲۲۸۹۷۷ / ۷۲۴۲۲۶۹

نام کتاب	اختلاف امت اور صراط مستقیم
مولف	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی
طابع	آر۔ زیڈ۔ پیکجز مچھلی منڈی لاہور
ناشر	مکتبہ مدنیہ ۱۷۔ اردو بازار لاہور
قیمت	....

فہرست حصہ اول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گرامی القدر جناب مولانا صاحب

گلدستہ آداب و ہزارہا تسلیمات!

میں. میرا ایک سگا بھائی. ایک خالہ زاد بھائی. پانچ سگے چچے اور بہت سے قریبی رشتہ دار یہاں دوبئی اور شارجہ میں عرصہ سے مقیم ہیں۔ ہم سب لوگ سوائے ایک یا دو کے سختی کے ساتھ نماز کے پابند ہیں۔ اور اپنی فراغت کے بیشتر لمحے مذہبی سوچ بچار اور بحث و مباحث پر ہی صرف کرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر تعلیم یافتہ ہیں اور تھوڑی بہت مذہبی سوجھ بوجھ بھی رکھتے ہیں۔ تقریباً ہم سب کے پاس مختلف عقائد رکھنے والے علماء کرام کی تحریر کردہ کتب موجود ہیں۔ جن کا ہم بغور مطالعہ کرتے ہیں۔ رشتوں کے لحاظ سے جتنے ہم قریب ہیں اتنے ہی مذہبی اختلافات ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے عقائد پر بڑی سخت نکتہ چینی کرتے ہیں۔ جیسا کہ آجکل اپنے وطن عزیز میں ہورہا ہے۔ ایک دوسرے کے پسندیدہ علمائے کرام پر تنقید کرتے ہیں اور بڑھ چڑھ کر خامیاں بیان کرتے ہیں۔ ہم میں سے اکثریت سنی عقیدے والوں کی ہے۔ جو اپنے آپ کو سچا عاشق رسول کہلاتے ہیں اور اس لحاظ سے وہ اپنے آپ کو افضل تصور کرتے ہیں۔ "جیسا کہ آج کل پاکستان میں نورانی میاں صاحب اپنے آپ کو یعنی اپنی جماعت کو "سواد اعظم" کہتے ہیں باقی چند جو دوسرے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو عربوں کی دیکھا دیکھی صرف فرض نماز ہی ادا کرتے ہیں اور دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ اسلام کی ابتداء یہاں ہی سے شروع ہوئی ہے۔

اس لئے یہ لوگ صحیح ہیں۔ ہم میں سے ایک گروپ ایسا بھی ہے جو مولانا مودودی صاحب کے علاوہ پاکستان میں کسی اور کو عالم ہی نہیں مانتا اور اس کا کہنا ہے کہ زیارتوں پر فاتحہ پڑھنا حضرت غوث پاک" کی گیارہویں دینا اور ختم شریف پڑھوانا سب شرک ہے وغیرہ۔ بہرحال ہم سب لوگ جب کسی موضوع پر بحث کرتے ہیں تو مجھے ثالث مقرر کیا جاتا ہے کیونکہ میں کسی بھی فرقے کو غلط اور کسی بھی عالم کو برا نہیں کہتا اس لئے میرے باقی ساتھی میرا فیصلہ بخوشی تسلیم کرلیتے ہیں اور اس طرح ہماری بحث کافی حد تک کسی انجام کو پہنچتی ہے مگر بعض سوالات ایسے ہوتے ہیں جو میں معلومات نہ ہونے کی وجہ سے حل نہیں کرپاتا۔ چونکہ "جنگ" میں میں آپ کا کالم بڑی پابندی سے اور توجہ سے پڑھتا ہوں اس لئے میں نے اپنے سب ساتھیوں سے مشورہ کرکے چند ضروری مسائل جن پر ہم لوگ آج تک متفق نہیں ہوئے ہیں پوچھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

(۱) سنی، شیعہ، دیوبندی، بریلوی، اور وہابی فرقوں کے عقائد میں کیا فرق ہے ان میں اختلافات کیا ہیں ان میں سب سے افضل کون سا فرقہ ہے اور اس میں کتنے فرقے ہیں۔ نیز اماموں کے نام معہ صفات کے تحریر فرمائیں۔

(۲) نماز میں صرف فرض ادا کرنا کہاں تک درست ہے۔ یہاں کے ایک بہت بڑے خطیب صاحب سے جو مصری ہیں میں نے یہ دریافت کیا کہ آپ بہت بڑے عالم ہیں آپ صرف نماز جمعہ میں دو فرض ہی کیوں ادا کرتے ہیں جب کہ سنت اور نفل بھی ہیں۔ انہوں نے مجھے یہ جواب دیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حجرہ مسجد نبویؐ کے دروازے میں تھا۔ وہ وہاں سے اٹھ کر مسجد میں جاتے تھے اور دو فرض نماز جمعہ جماعت کے ساتھ پڑھا کر واپس حجرے میں چلے جاتے تھے۔ اور حجرے میں جاکر وہ کیا پڑھتے تھے یہ کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ اس لئے میں سنت نبوی ادا کررہا ہوں۔

آپ مہربانی کرکے اس مسئلے پر تفصیل سے روشنی ڈالیں کہ آیا یہ خطیب صاحب درست فرماتے ہیں؟ اگر نہیں تو صحیح مسئلہ کیا ہے؟

(۳) زیارتوں پر فاتحہ خوانی کرنا۔ گیارہویں شریف دینا اور ختم شریف (یعنی کسی کی مغفرت کے لئے قرآن خوانی یاذکر الٰہی کرانا) پڑھانا شرک ہے؟ قرآن وسنت کے حوالے دے کر واضح کریں۔ پہلے سوال کے بارے میں میں اتنا عرض ہے کہ اس کا جواب ہماری زندگیوں کو بدل سکتا ہے۔ کیونکہ ہم سب اس بات پر متفق ہوگئے ہیں۔ کیونکہ جوکچھ بھی آپ قرآن وسنت کے مطابق لکھیں گے ہم اس پر عمل کریں گے اس لئے آپ مہربانی فرماکر ہمیں ایک صحیح راستہ دکھائیں۔

آپ کا دعاگو!

محمد کریم دبئی یواے ای

جواب:۔ آپ اور آپ کے رفقاء کی دین سے دلچسپی لائق مبارکباد ہے. مگر میرا مشورہ یہ ہے کہ اس دلچسپی کا رخ بحث و مباحثہ سے ہٹاکر دین کے سیکھنے سکھانے. اس کے عملی تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک طریقوں کو اپنی اور دوسروں کی زندگی میں لانے کی طرف پھیرنا چاہئے۔

اور میرا یہ معروضہ دو وجوہات پر مبنی ہے ایک یہ کہ بحث و مباحثہ سے انسان کی قوت عمل مفلوج ہوجاتی ہے۔ مسند احمد. ترمذی. ابن ماجہ اور مستدرک حاکم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ:

مَا ضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوْا عَلَيْهِ اِلَّا اُوْتُوا الْجَدَلَ.

جو قوم ہدایت سے ہٹ کر گمراہ ہو جاتی ہے اسے جھگڑا دے دیا جاتا ہے.

پس کسی قوم کا بحث مباحثوں اور جھگڑوں میں الجھ کر رہ جانا اس کے حق میں کسی طرح نیک فال قرار نہیں دیا جاسکتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ بحث و مباحثہ میں عام طور سے سمجھنے سمجھانے کا جذبہ مغلوب ہوجاتا ہے اور اپنی اپنی بات منوانے کا جذبہ غالب آجاتا ہے۔ خصوصاً جب کہ آدمی علوم شرعیہ سے پورے طور پر واقف نہ ہو وہ حدود شرعیہ کی رعائت کرنے سے قاصر رہتا ہے. بسا اوقات ایسا ہوگا کہ ایک چیز غلط اور ناحق ہوگی. مگر وہ اسے حق

ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ بسا اوقات اس بحث و مباحثہ میں وہ اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کی عیب جوئی کرے گا اور ان پر زبان طعن دراز کر کے اپنا نامہ اعمال سیاہ کرے گا. یہ ساری چیزیں مل کر اسے نہ صرف جذبہ عمل سے محروم کریں گی۔ بلکہ اس کو ذہنی ساخت میں قبول حق کی استعداد کم سے کم ہوجائے گی۔ اس لئے میرا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ صاحبان میں سے جس کو جس عالم دین پر اعتماد ہے اور جس عالم دین کے بارے میں دیانتداری سے یہ سمجھتا ہو کہ یہ خدا ترس محقق عالم دین ہے اور محض رضائے الٰہی کی خاطر خدا تعالیٰ کا پیغام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق عمل کرتے ہوئے کام میں لگا رہے اور ان بحث و مباحثوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے ذکر و تسبیح. درود و شریف تلاوت قرآن مجید اور دیگر خیر کے کاموں سے اپنے اوقات کو معمور رکھے۔

آپ کا پہلا سوال اگرچہ لفظوں میں بہت ہی مختصر ہے مگر اس کا جواب ایک ضخیم کتاب کا موضوع ہے۔ یہ ناکارہ نہ اتنی صلاحیت رکھتا ہے اور نہ اتنی فرصت ہے کہ اس مختصر سی فرصت میں اس موضوع کا حق ادا کر سکے تاہم آپ کے حکم کی تعمیل میں چند سطور لکھتا ہوں۔ اگر آپ اور آپ کے رفقاء کے لئے کسی درجہ میں مفید ہوں تو یہ اس ناکارہ کی سعادت ہوگی۔ ورنہ "کالائے بد بریش خاوند"۔

سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ "دین حق" کیا ہے جس کو معیار بناکر ہم اس بات پر غور کر سکیں کہ کونسا فرقہ حق پر ہے۔ یا حق سے قریب تر ہے؟

میں. آپ اور سب مسلمان جانتے ہیں کہ "دین حق" وہ پیغام الٰہی ہے جو ہمارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لے کر آئے جس پر آپ ﷺ نے اور آپ ﷺ کی نگرانی میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء نے عمل کیا اور جس کی قیامت تک حفاظت کا اللہ تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔ یہ دین حق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات. صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل اور ائمہ مجتہدین

کی تشریحات کی صورت میں محفوظ کر دیا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اس امت کے پاس آج بھی یہ ساری چیزیں بالکل صحیح سالم اس طرح محفوظ ہیں کہ گویا آج کے لئے ہی یہ دین نازل کیا گیا تھا۔

دوسری بات جس کا سمجھ لینا ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ امت میں دو قسم کے اختلافات ہوئے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں قسم کے اختلافات سے مطلع بھی کیا گیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں کے بارے میں امت کو ہدایات بھی عطا فرمائیں۔

پہلی قسم کا اختلاف وہ ہے جو اجتہادی مسائل میں صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدین کے درمیان رونما ہوا اور جو آج حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی اختلاف کے نام سے مشہور ہے۔ یہ اختلاف خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور میں بھی کبھی کبھی رونما ہوجاتا تھا مثلاً ایک موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بنو قریظہ کی بستی میں پہنچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

لَا یُصَلِّیَنَّ اَحَدُکُمُ الْعَصْرَ اِلَّا فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَۃَ۔

ترجمہ:۔ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ پہنچ کر

اتفاق سے وہاں پہنچنے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاخیر ہوگئی اور نماز عصر کا وقت ضائع ہونے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ کیا ہونا چاہئے؟ مشورہ میں دو فریق بن گئے۔ ایک کی رائے یہ تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ بنو قریظہ پہنچنے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھی جائے تو اب راستے میں نماز پڑھنے کا کیا جواز ہے؟ اس لئے خواہ نماز قضا ہوجائے مگر ارشاد نبویؐ کی تعمیل ضروری ہے۔ مگر دوسرے فریق کی رائے یہ تھی کہ اس حکم کو منشائے مبارک یہ تھا کہ ہمیں عصر کا وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے بنو قریظہ پہنچ جانا چاہئے اور عصر کی نماز وہاں پہنچ کر پڑھنی چاہئے۔ لیکن اب جب کہ ہم غروب سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکتے تو نماز عصر قضا کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ اگر ہم سے وہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی

ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ہمیں نماز عصر قضا کر کے اپنی کوتاہی میں مزید اضافہ کر لینا چاہئے۔ الغرض پہلے فریق نے ارشاد نبویؐ کی تعمیل میں عصر نماز قضا کرنا گوارا کیا، مگر ارشاد نبویؐ کے ظاہر سے ہٹنا گوارا نہیں کیا اور دوسرے فریق نے منشائے نبویؐ کی تعمیل ضروری سمجھی۔ راستے میں اتر کر نماز عصر پڑھی اور پھر بنو قریظہ پہنچے۔ جب بارگاہ نبویؐ میں یہ واقعہ پیش ہوا تو آپؐ نے کسی فریق کو عتاب نہیں فرمایا بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی کیونکہ دونوں منشائے نبویؐ کی تعمیل میں کوشاں تھے۔ اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ الغرض ایک اختلاف یہ ہے کہ جس کو "اجتہادی اختلاف" کہا جاتا ہے۔

یہ اختلاف نہ صرف ایک فطری اور ناگزیر چیز ہے. بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو "رحمت" فرمایا ہے۔ اور جس شخص کو حق تعالیٰ نے ذرا بھی نور بصیرت عطا کیا ہو. اس کو اس اختلاف کا "رحمت" ہونا کھلی آنکھوں نظر آتا ہے. فرصت اس کی متحمل نہیں ورنہ اس پر مزید روشنی ڈالتا۔ الغرض یہ اختلاف بالکل صحیح ہے اور اس کا حکم یہ ہے کہ جس امام مجتہد سے اعتقاد ہو اس کے اجتہاد پر عمل کیا جائے اور باقی بزرگوں کے بارے میں ادب و احترام کو ملحوظ رکھا جائے۔ کیونکہ یہ تمام حضرات اعلیٰ درجہ کے ماہر دین بھی تھے اور صاحب باطن عارف باللہ بھی ____ بعد کے لوگوں میں سے کوئی شخص نہ ان کے پائے کا عالم ہوا ہے اور نہ نور معرفت میں کوئی ان کی ہمسری کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ مثلاً حضرت پیران پیر مرشد شیخ عبدالقادر جیلانی. سید الطائفہ حضرت جنید بغدادیؒ۔ شیخ محی الدین ابن عربیؒ۔ خواجہ علی ہجویریؒ گنج بخش بابا فرید الدین شکر گنجؒ مجدد الف ثانیؒ ____ سب ان ائمہ مجتہدین کے پیروکار ہوئے ہیں ____ دوسری قسم کا اختلاف "نظریاتی اختلاف" کہلاتا ہے ____ اور یہی آپ کے سوال کا موضوع ہے ____ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اختلاف کی بھی پیش گوئی فرمائی تھی اور اس اختلاف میں حق و باطل کو جانچنے کا معیار بھی مقرر فرمایا تھا ____ چنانچہ ارشاد نبویؐ

ہے......

"بنو اسرائیل ۷۲ فرقوں میں بٹے تھے اور میری امت ۷۳ فرقوں میں بٹے گی۔ یہ سب کے سب سوائے ایک کے ـــــ جہنم میں جائیں گے۔ عرض کیا گیا۔ یارسول اللہ! یہ نجات پانے والا فرقہ کونسا ہے؟ فرمایا مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ جو لوگ اس راستے پر قائم رہیں گے جس پر میں ہوں اور میرے صحابہؓ ہیں۔"

ایک دوسری حدیث میں فرمایا:

"۷۲ دوزخ میں جائیں گے اور ایک جنت میں ـــــ اور یہ "الجماعت" ـــــ یعنی برحق جماعت ہے اور کچھ لوگ نکلیں گے جن میں خواہشات اور غلط نظریات اس طرح سرایت کر جائیں گے جس طرح باؤلے کتے کے کاٹے ہوئے شخص کی بیماری ہوتی ہے۔ کہ اس کا کوئی جوڑ اور رگ وریشہ ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری سرایت نہ کر جائے۔"

ایک اور حدیث میں ہے:

"جو شخص تم میں سے میرے بعد زندہ رہا وہ بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ اس لئے میرے طریقہ کو اور ہدایت یافتہ خلفائے راشدینؓ کے طریقہ کو لازم پکڑو! اور اسے دانتوں سے مضبوط پکڑلو۔ اور دیکھو! جو باتیں نئی نئی ایجاد کی جائیں گی ان سے احتراز کیجئو۔ اس لئے کہ ہر وہ چیز (جو دین کے نام پر) نئی ایجاد کی جائے وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خط کھینچ کر فرمایا: "یہ تو اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے"۔ اور اس کے دائیں بائیں کچھ لکیریں کھینچ کر فرمایا "یہ وہ راستے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا لوگوں کو ورغلا رہا ہے کہ ادھر آؤ! یہ صحیح راستہ ہے"۔ یہ ارشاد فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی. اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "یہ میرا سیدھا راستہ ہے. پس اس پر چلو" ـــــ (یہ تمام حدیثیں مشکوٰۃ شریف میں ہیں) اس موضوع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے ارشادات ہیں جن کو اس وقت جمع کرنا میرے لئے ممکن نہیں۔ اور نہ اس کی ضرورت ہے ـــــ ان ارشادات مقدسہ سے واضح طور پر حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت میں نظریاتی اختلاف کے رونما ہونے کی پیش گوئی فرمائی۔

(۲) اس اختلاف کو ناپسند فرمایا اور سوائے ایک جماعت حقہ کے باقی سب کو دوزخ کی وعید سنائی۔

(۳) اس اختلاف میں حق و باطل کو پہچاننے کا معیار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ معین فرمایا کہ جو شخص یا جو گروہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے طریقے پر قائم ہے۔ جس پر آپؐ کے بعد آپؐ کے صحابہ کرامؓ بھی عمل پیرا رہے. وہ حق پر ہے اور جو اس کے خلاف چلے وہ باطل پر ہے۔ گویا معیار حق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کا راستہ ہے قرآن نے بھی بہت سی جگہ اسی کو "معیار حق" قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا۔ (النساء ۱۱۵)

ترجمہ:۔ اور جو شخص مخالفت کرے۔ رسول (اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی جب کہ اس کے سامنے ہدایت کھل چکی ہے. اور چلے مومنین کا راستہ چھوڑ کر. ہم اس کو دھکا دیں گے جدھر وہ جاتا ہے اور اس کو دوزخ میں جھونک دیں گے۔ اور وہ بے بہت برا ٹھکانا۔

اس آیت کریمہ میں جن "المومنین" کے راستے کی نشاندہی کی گئی اس سے

جماعت صحابہؓ مراد ہے۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام امور کو جو دین کے نام پر بعد میں ایجاد کئے گئے۔ "بدعت" فرمایا۔

(۵) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدعات اور گمراہیوں کے ایجاد کرنیکی علت بھی بیان فرمائی یعنی غلط خواہشات کی پیروی۔ اور یہ ایسا مرض ہے کہ آدمی کے دل و دماغ ہی کو مسخ نہیں کرتا بلکہ جس طرح باؤلے کتے کے کاٹنے کا زہر آدمی کے سارے بدن میں سرایت کر جاتا ہے. اور وہ اچھا بھلا آدمی ہونے کے باوجود غیر انسانی حرکات پر اتر آتا ہے۔ اس طرح جس شخص کو غلط نظریات کے باؤلے کتے نے کاٹ کھایا ہو اس کے رگ و ریشہ میں بھی خودرائی کا زہر سرایت کر جاتا ہے۔ اور اسے اپنے خود تراشید نظریات کے سوا تمام دنیا افسانہ غلط نظر آنے لگتی ہے

(٦) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو ہدایت فرمائی کہ ان اختلافات کے ظہور کے وقت وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے خلفائے راشدین ــــــ جن کا ہدایت پر ہونا ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے ــــــ کے طریقہ پر سختی. قائم رہیں اسے دانتوں کی کچلیوں سے مضبوط پکڑلیں. بدعات و خواہشات کے ہزاروں جھکڑ چلیں اور نئے نئے خوش نما قسم کے نظریات کی لاکھوں بجلیاں کوندیں مگر امت کے ہاتھ سے یہ مضبوط رشتہ ہر گز نہیں چھوٹنا چاہئے۔

(۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا کہ "اللہ تعالیٰ کا راستہ" وہی ہے۔ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا۔ اور جس پر صحابہ کرامؓ چلے۔ یہ راستہ قیامت تک رہے گا۔ لیکن اس "خدائی راستے" کے بالمقابل کچھ شیطانی راستے بھی نکلیں گے اور ہر راستہ پر ایک شیطان بیٹھا لوگوں کے مزاج اور ان کی نفسیات کے مطابق دلائل بھی دے گا. اور خدا تعالیٰ کے راستہ کو نعوذ باللہ فرسودہ اور رجعت پسندانہ بھی بتائے گا۔ مگر امت کو آگاہ رہنا چاہئے۔ کہ خدا تعالیٰ تک پہنچنے کا ٹھیک راستہ وہی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا.

جس پر صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ چلے اور جس کی پیروی ہمیشہ سلف صالحین اور اولیائے امت کرتے آئے۔ اس ایک راستے کے سوا باقی سب شیطان کے ایجاد کئے ہوئے راستے ہیں۔ اور جو لوگ ان میں سے کسی راستے کی دعوت دیتے ہیں وہ شیطان کے ایجنٹ بلکہ مجسم شیطان ہیں۔ جو شخص خدا تعالیٰ کے مقرر کردہ صراط مستقیم کو چھوڑ کر ان پگڈنڈیوں پر نکل پڑے گا اسے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کسی اندھیرے غار میں کسی اژدہا کے منہ میں جائے گا۔ یا کسی لق و دق صحرا میں بھٹک کر کسی بھیڑیئے کا تر نوالہ بن کر رہ جائے گا۔

یہ اصول و قواعد جو قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں صراحۃً ذکر کئے گئے ہیں اگر اچھی طرح ذہن نشین کر لئے جائیں تو ایک متوسط ذہن کے آدمی کو یہ سمجھ لینا زیادہ مشکل نہیں ہو گا کہ آپ نے جن فرقوں اور جماعتوں کے بارے میں سوال فرمایا ہے ان میں سے حق پر کون ہے؟ اور نہ میرے لئے اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ میں ہر ایک کا تجزیہ کر کے بتاؤں۔ لیکن آپ کی آسانی کے لئے مختصراً اپنا تجزیہ بھی پیش کرتا ہوں۔

شیعہ سنی اختلاف

یہ تو آپ کو اور ہر مسلمان کو علم ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے بابرکت دور میں امت میں نظریاتی اختلاف کا کوئی وجود نہیں تھا بلکہ پوری امت اسلامیہ اختلاف کی وبا سے محفوظ اور کفر کے مقابلے میں یک جان اور یک قالب تھی۔ نظریاتی اختلاف کی ابتدا پہلی بار سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے آخری زمانہ خلافت میں ہوئی۔ اور یہی شیعہ مذہب کا نقطہ آغاز تھا ــــــ پہلے پہل اس کی بنیاد بہت سادہ سی تھی۔ یعنی حضرت علی کرم اللہ وجہہ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عزیز و قریب ہیں اس لئے وہی آپ کی خلافت و جانشینی کے زیادہ مستحق ہیں۔ یہ نظریہ بظاہر سادہ اور خوش نما ہونے کے باوجود اسلام کی دعوت اور

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تئیس سالہ تعلیم کے خلاف تھا۔ اس لئے کہ اسلام نے نسلی امتیاز اور خاندانی غرور کے سارے بتوں کو پاش پاش کر کے عزت و شرافت اور سیادت و بزرگی کا مدار "تقویٰ" پر رکھا تھا۔ اور تقویٰ کی صفت میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ چونکہ حضرات صحابہ کرامؓ کی پوری جماعت میں سب سے فائق اور سب کے سرتاج تھے (چنانچہ قرآن مجید سورہ والیل میں انہی کو "الاتقی" یعنی سب سے زیادہ متقی فرمایا گیا ہے) اس لئے وہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق تھے۔ کوفہ کی جامع مسجد میں حضرت علیؓ سے بر سر منبر یہ سوال گیا کہ آپ لوگوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلیفہ کیوں بنایا؟ آپ نے فرمایا کہ دین کے کاموں میں سب سے اہم تر نماز ہے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مرض الوفات میں حضرت ابو بکرؓ ہی کو ہمارا "امام نماز" بنایا تھا. باوجودیکہ میں وہاں موجود تھا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو میری موجودگی کا علم بھی تھا مگر اس کام کے لئے آپؐ نے مجھے یاد نہیں فرمایا بلکہ حضرت ابو بکرؓ کو حکم فرمایا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس شخصیت کو ہمارے دین کی امامت کے لئے منتخب فرمایا تھا۔ ہم نے دنیا کی امامت و قیادت کے لئے بھی اس کو چن لیا۔

الغرض یہ تھی وہ غلط بنیاد جس پر شیعہ نظریات کی عمارت کھڑی کی گئی۔ ان عقائد و نظریات کے اولین موجدہ یہودی الاصل منافق تھے (عبداللہ بن سبا. اور اس کے رفقاء) جو اسلامی فتوحات کی یلغار سے جل بھن کر کباب ہوگئے تھے انہیں اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا رخ موڑنے کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہ آیا کہ زہریلے نظریات کا بیج بو کر امت اسلامیہ کی وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔ جب مسلمان آپس میں دست و گریباں ہوں گے تو ان میں کفر کو للکارنے کی تب و تاب باقی نہیں رہے گی۔ چنانچہ انہوں نے "حب علی" کے خول میں مکروہ ترین عقائد بھر کر نظریاتی اختلاف کا ہائیڈروجن بم اسلام کے مرکز پر گرا دینا چاہا۔ اگر

اسلام خدا تعالیٰ کا آخری دین نہ ہوتا. اور اللہ تعالیٰ نے تاقیامت اس کی حفاظت کا وعدہ نہ فرمایا ہوتا تو قریب تھا کہ اسلامی قلعہ بھک سے اڑ جاتا۔ اور جس طرح سینٹ پال یہودی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو مسخ کر دیا تھا اسی طرح یہودی سازش اسلام کا حلیہ بگاڑنے میں بھی کامیاب ہوجاتی لیکن صحابہ و تابعین اور خود حضرت علی رضی اللہ عنہ. نے شدت سے اس فتنہ کی سرکوبی کی. نتیجہ یہ کہ شیعہ عقائد و نظریات "تقیہ" کی نقاب اوڑھنے پر مجبور ہوگئے۔

بعد میں شیعوں میں بہت سے فرقے ہوئے. جن کی تفصیل حضرت پیران پیر شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کی کتاب "غنیۃ الطالبین" اور حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" میں دیکھی جاسکتی ہے۔ انہی میں سے ایک فرقہ "شیعہ امامیہ" یا "شیعہ اثنا عشریہ" کہلاتا ہے اور یہی فرقہ آجکل عام طور سے "شیعہ" کہلاتا ہے ان کے عقائد کی تفصیل کا اس وقت موقعہ نہیں۔ البتہ ان کے چند اصول حسب ذیل ہیں:

(۱) ـــــ نظریہ امامت ـــــ شیعہ مذہب کی اصل الاصول بنیاد "عقیدہ امامت" ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے انبیاء کرامؑ کو مبعوث کیا جاتا تھا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اماموں کو بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے مبعوث کیا جائے گا۔ وہ شیعہ عقیدے میں نبی کی طرح ہر غلطی سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ ان پر وحی نازل ہوتی ہے. ان کی اطاعت ہر بات میں نبی کی طرح فرض ہے. وہ نبی کی طرح احکام شریعت نافذ کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ قرآن کریم کے جس حکم کو چاہیں منسوخ یا معطل بھی کرسکتے ہیں۔

گویا اسلامی عقیدہ میں جو مفہوم. جو حیثیت اور جو مرتبہ ایک مستقل صاحب شریعت نبی کا ہے ٹھیک وہی مفہوم. وہی حیثیت اور وہی مرتبہ شیعوں کے نزدیک "امام معصوم" کا ہے۔

شیعوں کا یہ "نظریہ امامت" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے

خلاف ایک بغاوت اور اسلام کی ابدیت کے خلاف ایک کھلی سازش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دور قدیم سے لیکر مرزا غلام احمد قادیانی تک جن جن لوگوں نے نبوت و رسالت کے جھوٹے دعوے کئے انہوں نے اپنے دعووں کا مصالحہ شیعوں کے "نظریات امامت" ہی سے مستعار لیا۔

شیعہ مذہب کا نظریہ امامت فطری طور پر غلط تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شیعہ مذہب بھی اس کا بوجھ زیادہ دیر تک نہ اٹھاسکا. بلکہ اس نے "اماموں" کا سلسلہ "بارہویں امام" پر ختم کر کے اسے (۲۶۰ھ) میں کسی نامعلوم غار (سرمن راء کے غار) میں ہمیشہ کے لئے غائب کر دیا۔ آج ان کو ساڑھے گیارہ صدیاں گزرتی ہیں مگر کسی کو کچھ خبر نہیں کہ "بارہویں امام" کہاں ہیں اور کس حالت میں ہیں۔

میں شیعہ کے "نظریہ امامت" پر جتنا غور کرتا ہوں میرے یقین میں اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے کہ یہ عقیدہ یہودیوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت پر ضرب لگانے اور امت میں جھوٹے مدعیان نبوت کے دعویٰ نبوت و امامت کا چور دروازہ کھولنے کے لئے گھڑا ــــــ غور فرمایئے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک چھ صدیوں کا طویل عرصہ گزرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ہادی مبعوث نہیں کیا جاتا ادھر جب ختم نبوت کا آفتاب (صلی اللہ علیہ وسلم) قیامت تک کی ساری دنیا کو منور کرنے کے بعد رخصت ہوتا ہے. تو شیعہ عقیدہ کے مطابق خدا ایک دن کیا ایک لمحہ کا وقفہ بھی نہیں کرتا. بلکہ فوراً ایک "امام معصوم" کو کھڑا کر کے اسے شریعت محمدیہؐ کے حلال و حرام کو بدلنے اور قرآن کو منسوخ کرنے کے اختیارات دے دیتا ہے ــــــ اور پھر ایک نہیں لگاتار بارہ امام اسی شان کے بھیجتا رہتا ہے ــــ اور جب اسلام پر اڑھائی صدیوں کا مایہ ناز دور گزر جاتا ہے تو خدا یکایک "اماموں کا سلسلہ بند کر دیتا ہے" بلکہ بارہواں امام جو بھیجا جا چکا تھا اسے بھی دو سال ہی کی عمر میں ہمیشہ کے لئے غائب کر دیتا ہے۔ کیا ایک ایسا شخص جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر ایمان

رکھتا ہو. جس کے نزدیک اسلام مٹنے. بدلنے اور مسخ ہونے کے لئے نہیں بلکہ قیامت تک اپنی اصلی حالت باقی رہنے اور چمکنے کے لئے آیا ہو وہ شیعوں کے "نظریہ امامت" کو ایک لمحہ کے لئے بھی برداشت کر سکتا ہے؟

شیعہ مذہب جن اکابر کو "امام معصوم" کہتا ہے. انہوں نے نہ کبھی "امامت" کا دعویٰ کیا۔ نہ مخلوق خدا کو اپنی اطاعت کی دعوت دی بلکہ وہ سب کے سب اہل سنت کے اکابر اور مسلمانوں کی آنکھوں کا نور تھے ان کا دین و مذہب. ان کا طور و طریق اور ان کی عبادت کبھی شیعوں کے اصول و عقائد کے مطابق نہیں ہوئی. بلکہ وہ سب صحابہ و تابعین کے طریقہ پر تھے۔ وہی دین جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے. اور جس پر ساری دنیا کے مسلمان عمل پیرا تھے یہ اکابر بھی ساری دنیا کے سامنے اسی پر عمل کرتے تھے ___ مگر شیعہ مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ اندر سے ان کے عقائد کچھ اور تھے مگر ازراہ تقیہ وہ مسلمانوں کے مطابق عمل کرتے تھے۔ گویا شیعوں کے نزدیک خدا نے "امام معصوم" بنا کر بھیجا بھی تو ایسے لوگوں کو جو دنیا کو کوئی ہدایت نہ دے سکے۔ بلکہ ساری عمر لباس تقیہ میں ملبوس رہے۔ اور بارہویں امام تو ایسے غائب ہوئے کہ آج تک ان کا کہیں سراغ نہیں! اس سے معلوم ہوا ہو گا کہ شیعوں کا نظریہ امامت نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت و نبوت پر ضرب لگاتا ہے۔ بلکہ یہ سراسر عقل کے بھی خلاف ہے. اور یہ خدا کی تعلیم نہیں بلکہ کسی یہودی دماغ کی ایجاد ہے۔

(۲) شیعوں کا دوسرا سب سے بڑا اصول صحابہ کرامؓ سے بغض و عداوت ہے۔ شیعوں کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد تمام صحابہؓ جنہوں نے حضرت ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کی (جن میں خود حضرت علیؓ بھی شامل ہیں) وہ نعوذ باللہ اس فعل کی وجہ سے سب کے سب کافر اور مرتد ہو گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے "امام معصوم" یعنی حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی۔ اور چونکہ تینوں خلفاء کے زمانہ میں حضرت علیؓ نے بھی مسلمانوں کو اپنی بیعت کی دعوت نہیں دی۔ بلکہ خود ان

تین حضرات کے ہاتھ پر بیعت فرمائی اس لئے شیعہ صاحبان حضرت علیؓ سے بھی خفا ہیں۔

شیعوں کا یہ نظریہ جس قدر باطل اور غلط ہے اس پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ اس عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دنیا میں تشریف لانا نعوذ باللہ بالکل لغو، بے کار اور بے سود ثابت ہوا۔ اسلام کا دعویٰ تو یہ ہے کہ وہ قیامت تک انسانیت کی راہنمائی کے لئے آیا ہے۔ مگر شیعہ عقیدہ یہ کہتا ہے کہ بالکل غلط ہے۔ اسلام تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک دن بھی آگے نہیں چلا بلکہ وہ پوری کی پوری جماعت جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تیئس سال کی مسلسل محنت کے بعد تیار کی تھی۔ اور جن کو اپنے درمیان اور آنے والی امت کے درمیان واسطہ بنایا تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے دن ہی نعوذ باللہ مرتد ہو گئی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیعہ مذہب اسلام کی نفی کا نام ہے۔ یعنی اگر شیعہ عقیدہ صحیح ہے تو اسلام ـــــ معاذ اللہ ـــــ غلط ہے اور اگر اسلام حق ہے تو شیعہ مذہب کے غلط اور باطل ہونے میں کسی عاقل کو شبہ نہیں ہونا چاہئے۔

شیعہ مذہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفقاء اور آپؐ کے جانشینوں پر حملہ کر کے خود اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر ایک ایسا حملہ کیا ہے جس کی مثال انسانی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ تفسیر مظہری میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے استاد امام شعبیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ اگر یہودیوں سے پوچھو کہ تمہاری امت میں سب سے افضل کون لوگ ہوئے ہیں؟ تو وہ فوراً کہیں گے کہ "حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفقاء اور ان کے صحابیؓ ـــــ اور اگر عیسائیوں سے پوچھو کہ تمہاری جماعت میں سب سے بزرگ تر کون لوگ ہیں؟ تو وہ فوراً بول اٹھیں گے کہ "عیسیٰ علیہ السلام کے حواری" ـــــ لیکن اگر شیعوں سے پوچھو کہ امت محمدیہ میں سب سے بدترین مخلوق کون ہے؟ تو ان کا جواب ہو گا "محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ" ـــــ نعوذ باللہ، استغفر اللہ!

بہر حال شیعوں کا نظریہ امامت اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے خلاف ایک بغاوت تھا. تو ان کا "نظریہ تبرا" خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف ایک کھلی بغاوت ہے۔ اور کوئی شخص جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو یہ تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیار کی ہوئی پوری جماعت آپؐ کے آنکھیں بند کرتے ہی نعوذ باللہ گمراہ اور مرتد ہو گئی تھی۔

(۳) شیعوں کا تیسرا عقیدہ اول الذکر دونوں عقیدوں سے بدتر. مگر دو دونی چار کی طرح اول الذکر دو عقیدوں کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور وہ ہے تحریف قرآن۔

مسلمان تو مسلمان آج تک کسی بد سے بدتر کافر کو بھی یہ کہنے کی جرات نہیں ہوئی (اور نہ بقائمی عقل و خرد کوئی اس کی جرائت کر سکتا ہے) کہ مسلمانوں کے پاس "قرآن مجید" کے نام سے جو مقدس کتاب محفوظ چلی آتی ہے. اور جس کے ہر زمانے میں ہزاروں نہیں. لاکھوں حافظ موجود رہے ہیں. وہ ٹھیک وہی کتاب نہیں جو مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی —— لیکن آفرین ہے شیعہ مذہب کے موجدوں کو انہوں نے یہ عقیدہ بھی شیعوں سے منوالیا۔ شیعہ مذہب کہتا ہے کہ قرآن کریم جو موجودہ شکل میں مسلمانوں کے پاس ہے یہ وہ اصل قرآن نہیں۔ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا تھا. بلکہ یہ صحیفہ عثمانی ہے ——

"اصلی [1] تے وڈا قرآن" بارہویں امام کے ساتھ کسی نامعلوم غار میں دفن ہے شیعوں کا یہ ایسا عقیدہ ہے کہ سوائے دو چار کے ان کے تمام امام. مجتہد اور علماء اس کو مانتے آئے ہیں۔ اور ان کی کتابوں میں ان کے "معصوم اماموں" کی دو ہزار سے زیادہ روایتیں اس پر متفق ہیں —— اور ہونا بھی یہی چاہئے تھا کیونکہ جب شیعوں کے بقول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد معاذ اللہ سارے صحابہؓ مرتد ہو گئے تھے تو ان کے ذریعے سے حاصل شدہ قرآن کریم پر ایمان کیسے ہو سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ جن دو چار شیعہ علماء نے یہ کہا کہ قرآن صحیح سالم محفوظ چلا آیا ہے ان کو سب سے پہلے صحابہ کرامؓ کی عظمت و بزرگی پر ایمان لانا پڑا۔ گویا شیعہ مذہب کی صداقت پر ایمان

۱۔ اصلی اور بڑا قرآن

رکھتے ہوئے کوئی شخص قرآن پر ایمان لا ہی نہیں سکتا....... اور نہ کسی شیعہ کا قرآن کریم پر ایمان لانا ممکن ہے۔

شیعوں کے عقائد و نظریات اور بھی بہت ہیں مگر زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ صرف انہی تین عقیدوں پر غور کر کے دیکھا جا سکتا ہے کہ شیعہ مذہب کو اسلام سے کیا نسبت ہے؟

میں نے اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا تھا کہ آپؐ نے مثال دینے کے لئے ایک خط کھینچ کر فرمایا کہ "یہ تو خدا کا راستہ ہے"۔ اور اس کے ارد گرد کچھ خطوط کھینچ کر فرمایا کہ "یہ وہ راستے ہیں جن میں سے ہر ایک پر ایک شیطان بیٹھا لوگوں کو اس کی دعوت دے رہا ہے"۔

اس ارشاد کی روشنی میں میں عرض کروں گا کہ شیعہ مذہب. خدا تعالیٰ کے راستے کے مقابلہ میں وہ سب سے پہلا راستہ ہے جو شیطان نے خدا کی مخلوق کو گمراہ کرنے کے لئے اپنے یہودی ایجنٹوں کے ذریعہ ایجاد کیا۔

شیعہ مذہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پہلے دن سے امت کا تعلق اس کے مقدس (نبی صلی اللہ علیہ وسلم) سے کاٹ دینا چاہا اس نے اسلام کی ساری بنیادوں کو اکھاڑ پھینکنے کی کوشش کی۔ اور اسلام کے بالمقابل ایک نیا دین تصنیف کر ڈالا۔ آپ نے سنا ہو گا کہ شیعہ مذہب. اسلام کے کلمہ پر راضی نہیں۔ بلکہ اس میں "علی ولی اللہ. وصی رسول اللہ. و خلیفہ بلا فصل" کی پیوند کاری کرتا ہے۔ بتایئے جب اسلام کا کلمہ اور قرآن بھی شیعوں کے لئے لائق تسلیم نہ ہو تو کس چیز کی کسر باقی رہ جاتی ہے؟ اور یہ ساری نحوست ہے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض و عداوت کی. جس سے ہر مومن کو اللہ کی پناہ مانگنی چاہئے۔

صحابہ کرامؓ وحی الٰہی سے پہلے مخاطب ہیں۔ ان کی سیرت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا ایک حصہ ہے۔ ان کا اخلاق و کردار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل ہے۔ اور وہ آنے والی پوری امت کے سردار. معلم اور مرشد ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دین اسلام کی امانت ان کے سپرد کر کے دنیا سے رحلت فرما ہوئے۔ اور بعد میں آنے والی امت کو جو کچھ ملا انہی اکابر کے طفیل اور انہی کی جوتیوں کے صدقے سے ملا. اس لئے صحابہ کرامؓ سے محبت دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے. کیونکہ آپ ہی کے تعلق کی بناء پر ہے۔ اور صحابہ کرامؓ سے عداوت دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت ہے۔ ان کی محبت جزو ایمان ہے اور ان کی شان میں گستاخی نہ صرف محسن کشی ہے بلکہ سلب ایمان کی موجب ہے. اس لئے میرا عقیدہ اہل سنت کے مطابق یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آل و اصحاب دونوں کی خاک پا کو اکسیر سعادت اور منبع برکت سمجھا جائے۔

جس شخص کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا بھی تعلق ہو گا وہ آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کو محبوب رکھے گا۔ چہ جائیکہ وہ اکابر جو آپ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشین ہوئے۔ اور ہم کو انہی کی قربانیوں کے طفیل دولت ایمان نصیب ہوئی اس لئے جس طرح حضرت علیؓ کی حمایت میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ذات کو تنقید کا نشانہ بنانے والے میرے نزدیک گمراہ ہیں۔ اسی طرح میں ان لوگوں کی رائے کو بھی صریح گمراہی سمجھتا ہوں جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں کسی ادنی گستاخی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ یا یزید کی حمایت میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں یاوہ گوئی کرتے ہیں۔ میں تمام آل و اصحاب کی محبت و عظمت کو جزو ایمان سمجھتا ہوں۔ اور ان میں سے کسی ایک بزرگ کی تنقیص. خواہ اشارے کنائے کے رنگ میں ہو. اسے سلب ایمان کی علامت سمجھتا ہوں۔ یہ میرا عقیدہ ہے۔ اور میں اسی عقیدے پر اپنے خدا کی بارگاہ میں حاضر ہونا چاہتا ہوں۔

(۲) حنفی وہابی اختلاف:

دوسرا اختلاف جس کے بارے میں آپ نے دریافت فرمایا ہے وہ "حنفی وہابی

اختلاف " ہے۔ اور آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان میں سے حق پر کون ہے؟ اس اختلاف کی نوعیت سمجھنے کے لئے چند امور کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ امت میں "نظریاتی اختلاف" تو بلاشبہ ایک فتنہ ہے. مگر فروعی مسائل میں "اجتہادی اختلاف" نہ صرف ایک ناگزیر اور فطری چیز ہے۔ بلکہ بارشاد نبوی. یہ امت کے لئے ایک رحمت ہے۔ بشرطیکہ اس میں شدت کا نقطہ لگا کر اسے "زحمت" میں تبدیل نہ کر لیا جائے۔

(۲) آپ یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ جن اکابر امت کو ائمہ اجتہاد تسلیم کیا گیا ہے وہ نہ صرف قرآن و سنت کے ماہر تھے۔ بلکہ بعد کی پوری امت سے بڑھ کر شریعت کے نکتہ شناس تھے. علم و فضل. دیانت و امانت. فہم و بصیرت. زہد و تقویٰ اور خدا شناسی میں ان سے بڑھ کر کوئی شخص اس امت میں پیدا نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ جن بزرگوں کو علم کے بڑے بڑے پہاڑ اور کشف و الہام کے بڑے بڑے دریا کہا جاتا ہے وہ سب ان ائمہ اجتہاد کے پیرو کار تھے۔ ایسے باکمال بزرگوں کا ان کی پیروی کرنا ان کے بلندی مرتبہ کی دلیل ہے۔

(۳) ائمہ اجتہاد بہت سے اکابر ہوئے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ نے امت کے سواد اعظم کو چار بزرگوں کے اجتہاد پر جمع کر دیا ہے۔ یعنی امام ابو حنیفہؒ۔ امام شافعیؒ۔ امام مالکؒ۔ اور امام احمد بن حنبلؒ۔

چوتھی صدی کے بعد جتنے اکابر علماء و مشائخ ہوئے ہیں وہ سب انہی چار میں سے کسی ایک کے پیرو تھے۔ گویا پوری امت کے ارباب علم و فضل اور ارباب قلوب و مکاشفہ ان اکابر کی قیادت و سیادت پر متفق ہیں اور کوئی قابل ذکر عالم اور بزرگ ایسا نہیں ملے گا جو ان میں سے کسی ایک کا متبع نہ ہو۔

(۴) ان بزرگوں میں بہت سے فروعی مسائل میں اختلاف بھی ہے. مگر اپنی اپنی جگہ سب حق پر ہیں اس لئے شریعت مطہرہ پر عمل کرنے کے لئے ان میں سے جس کے اجتہاد کی بھی پیروی کی جائے صحیح ہے. مگر ان میں سے کسی کی بے ادبی و گستاخی جائز

نہیں۔ کیونکہ کسی عالم کی گستاخی دراصل علم کی توہین ہے۔ اور علم شریعت کی بے حرمتی بارگاہ خداوندی میں ناقابل معافی ہے۔

(۵) شریعت مطہرہ کا بیشتر حصہ وہ ہے جس پر یہ چاروں امام متفق ہیں اور بقول شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ؒ ان چاروں بزرگوں کا کسی مسئلہ پر اتفاق کرنا "اجماع امت" کی علامت ہے۔ یعنی جس مسئلہ پر ائمہ اربعہ متفق ہوں سمجھ لینا چاہئے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے لیکر آج تک کی پوری امت اس پر متفق چلی آئی ہے ـــــ اس لئے ائمہ اربعہ کے اتفاقی مسئلہ سے باہر نکلنا جائز نہیں ـــــ میں اس کی مثال یہ دیا کرتا ہوں کہ پاکستان کے چاروں ہائی کورٹ قانون کی جس تشریح پر متفق ہو جائیں وہی قانون کی صحیح اور مسلمہ تعبیر ہوگی۔ اور کسی ایسے شخص کو، جو قانون پاکستان کا وفادار، اس متفقہ تشریح کے خلاف قانون کی تشریح کرنے کا حق نہیں ہوگا۔ اور اگر کوئی شخص ایسی حماقت کرے گا تو اس کی تشریح پاکستان کے کسی شہری کے لئے لائق تسلیم نہیں ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ ائمہ اربعہ، امت اسلامیہ کے چار ہائی کورٹ ہیں، ان کی حیثیت واضع قانون کی نہیں۔ بلکہ قانون کے شارح کی ہے۔ اور ان کے متفقہ تشریح سے انحراف کا کسی کو حق نہیں ہے۔

اس تمہید کے بعد گزارش ہے کہ "حنفی وہابی اختلاف" دو قسم کا ہے۔ ایک تو چند فروعی مسائل کا اختلاف ہے، مثلاً نماز میں ہاتھ کہاں باندھے جائیں؟ دونوں قدموں کے درمیان فاصلہ کتنا ہونا چاہئے؟ رفع یدین کیا جائے یا نہیں؟ آمین اونچی کہی جائے یا آہستہ؟ امام پیچھے فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں؟ وغیرہ۔

ان مسائل کی تعداد خواہ کتنی زیادہ ہو میں ان کو فروعی اختلاف سمجھتا ہوں۔ اور دونوں فریقوں میں سے جس کی جو تحقیق ہو اس کے لئے اسی پر عمل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر اہل حدیث حضرات ہمارے امام ابو حنیفہ ؒ کی تحقیق پر مطمئن نہیں تو انہیں اس پر کیوں مجبور کیا جائے۔ اسی طرح اگر ہمارے نزدیک اہلحدیث حضرات کی تحقیق لائق اطمینان نہیں تو کوئی ضروری نہیں کہ ہم ان کی تحقیق پر ہی عمل کریں۔ جیسا کہ

میں پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ فروعی اختلافات حضرات صحابہ کرام. سلف صالحین اور ائمہ ہدیٰ کے درمیان بھی رہے ہیں۔ اور یہ اختلاف اگر اپنی حد کے اندر رہے تو سراپا رحمت ہے۔ کہ امت کے کسی نہ کسی فرد کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر سنت کو کسی نہ کسی شکل میں محفوظ کر دیا ہے ـــــ لیکن میں ان مسائل میں تشدد کو روا نہیں سمجھتا. جس کے ذریعہ کے ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف زبان طعن دراز کرے۔ اور ان فروعی مسائل کی بنا پر ایک دوسرے کو گمراہ بتایا جائے۔ اس تشدد کے بعد یہ اختلاف رحمت نہیں رہے گا۔ بلکہ زحمت بن جائے گا۔ اور امت کی عملی قوتیں ان فروعی مسائل میں خرچ ہو کر ختم ہو جائیں گی۔ . ہر ایک چیز اپنی حد کے اندر رہے تو اچھی لگتی ہے. اور جب اپنی حد سے نکل جائے تو وہ مذموم بن جاتی ہے۔ یہی حال ان فروعیات کا ہے۔

حنفی وہابی اختلاف کی دوسری قسم وہ ہے جس کو میں "نظریاتی اختلاف" سمجھتا ہوں. اور اس میں میری رائے اہلحدیث حضرات (جن کو آپ نے وہابی لکھا ہے۔ اور عام طور پر انہیں غیر مقلد کہا جاتا ہے) کے ساتھ متفق نہیں بلکہ میں ان کے موقف کو غلط سمجھتا ہوں۔ اصولی طور پر یہ اختلاف دو نکتوں میں ہے، اول یہ کہ اہل حدیث حضرات کے نزدیک کسی معین امام کی اقتدا نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہر شخص کو قرآن و حدیث سے جو بات سمجھ آئے اس پر عمل کرنا چاہئے۔ یہ مسئلہ "تقلید اور ترک تقلید" کے عنوان سے مشہور ہے۔ جو ایک بہت ہی معرکہ الآراء مسئلہ ہے اور جس پر چند معروضات پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

(۱) تقلید کے معنی ہیں "کسی لائق اعتماد آدمی کی بات کو بغیر مطالبہ دلیل تسلیم کر لینا"۔ جس آدمی کی اس کی بات مانی جا رہی ہے اگر وہ سرے سے لائق اعتماد نہیں تو ظاہر ہے کہ اس کی بات ماننا ہی غلط ہو گا۔ اور اگر وہ اپنے فن کا ماہر ہے تو ایک عامی آدمی کا اس سے دلیل کا مطالبہ کرنا غلط ہو گا۔ اس کی مثال ایسی سمجھ لیجئے کہ آپ کسی طبیب یا ڈاکٹر کے پاس جاتے ہیں۔ اور وہ آپ کے لئے کوئی نسخہ تجویز کرتا ہے. اور وہ طبیب اپنے فن کا ماہر ہی نہیں بلکہ محض عطائی ہے تو آپ کا اس کے پاس تشریف لے

جانا ہی غلط ہوگا اور اگر وہ اپنے فن کا مستند ماہر ہے تو اسے کے تجویز کردہ نسخہ کی ایک ایک چیز کے اجزاء کے بارے میں آپ کا بحث کرنا. اور ایک ایک بات کے لئے دلیل کا مطالبہ کرنا قطعاً نادرست اور ناروا ہوگا۔

وجہ یہ کہ کہ ایک عامی آدمی کسی ماہر کے پاس جاتا ہی اس وقت ہے جب وہ مسئلہ اس کی عقل و فہم کی سطح سے اونچا ہو ـــــ ٹھیک اسی طرح دین و شریعت کا معاملہ سمجھنا چاہئے۔ پس دین کے وہ مسائل جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر چلے آرہے ہیں اور جن کو ہر شخص جانتا ہے کہ دین کا مسئلہ یہ ہے اس کے بارے میں کسی مسلمان کو نہ کسی عالم کے پاس جانے کی ضرورت پیش آتی ہے اور نہ کوئی جاتا ہے۔ دینی مسائل میں اہل علم کی طرف رجوع کی ضرورت اسی وقت لاحق ہوتی ہے جب کہ ہم ایسے عامی لوگوں کی ذہنی سطح سے وہ مسئلہ اونچا ہو ـــــ ایسی حالت میں دو صورتیں ممکن ہیں ایک تو یہ ہے کہ ہم خود قرآن و حدیث کھول کر بیٹھ جائیں۔ اور ہماری اپنی عقل و فہم میں جو بات آئے اسے "دین" سمجھ کر اس پر عمل کرنے لگیں۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ جو حضرات قرآن و سنت کے ماہر ہیں ان سے رجوع کریں اور انہوں نے اپنی مہارت. طویل تجربہ اور خداداد بصیرت سے قران و حدیث میں غور کرنے کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے اس پر اعتماد کریں۔ پہلی صورت خود رائی کی ہے۔ اور دوسری صورت کو تقلید کہا جاتا ہے جو عین تقاضائے عقل و فطرت کے مطابق ہے۔

ماہرین شریعت کی تحقیقات سے صرف نظر کرتے ہوئے ایک ایک مسئلہ کے لئے قرآن و حدیث میں غور کرنے والے عامی شخص کی مثال ایسی ہوگی کہ کوئی شخص بہت سی پیچیدہ بیماریوں میں مبتلا ہو جائے اور ماہرین فن سے رجوع کرنے کو بھی اپنی کسر شان سمجھے۔ اور اس مشکل کا حل وہ یہ تلاش کرے کہ طب کی مستند اور اچھی اچھی کتابیں منگوا کر ان کا مطالعہ شروع کردے اور پھر اپنے حاصل مطالعہ کا تجربہ خود اپنی ذات پر کرنے لگے۔ مجھے توقع ہے کہ اول تو کوئی عقلمند ایسی حرکت کرے گا نہیں اور اگر کوئی

شخص واقعی اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ وہ ماہرین فن سے رجوع کئے بغیر اپنے پیچیدہ امراض کا علاج اپنے مطالعہ کے زور سے کر سکتا ہے تو اسے صحت کی دولت تو نصیب نہیں ہوگی. البتہ اسے اپنے کفن دفن کا انتظام پہلے سے کر رکھنا چاہئے پس جس طرح طب میں خودرائی آدمی کو قبر میں پہنچا کر چھوڑتی ہے. اسی طرح دین میں خودرائی آدمی کو گمراہی اور زندقہ کے غار میں پہنچا کر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے سامنے جتنے گمراہ اور ملحد فرقے ہوئے ان سب نے اپنی مشق کا آغاز اسی خودرائی اور ترک تقلید سے کیا ـــــ مشہور اہلحدیث عالم مولانا محمد حسین بٹالوی مرحوم اس خودرائی اور ترک تقلید کا ماتم کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھتے ہیں:

"پچیس برس کے تجربہ سے ہم کو یہ بات معلوم ہوئی ہے ـــــ کہ جو لوگ بے علمی کے ساتھ مجتہد مطلق (ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں) اور مطلق تقلید کے تارک بن جاتے ہیں وہ آخر اسلام کو سلام کر بیٹھتے ہیں۔ کفر و ارتداد کے اسباب اور بھی بکثرت موجود ہیں. مگر دینداروں کے بے دین ہو جانے کے لئے بے علمی کے ساتھ ترک تقلید بڑا بھاری سبب ہے۔ گروہ اہلحدیث میں جو بے علم یا کم علم ہو کر ترک مطلق تقلید کے مدعی ہیں وہ ان نتائج سے ڈریں۔ اس گروہ کے عوام آزاد اور خود مختار ہوتے جاتے ہیں۔" (اشاعۃ السنۃ نمبر ۴ جلد نمبر ۱ مطبوعہ ۱۸۸۸ء)

(۲) یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہوگی کہ عامی آدمی کو ایک "معین امام" کی تقلید ہی کیوں ضروری ہے؟ جو شخص قرآن و حدیث کا اس قدر ماہر ہو کہ وہ خود مرتبہ اجتہاد کو پہنچ گیا ہو وہ عامی نہیں. بلکہ خود مجتہد ہے۔ اس کو کسی دوسرے ماہر فن کی تقلید نہ صرف یہ کہ ضروری نہیں بلکہ جائز بھی نہیں۔ (مگر آج کل کے ہم جیسے طالب علموں کے بارے میں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے کہ وہ اردو تراجم کی مدد سے مرتبہ

اجتہاد کو پہنچ گئے ہیں)

اور جو شخص خود درجہ اجتہاد پر فائز نہ ہو اس نے خواہ کتنی کتابیں پڑھ رکھی ہوں. وہ عامی ہے اور اس کو بہر حال کسی مجتہد کے قول کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اب اگر وہ ایک۔ "متعین امام" پر اعتماد کر کے اس کے مسائل پر عمل کرے گا تو شرعاً اس پر جو ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس نے اسے پورا کر دیا لیکن اگر وہ کسی ایک امام کے بجائے جس امام کی جو بات پسند آئے گی اسے قبول کرے گا تو سوال یہ ہے کہ اس کے پاس پسند و ناپسند کا معیار کیا ہو گا؟ اگر کہا جائے کہ قرآن و حدیث اس کا معیار ہے اور یہ شخص جس امام کے قول کو قرآن و حدیث کے مطابق پاتا ہے اسی کو اختیار کرتا ہے تو اس نے در حقیقت اپنی فہم کو معیار بنایا ہے ——— اس لئے ہم کہیں گے کہ اگر وہ واقعی قرآن و حدیث کا ماہر ہے اور اس کا فہم قرآن و حدیث حجت ہے تو اس کو کسی امام کی تقلید کی ضرورت ہی نہیں یہ خود مجتہد مطلق ہے اور اگر وہ قرآن و حدیث کا ماہر نہ ہونے کے باوجود اپنی عقل و فہم کو معیار بناتا ہے تو پھر وہ خود رائی کا شکار ہے، جو اس کے دین کے لئے مہلک ہو سکتی ہے۔

(۳) بہت سے اکابر اولیاء اللہ کا معمول تھا کہ ائمہ کے اقوال کو جمع کرتے تھے. اور ہر مسئلہ میں ایسے قول کو اختیار کرتے تھے جس میں زیادہ سے زیادہ احتیاط نظر آئے۔ مثلاً ایک امام کے نزدیک ایک چیز ضروری ہے اور دوسرے کے نزدیک ضروری نہیں۔ تو وہ حضرات ضروری والے قول پر عمل پیرا ہوتے تھے. اسی طرح مثلاً ایک امام کے نزدیک ایک چیز مکروہ ہے اور دوسرے کے نزدیک مکروہ نہیں تو وہ حضرات کراہت کے قول پر عمل کرتے ہوئے اس سے پرہیز کرتے تھے ——— یہ تو خدا ترس بندوں کی شان تھی۔ مگر اب ترک تقلید کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ جس امام کا جو مسئلہ خواہش نفس کے مطابق نظر آئے اس پر عمل کرو. یہ دراصل قرآن و حدیث کی پیروی نہیں بلکہ خواہش نفس کی پیروی ہے۔ گو شیطان نے اسے قرآن و حدیث کی پیروی کا رنگ دے دیا ہے۔

(۴) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ چوتھی صدی سے پہلے کسی "معین امام" کی تقلید کا رواج نہیں تھا. بلکہ ہوتا یہ تھا کہ جس شخص کو مسئلہ دریافت کرنے کی

ضرورت ہوتی وہ کسی بھی عالم سے مسئلہ پوچھ لیتا. اور اس پر عمل کرتا لیکن چوتھی صدی کے بعد حق تعالیٰ شانہ نے امت کو ائمہ اربعہ کی اقتدا پر جمع کر دیا۔ اور ایک معین امام کی تقلید کو لازم سمجھا جانے لگا۔ اس زمانے میں یہی خیر کی بات تھی۔ اس لئے کہ اب لوگوں میں دیانت و تقویٰ کی کمی آگئی تھی۔ اگر ایک معین امام کی تقلید کی پابندی نہ ہوتی تو ہر شخص اپنی پسند کے مسائل چن چن کر ان پر عمل کیا کرتا اور دین ایک کھلونا بن کر رہ جاتا۔ پس اس خودرائی کا ایک ہی علاج تھا کہ نفس کو کسی ایک ماہر شریعت کے فتویٰ پر عمل کرنے کا پابند کیا جائے۔ اور اسی کا نام تقلید شخصی ہے۔

(۵) اہلحدیث حضرات کی جانب سے کہا جاتا ہے کہ چونکہ تقلید کا رواج کئی صدیوں بعد ہوا ہے اس لئے وہ "بدعت" ہے۔ مگر تقلید کو بدعت کہنا ان کی غلطی ہے. اس لئے کہ اول تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ ان اہلحدیث حضرات کے سوا ـــــ جن کا وجود تیرہویں صدی میں بھی نہیں تھا ـــــ باقی پوری امت محمدیہ گمراہ ہوگئی نعوذ باللہ ـــــ اور یہ ٹھیک وہی نظریہ ہے جو شیعہ مذہب حضرات صحابہ کرامؓ کے بارے میں پیش کرتا ہے. اور چونکہ اسلام قیامت تک کے لئے آیا ہے اس لئے پوری امت کا ایک لمحہ کے لئے بھی گمراہی پر متفق ہونا باطل ہے۔

دوسرے. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانے میں بھی یہ دستور تھا کہ ناواقف اور عامی لوگ اہل علم سے مسائل پوچھتے اور ان کے فتویٰ پر بغیر طلب دلیل عمل کرتے تھے۔ اور اسی کو تقلید کہا جاتا ہے گویا "تقلید" کا لفظ اس وقت اگرچہ استعمال نہیں ہوتا تھا مگر تقلید کے معنی پر لوگ اس وقت بھی عمل کرتے تھے۔ سو آپ اس کا نام اب بھی تقلید نہ رکھئے اقتدا و اتباع رکھ لیجئے۔

تیسرے. فرض کرو اس وقت تقلید کا رواج نہیں تھا تب بھی اس کو بدعت نہیں کہا جاسکتا ہے اس لئے کہ دین و شریعت پر چلنا تو فرض ہے. اور میں اوپر بتا چکا ہوں کہ آج

جو "شخصی تقلید" کے بغیر شریعت پر چلنے کی کوشش کرے گا وہ کبھی نفس و شیطان کے مکر سے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے بغیر خطرات کے دین پر چلنے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے کسی ایک ماہر شریعت امام کی پیروی ـــــ معروضی طور پر دیکھا جائے تو اہلحدیث حضرات بھی ـــــ معدودے چند مسائل کے سوا ـــــ اہل ظاہر محدثین کی ہی پیروی کرتے ہیں۔ اس لئے گو انہیں "تقلید" کے لفظ سے انکار ہے۔ مگر غیر شعوری طور پر ان کو بھی اس سے چارہ نہیں۔ اس لئے کہ دین کوئی عقلی ایجاد نہیں۔ بلکہ منقولات کا نام ہے۔ اور منقولات میں ہر بعد میں آنے والے طبقہ کو اپنے سے پہلے طبقہ کے نقش قدم پر چلنا لازم ہے۔ یہ فطری چیز ہے جس کے بغیر شریعت پر عمل کرنا ممکن نہیں۔

(۲) اہلحدیث حضرات کا مولد و منشا غیر منقسم ہندوستان ہے. چونکہ یہاں پہلے سے حنفی مذہب رائج تھا۔ اس لئے ان کے ـــــ اعتراضات کا اول و آخر نشانہ حنفی مذہب بنا. اسی پر بس نہیں بلکہ انہوں نے حضرت امام ابو حنیفہؒ کی کسر شان میں بھی کسر نہ چھوڑی۔ اگرچہ اہلحدیث کا بہت سا سنجیدہ طبقہ. خصوصاً ان کے اکابر و بزرگ حضرت امامؒ کی بے ادبی کو روا نہیں سمجھتے. مگر ان کا نو عمر. خام علم اور خام فہم طبقہ "عمل بالحدیث" کے معنی ہی حضرت امامؒ کی بے ادبی۔ گستاخی کرنے کو سمجھتا ہے۔

میں ان حضرات کے اس طرز عمل کو خود ان کے حق میں نہایت خطرناک سمجھتا ہوں۔ کیونکہ حضرت امامؒ کی بلندی شان کے لئے یہی کافی ہے کہ مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ. جیسے اکابر ان کے مقلد ہوئے ہیں۔ اس لئے چند خوش فہم لوگوں کی تنقید سے حضرت امامؒ کی بلندی مرتبت میں تو کوئی فرق نہیں آئے گا۔ البتہ سلف صالحین اور خاصانِ خدا کی اہانت کرنے پر خدا تعالیٰ کا جو وبال نازل ہوا کرتا ہے وہ ان حضرات کے لئے خطرے کی چیز ضرور ہے۔

اہلحدیث حضرات کے نظریاتی اختلاف کا دوسرا نکتہ یہ ہے کہ یہ حضرات بعض

لوقلت شوق اجتہاد میں "اجماع امت" سے بھی بے نیاز ہو جاتے ہیں یہاں اس کی دو مثالیں عرض کرتا ہوں۔

اول: آپ کو معلوم ہو گا کہ بیس رکعت تراویح کا دستور مسلمانوں میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے سے آج تک چلا آرہا ہے. اور چاروں ائمہ دین بھی اس پر متفق ہیں لیکن اہلحدیث حضرات اس کو بلا تکلف "بدعت" کہہ دیتے ہیں۔ اور اس مسئلہ میں میں نے بعض حضرات کو اپنے کانوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں ناروا الفاظ کہتے سنا ہے۔

دوم: دوسرا مسئلہ تین طلاق بلفظ واحد کا ہے یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو ایک لفظ یا ایک مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالے تو تین ہی طلاقیں شمار ہوں گی۔ یہ فتویٰ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیا تھا اور تمام صحابہ و تابعین نے اس فتوے کو قبول کیا ____ مجھے کسی صحابی و تابعی کا علم نہیں جس نے اس فتوے سے اختلاف کیا ہو۔ یہی مذہب ائمہ اربعہ کا ہے (جن کے اتفاق کو میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے حوالے سے اجماع امت کی علامت بتا چکا ہوں) لیکن اہلحدیث حضرات بڑی جرات سے ایسی تین طلاقوں کے ایک ہونے کا فتویٰ دیتے ہیں۔ مجھے یہاں ان دونوں مسائل میں ان کے شبہات سے بحث نہیں. بلکہ صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ حضرات ان دونوں مسائل میں اجماع امت سے ہٹ کر شیعوں کے نقش قدم پر ہیں اور حضرات خلفائے راشدین کی پیروی کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا تھا اس کا رشتہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔

میں اس تصور کو ساری گمراہیوں کی جڑ سمجھتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ. تابعین عظامؒ ائمہ ہدیٰؒ اور اکابر امتؒ نے فلاں مسئلہ صحیح نہیں سمجھا۔ اور آج کے کچھ زیادہ پڑھے لکھے لوگوں کی رائے ان اکابر کے مقابلے میں زیادہ صحیح ہے۔ نعوذ باللہ

(۳) دیوبندی بریلوی اختلاف:

تیسرا اختلاف جس کے بارے میں آپ نے میری رائے طلب کی ہے وہ "دیوبندی بریلوی اختلاف" ہے اور آپ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ان میں سے حق پر کون ہے؟ میرے لئے "دیوبندی بریلوی اختلاف" کا لفظ ہی موجب حیرت ہے۔ آپ سن چکے ہیں کہ شیعہ سنی اختلاف تو صحابہ کرامؓ کو ماننے یا نہ ماننے کے مسئلہ پر پیدا ہوا۔ اور حنفی وہابی اختلاف. ائمہ ہدیٰ کی پیروی کرنے نہ کرنے پر پیدا ہوا۔ لیکن "دیوبندی بریلوی اختلاف" کی کوئی بنیاد میرے علم میں نہیں ہے. اس لئے کہ یہ دونوں فریق امام ابو حنیفہؒ کے ٹھیٹھ مقلد ہیں۔ عقائد میں دونوں فریق امام ابوالحسن اشعریؒ اور امام ابو منصور ماتریدیؒ کو امام و مقتدا مانتے ہیں تصوف و سلوک میں دونوں فریق اولیاء اللہ کے چاروں سلسلوں —— قادری. چشتی. سہروردی. نقشبندی —— میں بیعت کرتے کراتے ہیں۔

الغرض یہ دونوں فریق اہل سنت والجماعت کے تمام اصول و فروع میں متفق ہیں۔ صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین کی عظمت کے قائل ہیں۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے مقلد اور مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ تک سب اکابر کے عقیدت مند ہیں. اور اکابر اولیاء اللہ کی کفش برداری کو سعادت دارین جانتے ہیں۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان مجھے اختلاف کی کوئی صحیح بنیاد نظر نہیں آتی —— تاہم میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ ان کے درمیان چند امور میں اختلاف ہے اس لئے میں کسی فریق کا نام لئے بغیر. قرآن و سنت اور فقہ حنفی کی تصریحات کی روشنی میں ان کے مختلف فیہ مسائل کے بارے میں اپنا نقطہ نظر پیش کر دینا کافی سمجھتا ہوں۔

ان دونوں کے درمیان جن نکات میں اختلاف ہے وہ یہ ہیں:-

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نور تھے یا بشر؟

(۲) آپؐ عالم الغیب تھے یا نہیں؟

(۳) آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں یا نہیں؟

(۴) آپ صلی اللہ علیہ وسلم مختار کل ہیں یا نہیں. یعنی اس کائنات کے تمام اختیارات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبضہ میں ہیں یا اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں؟

ان مسائل میں جس فریق کا عمل قرآن کریم. ارشادات نبویؐ. تعامل صحابہ اور فقہ حنفی کے مطابق ہوگا میں اسے حق پر سمجھتا ہوں۔ اور دوسرے کو غلطی پر..... اب میں نہایت اختصار کے ساتھ ان متنازع فیہ مسائل کے بارے میں اپنا نکتہ نظر پیش کرتا ہوں۔

۱۔ نور اور بشر.

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ آپؐ اپنی ذات کے لحاظ سے نہ صرف نوع بشر میں داخل ہیں بلکہ افضل البشر ہیں نہ صرف انسان ہیں بلکہ نوع انسان کے سردار ہیں۔ نہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کی نسل سے ہیں بلکہ آدمؑ و اولاد آدم کے لئے سرمایہ صد افتخار ہیں ــــــ صلی اللہ علیہ وسلم ــــــ خود ارشاد نبویؐ ہے:

اَنَا سَیِّدُ وُلْدِ اٰدَمَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ (مشکوٰۃ ص۵۱۱)

ترجمہ:۔ میں اولاد آدم کا سردار ہوں گا قیامت کے دن۔

اس لئے آپؐ کا بشر انسان اور آدمی ہونا نہ صرف آپؐ کے لئے طرہ افتخار ہے. بلکہ آپؐ کے بشر ہونے سے انسانیت و بشریت رشک ملائکہ ہے۔

جس طرح آپؐ اپنی نوع کے اعتبار سے بشر ہیں اسی طرح آپؐ صفت ہدایت کے لحاظ سے ساری انسانیت کے لئے مینارہ نور ہیں. یہی "نور" ہے جس کی روشنی میں انسانیت کو خدا تعالیٰ کا راستہ مل سکتا ہے۔ اور جس کی روشنی ابد تک درخشندہ و تابندہ رہے گی۔ لہٰذا میرے عقیدے میں آپؐ بیک وقت نور بھی ہیں اور بشر بھی ــــــ اور میرے نزدیک نور و بشر کو دو خانوں میں بانٹ کر ایک کی نفی اور دوسرے کا اثبات غلط ہے۔

بشراور انسان دونوں ہم معنی لفظ ہیں۔ اور بشریت کی نفی کے معنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو نعوذ باللہ دائرہ انسانیت سے خارج کرنا ہے. حالانکہ قرآن کریم میں سینکڑوں جگہ انبیاء کرامؑ کے بنی نوع انسان میں سے ہونے کی صراحت کی گئی ہے۔ ادھر تمام اہلسنّت والجماعت اس پر متفق ہیں کہ صرف نوع انسان ہی میں سے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ہے۔ اہل سنت کے عقائد کی مشہور کتاب "شرح عقائد نسفی " میں رسول کی تعریف یہ کی گئی ہے:

اِنْسَانٌ بَعَثَہُ اللہُ لِتَبْلِیْغِ الرِّسَالَۃِ وَالْاَحْکَامِ۔

ترجمہ:۔ رسول وہ انسان ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے پیغامات واحکام بندوں تک پہنچانے کے لئے کھڑا کرتا ہے۔

اور فقہ حنفی کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری (ص ۲۶۳ ج ۲) میں "فصول عمادیہ" کے حوالے سے لکھا ہے کہ "جو شخص کہے کہ میں نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے یا جن. وہ مسلمان نہیں"۔ الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا انسان اور بشر ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا کوئی شخص بشرط سلامتی عقل ہرگز انکار نہیں کر سکتا۔

بعض لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ آپؐ خدا کے نور میں سے نور تھے. جو لباس بشریت میں جلوہ گر ہوئے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ "احد" اور "احمد" میں صرف "میم" کا پردہ ہے نعوذ باللہ یہ بعینہٖ وہی عقیدہ ہے جو عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں رکھتے ہیں کہ وہ خدا تھے جو لباس بشریت میں آئے۔ اسلام میں ایسے لغو اور باطل عقائد کی کوئی گنجائش نہیں۔ خدا اور بندہ خدا کو ایک کہنا اس سے زیادہ لغو اور بیہودہ بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ پہلی امتوں نے اسی قسم کے غلو سے اپنے دین کو برباد کیا تھا. اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے بارے میں بھی اسی غلو کا اندیشہ تھا اس لئے آپؐ نے امت کو ہدایت فرمائی فرمائی کہ "میری تعریف میں ایسا مبالغہ نہ کیجئو جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے

بارے میں کیا کہ انہیں خدا اور خدا کا بیٹا بنا ڈالا. میں اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں۔ مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہیو" (صلی اللہ علیہ وسلم) (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۹)

اس ارشاد مقدس کی روشنی میں میرا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کمالات و خصوصیات میں تمام کائنات میں سب سے اعلیٰ واشرف اور یکتا ہیں. کوئی آپؐ کے مثل نہیں۔ مگر آپؐ بہرحال انسان ہیں. خدا نہیں —— یہی اسلام کی تعلیم ہے. اور اسی پر میرا ایمان ہے ——

(۲) عالم الغیب:

میرا عقیدہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ شانہ نے وہ علوم عطا کئے جو کسی مقدس نبی اور کسی مقرب فرشتے کو عطا نہیں کئے گئے۔ بلکہ تمام اولین و آخرین کے علوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دریائے علم کا ایک قطرہ ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ کی ذات وصفات گزشتہ و آئندہ کے بیشمار واقعات برزخ اور قبر کے حالات میدان محشر کے نقشے. جنت و دوزخ کی کیفیت. الغرض وہ تمام علوم جو آپؐ کی ذات اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کے شایان شان تھے وہ سب آپؐ کو عطا کئے گئے. اور ان کا اندازہ حق تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں۔ اسی کے ساتھ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جس طرح ساری کائنات کے علوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم مقدسہ سے کوئی نسبت نہیں یہی حیثیت آپؐ کے علوم کی حق تعالیٰ کے علم محیط کے مقابلے میں ہے —— صحیح بخاری شریف کی حدیث ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک چڑیا کو دریا کے کنارے پانی پیتے ہوئے دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا.

مَا عِلْمِیْ وَعِلْمُكَ مِنْ عِلْمِ اللهِ اِلَّا مِثْلَ مَا نَقَصَ هٰذَا الْعُصْفُوْرُ مِنْ هٰذَا الْبَحْرِ (ص ۶۸۸ ج ۲)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں میرے اور آپ کے علم کی مثال اس قطرے کی ہے جو اس

چڑیا نے اس دریا سے کم کیا ہے۔

اور یہ مثال بھی محض سمجھانے کے لئے ہے ورنہ مخلوق کے محدود علم کو اللہ تعالیٰ کے غیر محدود علم کے ساتھ کیا نسبت؟ (حاشیہ صحیح بخاری ص ۴۸۲ ج ۱) یہی سبب ہے کہ قرآن کریم میں جگہ جگہ "عالم الغیب" کا لفظ اللہ تعالیٰ کی خاص صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے. اور بہت سی جگہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے "عالم الغیب" ہونے کی نفی کی گئی ہے۔ بیسویں پارے کی ابتداء میں اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات الوہیت ذکر کرتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا۔

"قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ وَمَا يَشْعُرُوْنَ أَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ"

ترجمہ:۔ فرمادیجئے کہ آسمانوں اور زمین میں جتنی مخلوق بھی موجود ہے ان میں سے کوئی غیب نہیں جانتا۔ اللہ کے سوا۔ اور ان کو خبر دو کہ وہ کب اٹھائے جائیں گے (النحل: ۶۵)

اسی طرح بہت سی احادیث میں بھی یہ مضمون ارشاد ہوا ہے ان آیات واحادیث کو نقل کیا جائے تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب بھی کافی نہیں ہوگی۔ اور ہمارے تمام ائمہ اہلسنت اور ائمہ احناف کا یہی مسلک ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کو "عالم الغیب" کہنا صحیح نہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ "جو شخص یہ کہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ سلم غیب جانتے تھے. اس نے اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھا ہے" (صحیح بخاری مشکوٰۃ شریف ص ۵۰۱)

اور فقہ حنفی کی مشہور کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ "جس شخص نے کسی عورت سے گواہوں کے بغیر نکاح کیا اور یہ کہا کہ ہم خدا اور رسولؐ کو گواہ بناتے ہیں تو وہ کافر ہو جائے گا" (فتاویٰ عالمگیری ص ۲۶۶ ج ۲) اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو "عالم الغیب" سمجھا اور ایسا عقیدہ رکھنا کفر ہے۔ (فتاویٰ قاضی خان برحاشیہ عالمگیری ص ۳۳۴ ج ۱ البحر الرائق ص ۸۸ ج ۳)

بعض لوگ بڑی ڈھٹائی سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ "عالم الغیب" نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "عالم الغیب" ہیں۔ ایسا کلمہ کفر سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ دراصل یہ مسکین یہی نہیں جانتے کہ "علم الغیب" کسے کہتے ہیں؟ ہمارے ائمہ احناف کی مشہور تفسیر "مدارک" میں لکھا ہے:

"وَالْغَيْبُ : هُوَمَالَمْ يَقُمْ عَلَيْهِ دَلِيْلٌ وَلَا اطَّلَعَ عَلَيْهِ مَخْلُوْقٌ"

ترجمہ:۔ یعنی "غیب" ان چیزوں کو کہا جاتا ہے جن پر کوئی دلیل قائم نہیں۔ اور نہ کسی مخلوق کو ان کی اطلاع ہے"۔

پس جن امور کا علم انبیاء کرام علیہم السلام کو بذریعہ وحی عطا کر دیا جاتا ہے۔ یا جو چیزیں اولیاء کرام کو بذریعہ الہام یا کشف معلوم ہوجاتی ہیں ان پر "غیب" کا اطلاق نہیں ہوتا ــــ خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم مبارکہ اس قدر ہیں کہ ان کی وسعت کا اندازہ کسی انسان، کسی جن اور کسی فرشتے کو نہ ہوا ہے، اور نہ ہوسکتا ہے لیکن نہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم، علم الٰہی کے مساوی ہیں۔ اور نہ قرآن کریم، حدیث نبویؐ اور فقہ حنفی کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو "عالم غیب" کہنا صحیح ہے۔

(۳) حاضر و ناظر:۔

اس نکتہ پر غور کرنے کے سب سے پہلے "حاضر و ناظر" کا مطلب سمجھ لینا ضروری ہے، یہ دونوں عربی کے لفظ ہیں جن کے معنی ہیں "موجود اور دیکھنے والا"۔ اور جب ان دونوں کو ملا کر استعمال کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ہوتی ہے "وہ شخصیت جس کا وجود کسی خاص جگہ میں نہیں بلکہ اس کا وجود بیک وقت ساری کائنات کو محیط ہے، اور کائنات کی ایک ایک چیز کے تمام حالات اول سے آخر تک اس کی نظر میں ہیں۔" میرا عقیدہ یہ ہے کہ "حاضر و ناظر" کا یہ مفہوم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک پر صادق آتا ہے۔ اور یہ صرف اسی کی شان ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے

میں سب جانتے ہیں کہ آپ روضہ اطہر میں استراحت فرما ہیں۔ اور دنیا بھر کے مشتاقان زیارت وہاں حاضری دیتے ہیں۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ عقیدہ کہ آپ ہر جگہ موجود ہیں۔ اور کائنات کی ایک ایک چیز آپ کی نظر میں ہے۔ بداہت عقل کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں۔ چہ جائیکہ یہ شرعاً درست ہو۔ یہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اور اس کو کسی دوسری شخصیت کے لئے ثابت کرنا غلط ہے۔

اور اگر "حاضر و ناظر" ماننے والوں کا یہ مطلب ہے کہ اس دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد آپ کی روح طیبہ کو اجازت ہے کہ جہاں چاہیں تشریف لے جائیں تو اول تو اس سے آپ کا ہر جگہ "حاضر و ناظر" ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ پاکستان کے ہر شخص کو اجازت ہے کہ وہ ملک کے جس حصے میں جب چاہے آجا سکتا ہے۔ کیا اس اجازت کا کوئی شخص یہ مطلب سمجھے گا کہ پاکستان کا ہر شہری پاکستان میں "حاضر و ناظر" ہے؟ ___ کسی جگہ جانے کی اجازت ہونے سے وہاں واقعۃً حاضر ہونا تو لازم نہیں آتا۔ اس کے علاوہ جب کسی خاص جگہ (مثلاً کراچی) کے بارے میں کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہاں حاضر ہیں تو یہ ایک مستقل دعویٰ ہے جس کی دلیل کی ضرورت ہوگی، چونکہ اس کی کوئی دلیل شرعی موجود نہیں اس لئے بغیر دلیل شرعی کے اس کا عقیدہ رکھنا ناجائز ہوگا۔ بعض لوگ نہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں، بلکہ تمام اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہوتے ہیں۔ مجھے ان حضرات کی سخاوت پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ کتنی فیاضی سے اللہ تعالیٰ شانہ کی صفات اس کی مخلوق میں تقسیم کرتے پھرتے ہیں، بہر حال ائمہ اہل سنت کے نزدیک یہ جسارت قابل برداشت نہیں۔ فتاویٰ بزازیہ میں فرماتے ہیں:

قَالَ عُلَمَاءُنَا مَنْ قَالَ اَرْوَاحُ الْمَشَایِخِ حَاضِرَةٌ تَعْلَمُ یُکَفَّرُ (بزازیہ برحاشیہ عالمگیری ص ۳۲۶ ج ۶)

ترجمہ:۔ ہمارے علماء نے فرمایا ہے کہ جو شخص کہے کہ بزرگوں کی روحیں حاضر ہیں اور وہ سب کچھ جانتی ہیں ایسا شخص کافر ہے۔

(۴) مختارِ کل:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے خدائی صفات ثابت کرنے کا صاف صاف نتیجہ یہ تھا کہ آپ ؐ کو خدائی اختیارات میں بھی حصہ دار ٹھہرایا جائے۔ چنانچہ بعض لوگوں نے یہ عقیدہ بھی بڑی شد و مد سے پیش کیا ہے کہ اس کارخانہ عالم کے متصرف و مختار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کو تمام اختیارات عطا کر دیئے ہیں۔

اس لئے یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو "مختار کل" کا خطاب دیتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم. حدیث نبوی ؐ اور عقائد اہلسنت میں اس عقیدے کی کوئی گنجائش نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کے کل یا بعض اختیارات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا کسی اور کو دیئے ہیں ـــ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ موت و حیات. صحت و مرض. عطاء و بخشش. سب اسی کے ہاتھ میں ہے. یہی وجہ ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیاء اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں التجائیں اور دعائیں کرتے اور اسی کو ہر قسم کے نفع و نقصان کا مالک سمجھتے رہے ہیں۔ یہی حال تمام اکابر اولیاء اللہ کا ہے۔ کسی نبی و ولی اور صدیق و شہید نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اسے کائنات میں تصرف کا حق دے دیا گیا ہے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس بارے میں جو عقیدہ تھا وہ یہ ہے:

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سوار تھا۔ آپ ؐ نے

مجھے مخاطب کر کے فرمایا:

اے لڑکے! تو اللہ کے حقوق کی حفاظت کر. اللہ تیری حفاظت کرے گا۔ تو اللہ کے حقوق کی حفاظت کر تو اس کو اپنے سامنے پائے گا۔ اور جب کچھ مانگنا ہو تو اللہ تعالیٰ سے مانگ۔ اور جب مدد کی ضرورت ہو تو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کر. اور یقین رکھ کر ساری جماعت اگر تجھے کوئی نفع پہنچانے پر جمع ہو جائے تو تجھے کوئی نفع نہیں پہنچا سکتی سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔ اور اگر ساری جماعت تجھے کوئی نقصان پہنچانے پر جمع ہو جائے تو تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی سوائے اس کے جو اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے لکھ دیا ہے۔" (مشکوٰۃ شریف ص ۴۵۳)

شیخ علی القاری ؒ اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

"اللہ سے مانگ" یعنی صرف اللہ تعالیٰ سے مانگ۔ اس لئے کہ عطیات کے خزانے اسی کے پاس ہیں۔ اور عطاء و بخشش کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ ہر نعمت یا نقمت، خواہ دنیا کی ہو یا آخرت کی، جو بندے کو پہنچتی ہے یا اس سے دفع ہوتی ہے وہ بغیر کسی شائبہ غرض یا ضمیمہ علت کے صرف اسی کی رحمت سے ملتی ہے. کیونکہ وہ جواد مطلق ہے. اور وہ ایسا غنی ہے کہ کسی کا محتاج نہیں۔ اس لئے امید صرف اسی کی رحمت سے ہونی چاہئے. بڑی بڑی مہمات میں التجا اسی کی بارگاہ میں ہونی چاہئے۔ اور تمام امور میں اعتماد اسی کی ذات پر ہونا چاہئے اس کے سوا کسی سے نہ مانگے۔ کیونکہ اس کے سوا کوئی دوسرا نہ دینے پر قادر ہے نہ روکنے پر نہ مصیبت ٹالنے پر، نہ نفع پہنچانے پر۔ کیونکہ اس کے

ماسوا خود اپنی ذات کے نفع نقصان کا اختیار نہیں رکھتے. اور نہ وہ موت و حیات اور جی اٹھنے کی قدرت رکھتے ہیں "

اور آگے " ساری جماعت " کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" بے شک ساری امت " یعنی تمام مخلوق. خاص و عام انبیاء و اولیاء اور ساری امت بالفرض اس بات پر متفق ہو جائیں کہ دنیا یا آخرت کے کسی معاملے میں تجھے کسی چیز کا نفع پہنچائیں تو تجھے نفع پہنچانے پر قادر نہیں " ۔ (مرقاۃ المفاتیح ص ۹۱ ج ۵)

اور حضرت پیران پیر شاہ عبدالقادر جیلانیؒ " الفتح الربانی " کی مجلس نمبر ۶۱ میں فرماتے ہیں:

إِنَّ الْخَلْقَ عَجِزٌ عَدَمٌ، لَا هَلْكَ بِأَيْدِيهِمْ وَلَا مِلْكَ، لَا غِنىٰ بِأَيْدِيهِمْ وَلَا فَقْرَ، وَلَا ضَرَّ بِأَيْدِيهِمْ وَلَا نَفْعَ، وَلَا مُلْكَ عِنْدَهُمْ إِلَّا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔ لَا قَادِرَ غَيْرُهُ، وَلَا مُعْطِيَ وَلَا مَانِعَ وَلَا ضَارَّ وَلَا نَافِعَ غَيْرُهُ، وَلَا مُحْيِيَ وَلَا مُمِيتَ غَيْرُهُ۔

ترجمہ:۔ بے شک مخلوق عاجز اور عدم محض ہے. نہ ہلاکت ان کے ہاتھ میں ہے اور نہ ملک۔ نہ مالداری ان کے قبضہ میں ہے. نہ فقر. نہ نقصان ان کے ہاتھ میں ہے اور نہ نفع. نہ اللہ تعالیٰ کے سوا ان کے پاس کوئی ملک ہے اور نہ اس کے سوا کوئی قادر ہے۔ نہ اس کے سوا کوئی دینے والا ہے۔ نہ روکنے والا. نہ کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ نہ نفع دے سکتا۔ نہ اس کے سوا کوئی زندگی دینے والا ہے نہ موت " ۔

یہی عقیدہ تمام اولیاء اللہ کا اور تمام اکابر اہل سنت کا ہے ـــــ اور حق تعالیٰ شانہ انبیاء کرام علیہم السلام کے ہاتھ پر بطور معجزہ کے اور اولیاء اللہ کے ہاتھ پر بطور کرامت کے جو چیزیں ظاہر

فرماتے ہیں وہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہے۔ اسی بناء پر اس کو معجزہ اور کرامت کہا جاتا ہے۔ معجزہ اور کرامت کو دیکھ کر ان کو خدائی میں شریک اور کائنات کا مالک اور مختار سمجھ لینا حماقت ہے۔ یہی حماقت عیسائیوں سے سرزد ہوئی جب انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر (مثلاً مردوں کو زندہ کرنے سے) ان کو خود خدائی کا حصے دار سمجھ لیا۔ قرآن کریم کی دعوت کا سب سے اہم ترین موضوع اور انبیاء کرامؑ کی بعثت کا سب سے بڑا مقصد حق تعالیٰ کی توحید ذات. توحید صفات اور توحید افعال ہے۔ قرآن کریم نے حقِ تعالیٰ شانہ کی الوہیت کے جو دلائل بارہا مختلف پیرایوں میں بیان فرمائے ہیں ان میں سب سے زیادہ واضح دلیل یہی ہے کہ بتاؤ! کائنات میں متصرف کون ہے؟ رزق کون دیتا ہے؟ موت و حیات اور صحت و مرض کس کے قبضہ میں ہے؟ نفع و نقصان کا کون مالک ہے؟ وغیرہ وغیرہ ـــــ ظاہر ہے کہ ان چیزوں کو اگر دوسروں کے لئے ثابت کیا جائے تو قرآن کریم کا تقریباً ایک تہائی حصہ باطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے جو احکام صادر ہوتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تشریعی احکام. جو انبیاء کرام علیہم السلام کی معرفت بندوں کو دیئے گئے ہیں۔ اور دوسرے تکوینی احکام جو کائنات کی ہر چیز پر جاری ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی تشریعی احکام سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ خواہ وہ خدا تعالیٰ کا کتنا ہی مقرب ہو۔ اسی طرح اس کی تکوینی احکام سے کوئی مخلوق خارج نہیں. خواہ وہ آسمان کی مخلوق ہو یا زمین کی وہ انبیاء کرام علیہم السلام ہوں یا خدا تعالیٰ کے فرشتے ساری کائنات اللہ کے تکوینی احکام کی پابند اور اس کی قضاء وقدر کے تحت ہے لوگ انبیاء و اولیاء کو کائنات کے اختیارات تفویض کرتے ہیں۔ حالانکہ جن حضرات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت نصیب فرمائی ہے وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادہ کے ہاتھ میں "مردہ بدست زندہ" کی طرح سمجھتے ہیں اور ہم جیسے محجوب لوگ جو اپنی خود مختاری پر ناز کرتے ہیں حضرات عارفین تو اس سے بھی برائت کا اظہار کرتے ہیں۔ اس لئے انبیاء و اولیاء کو کائنات میں متصرف سمجھنا خود ان اکابر کے ذوق و مسلک اور ان کی دعوت کے خلاف ہے۔

یہ چار تو وہ اہم ترین مسائل ہیں جن کا تعلق عقیدے سے ہے۔ ان کے علاوہ بعض اور امور میں بھی جھگڑا ہے۔ میں ان کے بارے میں بھی اپنا نکتہ نظر واضح کئے دیتا ہوں۔

غیر اللہ کو پکارنا.

ان میں سے ایک مشہور مسئلہ یہ ہے کہ " یارسول اللہ " کہنا جائز ہے یا نہیں ؟ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے کہ " یارسول اللہ ! " کہنے کی کئی صورتیں ہیں۔ اور سب کا حکم ایک نہیں ۔ مثلاً ایک صورت یہ ہے کہ شعراء اپنے تخیل میں جس طرح کبھی باد صبا کو خطاب کرتے ہیں۔ اور کبھی پہاڑوں اور جنگلوں کو. کبھی حیوانات اور پرندوں کو ــــ ان میں سے کسی کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ جن کو وہ خطاب کر رہے ہیں وہ ان کی بات سنتے اور اس کا جواب دیتے ہیں. بلکہ یہ محض ایک ذہنی پرواز اور تخیلاتی چیز ہوتی ہے. جس پر واقعاتی احکام جاری نہیں ہوتے. اسی طرح شعراء کے کلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا دیگر مقبولان الٰہی کو تخیلاتی طور پر جو خطاب کیا جاتا ہے. میں اس کو صحیح اور درست سمجھتا ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جس طرح عشاق اپنے محبوبوں کو خطاب کرتے ہیں اسی طرح آپ ؐ کو محض اظہار و محبت کے لئے خطاب کیا جائے واقعتہً ندا مقصود نہ ہو ــــ یا جس طرح کہ کسی مادر شفیق کا بچہ فوت ہو جائے تو وہ اس کا نام لیکر پکارتی ہے وہ جانتی ہے کہ اس کی آہ و بکاء کی آواز بچے کی قبر تک نہیں پہنچ رہی اس کے باوجود وہ اپنی مامتا کی وجہ سے ایسا کرنے پر گویا مجبور ہے۔ اسی طرح جو عشاق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عشق میں واقعی جل بھن گئے ہوں اور انہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پکارنے کے لئے بغیر کسی کروٹ چین ہی نہ آئے۔ حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی آہ و بکا سامعہ مبارک تک نہیں پہنچتی. ان کا " یارسول اللہ ! " کہنا بھی جائز ہو گا. بشرطیکہ عقیدہ میں فساد نہ ہو۔

ایک صورت یہ ہے کہ کوئی شخص "الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ" کے صیغہ سے درود شریف پڑھتا ہے. اور خیال کرتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے فرشتے اس درود کو بارگاہ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) میں پہنچا دیں گے۔ ان کے اس فعل کو بھی ناجائز نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے.

مَنْ صَلّٰی عِنْدَ قَبْرِیْ سَمِعْتُهٗ وَمَنْ صَلّٰی عَلَیَّ نَائِیًا اُبْلِغْتُهٗ
(مشکوٰۃ شریف ص ۸۶)

ترجمہ: جو شخص مجھ پر میری قبر کے پاس درود پڑھے میں اسے خود سنوں گا۔ اور جو شخص مجھ پر دور سے درود شریف پڑھے وہ مجھے پہنچایا جائے گا۔

ایک اور حدیث میں ہے:

اِنَّ لِلّٰهِ مَلٰٓئِكَةً سَيَّاحِيْنَ فِى الْاَرْضِ يُبَلِّغُوْنِىْ مِنْ اُمَّتِى السَّلَامَ (مشکوٰۃ شریف ص ۸۶)

ترجمہ: بے شک اللہ تعالیٰ کے کچھ فرشتے زمین میں پھرتے رہتے ہیں اور میری امت کا سلام مجھے پہنچاتے ہیں۔

ایک اور حدیث میں ہے:

لَا تَجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قُبُوْرًا وَلَا تَجْعَلُوْا قَبْرِىْ عِيْدًا وَصَلُّوْا عَلَیَّ فَاِنَّ صَلٰوتَكُمْ تُبَلِّغُنِىْ حَيْثُ كُنْتُمْ (حوالۂ بالا)

ترجمہ: ۔ اپنے گھروں کو قبریں نہ بناؤ۔ اور میری قبر کو عید میلہ نہ بنالینا۔ اور مجھ پر صرف درود شریف پڑھا کرو۔ کیونکہ تم جہاں سے بھی درود پڑھو وہ مجھے پہنچا دیا جاتا ہے۔

اگرچہ اس کے کے لئے بھی صحیح طریقہ یہی ہے کہ درود و سلام بھیجنے کا جو طریقہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے اسی کو اختیار کرے. غائبانہ درود میں خطاب کے صیغے استعمال نہ کرے. اس کے باوجود اگر اس کے عقیدے میں کسی قسم کا فساد نہیں۔ یا اس کے فعل سے کسی دوسرے کے عقیدے میں بگاڑ پیدا ہونے کا اندیشہ نہیں تو اس کے "یارسول اللہ" کہنے کو ناجائز نہیں کہا جائے گا ہاں اگر فساد عقیدہ کا اندیشہ ہو تو ناجائز کہے بغیر چارہ نہیں۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص اس نیت سے یارسول اللہ کہتا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ ہر شخص کی بات ہر جگہ سنتے ہیں. اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی حاضر و ناظر ہیں اور ہر شخص کی ہر جگہ سنتے ہیں. میں اس صورت کو صحیح نہیں

سمجھتا.

یہ عقیدہ جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں، غلط ہے، اور قرآن کریم، حدیث نبویؐ اور فقہ حنفی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ـــــ چونکہ عوام حدود کی رعایت کم ہی رکھا کرتے ہیں اس لئے سلف صالحین اس معاملہ میں بڑی احتیاط فرماتے تھے۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، کا ارشاد نقل کیا ہے:

"جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے۔ ہم التحیات میں "السلام علیک ایہا النبی" پڑھا کرتے تھے، مگر جب آپؐ کا وصال ہو گیا تو ہم اس کے بجائے علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کہنے لگے۔ (ص ۹۲۶ ج ۲)

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا مقصد اس سے یہ بتانا تھا کہ "التحیات" میں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کے صیغہ سے سلام کیا جاتا ہے وہ اس عقیدہ پر مبنی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہر جگہ حاضر و موجود ہیں۔ اور ہر شخص کے سلام کو خود سماعت فرماتے ہیں ـــــ نہیں! بلکہ یہ خطاب کا صیغہ اللہ تعالیٰ کے سلام کی حکایت ہے، جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں فرمایا تھا

" یارسول اللہ! کہنے کی پانچویں صورت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر پر حاضر ہو کر مواجہ شریفہ کے سامنے کھڑے ہو کر پڑھے "الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ"۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روضہ اطہر میں حیات ہیں۔ اور ہر زائر کے سلام کو سماعت فرماتے اور اس کا جواب مرحمت فرماتے ہیں اس لئے وہاں جا کر خطاب کرنا نہ صرف جائز بلکہ احسن ہے۔

یہ ہیں وہ چند صورتیں، جن میں سے ہر ایک کا حکم میں عرض کر چکا ہوں۔ اب ہمارے یہاں جو لوگ "یارسول اللہ!" کہتے ہیں وہ کس نیت کس کیفیت اور کس مقصد سے کہتے ہیں؟ اس کا فیصلہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ البتہ یہاں دو مسئلے اور عرض کر دینا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ شیعہ صاحبان نے "نعرہ حیدری، یاعلی" ایجاد کیا

تھا۔ بعض لوگوں نے ان کی تقلید میں "نعرہ رسالت. یارسول اللہ" اور نعرہ غوثیہ: یاغوث!" ایجاد کرلیا۔ مگر مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور ائمہ ہدیٰ کی زندگی میں کہیں نظر نہیں آیا کہ "اللہ اکبر" کے سوا مسلمانوں نے کسی اور نام کا نعرہ لگایاہو. نہ قرآن کریم. حدیث نبوی اور فقہ حنفی یاکسی میں اس کا ذکر ہے۔ اس لئے میں اسے شیعوں کی تقلید سمجھتا ہوں۔ جس سے اہلسنّت والجماعت بالکل بری ہیں۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح بطور دعاء و تقرب حق تعالیٰ کو پکارا جاتا اور اس کے پاک نام کا وظیفہ پڑھا جاتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور بزرگ ہستی کو پکارنا اور اس کے نام کا وظیفہ جپنا اسلام نے جائز نہیں رکھا۔ کیونکہ یہ فعل عبادت کے زمرے میں آتا ہے اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ شانہ کا حق ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور اولیائے امت میں سے کسی نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بزرگ ہستی کے نام کا وظیفہ نہیں پڑھا۔ حضرت قاضی ثناء اللہ حنفی پانی پتیؒ ارشاد الطالبین میں فرماتے ہیں:

وَلَا يَصِحُّ الذِّكْرُ بِاَسْمَآءِ الْاَوْلِيَآءِ عَلٰى سَبِيْلِ الْوَظِيْفَةِ اَوِ السَّيْفِيِّ لِقَضَآءِ الْحَاجَةِ كَمَا يَقْرَؤُوْنَ الْجُهَّالُ۔

(بحوالہ الجنۃ لاهل السنۃ ص۷)

ترجمہ:۔ اور اولیاء اللہ کے نام کا وظیفہ پڑھنا یا کسی مراد کے لئے سیفی پڑھنا صحیح نہیں۔ جیسا کہ جاہل لوگ پڑھتے ہیں۔

نیز ارشاد الطالبین فارسی ص ۱۹ میں فرماتے ہیں:

مگر آنکہ ذکر محمد رسول اللہ با ذکر خدائے تعالیٰ در اذان و اقامت و تشہد و مانند آں عبادت است و ذکر محمد رسول اللہ

مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ساتھ محمد رسول اللہ کا نام اذان ، اقامت، اور کلمہ شہادت وغیرہ میں ذکر عبادت ہے ...... مگر آنحضرت

ہم بروجہیکہ در شرع وارد نشدہ است، چنانچہ کسے بطور وظیفہ یا محمد یا محمد گفتہ باشد، روا نباشد (ص ۱۹)

صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر ایسے طریقہ پر کرنا جو شریعت میں نہیں آیا، مثلاً یہ کہ کوئی شخص یا محمدؐ یا محمدؐ، کا وظیفہ پڑھنے لگے، یہ جائز نہیں۔

توسل اور دعاء:

ایک اہم نزاعی مسئلہ یہ ہے کہ آیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین کا توسل (وسیلہ پکڑنا) جائز ہے یا نہیں؟ اس میں میرا مسلک یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، انبیاء کرام علیہم السلام، صحابہ کرامؓ اور دیگر مقبولان الٰہی کے طفیل اور وسیلے سے دعاء مانگنا جائز ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ اے اللہ! اپنے ان نیک اور مقبول بندوں کے طفیل میری یہ دعاء قبول فرما، یا میری فلاں مراد پوری فرمادے۔

بعض علماء نے اس توسل کا انکار کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اپنے کسی نیک عمل کا حوالہ دے کر اور اس کو وسیلہ بنا کر دعاء کرنا تو صحیح ہے، جیسا کہ "حدیث الغار" میں تین شخصوں کے اپنے اپنے عمل سے توسل کرنے کا تذکرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا (صحیح بخاری ص ۴۹۳ ج ۱) مگر کسی شخصیت کے وسیلے سے دعا کرنا صحیح نہیں۔ اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ کسی زندہ شخصیت کے وسیلے سے دعا کرنا تو جائز ہے، جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے توسل سے دعا فرمائی تھی (صحیح بخاری ص ۱۳۷ ج ۱) مگر جو حضرات اس دنیا سے تشریف لے جاچکے ہیں ان کے طفیل سے دعا کرنا صحیح نہیں۔

مگر میں ان حضرات کی رائے سے متفق نہیں ہوں۔ کیونکہ توسل میں دعا بزرگوں سے نہیں کی جاتی، بلکہ براہ راست خدا تعالیٰ سے کی جاتی ہے۔ پس جب کسی ایسے مقبول بندے کے توسل سے دعا کرنا جائز ہے جو اس دنیا میں موجود ہو تو ان مقبولان الٰہی کے توسل سے دعا کرنا بھی صحیح ہوگا جو اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔

نیز جب اپنے نیک عمل کے توسل سے دعا کرنا جائز ہے تو کسی مقبول بارگاہ خداوند کے توسل سے بھی دعا کرنا صحیح ہے۔ کیونکہ اس کی حقیقت دراصل یہ دعا کرنا ہے کہ "یااللہ! میرا تو کوئی عمل ایسا نہیں جس کو میں آپ کی بارگاہ عالی میں پیش کر کے اس کے وسیلے سے دعا کروں. البتہ فلاں بندہ آپ کی بارگاہ میں مقبول ہے۔ اور مجھے اس سے محبت و عقیدت کا تعلق ہے۔ پس اے اللہ! آپ اس تعلق کی لاج رکھتے ہوئے. جو مجھے آپ کے نیک بندوں سے ہے. میری یہ درخواست قبول فرمایئے" ـــــ تو دراصل یہ اپنے اس تعلق کے ذریعے توسل ہے جو اسے اللہ تعالیٰ کے نیک اور مقبول بندوں سے ہے بلکہ میرے نزدیک اس توسل میں تواضع اور عبدیت کی شان زیادہ پائی جاتی ہے۔ کہ آدمی کو اپنے کسی عمل پر نظر نہ ہو، اور وہ اپنے کسی نیک عمل کو اس لائق نہ سمجھے کہ اسے بارگاہ خداوندی میں پیش کر سکے۔

بہر حال توسل کی یہ صورت صحیح ہے، اور بزرگان دین سے منقول اور ان کا معمول رہی ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا یہ شعر کس کو یاد نہیں ہوگا۔

خدایا بحق بنی فاطمہ

کہ برقول ایمان کنی خاتمہ

مگر یہ عقیدہ نہ رکھا جائے کہ ـــــ توسل کئے بغیر دعا کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو سنتے ہی نہیں۔ اور نہ یہ عقیدہ رکھا جائے کہ انبیاء و اولیاء کے وسیلے سے جو دعاء کی جائے اس کا ماننا اللہ تعالیٰ کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے نہیں! بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ان مقبولان الٰہی کے طفیل سے جو دعاء کی جائے گی اس کی قبولیت کی زیادہ امید ہے۔

ہماری فقہ حنفی کی کتابوں میں جو مسئلہ لکھا ہے کہ:

وَيُكْرَهُ اَنْ يَقُوْلَ فِيْ دُعَائِهٖ بِحَقِّ فُلَانٍ، اَوْ بِحَقِّ اَنْبِيَائِكَ وَرُسُلِكَ لِاَنَّهٗ لَاحَقَّ لِلْمَخْلُوْقِ عَلَى الْخَالِقِ (ہدایہ ص ۴۷۵ ج ۴ کتاب الکراہیۃ)

ترجمہ:۔ اور مکروہ ہے کہ اپنی دعا میں یوں کہے کہ یااللہ! بحق فلاں۔ یا بحق اپنے نبیوں اور رسولوں کے مجھے فلاں چیز عطا فرما۔ کیونکہ مخلوق کا کوئی حق خالق کے ذمہ نہیں۔

اس کا یہی مطلب ہے جو میں نے اوپر ذکر کیا. یعنی اگر یہ خیال ہو کہ جو دعا ان

حضرات کے وسیلے سے کی جائے گی اس کا پورا کرنا اللہ تعالیٰ پر لازم اور واجب ہو جائے گا تو یہ توسل جائز نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ذمہ کسی مخلوق کا کوئی حق واجب نہیں۔ اس کریم داتا کی طرف سے جس کو جو کچھ عطا کیا جاتا ہے وہ محض فضل و احسان ہے ورنہ اس کی بارگاہ عالی میں کسی مخلوق کا کوئی استحقاق نہیں۔

وسیلہ کی دوسری صورت:

بعض لوگ "وسیلہ" کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ چونکہ ہم لوگوں کی رسائی خدا تعالیٰ کے دربار تک نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ہمیں جو درخواست کرنی ہو اس کے مقبول بندوں کے سامنے پیش کریں اور کچھ مانگنا ہو ان سے مانگیں۔ چنانچہ یہ لوگ اپنی مرادیں اولیاء اللہ سے مانگتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ اکابر باعطائے الٰہی، ان کی مرادیں پوری کرنے پر قادر ہیں۔ میں نے خواجہ بہاء الحق زکریا ملتانیؒ، خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ، خواجہ علی ہجویری (المعروف بہ داتا گنج بخش) سلطان الہند خواجہ نظام الدین اولیاء اور دیگر اکابر اولیاء اللہ (قدس اللہ اسرارہم) کے مزارات پر لوگوں کو ان بزرگوں سے دعائیں مانگتے دیکھا ہے، میں اس فعل کو خالص جہالت سمجھتا ہوں۔ اور یہ دراصل دو غلطیوں کا مجموعہ ہے۔

ایک یہ کہ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی بارگاہ عالی کو بھی دنیا کے شاہی درباروں پر قیاس کر لیا ہے، گویا جس طرح دنیا کے بادشاہوں تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہو سکتی بلکہ امراء و وزراء کی وساطت اور چپراسیوں اور دربانوں کی منت کشی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی طرح خدا کے دربار میں کوئی شخص براہ راست عرض معروض نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کو درمیانی واسطوں کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت ہے۔

مگر خدا تعالیٰ کو دنیا کے بادشاہوں پر قیاس کرنا سراسر غلط ہے۔ اس لئے کہ بادشاہ اور رعایا کے درمیان واسطوں کی ضرورت تو اس لئے پیش آتی ہے کہ وہ رعایا کی داد و فریاد خود نہیں سن سکتے۔ اور نہ ہر شخص اپنی آواز براہ راست ان تک پہنچا سکتا ہے۔

اس کے برعکس حق تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ دنیا کے سارے انسانوں، فرشتوں، جنات اور حیوانات میں سے ایک ایک کی آواز وہ اس طرح سنتے ہیں کہ گویا باقی ساری کائنات خاموش ہے، اور صرف وہی ایک گفتگو کر رہا ہے۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ نہایت تاریک رات میں سنگ سیاہ پر بھوری چیونٹی کے چلنے کی آواز بھی خدا تعالیٰ سنتے ہیں۔

پھر دنیا کے بادشاہوں تک ہر آدمی کی رسائی ممکن نہیں، مگر خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ ہر شخص سے اس کی رگ گردن سے بھی قریب تر ہیں۔ ایک بار صحابہ کرامؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

اَقَرِیْبٌ رَبُّنَا فَنُنَاجِیْهِ اَمْ بَعِیْدٌ فَنُنَادِیْهِ ؟

ترجمہ:۔ ہمارا رب ہم سے قریب ہے کہ ہم اسے آہستہ پکاریں یا دور ہے کہ زور سے پکاریں؟

اس پر قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۔ (البقرۃ : ۱۸۶) (تفسیر ابن کثیر ص ۲۱۷ ج ۱)

ترجمہ:۔ اور جب میرے بندے آپؐ سے میرے بارے میں دریافت کریں (کہ میں ان سے نزدیک ہوں یا دور؟) تو (ان کو بتایئے کہ) میں نزدیک ہوں، میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں، جب بھی وہ مجھے پکارے۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۱۷ ج ۱)

فرمایئے ایسا دربار جس میں ہر شخص ہر آن اور ہر لمحے اپنی درخواست پیش کر سکتا ہو، اور جہاں ہر درخواست پر فوراً کارروائی ہو، اور جو ہر درخواست کو پورا کرنے اور ہر شخص کی ساری مرادیں برلانے کی قدرت رکھتا ہو، اور پھر وہ رحیم و شفیق بھی ایسا ہو کہ خود مانگنے والوں کا منتظر ہو۔ ایسی بارگاہ کو چھوڑ کر دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھرنا عقل و دانش کی بات ہے یا حماقت و جہالت کی؟ حق تعالیٰ کے دربار کی تو یہ شان ہے:

ہر کہ خواہد گو بیا دہر کہ خواہد گو برو
دار و گیر و حاجب دربان دریں درگاہ نیست
(جس کا جی چاہے آئے، اور جس کا جی چاہے جائے۔ اس دربار میں نہ دار و گیر ہے نہ دربان کی حاجت۔)

ایک بزرگ نے خوب فرمایا ہے:

جو کتا در در پھرے اسے ذر ذر دُر دُر ہو،
اور جو ایک ہی در کا ہو رہے اسے کاہے کو دُر دُر ہو،

دوسری غلطی ان لوگوں سے یہ ہوئی کہ انہوں نے یوں سمجھ لیا کہ جس طرح شاہان دنیا کچھ مناسب و اختیارات گورنروں اور ماتحت افسروں کو تفویض کر دیتے ہیں اور اس تفویض کے بعد انہیں زیر اختیار معاملوں میں بادشاہ سے رجوع کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ وہ اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ان امور میں خود ہی فیصلے کیا کرتے ہیں۔ کچھ یہی صورت حق تعالیٰ شانہ کی بادشاہی میں بھی ہوگی۔ اس نے بھی اس کائنات میں تصرف کے کچھ اختیارات نبیوں، ولیوں، اماموں اور شہیدوں کو عطا کر دیئے ہوں گے، اور خدائی کے جو محکمے باعطائے الٰہی ان بزرگوں کے سپرد کر دیئے گئے ہیں وہ ان میں خود مختار ہیں، جو چاہیں کریں، اور جس کو چاہیں دیں یا نہ دیں۔

لیکن یہ غلطی پہلی غلطی سے بھی بدتر ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے بادشاہ یا سربراہان ممالک جو اختیارات اپنے ماتحت گورنروں یا افسروں کے حوالے سے کر دیتے ہیں اس کی وجہ ان کا عجز و قصور ہے، کہ وہ اپنی قلمرو کے ہر چھوٹے بڑے کام کو خود کرنے سے قاصر اور معاونین کے محتاج ہیں، وہ اپنے گورنروں اور افسروں کی مدد کے بغیر نظام مملکت نہیں چلا سکتے۔ اس کے برعکس حق تعالیٰ شانہ کی شان یہ ہے کہ اسے کائنات کے ایک ایک ذرے کا علم بھی ہے اور اس پر قدرت بھی۔ کائنات کی کوئی چھوٹی بڑی چیز نہ اس کے علم سے باہر ہے اور نہ اس کے حکم قضا و قدر سے آزاد ہے۔ حق تعالیٰ

شانہ کا علم اس کی مشیت. اس کی قدرت اور اس کی تکوین. زمین و آسمان کی ایک ایک چیز پر حاوی اور کائنات کے ایک ایک ذرے کو محیط ہے درخت کا ایک پتہ بھی اس کے علم وارادہ اور حکم کے بغیر نہیں ہل سکتا ہے. اس لئے وہ کائنات کا نظام چلانے کے لئے کسی وزیر. کسی نائب اور کسی معاون کا محتاج نہیں. نہ اس کے نظام میں اس کا کوئی شریک ہے. نہ ہو سکتا ہے. نہ اس نے کائنات میں تصرف کے اختیارات کسی کو عطا کئے ہیں. نہ خدائی اختیارات کسی کو عطا کئے جا سکتے ہیں۔

حضرت قاضی ثناءاللہ حنفی پانی پتی" فرماتے ہیں:

"مسئلہ: اگر کسے گوید کہ خدا و رسول بریں عمل گواہ اند کافر شود اولیاء قادر نیستند بر ایجاد معدوم یا اعدام موجود. پس نسبت کردن ایجاد و اعدام واعطائے رزق یا اولاد و دفع بلا و مرض وغیر آں بسوئے ایشاں کفر است۔ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ یعنی بگوا ے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) مالک نیستم من برائے خویشتن نفع را و نہ ضرر را. مگر آنچہ خدا خواہد" (ارشاد الطالبین ص ۱۸)

ترجمہ: ۔ مسئلہ: اگر کوئی شخص یوں کہے کہ اس بات پر خدا اور رسول گواہ ہیں تو کافر ہو جائے گا (کیونکہ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عالم الغیب سمجھا) اولیاء اللہ کسی غیر موجود چیز کو وجود عطا کرنے اور کسی موجود کو معدوم کر دینے پر قادر نہیں۔ پس وجود دینے نہ دینے۔ رزق یا اولاد دینے اور مصیبت اور بیماری کے ہٹانے وغیرہ کی نسبت ان کی طرف کرنا کفر ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ فرما دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لئے (بھی) نہ نفع کا مالک ہوں اور نہ نقصان کا مگر جو کچھ خدا چاہے"

اس لئے یہ تصور ہی سرے سے غلط ہے کہ مخلوق اپنے خالق کے سامنے عرضیاں پیش کرنے کے بجائے اس کے کسی نائب کے سامنے پیش کرے۔

الغرض وسیلہ پکڑنے کے یہ معنی کہ ہم بزرگوں کی خدمت میں عرضیاں پیش کیا

کریں۔ اور ان سے اپنی حاجتیں اور مرادیں مانگا کریں، بالکل غلط اور قطعاً ناروا ہے۔ قرآن کریم نے مخلوق کو پکارنے اور اس سے دعائیں مانگنے کو سب سے بدترین گمراہی قرار دیا ہے ارشاد ربانی ہے:

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ، وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غَافِلُوْنَ (الاحقاف ۴۶)

ترجمہ:۔ اور اس شخص سے بڑا گمراہ کون ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کو پکارے جو قیامت تک اس کی دعا قبول نہیں کر سکتے۔ اور وہ ان کی دعا سے بالکل بے خبر ہیں"۔

بزرگوں سے مرادیں مانگنا اور ان سے اپنی حاجات کے لئے دعائیں کرنا اس لئے بھی غلط ہے کہ دعا ایک اعلیٰ ترین عبادت ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ (ترمذی)

دعا عبادت کا مغز ہے

ایک اور حدیث میں ہے:

اَلدُّعَآءُ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ " وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ " (مشکوٰۃ صد ۱۹۴)

ترجمہ:۔ دعا ہی اصل عبادت ہے۔ یہ ارشاد فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو۔ میں تمہاری دعا سنوں گا"۔ "مشکوٰۃ ص ۱۹۴)

ایک اور حدیث میں ہے

لَيْسَ شَيْءٌ اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ مِنَ الدُّعَآءِ (مشکوٰۃ شریف صد ۱۹۴)

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا سے زیادہ کوئی چیز قابل قدر نہیں۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۱۹۴)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی" ان احادیث کی شرح میں فرماتے ہیں کہ دعا افضل ترین عبادت اور عبادت کا مغز اس لئے ہے کہ عبادت کا خلاصہ ہے "معبود کے سامنے انتہائی عجز و بے بسی اور خضوع و تذلل کا مظاہرہ کرنا" —— اور یہ بات دعا میں علی وجہ الکمال پائی جاتی ہے. اسی بناء پر دعا اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سب عبادات سے زیادہ لائق قدر ہے۔ (حاشیہ مشکوٰۃ)

بہرحال جب یہ معلوم ہوا کہ دعا نہ صرف عبادت ہے بلکہ عبادت کا مغز ہے اور خلاصہ ہے تو حق تعالیٰ کے سوا جس طرح کسی اور کی عبادت جائز نہیں۔ اسی طرح کسی بزرگ ہستی سے دعائیں کرنا اور مرادیں مانگنا بھی روا نہیں۔ اس لئے کہ یہ عبادت ہے۔ اور عبادت صرف اللہ تعالیٰ کا حق۔

حضرت قاضی ثناء اللہ حنفی پانی پتی" فرماتے ہیں:

"مسئلہ. دعا از اولیائے مردگان یا زندگان واز انبیاء جائز نیست رسول خدا فرمود (صلی اللہ علیہ وسلم)

اَلدُّعَآءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ یعنی دعا خواستن از خدا عبادت است. پستر ایں آیت خواند:

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ.

آنچہ جہال میگویند یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیاء للہ. یاخواجہ شمس الدین پانی پتی شیئاً" للہ جائز نیست. شرک وکفراست. واگر یاالٰہی بحرمت خواجہ شمس الدین پانی پتی حاجت من رواکن گوید مضائقہ ندارد۔

حق تعالیٰ شانہ میفرماید:

وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔

یعنی کسانیکہ دعا میخواہید سوائے خدا آنہا بندگانند

مانند شما۔ آنہاراچہ قدرت است کہ حاجت کسے بر آرند۔ "
(ارشاد الطالبین فارسی ص ۱۸ مطبوعہ مجتبائی دہلی ۱۹۱۵ء)

ترجمہ:۔ "مسئلہ: فوت شدہ یا زندہ بزرگوں سے اور انبیاء کرام علیہم السلام سے دعائیں مانگنا جائز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "دعا عبادت کا مغز ہے" پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی: "اور تمہارے رب نے فرمایا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں سنوں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں۔ وہ جہنم میں ذلیل و خوار ہو کر داخل ہوں گے"۔ اور یہ جو جاہل لوگ کہتے ہیں "یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً للہ" —— "یاخواجہ شمس الدین پانی پتی شیاء للہ" جائز نہیں بلکہ شرک و کفر ہے۔ اور اگر یوں کہے کہ "یاالٰہی بطفیل خواجہ شمس الدین پانی پتی میرا یہ کام کردے تو کوئی مضائقہ نہیں ——

اور حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ:۔ یعنی خدا کے سوا تم جن لوگوں کو پکارتے ہو وہ بھی تمہاری طرح بندے ہیں۔ ان کو کیا قدرت ہے کہ کسی کی حاجت و مراد پوری کریں"۔

وسیلہ کی تیسری صورت:

وسیلہ پکڑنے کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ براہ راست بزرگوں سے تو اپنی حاجات نہ مانگی جائیں البتہ ان کی خدمت میں یہ گزارش کی جائے کہ وہ حق تعالیٰ کے دربار میں ہماری حاجت و مراد پورا ہونے کی دعا فرمائیں —— یہ صورت، پہلی اور دوسری صورت کے گویا درمیان درمیان ہے، کیونکہ پہلی صورت میں تو مانگنے والا براہ راست خدا تعالیٰ سے مانگ رہا تھا، البتہ مقبولانِ الٰہی سے اپنے تعلقِ و محبت کا واسطہ

دے کر دعا کر رہا تھا ـــــــ دوسری صورت میں یہ اپنی حاجت ہی خدا تعالیٰ کے بجائے بزرگوں سے منظور کرا رہا تھا۔ اور تیسری صورت میں وہ مانگنا تو خدا تعالیٰ ہی سے چاہتا ہے. مگر بزرگوں سے یہ کہتا ہے کہ وہ بھی اس کی حاجت کو خدا تعالیٰ سے مانگیں. اور اس کے حق میں وہ مراد پوری ہونے کی دعا کریں۔

اس کا حکم یہ ہے کہ جو حضرات اس دنیا میں تشریف فرما ہیں ان سے دعا کی درخواست کرنا تو عین سنت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لیکر آج تک مسلمان ایک دوسرے کو دعا کے لئے کہتے آئے ہیں. رہے وہ اکابر جو اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں ان کی قبر پر جاکر ان سے دعا کی درخواست کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے چند باتوں پر غور کرنا ضروری ہے۔

اول: یہ کہ کسی کو خطاب کرنا اسی صورت میں صحیح اور معقول ہو سکتا ہے جب کہ وہ ہماری بات سنتا بھی ہو۔ یہ مسئلہ کہ قبروں میں مردے سنتے ہیں یا نہیں؟ ہماری کتابوں میں "سماعِ موتیٰ" کے عنوان سے مشہور ہے۔ اور اس مسئلہ میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے زمانے سے اختلاف چلا آتا ہے۔ بعض اس کے قائل ہیں۔ اور بعض انکار کرتے ہیں۔ دونوں طرف بڑے بڑے اکابر ہیں۔ اس لئے اس مسئلہ کا قطعی فیصلہ نہیں ہو سکتا. کیونکہ جس مسئلہ میں صحابہ کرامؓ کا اختلاف ہو اس میں کسی ایک جانب کو قطعی حق اور دوسری جانب کو قطعی باطل قرار دینا ممکن نہیں۔ پس جو حضرات سماع موتی کے قائل ہیں ان کے نزدیک مردوں کو خطاب کیا جا سکتا ہے۔ اور جو قائل نہیں ان کے نزدیک مردوں کو خطاب کرنا ہی درست نہیں۔

دوم: یہ کہ آیا سلف صالحین کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ اہل قبور سے دعا کی درخواستیں کیا کرتے ہوں یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو حضرات "سماعِ موتیٰ" کے قائل نہیں تھے ان کا معمول تو ظاہر ہے کہ یہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اور جو حضرات اس کے قائل تھے ان میں سے بھی کسی کے بارے میں مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کا یہ معمول رہا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ حضرت عمر

رضی اللہ عنہ عمرہ کے لئے تشریف لے جارہے تھے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا:

يَا أَخِيْ لَا تَنْسَنَا مِنْ دُعَائِكَ (مسند احمد ص ۳۹ ج ۱ ص ۵۹ ج ۲)

ترجمہ:۔ میرے بھائی! ہمیں اپنی دعا میں نہ بھولنا۔ (مسند احمد ص ۳۹ ج ۱ ص ۵۹ ج ۲)

مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کسی نبی وصدیق کی قبر پر جاکر ان سے دعا کی فرمائش کی ہو، اسی طرح صحابہؓ و تابعینؒ بھی ایک دوسرے سے دعا کی درخواست کیا کرتے تھے۔ مگر کسی سے یہ ثابت نہیں کہ انہوں نے کسی شہید کی قبر پر جاکر ان سے دعا کی درخواست کی ہو۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے فتاویٰ میں ہے:

استمداد از اموات خواہ نزدیک قبور باشد یا غائبانہ بے شبہ بدعت است، در زمانہ صحابہ و تابعین نہ بود لیکن اختلاف است درآں کہ ایں بدعت سیئہ است یاحسنہ، ونیز حکم مختلف می شود باختلاف طروق استمداد۔ (فتاویٰ عزیزی ص ۸۹ ج ۱)

مُردوں سے مدد طلب کرنا خواہ ان کی قبروں پر جا کر کی جائے۔ یا غائبانہ، بلاشبہ بدعت ہے۔ صحابہؓ وتابعینؒ کے زمانے میں یہ معمول نہیں تھا۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہ بدعت سیئہ ہے یا حسنہ۔ نیز استمداد کے مختلف طریقوں کی بناء پر حکم بھی مختلف ہو جائے گا۔

سوم: یہ کہ جب اس کے جواز و عدم جواز میں بھی کلام ہے۔ اور سلف صالحین کا معمول بھی یہ نہیں تھا تو کیا اس کو مستحسن سمجھ کر اس کی اجازت دیدی جائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسی چیز "بدعت" کہلاتی ہے۔ اسی بناء پر حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کو "بلاشبہ بدعت است" فرمایا ہے۔ اور میں "سنت و بدعت" کے بارے میں تو شاید آگے چل کر کچھ عرض کرسکوں۔ مگر مختصراً اتنا یہاں بھی عرض کردیتا ہوں کہ جن چیزوں کو سلف صالحین نے مستحسن نہیں سمجھا اس میں ما و شما کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایسے امور کے بارے میں امام ربانی مجدد الف ثانیؒ (قدس سرہ) کا

ارشاد ہوا کہ:

ایں فقیر در ہیچ بدعت ازیں بدعتہا حسن و نورانیت مشاہدہ نمی کند و جز ظلمت و کدورت احساس نمی نماید (مکتوبات امام ربانی اول مکتوب ۱۸۶)	یہ فقیران بدعتوں میں سے کسی بدعت میں حسن اور نورانیت کا مشاہدہ نہیں کرتا اور بدعتوں میں سوائے ظلمت و کدورت اور کوئی چیز نظر نہیں آتی۔

اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ "ہر نئی چیز (جو دین کے نام سے ایجاد کی جائے) بدعت ہے۔ اور ہر بدعت گمراہی ہے" نقل کر کے حضرت مجدد" فرماتے ہیں:

ہر گاہ ہر محدث بدعت است و ہر بدعت پس معنیٰ حسن در بدعت چہ بود۔ (حوالہ بالا)	جب ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے پس بدعت میں حسن و خوبی کے کیا معنی؟

اس ناکارہ کے نزدیک حضرت مجدد" کا یہ ارشاد آب زر سے لکھنے کے لائق۔ اور اس باب میں "قول فیصل" کی حیثیت رکھتا ہے۔

بہرحال جو بزرگ فوت ہو چکے ہیں ان کی خدمت میں یہ عرض کرنا کہ وہ ہمارے لئے دعا کریں ایک مشتبہ سی چیز ہے۔ پس جب کہ ہمارے لئے حق تعالیٰ سے دعائیں مانگنے کا راستہ کھلا ہے۔ اور جب کہ حق تعالیٰ نے ہماری دعاؤں اور التجاؤں کو قبول کرنے کا قطعی وعدہ بھی فرما رکھا ہے تو میں اس بات کو قطعاً ناموزوں سمجھتا ہوں کہ اس واضح اور صاف راستے کو چھوڑ کر خواہ مخواہ ایک ایسا طریقہ ہی اختیار کیا جائے جس میں حضرت مجدد الف ثانی" کو "بدعت" کی نحوست اور تاریکی نظر آتی ہو۔ اور جس کے جواز و عدم جواز میں بھی کلام ہو۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ ساری بحث غیر انبیاء میں ہے ـــــ انبیاء کرام علیہم السلام ـــــ خصوصاً آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں میرا عقیدہ "حیات النبی" کا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اقدس پر حاضر ہوکر صلوٰۃ و سلام پڑھنے اور شفاعت کی درخواست کرنے کا مسئلہ ہماری کتابوں میں لکھا ہے۔ اس لئے جس سعادتمند کو بارگاہ نبوت کے آستانہ عالیہ پر حاضری نصیب ہو وہ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں دعا اور شفاعت کے لئے درخواست کرے تو میں اسے جائز بلکہ مستحسن سمجھتا ہوں۔ واللہ اعلم۔

زیارت قبور:

قبروں کی زیارت اور ان پر بجالائے جانے والے اعمال کا مسئلہ بھی محل نزاع ہے. اس سلسلہ میں میں اپنے نکتہ نظر کی وضاحت کے لئے چند امور عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

(۱) جاہلیت کی قبر پرستی سے نفرت دلانے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں امت کو قبروں پر جانے سے منع فرمادیا تھا۔ اور جب اس رسم کی بخوبی اصلاح ہوگئی تو آپؐ نے زیارت قبور کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا:

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُزَهِّدُ فِى الدُّنْيَا وَتُذَكِّرُ الْآخِرَةَ (مشکوٰۃ شریف ص ۱۵۴)

میں تمہیں قبروں کی زیارت سے منع کیا کرتا تھا۔ (اب وہ ممانعت منسوخ کی جاتی ہے) پس ان کی زیارت کیا کرو. کیونکہ وہ دنیا سے بے رغبت کرتی ہیں. اور آخرت کو یاد دلاتی ہیں۔

اس لئے قبرستان میں جانے کی اجازت ہے۔ البتہ دو مسئلوں میں اختلاف ہے ایک یہ کہ یہ اجازت مردوں اور عورتوں سب کو ہے. یا صرف مردوں کو؟ بعض اکابر کی رائے یہ ہے کہ عورتوں کو اجازت نہیں. کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے

عورتوں کے بارے میں خصوصیت سے فرمایا ہے:

لَعَنَ اللّٰهُ زَوَّارَاتِ الْقُبُوْرِ (مشکوٰۃ شریف صہ ۱۵۴)

اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو قبروں کی زیارت کو جاتی ہیں۔

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد اجازت سے پہلے کا ہے۔ اور اب مردوں کی طرح عورتوں کو بھی اجازت ہے۔ صحیح یہ ہے کہ عورتوں کو ممانعت اس بنا پر کی گئی ہے کہ یہ کم صبری اور کم علمی کی بنا پر وہاں جاکر جزع فزع نیز بدعات اور غیر شرعی حرکات کا ارتکاب کرنے سے باز نہیں رہ سکتیں. چونکہ ان کے جانے میں فتنے کا احتمال غالب تھا اس لئے ان کو خصوصیت سے منع کر دیا گیا ____ تاہم اگر کوئی عورت وہاں جاکر کسی بدعت اور کسی غیر شرعی حرکت کی مرتکب نہ ہو تو اس کو اجازت ہے۔ مگر بوڑھی عورتیں جا سکتی ہیں. جوان عورتوں کو نہیں جانا چاہئے۔ (فتاویٰ شامی ص ۲۴۲ ج ۲ طبع جدید مصر)

دوم: یہ کہ صرف اپنے شہر کے قبرستان کی زیارت کے لئے جانا ہی صحیح ہے۔ یا دوسرے شہروں میں اولیاء اللہ اور صالحین کی قبروں کی زیارت کے لئے جانے کی بھی اجازت ہے؟ بعض اکابر کا ارشاد ہے کہ آدمی دوسرے شہر میں گیا ہوا ہو تو وہاں کی قبور کی زیارت بھی کر سکتا ہے۔ مگر صرف زیارت قبور کے ارادے سے جانا صحیح نہیں. لیکن امام غزالیؒ اور دوسرے بہت سے اکابر فرماتے ہیں کہ اس کی بھی اجازت ہے. اور یہی صحیح ہے. لیکن شرط یہ ہے کہ وہاں جاکر کوئی خلاف شرع کام نہ کرے۔ (حوالہ بالا)

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے زیارت قبور کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ جب آدمی قبرستان جائے تو اہلِ قبور کو ان الفاظ میں سلام کہے۔

اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ دَارَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ۔ اَنْتُمْ لَنَا سَلَفٌ وَنَحْنُ لَكُمْ تَبَعٌ، وَاِنَّا اِنْ شَآءَ اللّٰهُ بِكُمْ لَاحِقُوْنَ۔ نَسْأَلُ اللّٰهَ لَنَا وَلَكُمُ الْعَافِيَةَ۔ (مشکوٰۃ شریف صہ ۱۵۴)

اس کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت کرے اور کچھ پڑھ کر ان کو ایصال ثواب کرے۔ احادیث شریفہ میں بعض خاص خاص سورتوں کے خاص فضائل بھی آئے ہیں۔ اسی طرح درود شریف کے فضائل بھی آئے ہیں۔ بہرحال درود شریف، سورہ فاتحہ، آیت الکرسی، سورہ اخلاص اور دیگر جتنی سورتیں چاہے پڑھ کر ان کا ثواب بخشے۔ قبر پر دعا یا تو بغیر ہاتھ اٹھائے کرنی چاہئے۔ یا قبر کی طرف پشت اور قبلہ کی طرف منہ کر کے دعا کی جائے۔

(فتاویٰ عالمگیری ص ۳۵۰ ج ۵ کتاب الکراہیۃ)

(۳) زیارت قبور کا اہم ترین مقصد جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ یہ ہے کہ قبروں کا منظر دیکھ کر دنیا کی بے ثباتی کا یقین تازہ ہو۔ آدمی ان سے عبرت پکڑے، اپنی موت اور قبر کو یاد کرے اور آخرت کی تیاری کے لئے اپنے نفس کو آمادہ کرے ـــــ دوسرا مقصد اہل قرابت کا حق ادا کرنا اور ان کو دعائے مغفرت اور ایصال ثواب سے نفع پہنچانا ہے۔ اور اہل اللہ کی قبروں کی زیارت سے ان کے فیوض و برکات سے خود مستفید ہونا اور جس راستے پر چل کر وہ مقبول بارگاہ خداوندی ہوئے ہیں اس راستے پر چلنے کا عزم کرنا ہے۔

(۴) شریعت نے قبروں کے معاملے میں افراط و تفریط کو روا نہیں رکھا، چنانچہ ان کی بے حرمتی کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ اور ان کی تعظیم میں مبالغہ و غلو کرنے سے بھی ـــــ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے، ان پر قبے تعمیر کرنے اور ان پر بیٹھنے کی ممانعت فرمائی ہے۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۱۴۸)

ایک حدیث میں ہے کہ نہ قبروں پر بیٹھو اور نہ ان کی طرف نماز پڑھو ـــــ ایک اور حدیث میں ہے کہ تم میں سے کوئی شخص آگ کے انگارے پر بیٹھ جائے جس سے اس کے کپڑے جل جائیں اور آگ اس کے بدن تک پہنچ جائے یہ اس کے لئے بہتر

ہے بہ نسبت اس کے کہ کسی قبر پر بیٹھے۔

(۵) ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے، ان پر کچھ لکھنے، اور ان کو روندنے سے ممانعت فرمائی ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن حزم صحابیؓ کو قبر سے ٹیک لگاتے ہوئے دیکھ کر فرمایا "قبر والے کو ایذا نہ دے"۔

(مشکوٰۃ شریف ص ۱۴۸، ۱۴۹)

ان احادیث طیبہ سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قبروں کی اہانت اور بے حرمتی بھی منظور نہیں اور ان کی بے جا تعظیم بھی ـــــ البتہ اگر قبر پر کوئی خلاف شریعت حرکت کی گئی ہو تو اس کا ازالہ ضروری ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس مہم پر روانہ فرمایا تھا کہ جس تصویر یا مورتی کو دیکھوں اس کو مٹا ڈالوں، اور جس قبر کو اونچا دیکھوں اسے برابر کر دوں۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۱۴۸)

ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پختہ قبریں بنانا یا ان پر قبے تعمیر کرنا جائز نہیں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے دونوں رفقاء (حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما) کی قبور شریفہ بھی پختہ نہیں۔ بلکہ کچی ہیں۔ [1]

(مشکوٰۃ شریف ص ۱۴۹)

(۵) اب ان اعمال کا جائزہ لیجئے جو ہمارے ناواقف عوام اولیاء اللہ کی قبروں پر بجالاتے ہیں، مثلاً قبروں پر غلاف ڈالنا۔ ان پر چراغ جلانا۔ ان کو سجدہ کرنا۔ ان کا طواف کرنا۔ ان کو چومنا۔ ان پر پیشانی اور آنکھیں ملنا، ان کے سامنے دست بستہ اس طرح کھڑے ہونا جس طرح نمازی خدا کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوتا ہے، ان کے سامنے رکوع کی طرح جھکنا، ان پر منتیں ماننا اور چڑھاوے چڑھانا۔ وغیرہ وغیرہ اگر آپ کو کبھی بزرگوں کے مزارات پر جانے کا اتفاق ہوا ہوگا تو آپ نے یہ سارے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہوں گے، حالانکہ ہمارے اہل سنت اور ائمہ

---

[1] [illegible] سعد احمد پالن پوری

احناف کی کتابوں میں ان تمام امور کو ناجائز لکھا ہے۔

پختہ مزارات اور ان کے قبّے:

قبروں کو پختہ کرنے کی ممانعت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اوپر نقل کر چکا ہوں۔ ہمارے ائمہ اہل سنت نے انہی ارشادات کی روشنی میں اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ امام محمدؒ (جو ہمارے امام ابو حنیفہؒ کے شاگرد اور ان کے مذہب کے مدون ہیں) فرماتے ہیں:

وَلَا نَرَىٰ اَنْ يُّزَادَ عَلٰى مَا خَرَجَ مِنْهُ وَنَكْرَهُ اَنْ يُّجَصَّصَ اَوْ يُطَيَّنَ ...... اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نَهٰى عَنْ تَرْبِيْعِ الْقُبُوْرِ وَتَجْصِيْصِهَا قَالَ مُحَمَّدٌ : بِهٖ نَاْخُذُ وَهُوَ قَوْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ (کتاب الآثار ص ۹۶)

اور ہم اس کو صحیح نہیں سمجھتے کہ جو مٹی قبر سے نکلے اس سے زیادہ ڈالی جائے۔ اور ہم قبریں پختہ بنانے اور ان کی لپائی کو مکروہ جانتے ہیں...... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبر کو مربع بنانے اور انہیں پختہ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ ہمارا یہی مذہب ہے۔ اور یہی حضرت امام ابو حنیفہؒ کا ارشاد ہے۔ (کتاب الآثار ص۹۶)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ہر اونچی قبر کو منہدم کر کے اسے برابر کرنے کا حکم دیا تھا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مطابق میں نے مکہ مکرمہ میں ائمہ کو قبروں پر بنائی گئی عمارتوں کے منہدم کرنے کا حکم دیتے ہوئے دیکھا ہے۔ (شرح مسلم نووی ص ۳۱۲ ج ۱)

اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ حضرات اولیاء اللہ کے مزارات پر جو گنبد اور قُبّے بنے ہوئے ہیں وہ اکابر اس سے بالکل بری ہیں۔ انہوں نے نہ اس فعل کو کبھی پسند فرمایا۔ نہ اس کی اجازت دی ہے۔ اور نہ اس کی وصیت فرمائی ہے۔ اس کی ذمہ داری ان دنیا دار امراء و سلاطین و عائد ہوتی ہے۔ جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

ارشادات مقدسہ کی مخالفت کرکے اس فعل شنیع کو روا رکھا. اور اب تو لوگوں نے قبر کے پختہ ہونے اور اس پر شاندار روضہ تعمیر ہونے ہی کو ولایت کا معیار سمجھ لیا ہے۔ ایسے بہت سے واقعات آپ کے علم میں ہوں گے کہ کسی تاجر قبر نے خواب یا الہام کا حوالہ دیکر کسی جگہ جعلی قبر بناڈالی اور لوگوں نے اس کی پرستش شروع کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بہرحال حنفی مذہب کی قریباً تمام معتبر کتابوں. مثلاً عالمگیری، قاضی خان سراجیہ. درمختار. کبیری وغیرہ میں اس فعل کو ناجائز لکھا ہے۔ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

اَمَّا الْبِنَآءُ فَلَمْ اَرَ مَنِ اخْتَارَ جَوَازَهُ (ص۲۳۷ ج۲ طبع جدید مصر)

میں نے نہیں دیکھا کہ کسی نے اس کے جواز کو اختیار کیا ہو۔

اور حضرت قاضی ثناء اللہ حنفی پانی پتیؒ فرماتے ہیں:

وآنچہ برقبور اولیاء عمارتہائے رفیع بنای کنند، وچراغاں روشن کنند و ازیں قبیل ہرچہ می کنند حرام است"۔
(مالا بدمنہ ص ۸۴ مطبوعہ مجتبائی ۱۳۱۱ھ)

اور یہ جو اولیاء اللہ کی قبروں پر اونچی اونچی عمارتیں بناتے ہیں۔ چراغاں کرتے ہیں۔ اور اسی قسم کے اور کام جو کرتے ہیں، یہ سب حرام ہیں۔

قبروں پر غلاف چڑھانا.

قبروں پر غلاف چڑھانا بھی جائز نہیں. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم. صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ کے مبارک زمانے میں کسی کی قبر پر چادر نہیں چڑھائی گئی۔ علامہ ابن عابدین شامی فرماتے ہیں:

فِی الْاَحْکَامِ عَنِ الْحُجَّةِ "، تُکْرَهُ السُّتُوْرُ عَلَی الْقُبُوْرِ۔ (ص۲۲۸ ج۲)

ترجمہ:۔ "الاحکام" میں "الحجۃ" سے نقل کیا ہے کہ قبروں پر چادر ڈالنا مکروہ ہے۔

(ردالمحتار ص ۲۲۸ ج ۲)

قبروں پر چراغ جلانا.

قبر پر چراغ اور قندیل روشن کرنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ممانعت فرمائی ہے بلکہ ایسا کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

لَعَنَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ زَائِرَاتِ الْقُبُوْرِ وَالْمُتَّخِذِيْنَ عَلَيْهَا الْمَسَاجِدَ وَالسُّرُجَ ۔ (مشکوٰۃ شریف ص۷۱)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے ان عورتوں پر جو قبروں پر جاتی ہیں۔ اور ان لوگوں پر جو قبروں کو سجدہ گاہ بناتے ہیں اور ان پر چراغ جلاتے ہیں۔

علامہ علی القاری حنفی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:۔

وَالنَّهْيُ عَنِ اتِّخَاذِ السِّرَاجِ لِمَا فِيْهِ تَضْيِيْعُ الْمَالِ، لِاَنَّهٗ لَا نَفْعَ لِاَحَدٍ مِنَ السِّرَاجِ، وَلِاَنَّهَا مِنْ آثَارِ جَهَنَّمَ، وَاِمَّا لِلْاِحْتِرَازِ عَنْ تَعْظِيْمِ الْقُبُوْرِ كَالنَّهْيِ عَنِ اتِّخَاذِ الْقُبُوْرِ مَسَاجِدَ ۔ (حاشیہ مشکوٰۃ)

قبر پر چراغ جلانے کی ممانعت یا تو اس لئے ہے کہ اس میں مال کو بے فائدہ ضائع کرنا ہے. کیونکہ اس کا کسی کو نفع نہیں. اور اس لئے کہ آگ تو جہنم کے آثار میں سے ہے (اس کو قبر سے دور رکھنا چاہئے) یا یہ ممانعت قبرں کی تعظیم سے بچانے کے لئے ہے جیسا کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی ممانعت بھی اسی بناء پر ہے۔ (حاشیہ مشکوٰۃ)

حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتی حنفی فرماتے ہیں:

"قبور اولیاء بلند کردن. و گنبد براں ساختن. و عرس و امثال آں و چراغاں کردن ہمہ بدعت است. بعضے ازاں حرام است. و بعضے مکروہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر شمع افروزاں نزد قبر و سجدہ کنندگان رالعنت گفتہ. و فرمودہ کہ قبرمراعید و مسجد نکیند در مسجد سجدہ میکنند. درروز عید برائے مجمع روزیے در سال مقرر کردہ شدہ. رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم علی رضی اللہ عنہ رافرستاد کہ قبور مشرفہ برابر کنند. و ہرجاکہ تصویر بنیند اورا محو

کنند"

(ارشاد الطالبین ص ۲۰)

ترجمہ:۔ "اولیاء اللہ کی قبروں کو اونچا کرنا. ان پر گنبد بنانا. ان کا عرس وغیرہ کرنا. چراغ روشن کرنا. یہ ساری چیزیں بدعت ہیں۔ ان میں بعض حرام ہیں۔ اور بعض مکروہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر شمع جلانے والوں اور سجدہ کرنے والوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید اور مسجد نہ بنانا۔ مسجد میں سجدہ کیا کرتے تھے. اور عید کا دن مجمع کے لئے سال میں ایک دن مقرر کیا گیا ہے ــــــ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس مقصد کے لئے بھیجا تھا کہ اونچی قبروں کو برابر کر دیں۔ اور جہاں تصویر دیکھیں اسے مٹا ڈالیں"

قبروں پر طواف اور سجدہ وغیرہ:

ناواقف لوگ قبروں کو سجدہ کرتے ہیں۔ ان کا طواف کرتے ہیں. ان کے آستانے کو چومتے ہیں، یہ تمام افعال شرعاً ناجائز ہیں۔ اور ہمارے ائمہ اہل سنت نے ان کو حرام و ناجائز ہونے کی تصریح کی ہے۔ اس لئے کہ طواف، سجدہ. رکوع. ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونا یہ سب عبادت کی شکلیں ہیں. اور ہماری شریعت نے قبروں کی ایسی تعظیم کی اجازت نہیں دی ہے کہ پوجا کی حد تک پہنچ جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم تھا کہ پہلی امتیں اسی غلو سے گمراہ ہوئی ہیں۔ اس لئے آپؐ نے اپنی امت کو ان افعال سے بچنے کی تاکید اور وصیت فرمائی ہے۔ ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری ایام میں فرماتے تھے.

لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ

(مشکوٰۃ شریف صہ ۶۹)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ

گاہ بنالیا۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۶۹)

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ سنو! تم سے پہلے لوگ اپنے نبیوں ولیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا کرتے تھے۔ خبردار! تم قبروں کو سجدہ کی جگہ نہ بنانا میں تمہیں منع کرتا ہوں۔ (حوالہ بالا)

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ، اِشْتَدَّ غَضَبُ اللّٰهِ عَلٰى قَوْمٍ اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ (مشکوٰۃ شریف صہ ۱۷۲)

ترجمہ:۔ اے اللہ! میری قبر کو بت نہ بنا جس کو پوجا جائے۔ اللہ کا غضب سخت بڑھ سکتا ہے اس قوم پر جو اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنائے۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۱۷۲)

قیس بن سعد صحابی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حیرہ گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ لوگ اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہیں۔ میں نے دل میں کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے زیادہ مستحق ہیں کہ آپ کو سجدہ کیا جائے۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو اپنا یہ خیال ظاہر کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

اَرَاَيْتَ لَوْ مَرَرْتَ بِقَبْرِيْ اَكُنْتَ تَسْجُدُ لَهٗ؟ فَقُلْتُ لَا، فَقَالَ لَا تَفْعَلُوْا لَوْ كُنْتُ اٰمِرًا اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ النِّسَآءَ اَنْ يَّسْجُدْنَ لِاَزْوَاجِهِنَّ لِمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَهُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ حَقٍّ (مشکوٰۃ شریف صہ ۲۸۲)

دیکھو! اگر تم میری قبر کے پاس سے گزرتے تو کیا اس کو سجدہ کرتے؟ میں نے عرض کیا ہرگز نہیں۔ فرمایا پھر (زندگی میں بھی) نہ کرو اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ کسی مخلوق کو سجدہ کرے تو عورتوں کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ بوجہ اس حق کے جو اللہ تعالیٰ نے مردوں کا ان پر رکھا۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۲۸۲)

ان احادیث طیبہ پر غور فرمایئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے بارے میں قبر پرستی کا خطرہ کتنی شدت سے محسوس فرماتے ہیں اور پھر کس سختی کے ساتھ اس سے ممانعت فرماتے ہیں، جس قبر کو سجدہ کیا جائے اسے بت قرار دیکر سجدہ

کرنیوالوں پر لعنت فرماتے ہیں اور اسے غضب خداوندی کے بھڑکنے کا سبب ٹھہراتے ہیں۔

ان احادیث کی بناء پر علمائے اہل سنت نے قبر پر سجدہ کرنے کو شرک جلی فرمایا ہے۔ ملا علی قاریؒ حدیث "لعن اللہ الیہود والنصاریٰ" کی شرح میں فرماتے ہیں:

"یہود و نصاریٰ کے ملعون ہونے کا سبب یا تو یہ تھا کہ وہ انبیاء کی تعظیم کی خاطر ان کی قبروں کو سجدہ کرتے تھے، اور یہ شرک جلی ہے ــــــ یا اس لئے کہ وہ انبیاء کے مدفن میں اللہ تعالیٰ کی نماز پڑھتے تھے۔ اور نماز کی حالت میں قبروں کی طرف منہ کرتے اور ان پر سجدہ کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ وہ بیک وقت دو نیک کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی، اور انبیاء کرام کی تعظیم میں مبالغہ بھی۔ اور یہ شرک خفی تھا۔ کیونکہ یہ فعل مخلوق کی ایسی تعظیم کو متضمن تھا جس کی اجازت نہیں دی گئی ــــــ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس سے منع فرمایا یا تو اس لئے کہ یہ فعل یہودیوں کی سنت کے مشابہ ہے یا اس لئے کہ اس میں شرک خفی پایا جاتا ہے"۔ (حاشیہ: مشکوٰۃ ص ۶۹)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "الفوز الکبیر" میں فرماتے ہیں:

"اگر تم مشرکین کے عقائد و اعمال کی پوری تصویر دیکھنا چاہو تو اس زمانے کے عوام اور جہلا کو دیکھو کہ وہ مزارات و آثار پر جاکر طرح طرح کے شرک کا ارتکاب کس طرح کرتے ہیں۔ اس زمانے کی آفتوں میں سے کوئی آفت نہیں جس میں اس زمانے میں کوئی نہ کوئی قوم مبتلا نہیں۔ ان کے مثل اعتقاد نہیں رکھتی۔ خدا تعالیٰ ہمیں ایسے عقیدوں اور عملوں سے بچائے

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں:

سجدہ کردن بسوئے قبور اولیاء و طواف گرد قبور کردن و دعا از آنہا خواستن و نذر برائے آنہا قبول کردن حرام است. بلکہ چیزہا ازان بکفر میرساند۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بر آنہا لعنت گفتہ. و ازاں منع فرمودند. و گفتہ کو قبر مرابت نہ کنند"۔ (مالا بد منہ ص ۸۸)

ترجمہ:۔ اولیاء کی قبروں کو سجدہ کرنا. قبروں کے گرد طواف کرنا. ان سے دعا مانگنا ان کے لئے نذر قبول کرنا حرام ہے. بلکہ ان میں سے بہت سی چیزیں کفر تک پہنچاوتی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور ان سے منع کیا ہے. اور فرمایا ہے کہ میری قبر کو بت نہ بنالینا"۔

اور ارشاد الطالبین (ص ۸۱) میں فرماتے ہیں:

"وگرد قبور گردیدن جائز نیست۔ کو طواف بیت اللہ حکم نماز دارد. **قال** رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم طواف البیت صلوٰۃ طواف بیت اللہ حکم نماز دارد"۔

ترجمہ:۔ "اور قبروں کے گرد چکر لگانا جائز نہیں۔ کیونکہ بیت اللہ کا طواف نماز کا حکم رکھتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بیت اللہ کا طواف نماز ہے"۔

فتاویٰ عالمگیری ص ۳۵۱ ج ۵ میں ہے:

قَالَ بُرْهَانُ التَّرْجُمَانِيُّ: لَانَعْرِفُ وَضْعَ الْيَدِ عَلَى الْمَقَابِرِ سُنَّةً وَلَامُسْتَحْسِنًا وَلَانَرٰى بِهٖ بَأْسًا، وَقَالَ عَيْنُ الْاَئِمَّةِ الْكَرَابِيْسِيُّ هٰكَذَا وَجَدْنَاهُ مِنْ غَيْرِ نَكِيْرٍ مِّنَ السَّلَفِ، وَقَالَ شَمْسُ الْاَئِمَّةِ الْمَكِّيُّ بِدْعَةٌ. كَذَا فِي الْقُنْيَةِ. وَلَايَمْسَحُ الْقَبْرَ وَلَايُقَبِّلُهُ، فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَادَةِ النَّصَارٰى"

ترجمہ:۔ "برہان ترجمانی کہتے ہیں کہ ہم قبر پر ہاتھ رکھنے کو نہ سنت سمجھتے ہیں اور

نہ اچھی بات لیکن اگر کوئی ہاتھ لگائے تو گناہ نہیں سمجھتے۔ عین الائمہ کرابیسی فرماتے ہیں کہ ہم اس کو سلف سے نکیر کے بغیر ایسا ہی پایا ہے۔ اور شمس الائمہ مکی فرماتے ہیں کہ یہ بدعت ہے۔ (قنیہ) اور قبر پر ہاتھ نہ پھیرے. اور نہ اس کو بوسہ دے. کیونکہ یہ عیسائیوں کی عادت ہے"۔

اس فتویٰ کا خلاصہ یہ ہے کہ قبر پر ہاتھ رکھا جائے تو مضائقہ نہیں۔ جب کہ اسے سنت یا اچھی بات نہ سمجھا جائے. لیکن اس پر ہاتھ پھیرنے کو باعث برکت سمجھنا. اس کو چومنا اور بوسہ دینا "بدعت" ہے۔ یہ سلف صالحین کا طریقہ نہیں تھا۔ بلکہ نصاریٰ کا معمول ہے۔

قبروں پر منتیں اور چڑھاوے:

بہت سے لوگ نہ صرف اولیاء اللہ سے مرادیں مانگتے ہیں، بلکہ ان کی منتیں بھی مانتے ہیں کہ اگر ان کا فلاں کام ہوجائے تو ان کی قبر پر غلاف یا شرینی چڑھائیں گے یا اتنی رقم ان کی نذر کریں گے۔ اس سلسلہ میں چند مسائل معلوم کرلینا ضروری ہے:

(۱) منت ماننا اور نذر و نیاز دینا عبادت ہے۔ اور غیر اللہ کی عبادت جائز نہیں۔ ہمارے حنفیہ کی مشہور کتاب درمختار میں ہے:

وَاعْلَمْ اَنَّ النَّذْرَ الَّذِی یَقَعُ لِلْاَمْوَاتِ مِنْ اَکْثَرِ الْعَوَامِ وَمَا یُؤْخَذُ مِنَ الدَّرَاهِمِ وَالشَّمْعِ وَالزَّیْتِ وَنَحْوِهَا اِلٰی ضَرَائِحِ الْاَوْلِیَاءِ الْکِرَامِ تَقَرُّبًا اِلَیْهِمْ فَهُوَ بِالْاِجْمَاعِ بَاطِلٌ وَحَرَامٌ۔ مَالَمْ یَقْصِدُوْا صَرْفَهَا لِفُقَرَاءِ الْاَنَامِ، وَقَدِ ابْتُلِیَ النَّاسُ بِذٰلِكَ، لَا سِیَّمَا فِی هٰذِهِ الْاَعْصَارِ وَقَدْ بَسَطَهُ الْعَلَّامَةُ قَاسِمٌ فِی شَرْحِ دُرَرِ الْبِحَارِ۔ (درمختار قبیل باب۔ الاعتکاف)

ترجمہ:۔ "جاننا چاہئے کہ اکثر عوام کی طرف سے مردوں کے نام کی جو نذر مانی

جاتی ہے۔ اور اولیائے کرام کی قبروں پر روپے پیسے، شمع تیل وغیرہ، ان کے تقرب کی خاطر جولائے جاتے ہیں وہ بلا جماع باطل اور حرام ہے۔ اور لوگ اس میں بکثرت مبتلا ہیں خصوصاً اس زمانے میں۔ اور اس مسئلہ کو علامہ قاسمؒ نے "درالبحار" کی شرح میں بڑی تفصیل سے لکھا ہے"۔

علامہ شامیؒ فرماتے ہیں کہ ایسی نذر کے باطل اور حرام ہوے کی کئی وجوہ ہیں" ایک یہ کہ یہ نذر مخلوق کے لئے ہے۔ اور مخلوق کے نام کی منت ماننا جائز نہیں۔ کیونکہ نذر عبادت ہے۔ اور عبادت مخلوق کی نہیں ہوتی ـــــ دوم یہ کہ جس کے نام کی منت مانی گئی ہے وہ میت ہے۔ اور مردہ کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ـــــ سوم یہ کہ اگر نذر ماننے والے کا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا مرا ہوا شخص بھی تکوینی امور میں تصرف رکھتا ہے تو اس کا یہ عقیدہ کفر ہے ـــ (ردالمختار ص ۱۳۹)

اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں:

"عبادت مر غیر خدارا جائز نیست. وز مدد خواستن از غیر خدا...... پس نذر کردن برائے اولیاء نیست کے نذر عبادت است" (ارشاد الطالبین ص ۱۸)

ترجمہ:۔ "عبادت غیر خدا کی جائز نہیں اور نہ غیر خدا سے مدد مانگنا ہی جائز ہے...... پس اولیاء اللہ کے نام کی نذر ماننا جائز نہیں کیونکہ نذر عبادت ہے"۔

الغرض یہ مسئلہ ہماری بڑی بڑی سب کتابوں میں لکھا ہے کہ نذر عبادت ہے اور عبادت غیر اللہ کی جائز نہیں۔ اس لئے اولیاء اللہ کے مزارات پر منتیں ماننا اور چڑھاوے چڑھانا بلا جماع حرام اور باطل ہے۔

(۲) اگر کسی شخص نے ایسی نذر مان لی ہو تو اس کا پورا کرنا جائز نہیں۔ اگر پورا کرے گا تو گناہ گار ہوگا۔ فتاویٰ عالمگیری، بحر الرائق اور دیگر فتاویٰ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ اگر کسی معصیت کی نذر مانی ہو تو وہ صحیح نہیں اور نہ اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ (فتاویٰ عالمگیری ص ۲۰۸ ج ۱) بلکہ اس سے توبہ کرنا لازم ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں:

"واگر کسے نذر کرد وفائے نذر نکند . کہ احتراز از معصیت بقدر امکان واجب است" (ارشاد الطالبین ص ۱۸)

"اور اگر کسی نے ایسی نذر مان لی ہو تو اسے پورا نہ کرے. کیونکہ جہاں تک ہو سکے گناہ سے پرہیز کرنا واجب ہے۔

مطلب یہ کہ ایسی نذر ماننا ہی گناہ تھا. اب اس کو پورا کرنا ایک مستقل گناہ ہو گا۔ اس لئے پہلے گناہ سے توبہ کرے. اور دوسرے گناہ کی حماقت نہ کرے۔

(۳) ۔ اگر کسی شخص نے ایسی نذر مانی اور اسے پورا بھی کر دیا تو وہ چیز غیر اللہ کے لئے نامزد ہونے کی وجہ سے حرام ہوگی. اور اس کا استعمال کسی شخص کے لئے بھی جائز نہیں ہو گا ـــــــ البتہ جس شخص نے یہ چڑھاوا چڑھایا ہے جب تک وہ چیز اپنی اصل حالت میں موجود ہو وہ اپنی منت سے توبہ کر کے اسے واپس لے سکتا ہے۔ یہی حکم اس جانور کا ہے جو غیر اللہ کے لئے چڑھاوے کے طور پر نامزد کیا گیا ہو۔ کہ جب تک وہ جانور زندہ ہے منت ماننے والا اپنی منت سے توبہ کر کے اس کو واپس لے سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ غیر اللہ کے نام ذبح کر دیا گیا۔ خواہ بوقت ذبح اس پر بسم اللہ پڑھی گئی ہو. اس کا کھانا حلال نہیں ہو گا۔ امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہ مکتوبات. شریفہ دفتر سوم، میں تحریر فرماتے ہیں:

حیوانات را از مشائخ می کنند و بر سر قبرہائے ایشاں رفتہ آں حیوانات را ذبح می نمایند در روایات فقہیہ ایں امر رانیز داخل شرک ساختہ اند و دریں مبالغہ نمودہ وایں ذبح را از جنس ذبائح جن انگاشتہ اند کہ ممنوع شرعی است داخل دائرہ شرک"

"جو جانور کہ بزرگوں کے نام پر دیتے ہیں۔ اور ان کی قبروں پر جاکر ان جانوروں کو ذبح کرتے ہیں۔ فقہی روایات میں اس امر کو بھی شرک میں داخل کیا ہے اور اس سے بچنے کی بہت ہی تاکید کی ہے. اور اس ذبح کو ان ذبیحوں کی جنس میں شمار کیا ہے جو جنات کے نام پر ذبح کئے جاتے ہیں اور شرعاً منع اور شرک کے دائرہ میں داخل

ہیں"۔

(۴) اور اگر کسی شخص نے منت اللہ تعالیٰ کے لئے مانی ہو، اور محض اس بزرگ کی روح کو ایصال ثواب مقصود ہو، یا وہاں کے فقراء کو نفع پہچانا مقصود ہو تو اس کو حرام اور شرک نہیں کہا جائے گا۔ مگر عوام اس مسئلہ میں اور اس سے پہلے مسئلہ میں کوئی تمیز نہیں کرتے، اس لئے اس سے بھی پرہیز کرنا ضروری ہے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی اوپر جو عبارت لکھی گئی ہے اس کے بعد فرماتے ہیں۔

"ازیں عمل نیز اجتناب باید نمود کہ شائبہ شرک دارو ۔ وجوہ نذر بسیا است۔ چہ در کارست کہ نذر ذبح حیوانے کنند و ارتکاب ذبح آں نمایند و بذبح جن ملحق سازند وتشبہ بعبدہ جن پیدا کنندہ" (مکتوب ۴۱ دفتر سوم)

"اس عمل سے بھی پرہیز کرنا چاہئے کہ شرک کا شائبہ رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کے نام کی منت ماننے کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، کیا ضروری ہے کہ حیوان کے ذبح ہی کی منت مانی جائے، اور اس کی ذبح کا ارتکاب کیا جائے۔ اور جنات کے نام ذبح کئے گئے جانور کے ساتھ اس کو ملحق کیا جائے اور جنات کی پرستش کرنے والوں سے مشابہت کی جائے"۔

(۵) اگر کسی شخص نے یہ نذر مانی کہ اگر میرا فلاں کام ہو جائے تو میں اللہ تعالیٰ کے نام پر اتنے روپے کی شیرینی یا اتنا کپڑا، یا اتنا غلہ ـــــ خواجہ بہاء الحق زکریا ملتانی کی خانقاہ کے فقیروں میں تقسیم کروں گا۔ اور اس کا ثواب حضرت خواجہ قدس سرہ کو پہنچاؤں گا تو اس کی نذر صحیح ہے۔ لیکن اگر اس کا وہ کام پورا ہو جائے تو ضروری نہیں ہے کہ انہی فقیروں پر یہ چیز تقسیم کرے جن کا اس نے نام لیا تھا۔ بلکہ اتنی شیرینی اتنا غلہ۔ اتنا روپیہ وغیرہ خواہ کسی بھی فقیر کو دے دے اس کی نذر پوری ہو جائے گی۔ اور اس کا ثواب حضرت خواجہ کو پورا ملے گا۔ اور اگر کسی کا دل کسی اور فقیر کو دینے پر

راضی نہیں ہوتا بلکہ حضرت خواجہ کی خانقاہ کے فقیروں کو دینا ہی ضروری سمجھتا ہے۔ اور اس کا خیال ہے کہ اس کے بغیر اس کی نذر پوری نہیں ہوگی تو اس سے ثابت ہو گا کہ یہ شخص دراصل اللہ تعالیٰ کی نذر نہیں مان رہا۔ بلکہ خود حضرت خواجہ کو چڑھاوا دینا چاہتا ہے۔ ورنہ اگر یہ نذر محض اللہ تعالیٰ کے نام پر ہوتی اور حضرت خواجہ کو محض ایصال ثواب مقصود ہوتا۔ اس نذر سے خود ان کا تقرب مقصود نہ ہوتا تو اس نذر کے پورا ہونے کا جو طریقہ ائمہ دین نے بتایا تھا اس پر اس کا دل ضرور راضی ہو جاتا لہٰذا اس کا یہ کہنا کہ میں صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی نذر مان رہا ہوں۔ غلط ثابت ہو جاتا ہے۔

خلاصہ: یہ کہ اولیاء اللہ کے مزارات پر جو منتیں مانی جاتی ہیں اور جو چڑھاوے چڑھائے جاتے ہیں اگر ان سے محض ان بزرگوں کا تقرب مقصود ہو۔ اور یہ خیال ہو کہ ان نذروں کو قبول کر کے وہ ہمارا کام کر دیں گے. اور اگر ہم نے ان کے نام کی منت نہ دی تو وہ ہم سے ناراض ہو جائیں گے اور اس سے ہمارے کاروبار. جان و مال اور بیوی بچوں کو نقصان پہنچے گا تو جیسے کہ اوپر درمختار کی عبارت گزری ہے۔ یہ بالا جماع حرام اور باطل ہے۔ اور اس کے شرک ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اور اگر ان بزرگوں کی منت نہیں مانی جاتی۔ بلکہ منت صرف اللہ تعالیٰ کے نام کی مانی جاتی ہے اور ان بزرگوں کی ناراضی و رضامندی کا اس منت سے کوئی تعلق نہیں بلکہ ان کو صرف ثواب پہنچانا مقصود ہے تو یہ منت بلاشبہ صحیح ہے. مگر مشاہدہ بتاتا ہے کہ جو لوگ بزرگوں کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں. ان کی یہ نیت ہرگز نہیں ہوتی. بلکہ وہ یہ کہہ کر کہ "ہم خدا کی منت مان رہے ہیں۔ اور بزرگوں کو صرف ایصال ثواب مقصود ہوتا ہے"۔ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اسی مکتوب ۴۱ دفتر سوم میں آگے لکھتے ہیں:

"اسی (نذر لغیر اللہ) کی قسم سے عورتوں کے وہ روزے بھی ہیں جو وہ پیروں اور بیبیوں کی نیت سے رکھتی ہیں اکثر ان کے نام اپنی طرف سے

گھڑ کر ان کے نام پر اپنے روزوں کی نیت کرتی ہیں۔ اور افطار کے وقت ہر خاص روزہ کے لئے ایک مخصوص طریقہ مقرر کرتی ہیں۔ اور ان روزوں کے لئے دنوں کا تعین بھی کرتی ہیں. اپنے مقاصد و مطالب کو ان روزوں کے ساتھ وابستہ کرتی ہیں۔ اور ان روزوں کے وسیلے سے ان پیروں اور بیبیوں سے اپنی مرادیں مانگتی ہیں۔ اور اپنی مرادوں کا پورا ہونا انہی کی طرف سے سمجھتی ہیں۔ اور یہ عبادت میں شرک ہے۔ اور غیر اللہ کی عبادت کے وسیلے سے اس غیر اللہ سے اپنی مراد مانگنا ہے. اس فعل کی برائی کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔

جب اس فعل کی برائی ظاہر کی جائے تو بعض عورتیں جو کہا کرتی ہیں کہ "ہم یہ روزے خدا کے لئے رکھتی ہیں اور ان کا ثواب پیروں کو بخشتی ہیں"۔ یہ نرا بہانہ ہے۔ اگر یہ اس بات میں سچی ہیں تو ان روزوں کے لئے دنوں کا تعین کس لئے؟ اور افطار کے لئے خاص قسم کے کھانے کی تخصیص اور طرح طرح کی شکلوں کی تعینیں کیسی؟"۔

(۶) اسی نذر کے سلسلہ میں ایک اہم ترین مسئلہ، جو اس باب میں فیصلہ کن ہے اور جس سے عوام ہی نہیں، بلکہ بہت سے پڑھے لکھے بھی غافل ہیں۔ یہ ہے کہ دراصل کسی کام کے ہونے نہ ہونے میں نذر اور منت کو قطعاً کوئی دخل نہیں۔ نہ اس سے قضا و قدر کے فیصلے تبدیل ہوتے ہیں۔ صحیحین میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد ہے:

لَاتَنْذُرُوْا، فَاِنَّ النَّذْرَ لَايُغْنِيْ مِنَ الْقَدْرِ شَيْئًا وَاِنَّمَايُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنْ مَّالِ الْبَخِيْلِ" (مشکوٰۃ شریف ص ۲۹۷)

ترجمہ:۔ "منتیں نہ مانا کرو، کیونکہ منت تقدیر کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتی اس کے ذریعہ سے تو بس بخیل کا مال نکالا جاتا ہے"۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۲۹۷)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی اس کی شرح میں فرماتے ہیں:

"منت ماننے کی ممانعت اس اعتقاد کی بناء پر ہے کہ وہ تقدیر کی کسی بات کو ٹال دیتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کی عادت تھی کہ وہ اپنی حاجتوں کے پورا ہونے اور مصیبتوں کے دور ہونے کے لئے منتیں مانا کرتے تھے۔ اور یہ بخیل لوگوں کا وطیرہ ہے۔ اس لئے ان کو روکا گیا۔ لیکن سخی لوگ بغیر واسطہ نذر کے باختیار خود صدقہ دیتے ہیں، پس اس غرض سے منت ماننے کی جو ممانعت فرمائی گئی۔ اس میں اس بات کی ترغیب ہے کہ منت تو مانی جائے مگر مخلصانہ طریقے پر"۔ (حاشیہ مشکوٰۃ)

حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ صدقہ سے رد بلا ہوتا ہے لیکن نذر ماننے میں ایک قسم کی سوداگری ہے کہ اگر یہ کام ہوا تو صدقہ دیں گے ورنہ نہیں۔ بہر حال جو منت اللہ تعالیٰ کے نام پر مانی جائے اس سے بھی قضاو قدر کے فیصلے تبدیل نہیں ہوتے، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ بزرگوں کے نام پر جو منتیں مانی جاتی ہیں ان سے خدا تعالیٰ کی تقدیر کیسے بدل سکتی ہے؟ لیکن ہوتا یہ ہے کہ منت ماننے کے بعد اگر کام نہ ہو تب تو لوگ تقدیر کے سامنے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "بس قسمت میں یونہی لکھا تھا" اور اگر کام ہو گیا تو اس کو تقدیر کا کرشمہ نہیں سمجھتے بلکہ اس بزرگ کا تصرف سمجھتے ہیں کہ دیکھو ہم نے فلاں پیر کی منت مانی تھی، اس نے (نعوذ باللہ) یہ چیز ہم کو دیدی —— یہ ہے وہ جڑ جس سے فساد عقیدہ کی کونپلیں پھوٹتی ہیں، اور جس کے ذریعہ شیطان لوگوں کو خدا تعالیٰ سے ہٹا کر اس کے بندوں کا پجاری بناتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مذکورہ بالا ارشاد میں اس جڑ پر تیشہ چلایا ہے کہ منت خدا کے نام کی مانی جائے وہ بھی اس کے قضاو قدر کے فیصلوں کو نہیں بدلتی۔ چہ جائیکہ وہ منت جو اس کے عاجز بندوں کے نام پر مانی جائے۔

عید میلاد النبیؐ:

۱۲/ ربیع الاول کو آنحضرت سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا "جشن عید" منایا جاتا ہے۔ اور آج کل اسے اہل سنت کا خاص شعار سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کے بارے

میں بھی چند ضروری نکات عرض کرتا ہوں۔

(۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر خیر ایک اعلیٰ ترین عبادت بلکہ روح ایمان ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ایک ایک واقعہ سرمہ چشم بصیرت ہے۔ آپؐ کی ولادت آپؐ کی صغرسنی۔ آپؐ کا شباب۔ آپؐ کی بعثت، آپؐ کی دعوت، آپؐ کا جہاد، آپؐ کی قربانی۔ آپؐ کا ذکر و فکر، آپؐ کی عبادت و نماز، آپؐ کے اخلاق و شمائل، آپؐ کی صورت و سیرت، آپؐ کا زہد و تقویٰ، آپؐ کا علم و خشیت آپؐ کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، سونا جاگنا، آپؐ کی صلح و جنگ، خفگی و غصہ، رحمت و شفقت، تبسم و مسکراہٹ، الغرض آپؐ کی ایک ایک ادا اور ایک ایک حرکت و سکون امت کے لئے اسوہ حسنہ اور اکسیر ہدایت ہے، اور اس کا سیکھنا سکھانا، اس کا مذاکرہ کرنا، دعوت دینا امت کا فرض ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

اسی طرح آپؐ سے نسبت رکھنے والی شخصیات اور چیزوں کا تذکرہ بھی عبادت ہے۔ آپؐ کے احباب واصحاب، ازواج و اولاد، خدام و عمال، آپؐ کا لباس و پوشاک، آپؐ کے ہتھیاروں، آپؐ کے گھوڑوں، خچروں اور ناقہ کا تذکرہ بھی عین عبادت ہے کیوں کہ یہ دراصل ان چیزوں کا تذکرہ نہیں بلکہ آپؐ کی نسبت کا تذکرہ ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ کے دو حصے ہیں۔ ایک ولادت شریفہ سے لیکر قبل از نبوت تک کا۔ اور دوسرا بعثت سے لیکر وصال شریف تک کا پہلے حصہ کے جستہ جستہ بہت سے واقعات حدیث و سیرت کی کتابوں میں موجود ہیں اور حیات طیبہ کا دوسرا حصہ ـــــ جسے قرآن کریم نے امت کے لئے "اسوہ حسنہ" فرمایا ہے ـــــ اس کا مکمل ریکارڈ حدیث و سیرت کی شکل میں محفوظ ہے۔ اور اس کو دیکھنے سے ایسا لگتا ہے کہ آپؐ باہمہ خوبی و زیبائی گویا ہماری آنکھوں کے سامنے چل پھر رہے ہیں۔ اور آپؐ کے جمال جہاں آرا کی ایک ایک ادا اس میں صاف جھلک رہی ہے۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

بلامبالغہ یہ اسلام کا عظیم ترین اعجاز اور اس امت مرحومہ کی بلند ترین سعادت ہے کہ ان کے پاس ان کے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا پورا ریکارڈ موجود ہے۔ اور وہ ایک ایک واقعہ کے بارے میں دلیل و ثبوت کے ساتھ نشاندہی کر سکتی ہے کہ یہ واقعہ کہاں تک صحیح ہے؟ ___ اس کے برعکس آج دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں جن کے پاس ان کے ہادی کی زندگی کا صحیح اور مستند ریکارڈ موجود ہو ___ یہ نکتہ ایک مستقل مقالے کا موضوع ہے، اس لئے یہاں صرف اسی قدر اشارے پر اکتفاء کرتا ہوں۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کو بیان کرنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ آپؐ کی سیرت طیبہ کے ایک ایک نقشے کو اپنی زندگی کے ظاہر و باطن پر اس طرح آویزاں کیا جائے کہ آپؐ کے ہر امتی کی صورت و سیرت، چال ڈھال، رفتار و گفتار، اخلاق و کردار آپؐ کی سیرت کا مرقع بن جائے۔ اور دیکھنے والے کو نظر آئے کہ یہ محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہے ___

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جہاں بھی موقعہ ملے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر خیر سے ہر مجلس و محفل کو معمور و معطر کیا جائے۔ آپؐ کے فضائل و کمالات اور آپؐ کے بابرکت اعمال و اخلاق اور طریقوں کا تذکرہ کیا جائے۔ اور آپؐ کی زندگی کے ہر نقش قدم پر مرمٹنے کی کوشش کی جائے۔ سلف صالحین صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ ان دونوں طریقوں پر عامل تھے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک سنت کو اپنے عمل سے زندہ کرتے تھے اور ہر محفل و مجلس میں آپؐ کی سیرت طیبہ کا تذکرہ کرتے تھے۔ آپؐ نے سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ سنا ہو گا کہ ان کے آخری لمحات حیات میں ایک نوجوان ان کی عیادت کے لئے آیا۔ واپس جانے لگا تو حضرت نے فرمایا: برخوردار تمہاری چادر ٹخنوں سے نیچی ہے۔ اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے ___ ان کے صاحبزادے سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے اپنانے کا اس قدر

شوق تھا کہ جب حج پر تشریف لے جاتے تو جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سفر حج میں پڑاؤ کیا تھا وہاں اترتے۔ جس درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا اس درخت کے نیچے آرام فرمایا تھا اس درخت کے نیچے آرام کرتے۔ اور جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فطری ضرورت کے لئے اترے تھے، خواہ تقاضا نہ ہوتا تب بھی وہاں اترتے، اور جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے تھے اس کی نقل اتارتے ــــــ رضی اللہ عنہ یہی عاشقان رسول تھے (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کے دم قدم سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ صرف اوراق کتب کی زینت نہیں رہی بلکہ جیتی جاگتی زندگی میں جلوہ گر ہوئی۔ اور اس کی بوئے عنبرین نے مشام عالم کو معطر کیا۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ بہت سے ایسے ممالک میں پہنچے جن کی زبان نہیں جانتے تھے۔ نہ وہ ان کی لغت سے آشنا تھے، مگر انکی شکل و صورت، اخلاق و کردار اور اعمال و معاملات کو دیکھ کر علاقوں کے علاقے اسلام کے حلقہ بگوش اور جمال محمدیؐ کے غلام بے دام بن گئے۔ یہ سیرت نبوی کی کشش تھی جس کا پیغام ہر مسلمان اپنے عمل سے دیتا تھا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

(۴) سلف صالحین نے کبھی سیرت النبی کے جلسے نہیں کئے، اور نہ میلاد کی محفلیں سجائیں۔ اس لئے کہ وہاں "ہر روز" روز عید اور ہر شب "شب برات" کا قصہ تھا۔ ظاہر ہے کہ جب ان کی پوری زندگی "سیرت النبی" کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، جب ان کی ہر محفل و مجلس کا موضوع ہی سیرت طیبہ تھا۔ اور جب ان کا ہر قول و عمل سیرت النبی کا مدرسہ تھا تو ان کو اس نام کے جلسوں کی نوبت کب آ سکتی تھی۔ لیکن جوں جوں زمانہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک دور سے بعد ہوتا گیا عمل کے بجائے قول کا اور کردار کے بجائے گفتار کا سکہ چلنے لگا ــــــ الحمد للہ یہ امت کبھی بانجھ نہیں ہوئی۔ آج اس گئے گزرے دور میں بھی اللہ تعالیٰ کے ایسے بندے موجود ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا آئینہ سامنے رکھ کر اپنی زندگی کے گیسو و کاکل سنوارتے ہیں، اور ان کے لئے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک

ایک سنت ملک سلیمان اور گنج قارون سے زیادہ قیمتی ہے۔ لیکن مجھے شرمساری کے ساتھ یہ اعتراف کرنا چاہئے کہ ایسے لوگ کم ہیں، جب کہ ہم میں سے اکثریت مجھ ایسے بدنام کنندہ گپوڑوں اور نعرہ بازوں کی ہے جو سال میں ایک دوبار سیرت النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے نعرے لگا کر یہ سمجھ لیتے ہیں۔

کہ ان کے ذمہ ان کے محبوب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جو حق تھا وہ قرض انہوں نے پورا ادا کر دیا، اور اب ان کے لئے شفاعت واجب ہوچکی ہے۔ مگر ان کی زندگی کے کسی گوشے میں دور دور تک سیرت طیبہ کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت کے ایک ایک نشان کو انہوں نے اپنی زندگی کے دامن سے کھرچ کھرچ کر صاف کر ڈالا ہے۔ اور روزمرہ نہیں بلکہ ہر لحہ اس کی مشق جاری رہتی ہے، مگر ان کے پتھر دل کو کبھی احساس تک نہیں ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی سنتوں اور اپنے طریقوں کے مٹنے سے کتنی تکلیف اور اذیت ہوتی ہوگی۔ وہ اس خوش فہمی میں ہیں کہ بس قوالی کے دوچار نغمے سننے، نعت شریف کے دوچار شعر پڑھنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حق ادا ہوجاتا ہے۔

(۵) میلاد کی محفلوں کے وجود سے امت کی چھ صدیاں خالی گزرتی ہیں اور ان چھ صدیوں میں جیسا کہ میں ابھی عرض کرچکا ہوں۔ مسلمانوں نے کبھی "سیرت النبی" کے نام سے کوئی جلسہ یا "میلاد" کے نام سے کوئی محفل نہیں سجائی۔ "محفل میلاد" کا آغاز سب سے پہلے ۶۰۲ھ میں سلطان ابو سعید مظفر اور ابوالخطاب ابن دحیہ نے کیا۔ جس میں تین چیزیں بطور خاص ملحوظ تھیں۔

(۱) بارہ ربیع الاول کی تاریخ کا تعین۔

(۲) علماء و صلحاء کا اجتماع۔

(۳) اور ختم محفل پر طعام کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرفتوح کو ایصالِ ثواب۔ ان دونوں صاحبوں کے بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کس قماش کے آدمی تھے؟ بعض مؤرخین نے ان کو فاسق و کذاب لکھا ہے۔ اور بعض نے

عادل و ثقہ۔ واللہ اعلم

____ جب یہ نئی رسم نکلی تو علمائے امت کے درمیان اس کے جواز و عدم جواز کی بحث چلی، علامہ فاکہانیؒ اور ان کے رفقاء نے ان خودساختہ قیود کی بنا پر اس میں شرکت سے عذر کیا اور اسے "بدعت سیہ" قرار دیا۔ اور دیگر ____ علماء نے سلطان کی ہم نوائی کی۔ اور ان قیود کو مباح سمجھ کر اس کے جواز و استحسان کا فتویٰ دیا جب ایک بار یہ رسم چل نکلی تو نہ صرف "علما و صلحاء کے اجتماع" تک محدود نہ رہی بلکہ عوام کے دائرے میں آکر ان کی نئی نئی اختراعات کا تختہ مشق بنتی چلی گئی۔ آج ہمارے سامنے عید میلاد النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی جو ترقی یافتہ شکل موجود ہے (اور ابھی خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں مزید کتنی ترقی مقدر ہے) اب ہمیں اس کا جائزہ لینا ہے۔

(۲) سب سے پہلے دیکھنے کی بات تو یہ ہے کہ جو فعل صحابہ و تابعین کے زمانے میں کبھی نہیں ہوا بلکہ جس کے وجود سے اسلام کی چھ صدیاں خالی چلی آئی ہیں۔ آج وہ "اسلام کا شعار" کہلاتا ہے۔ اس شعار اسلام کو زندہ کرنے والے "عاشقان رسول" کہلاتے ہیں۔ اور جو لوگ اس نوایجاد شعار اسلام سے ناآشنا ہوں ان کو ____ دشمنان رسول تصور کیا جاتا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

کاش! ان حضرات نے کبھی یہ سوچا ہوتا کہ چھ صدیوں کے جو مسلمان ان کے اس خود تراشیدہ شعار اسلام سے محروم رہے ہیں ان کے بارے میں کیا کہا جائے گا؟ کیا وہ سب نعوذ باللہ دشمنان رسول تھے؟ اور پھر انھوں نے اس بات پر کبھی غور کیا ہوتا کہ اسلام کی تکمیل کا اعلان تو حجۃ الوداع میں عرفہ کے دن ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ کونسا پیغمبر آیا تھا جس نے ایک ایسی چیز کو ان کے لئے شعار اسلام بنا دیا جس سے چھ صدیوں کے مسلمان ناآشنا تھے۔؟ کیا اسلام میرے یا کسی کے ابا کے گھر کی چیز ہے کہ جب چاہو اس کی کچھ چیزیں حذف کر دو، اور جب چاہو اس میں کچھ اور چیزوں کا اضافہ کر ڈالو؟

(۷) دراصل اسلام سے پہلے قوموں میں اپنے بزرگوں اور بانیان مذہب کی برسی منانے کا معمول ہے۔ جیسا کہ عیسائیوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم ولادت پر "عید میلاد" منائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلام نے برسی منانے کی رسم کو ختم کر دیا تھا. اور اس میں دو حکمتیں تھیں۔ ایک یہ کہ سالگرہ کے موقع پر جو کچھ کیا جاتا ہے وہ اسلام کی دعوت اور اس کی روح و مزاج سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔ اسلام اس ظاہری سج دھج۔ نمود و نمائش اور نعرہ بازی کا قائل نہیں. وہ اس شور و شغب اور ہاؤ ہو سے ہٹ کر اپنی دعوت کا آغاز دلوں کی تبدیلی سے کرتا ہے. اور عقائد حقہ. اخلاق حسنہ اور اعمال صالحہ کی تربیت ہے "انسان سازی" کا کام کرتا ہے۔ اس کی نظر میں یہ ظاہری مظاہرے ایک کوڑی کی قیمت بھی نہیں رکھتے. جن کے بارے میں کہا گیا ہے۔

ع "جگمگاتے درودیوار دل بے نور ہیں"

دوسری حکمت یہ ہے کہ اسلام دیگر مذہب کی طرح کسی خاص موسم میں برگ وبار نہیں لاتا. بلکہ وہ تو ایسا سدا بہار شجرہ طوبیٰ ہے. جس کا پھل اور سایہ دائم و قائم ہے۔ گویا اس کے بارے میں قرآنی الفاظ میں "اکلھا دائم وظلھا کہنا بجا ہے۔ اس کی دعوت اور اس کا پیغام اور کسی خاص تاریخ کا مرہون منت نہیں بلکہ آفاق وازمان کو محیط ہے۔

اور پھر دوسری قوموں کے پاس تو دو چار ہستیاں ہوں گی جن کی سالگرہ منا کر وہ فارغ ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کے دامن میں ہزاروں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں ایسی قد آور ہستیاں موجود ہیں جو ایک سے ایک بڑھ کر ہیں اور جن کی عظمت کے سامنے آسمان کی بلندیاں ہیچ اور نورانی فرشتوں کا تقدس گرد راہ ہے۔ اسلام کے پاس کم و بیش سوا لاکھ کی تعداد تو ان انبیاء کی ہے ___ جو انسانیت کے ہیرو ہیں۔ اور جن میں سے ایک ایک کا وجود کائنات کی ساری چیزوں پر بھاری ہے۔ پھر انبیاء کرام ؑ کے بعد صحابہ کرام ؓ کا قافلہ ہے ان کی تعداد بھی سوا لاکھ سے کیا کم ہوگی؟ پھر

ان کے بعد ہر صدی کے وہ لاکھوں اکابر اولیاء اللہ ہیں جو اپنے اپنے وقت میں رشد و ہدایت کے منارۂ نور تھے۔ اور جن کے آگے بڑے بڑے جابر بادشاہوں کی گردنیں جھک جاتی تھیں۔ اب اگر اسلام شخصیتوں کی سالگرہ منانے کا دروازہ کھول دیتا تو غور کیجئے اس امت کو سال بھر میں سالگرہوں کے علاوہ کسی اور کام کے لئے ایک لمحہ کی بھی فرصت ہوتی؟ ـــــ چونکہ یہ چیز ہی اسلام کی دعوت اور اس کے مزاج کے خلاف تھی اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین کے بعد چھ صدیوں تک امت کا مزاج اس کو قبول نہ کر سکا۔ اگر آپ نے اسلامی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اسلامی تاریخ میں چھٹی صدی وہ زمانہ ہے جس میں فرزندانِ تثلیث نے صلیبی جنگیں لڑیں، اور مسیحیت کے ناپاک اور منحوس قدموں نے عالم اسلام کو روند ڈالا، ادھر مسلمانوں کا اسلامی مزاج داخلی و خارجی فتنوں کی مسلسل یلغار سے کمزور پڑ گیا تھا۔ ادھر مسیحیت کا عالم اسلام پر فاتحانہ حملہ ہوا، اور مسلمانوں میں مفتوح قوم کا سا احساس کمتری پیدا ہوا، اس لئے عیسائیوں کی تقلید میں یہ قوم بھی سال بعد اپنے مقدس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کے "یوم ولادت" کا جشن منانے لگی، یہ قوم کے کمزور اعصاب کی تسکین کا ذریعہ تھا تاہم جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔ امت کے مجموعی مزاج نے اس کو قبول نہیں کیا۔ بلکہ ساتویں صدی کے آغاز سے لیکر آج تک علمائے امت نے اسے "بدعت" قرار دیا، اور اسے "ہر بدعت گمراہی ہے" کے زمرے میں شمار کیا۔

(۸) اگرچہ "میلاد" کی رسم ساتویں صدی کے آغاز سے شروع ہو چکی تھی، اور لوگوں نے اس میں بہت سے امور کے اضافے بھی کئے لیکن کسی کو یہ جرأت نہیں ہوئی تھی کہ اسے "عید" کا نام دیتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ "میری قبر کو "عید" نہ بنانا"۔ اور میں اوپر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ کے حوالے سے بتا چکا ہوں کہ "عید" بنانے کی ممانعت کیوں فرمائی گئی تھی۔ مگر اب چند سالوں سے اس سالگرہ کو "عید میلاد النبیؐ" کہلانے کا شرف بھی حاصل ہو گیا

ہے۔

دنیا کا کون مسلمان اس سے ناواقف ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے "عید" کے دو دن مقرر کئے ہیں۔ عید الفطر اور عید الاضحیٰ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کو بھی "عید" کہنا صحیح ہوتا، اور اسلام کے مزاج سے یہ چیز کوئی مناسبت رکھتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کو "عید" قرار دے سکتے تھے، اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک یہ پسندیدہ چیز ہوتی تو آپؐ نہ سہی، خلفائے راشدینؓ ہی آپؐ کے یوم ولادت کو "عید" کہہ کر "جشن عید میلاد النبیؐ" کی طرح ڈالتے، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، اس سے دو ہی نتیجے نکل سکتے ہیں یا یہ کہ ہم اس کو "عید" کہنے میں غلطی پر ہیں۔ یا یہ کو نعوذ باللہ ہمیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت کی خوشی ہے مگر صحابہ کرامؓ خصوصاً خلفائے راشدین کو کوئی خوشی نہیں تھی، انہیں آپؐ سے اتنا عشق بھی نہیں تھا جتنا ہمیں ہے ـــــ ستم یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ ولادت میں تو اختلاف ہے، بعض ۹ ربیع الاول بتاتے ہیں۔ بعض ۸ ربیع الاول، اور مشہور بارہ ربیع الاول ہے۔ لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریفہ ۱۲ ربیع الاول ہی کو ہوئی ـــــ گویا ہم نے "جشن عید" کے لئے دن بھی تجویز کیا تو وہ جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے داغ مفارقت دے گئے، اگر کوئی ہم سے یہ سوال کرے کہ تم لوگ "جشن عید" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت طیبہ پر مناتے ہو؟ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خوشی میں؟ (نعوذ باللہ) تو شائد ہمیں اس کا جواب دینا بھی مشکل ہوگا۔

بہرحال میں اس دن کو "عید" کہنا معمولی بات نہیں سمجھتا، بلکہ اس کو صاف صاف تحریف فی الدین سمجھتا ہوں۔ اس لئے کہ "عید" اسلامی اصطلاح ہے۔ اور اسلامی اصطلاحات کو اپنی خود رائی سے غیر منقول جگہوں پر استعمال کرنا دین میں تحریف ہے۔

(۹) اور پھر یہ "عید" جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کے مطابق منائی جاتی ہے وہ بھی لائق شرم ہے، بے ریش لڑکے غلط سلط نعتیں پڑھتے ہیں، موضوع اور من گھڑت قصے کہانیاں جن کا حدیث و سیرت کی کسی کتاب میں کوئی وجود نہیں، بیان کی جاتی ہیں، شور و شغب ہوتا ہے۔ نمازیں غارت ہوتی ہیں، اور نامعلوم کیا کیا ہوتا ہے، کاش! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر جو "بدعت" ایجاد کی گئی تھی اس میں کم از کم آپؐ کی عظمت و تقدس ہی کو ملحوظ رکھا جاتا۔

غضب یہ کہ سمجھا یہ جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان خرافاتی محفلوں میں بنفسِ نفیس تشریف بھی لاتے ہیں ـــــ فیاغربتہ الاسلام! (ہائے، اسلام کی بیچارگی!)

(۱۰) اب میں اس "عید میلاد النبیؐ" کا آخری کارنامہ عرض کرتا ہوں، کچھ عرصہ سے ہمارے کراچی میں "عید میلاد النبیؐ" کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر اور بیت اللہ شریف کی شبیہ بنائی جاتی ہے، اور جگہ جگہ بڑے بڑے چوکوں میں سانگ بناکر رکھے جاتے ہیں۔ لوگ ان سے تبرک حاصل کرتے ہیں ـــــ اور "بیت اللہ" کی خود ساختہ شبیہ کا طواف بھی کرتے ہیں ـــــ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھوں اور علماء کی نگرانی میں کرایا جارہا ہے۔ فیااسفاہ!

"جشن عید میلاد" کی باقی ساری چیزوں کو چھوڑ کر اسی ایک منظر کا جائزہ لیجئے کہ اس میں کتنی قباحتوں کو سمیٹ کر جمع کر دیا گیا ہے۔

اول: اس پر جو ہزاروں روپیہ خرچ کیا جاتا ہے یہ محض اسراف و تبذیر اور فضول خرچی ہے۔ آپ ملا علی قاریؒ کے حوالے سے سن چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں پر چراغ اور شمع جلانے والوں پر اس لئے لعنت فرمائی ہے کہ یہ فعل عبث ہے۔ اور خدا کے دیئے ہوئے مال کو مفت ضائع کرنا ہے۔ ذرا سوچئے! جو مقدس نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) قبر پر ایک چراغ جلانے کو فضول خرچی کی وجہ سے ممنوع اور ایسا کرنے والوں کو ملعون قرار دیتا ہے اس کا ارشاد اس ہزاروں لاکھوں

روپے کی فضول خرچی کرنے والوں کے بارے میں کیا ہوگا؟ اور پھر یہ بھی دیکھئے کہ یہ فضول خرچی وہ غربت زدہ قوم کر رہی ہے جو روٹی، کپڑا، مکان کے نام پر ایمان تک کا سودا کرنے کو تیار ہے۔ اس فضول خرچی کے بجائے اگر یہی رقم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایصال ثواب کے غرباء و مساکین کو چپکے سے نقد دے دی جاتی تو نمائش تو بلاشبہ نہ ہوتی مگر اس رقم سے سینکڑوں اجڑے گھر آباد ہوسکتے تھے۔ ان سینکڑوں بچیوں کے ہاتھ پیلے کئے جاسکتے تھے جو اپنے والدین کے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہیں۔ کیا یہ فضول خرچی اس قوم کے رہنماؤں کو سجتی ہے جس کے بہت سے افراد و خاندان نان شبینہ سے محروم اور جان و تن کا رشتہ قائم رکھنے سے قاصر ہوں؟ اور پھر یہ سب کچھ کیا بھی جارہا ہے کس ہستی کے نام پر؟ جو خود تو پیٹ پر پتھر بھی باندھ لیتے تھے، مگر جانوروں تک کی بھوک پیاس سنکر تڑپ جاتے تھے۔ آج کمیونزم اور لادین سوشلزم، اسلام کو دانت دکھارہا ہے۔ جب ہم دنیا کی مقدس ترین ہستی ــــــــ کے نام پر یہ سارا کھیل کھیلیں گے تو لادین طبقے، دین کے بارے میں کیا تاثر لیں گے؟ فضول خرچی کرنے والوں کو قرآن کریم نے "اخوان الشیاطین" فرمایا تھا، مگر ہماری فاسد مزاجی نے اس کو اعلیٰ ترین نیکی اور اسلامی شعار بناڈالا تھا۔

ع "بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست"

دوسرے اس فعل میں شیعوں اور رافضیوں کی تقلید ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ رافضی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی سالانہ برسی منایا کرتے اور اس موقعہ پر تعزیہ، علم، دلدل وغیرہ نکالا کرتے ہیں، انہوں نے جو کچھ حسینؓ اور آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کیا وہی ہم نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر کرنا شروع کردیا۔ انصاف کیجئے کہ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر اور بیت اللہ شریف کا سوانگ بناکر اسے بازاروں میں پھرانا اور اس کے ساتھ روضہ اطہر اور بیت اللہ کا سا معاملہ کرنا صحیح ہے تو روافض کا تعزیہ اور دلدل کا سوانگ رچانا کیوں غلط ہے؟ افسوس ہے کہ جو ملعون بدعت رافضیوں نے ایجاد کی تھی ہم نے ان کی تقلید کرکے

اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی کوشش کی۔

تیسرے، اس بات پر بھی غور کیجئے کہ روضہ اطہر اور بیت اللہ کی جو شبیہ بنائی جاتی ہے وہ شیعوں کے تعزیہ کی طرح محض جعلی اور مصنوعی ہے، جسے آج بنایا جاتا ہے اور کل توڑ دیا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس مصنوعی سوانگ میں اصل روضہ اطہر اور بیت اللہ کی کوئی خیر و برکت منتقل ہو جاتی ہے یا نہیں؟ اور اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی اس چیز میں کسی درجہ میں تقدس پیدا ہو جاتا ہے یا نہیں؟ اگر اس میں کوئی تقدس اور کوئی برکت نہیں تو اس فعل کے محض لغو اور عبث ہونے میں کیا شک ہے؟ اور اگر اس میں تقدس اور برکت کا کچھ اثر آ جاتا تو اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟ اور کسی مصنوعی اور جعلی چیز میں روضہ مقدسہ اور بیت اللہ شریف سے تقدس و برکت کا اعتقاد رکھنا اسلام کی علامت ہے یا جاہلیت کی؟ اور پھر روضہ شریف اور بیت اللہ شریف کی شبیہہ بنا کر اگلے دن اسے توڑ پھوڑ کر دینا کیا ان کی توہین نہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ بادشاہ کی تصویر بادشاہ نہیں ہوتی، نہ کسی عاقل کے نزدیک اس میں بادشاہ کا کوئی کمال ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بادشاہ کی تصویر کی توہین کو قانون کی نظر میں لائق تعزیر جرم تصور کیا جاتا ہے۔ اور اسے بادشاہ سے بغاوت پر محمول کیا جاتا ہے، لیکن آج روضہ اطہر اور بیت اللہ شریف کی شبیہہ بنا کر کل اسے منہدم کرنے والوں کو یہ احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ اسلامی شعائر کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

چوتھے، جس طرح شیعہ لوگ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے تعزیہ پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں اور منتیں مانتے ہیں۔ اب رفتہ رفتہ عوام کالانعام اس نو ایجاد "بدعت" کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنے لگے ہیں۔ روضہ اطہر کی شبیہ پر درود و سلام پیش کیا جاتا ہے۔ اور بیت اللہ شریف کی شبیہہ کا باقاعدہ طواف ہونے لگا ہے ___ گویا مسلمانوں کو حج و عمرہ کے لئے مکہ مکرمہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ اطہر کی زیارت کے لئے مدینہ منورہ جانے کی ضرورت نہیں، ہمارے ان دوستوں نے گھر گھر میں روضے اور بیت اللہ بنا دیئے ہیں، جہاں سلام بھی پڑھا جاتا

ہے. اور طواف بھی ہوتا ہے۔ میرے قلم میں طاقت نہیں کہ میں اس فعل کی قباحت و شناعت اور ملعونیت کو ٹھیک ٹھیک واضح کر سکوں۔ ہمارے ائمہ اہل سنت کے نزدیک یہ فعل کس قدر قبیح ہے؟ اس کا اندازہ لگانے کے لئے صرف ایک مثال کافی ہے. وہ یہ کہ ایک زمانے میں ایک بدعت ایجاد ہوئی تھی کہ عرفہ کے دن جب حاجی حضرات عرفات کے میدان میں جمع ہوتے ہیں تو ان کی مشابہت کے لئے لوگ اپنے شہر کے کھلے میدان میں نکل کر جمع ہوتے. اور حاجیوں کی طرح سارا دن دعاء و تضرع، گریہ و زاری اور توبہ استغفار میں گزارتے ـــــ اس رسم کا نام "تعریف" یعنی عرفہ منانا رکھا گیا تھا ـــــ بظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں تھی۔ بلکہ یہ ایک اچھی چیز تھی کہ اگر اس کا رواج عام ہو جاتا تو کم از کم سال بعد تو مسلمانوں کو توبہ و استغفار کی توفیق ہو جایا کرتی۔ مگر ہمارے علمائے اہل سنت نے (اللہ ان کو جزائے خیر عطا فرمائے) اس بدعت کی سختی سے تردید کی. اور فرمایا:

اَلتَّعْرِیْفُ لَیْسَ بِشَیْئٍ ۔ یعنی اس طرح عرفہ منانا بالکل لغو اور بیہودہ حرکت ہے۔

شیخ ابن نجیم صاحب البحر الرائق لکھتے ہیں:

"چونکہ وقوف عرفات ایک ایسی عبادت ہے جو ایک خاص مکان کے ساتھ مخصوص ہے اس لئے یہ فعل اس مکان کے سوا دوسری جگہ جائز نہ ہوگا۔ جیسا کہ طواف وغیرہ جائز نہیں، آپ دیکھتے ہیں طواف کعبہ کی مشابہت کے طور پر کسی اور مکان کا طواف جائز نہیں"۔ (ص ۱۷۶ ج ۲)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی" فرماتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا کہ "میری قبر کو عید نہ بنالینا" اس میں تحریف کا دروازہ بند کرنے کی طرف اشارہ ہے کیونکہ یہود و نصاریٰ نے اپنے نبیوں کی قبروں کے ساتھ یہی کیا تھا۔ اور انہیں حج کی طرح عید اور موسم بنالیا تھا"۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

شیخ علی القاریِ رحمتہ اللہ شرح مناسک میں فرماتے ہیں کہ طواف کعبہ شریف کی خصوصیات میں سے ہے۔ اس لئے انبیاء اولیاء کے قبور کے گرد طواف کرنا حرام ہے۔ جاہل لوگوں کے فعل کا کوئی اعتبار نہیں، خواہ وہ مشائخ و علماء کی شکل میں ہوں" (بحوالہ الجنتہ لاہل السنتہ ص ۷)

اور البحرالرائق، کفایہ شرح ہدایہ اور معراج الدرایہ میں ہے کہ "جو شخص کعبہ شریف کے علاوہ کسی اور مسجد کا طواف کرے۔ اس کے حق میں کفر کا اندیشہ ہے"

(الجنتہ لاہل السنہ ص ۷)

ان تصریحات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ روضہ اطہر اور کعبہ شریف کا سوانگ بنا کر ان کے ساتھ اصل کا سا جو معاملہ کیا جاتا ہے ہمارے اکابر اہل سنت کی نظر میں اس کی کیا حیثیت ہے۔

خلاصہ یہ کہ "جشن عید میلاد" کے نام پر جو خرافات رائج کر دی گئی ہیں۔ اور جن میں ہر آئے سال مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے۔ یہ اسلام کی دعوت۔ اس کی روح اور اس کے مزاج کے یکسر منافی ہیں۔ میں اس تصور سے پریشان ہو جاتا ہوں کہ ہماری ان خرافات کی روئداد جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی میں پیش ہوتی ہوگی تو آپ پر کیا گزرتی ہوگی؟ اور اگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم ہمارے درمیان موجود ہوتے تو ان چیزوں کو دیکھ کر ان کا کیا حال ہوتا؟ بہر حال میں اس کو نہ صرف "بدعت" بلکہ "تحریف فی الدین" تصور کرتا ہوں۔ اور اس بحث کو امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے ایک ارشاد پر ختم کرتا ہوں۔ جو انہوں نے اسی مسئلہ میں اپنے مرشد خواجہ باقی باللہؒ کے بارے میں فرمایا ہے:

"بہ نظر انصاف ببیند کہ اگر فرضاً" حضرت ایشاں دریں زمان دنیا زندہ می بودند وایں مجلس واجتماع منعقد می شد آیا بایں امر راضی می شدند۔ وایں اجتماع را پسندیدند یانہ۔ یقینِ فقیر آں است کہ ہرگز ایں معنی را تجویز نمی فرمودند۔ مقصود فقیر اعلام

بود. قبول کنند یانہ کنند ہیچ مضائقہ نیست وگنجائش مشاجرہ نہ"

ترجمہ:۔ انصاف کی نظر سے دیکھئے کہ اگر بالفرض حضرت ایشاں اس وقت دنیا میں تشریف فرما ہوتے اور یہ مجلس اور یہ اجتماع منعقد ہوتا آیا آپ اس پر راضی ہوتے. اور اس پر اجتماع کو پسند فرماتے یا نہیں؟ فقیر کا یقین یہ ہے کہ اس کو ہرگز جائز نہ رکھتے ___ فقیر کا مقصود صرف امر حق کا اظہار ہے۔ قبول کریں یا نہ کریں کوئی پرواہ نہیں۔ اور نہ کسی جھگڑے کی گنجائش۔ (دفتر اول مکتوب ۲۷۳)

سنت اور اہل سنت.

دیوبندی بریلوی، اختلاف کے اہم مسائل پر کتاب و سنت اور ائمہ اہل سنت کا نکتہ نظر آپ کے سامنے آچکا ہے۔ چونکہ گزشتہ سطور میں کئی جگہ سنت و بدعت کا لفظ آیا ہے اس لئے مناسب ہو گا کہ میں سنت و بدعت کے بارے میں چند امور عرض کر دوں تاکہ آپ کو یہ معلوم کرنے میں دقت پیش نہ آئے کہ اہل سنت کون ہیں؟

(۱) سنت و بدعت باہم متقابل ہیں۔ جب کہا جائے کہ فلاں چیز سنت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ "بدعت" نہیں۔ اور جب کہا جائے کہ یہ چیز "بدعت" ہے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ چیز خلاف سنت ہے۔

(۲) میرا. آپ کا اور تمام مسلمانوں کا ایمان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ایک طرف گزشتہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی شریعتیں منسوخ ہو گئیں. تو دوسری طرف آئندہ قیامت تک کے لئے نبوت کا دروازہ بند ہو گیا گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد ایک آپؐ ہی کی ذات گرامی ہے جس کے ذریعہ حق تعالیٰ شانہ کی پسند و ناپسند معلوم ہو سکتی ہے. اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے پسند و ناپسند کا جو آئین دیا اسی کا نام دین و شریعت ہے۔ جس کی تکمیل کا اعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے تین مہینے پہلے میدان عرفات میں کر دیا گیا۔ اب نہ اس دین میں

کمی ہو سکتی ہے اور نہ کسی اضافے کی گنجائش ہے۔

(۳) سنت طریقہ کو کہتے ہیں۔ پس عقائد۔ اعمال۔ اخلاق، معاملات اور عادات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو طریقہ اپنایا وہ "سنت" ہے اور اس کے خلاف "بدعت" ہے۔ طریقہ نبویؐ کا علم ہمیں قرآن کریم اور احادیث صحیحہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کی سنت کو لازم پکڑنے کا حکم دیا ہے، (یہ حدیث میں اس مضمون کی تمہید میں نقل کر چکا ہوں) اس لئے خلفائے راشدینؓ کی سنت بھی سنت نبویؐ کا حکم رکھتی ہے، نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے بہت سے فضائل بیان فرمائے ہیں، ان کو دین کے معاملہ میں ثقہ اور امین فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

اَکْرِمُوْا اَصْحَابِیْ فَاِنَّھُمْ خِیَارُکُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ، ثُمَّ یَظْھَرُ الْکِذْبُ، اَلْحَدِیْثَ۔ (مشکوٰۃ ص۵۵۴)

ترجمہ:۔ میرے صحابہ کی عزت کرو، کیونکہ وہ تم میں سب سے پسندیدہ لوگ ہیں۔ پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے پھر وہ لوگ جو ان کے بعد ہوں گے۔ اس کے بعد جھوٹ کا ظہور ہو گا۔ (مشکوٰۃ ص ۵۵۴)

ایک حدیث میں ہے کہ میرا جو صحابی کسی زمین میں فوت ہو گا وہ قیامت کے دن لوگوں کا قائد اور نور بن کر اٹھے گا۔ (حوالہ بالا)

یہ مضمون بہت سی احادیث میں ارشاد ہوا ہے، ادھر قرآن کریم نے جماعت صحابہؓ کو "المومنین" اور "خیر امت" کا خطاب دے کر ان کے راستے پر چلنے کا حکم دیا ہے۔ اور جو شخص ان کے راستے سے ہٹ جائے اسے گمراہ قرار دے کر اس کو جہنم میں جھونکنے کی وعید سنائی ہے۔ اور بہت سی آیات کریمہ میں صحابہ کرامؓ کو رحمت و رضوان کے مژدے سنائے ہیں۔ اس لئے حضرات صحابہ کرامؓ کی سنت ہی دراصل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ کا آئینہ ہے۔ جو کام ان اکابر

نے بالاتفاق کیا ہو یا جس کام کو بالا تفاق ترک کر دیا ہو وہ قطعی ہے۔ اور اس سے انحراف کسی کے لئے جائز نہیں۔ اور جو کام بعض صحابہؓ نے کیا اور کسی نے اس پر نکیر نہ کی وہ بھی بلاشبہ حق و صواب ہے۔ اور اس میں کسی شک و ارتیاب کی گنجائش نہیں،

الغرض کسی چیز پر صحابہ کرامؓ کا تعامل اس کے سنت ہونے کی دلیل ہے۔ اور چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین زمانے کے لوگوں کو خیرالقرون کے لوگ فرمایا ہے یعنی صحابہ کرامؓ، ان کے شاگرد، اور ان کے شاگردوں کے شاگرد (ان کو تابعین اور تبع تابعین کہا جاتا ہے) اس لئے ان تین زمانوں میں بغیر کسی روک ٹوک کے جس چیز پر مسلمانوں کا عمل در آمد رہا وہ سنت کے دائرے میں آتی ہے۔

(۵) "سنت" کی اس تشریح سے "بدعت" کی حقیقت خود بخود معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں معمول و مروج نہ رہی ہو اس کو دین کی بات سمجھ کر کرنا "بدعت" کہلاتا ہے مگر اس کی مزید تشریح کے لئے چند چیزوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

اول: یہ کہ جس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سے زیادہ صورتیں منقول ہوں، وہ سب سنت کہلائیں گی، ان میں سے کسی ایک کو اختیار کر کے دوسری کو "بدعت" کہنا جائز نہیں، اِلّا یہ کہ ان میں سے ایک منسوخ ہو، مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امین بالجہر بھی ثابت ہے اور آہستہ بھی ـــــ لہٰذا یہ دونوں سنت ہیں، اور ان میں سے کسی ایک کو "بدعت" کہہ کر اس کی مخالف جائز نہیں۔

دوم: ایک کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اکثری معمول تھا، مگر دوسرا کام آپؐ نے کبھی ایک آدھ مرتبہ کیا، اس صورت میں اصل "سنت" تو آپؐ کا اکثری معمول ہو گا، مگر دوسرے کام کو بھی، جو آپؐ نے بیان جواز کے لئے کیا، "بدعت" کہنا صحیح نہیں ہو گا۔ اسے "جائز" کہیں گے اگرچہ اصل سنت وہی ہے جس پر آپؐ

نے ہمیشہ عمل فرمایا

سوم: ان تین زمانوں کے بعد جو چیزیں وجود میں آئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کو خود مقصود سمجھا جاتا ہے۔ دوسری وہ جو خود مقصود بالذات نہیں. بلکہ کسی مامور شرعی کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر ان کو کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن کریم اور حدیث نبویؐ میں دین کا علم سیکھنے سکھانے اور پڑھنے پڑھانے کے بے شمار فضائل آئے ہیں اور اس کی نہایت تاکید فرمائی گئی ہے۔ اب حصول علم کے وہ ذرائع جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے زمانے کے بعد ایجاد ہوئے. ان کو اختیار کرنا بدعت نہیں کہلائے گا۔ (بشرطیکہ وہ بذات خود جائز ہوں) کیونکہ یہ ذرائع خود مقصود بالذات نہیں، بلکہ مامور شرعی کا ذریعہ محض ہیں۔

اسی طرح مثلاً قرآن کریم اور حدیث نبویؐ میں جہاد کے بہت سے فضائل آئے ہیں۔ تو جن ذرائع سے جہاد کیا جاتا ہے اور جو ہتھیار جہاد میں استعمال کئے جاتے ہیں ان کو اختیار کرنا محض اس لئے "بدعت" نہیں کہلائے گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم و صحابہ کرامؓ کے مبارک دور میں یہ آلات و ذرائع نہیں تھے کیونکہ یہ ذرائع خود مقصود بالذات نہیں نہ ان کو بذات خود دین سمجھ کر کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سفرحج بہت بڑی عبادت ہے۔ مگر سفر کے جدید ذرائع اختیار کرنا بدعت نہیں. کیونکہ ہوائی جہاز یا بحری جہاز میں بیٹھنے کو بذات خود عبادت نہیں سمجھا جاتا. بلکہ حصول عبادت کا ذریعہ تصور کیا جاتا ہے۔

الغرض جو چیزیں مامورات شرعیہ کے لئے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہیں. ان کا استعمال جائز ہے. لیکن کسی چیز کو بذات خود دین کے کام کی حیثیت سے ایجاد کرنا بدعت ہے۔

چہارم: قرآن کریم اور حدیث نبویؐ میں بہت سے مسائل شریعت کے اصول و قواعدؒ ارشاد فرمائے گئے ہیں. اور اہل استنباط کو ان اصول و قواعد کی روشنی میں ان مئے

مسائل کا حکم معلوم کرنے کی ہدایت کی گئی ہے جو بعد میں رونما ہونے والے تھے۔ پس خدا تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حکم کی تعمیل میں ائمہ ہدیٰ نے جو مسائل قرآن و سنت سے نکالے ان کو بھی بدعت نہیں کہا جائے گا۔ کیونکہ وہ سب قرآن کریم اور حدیث نبوی سے ہی ثابت کئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم، سنت نبوی، تعامل صحابہ و تابعین کے بعد ائمہ اجتہاد کے اجتہادی مسائل کو بھی دین کا ایک حصہ سمجھا جاتا ہے۔ اور "اجتہاد" بھی دلائل شرعیہ میں سے ایک غیر مستقل شرعی دلیل ہے۔

پنجم: جو بات نہ قرآن کریم سے ثابت ہو، نہ حدیث نبویؐ سے، نہ تعامل صحابہ و تابعین سے، اور نہ فقہائے امت کے اجتہاد و قیاس سے، وہ دین سے خارج ہے، اس کو نہ کسی بزرگ کے کشف و الہام سے "دین" بنایا جاسکتا ہے۔ اور نہ کسی پڑھے لکھے کی قیاس آرائی سے ــــ کیونکہ شریعت کے دلائل یہی چار ہیں جو میں نے اوپر ذکر کئے۔ ان کے علاوہ کسی چیز کو شرعی دلیل کی حیثیت سے پیش کرنا بجائے خود "بدعت" ہے، چہ جائیکہ اس سے دین کی کسی چیز کو ثابت کیا جائے۔

(٦) "بدعت" کی دو قسمیں ہیں ایک اعتقادی، دوسری عملی ــــ اعتقادی بدعت کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ ایسے عقائد و نظریات رکھے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے خلاف ہوں۔ "ظلمات بعضها فوق بعض" کے مطابق۔ آگے ان کی بہت سی قسمیں بن جاتی ہیں۔ بعض صریح کفر ہیں۔ جیسے قادیانیوں کا یہ عقیدہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی ــــ نعوذ باللہ ــــ نبوت کا دروازہ کھلا ہے۔ یا یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام وفات پاچکے ہیں۔ وغیرہ اور بعض اعتقادی بدعتیں کفر تو نہیں، مگر ان کو ضلالت و گمراہی کہا جائے گا۔

عملی بدعت یہ کہ کسی عقیدے میں تو تبدیلی نہ ہو۔ مگر بعض اعمال ایسے اختیار کئے جائیں جو سلف صالحین سے منقول نہیں۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "بدعت" کی جتنی مذمت فرمائی ہے شائد کفر و شرک کے بعد کسی اور چیز کی اتنی برائی نہیں بیان فرمائی ـــــ اس سلسلہ کی ایک دو حدیثیں میں مضمون کے شروع میں نقل کر چکا ہوں اور اگر مزید نقل کروں گا تو یہ مضمون زیادہ طویل ہو جائے گا. ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ بدعت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مردود ملعون اور ضلالت و گمراہی فرمایا ہے۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جو شخص بدعت ایجاد کرے یا اس میں مبتلا ہو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں کس قدر ذلیل آدمی ہے. ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اس کا کوئی فرض و نفل اللہ کی بارگاہ میں قبول نہیں۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ جس شخص نے کسی صاحب بدعت کی توقیر کی اس نے اسلام کو ڈھانے میں مدد دی۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ جو شخص "الجماعت" سے ایک بالشت بھی دور ہٹا اس نے اسلام کا جوا اپنی گردن سے اتار پھینکا ـــــ (مشکوٰۃ شریف ص ۳۱)

ان ارشادات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بظاہر معمولی سی بدعت سے بھی کس قدر نفرت تھی۔

رہا یہ کہ "بدعت" اس قدر مبغوض چیز کیوں ہے؟ اکابر امت نے اس پر بہت طویل کلام کیا ہے۔ میں نہایت اختصار کے ساتھ یہاں چند وجوہ کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

اول: یہ کہ دین اسلام کی تکمیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہو چکی۔ اور وہ تمام باتیں جن سے حق تعالیٰ شانہ کا قرب و رضا حاصل ہو سکتی تھی ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا. اب جو شخص دین کے نام پر کوئی بدعت گھڑ کر لوگوں کو اس کی دعوت دیتا ہے وہ گویا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین نعوذ باللہ ناقص ہے. اور قرب و رضائے خداوندی کا جو راستہ اس احمق کو معلوم ہوا ہے وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو (نعوذ باللہ) معلوم نہیں ہوا۔ یا وہ کہنا چاہتا ہے کہ شریعت کا جو فہم اور منشائے خداوندی کا جو ادراک اس مبتدع کو ہوا وہ

نہ تو آنحضرت صلی اللہ کو ہوا اور نہ صحابہؓ و تابعینؒ کو ـــــ نعوذ باللہ۔

الغرض جو کام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ نے نہیں کیا آج جو شخص اس کو عبادت اور دین بتاتا ہے وہ نہ صرف سلف صالحین پر بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین پر حملہ کرتا ہے. پس ایسے شخص کے مردود ہونے میں کیا شبہ ہے؟

دوم: بدعت کے علاوہ آدمی جو گناہ بھی کرتا ہے اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ میں ایک غلط کام کر رہا ہوں. وہ اس گناہ پر پشیمان ہوتا ہے اور اس سے توبہ کرلیتا ہے۔ مگر "بدعت" ایسا منحوس گناہ ہے کہ کرنے والا اس کو غلطی سمجھ کر نہیں بلکہ ایک "اچھائی" سمجھ کر کرتا ہے. اور شیطان اس گناہ کو اس کی نظر میں ایسا خوبصورت بنا کر پیش کرتا ہے کہ اسے اپنی غلط روی کا کبھی احساس ہی نہ ہو پائے اور وہ مرتے دم تک توبہ سے محروم رہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے گنہ گاروں اور پاپیوں کو توبہ کی توفیق ہو جاتی ہے. مگر بدعت کے مریض کو کبھی شفا نہیں ہوتی. اِلّا یہ کہ خدا تعالیٰ کی خاص رحمت اس کی دستگیری کرے اور اس کی برائی اس کے سامنے کھل جائے۔

سوم: آدمی کو بدعت کی نحوس اور تاریکی سنت کے نور سے محروم کر دیتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَا اَحْدَثَ قَوْمٌ بِدْعَةً اِلَّا رُفِعَ مِثْلُهَا مِنَ السُّنَّةِ فَتَمَسُّكٌ بِسُنَّةٍ خَيْرٌ مِنْ اِحْدَاثِ بِدْعَةٍ (رواہ احمد۔ مشکوٰۃ صہ ۳۱)

ترجمہ:۔ جب کوئی قوم کوئی سی بدعت ایجاد کرلیتی ہے تو اس کی مثل سنت اس سے اٹھالی جاتی ہے۔ اس لئے چھوٹی سے چھوٹی سنت پر عمل کرنا بظاہر اچھی سے اچھی بدعت ایجاد کرنے سے بہتر ہے۔

ایک اور روایت میں ہے:

مَا ابْتَدَعَ قَوْمٌ بِدْعَةً فِيْ دِيْنِهِمْ اِلَّا نَزَعَ اللّٰهُ مِنْ سُنَّتِهِمْ مِثْلَهَا ثُمَّ لَا يُعِيْدُهَا اِلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ (رواہ الدارمی عن حسان موقوفاً مشکوٰۃ صہ ۳۱)

ترجمہ:۔ جب کوئی قوم اپنے دین میں کوئی بدعت گھڑلیتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو بقدر سنت اس سے چھین لیتے ہیں اور پھر قیامت تک اسے ان کی طرف واپس نہیں لوٹاتے۔ (مشکوٰۃ ص ۳۱)

اور سنت سے اس محرومی کا سبب یہ ہے کہ بدعت میں مبتلا ہونے کے بعد قلب کی نورانیت و صلاحیت زائل ہوجاتی ہے۔ آدمی حق و باطل کی تمیز کھو بیٹھتا ہے. اس کی مثال اس اناڑی کی سی ہوجاتی ہے جس کو کسی نوسرباز نے روپیہ بڑھانے کا جھانسہ دیکر اس سے اصلی نوٹ چھین لئے ہوں. اور جعلی نوٹوں کی گڈی اس کے ہاتھ میں تھمادی ہو۔ وہ احمق خوش ہے کہ اسے ایک کے بدلے میں سو مل گئے مگر یہ خوشی اسی وقت تک ہے جب تک وہ انہیں لیکر بازار کا رخ نہیں کرتا۔ بازار جاتے ہی اس کو نہ صرف کاغذ کے ان بے قیمت پرزوں کی حقیقت معلوم ہوجائے گی. بلکہ جعلی کرنسی کے الزام میں اسے ہتھکڑی بھی لگادی جائے گی ـــــ خوب سمجھ لیجئے کہ آخرت کے بازار میں صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا سکہ چلے گا۔ اور جن لوگوں نے بدعتوں کی جعلی کرنسیوں کے انبار لگا رکھے ہیں وہاں ان کی قیمت ایک کوڑی بھی نہ ہوگی. بلکہ سکہ محمدؐ کے مقابلے میں جعلی کرنسی بنانے اور رکھنے کے الزام میں پابند سلاسل کردیئے جائیں گے ـــــ حدیث نبویؐ میں ارشاد ہے کہ۔

"میں حوض کوثر پر تم سے پہلے موجود ہوں گا. جو شخص میرے پاس آئے گا وہ اس کا پانی پئے گا۔ اور جو ایک بار پی لے گا پھر اسے کبھی پیاس نہیں ہوگی۔ کچھ لوگ میرے پاس وہاں آئیں گے. جن کو میں پہچانتا ہوں گا۔ اور وہ مجھے پہچانتے ہوں گے۔ مگر میرے اور ان کے درمیان رکاوٹ پیدا کردی جائے گی۔ میں کہوں گا کہ یہ تو میرے آدمی ہیں۔ مجھے جواب ملے گا کہ "آپؐ نہیں جانتے انہوں نے آپؐ کے بعد کیا کیا۔" یہ جواب سن کر میں کہوں گا.

سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِي (متفق علیہ۔ مشکوٰۃ ص ۴۸۸)

ترجمہ:۔ پھٹکار پھٹکار ان لوگوں کے لئے جنہوں نے میرے بعد میرا طریقہ بدل

ڈالا۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑ کر دین میں نئی نئی بدعتیں ایجاد کرلی ہیں وہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حوض کوثر سے محروم رہیں گے۔ اس سے بڑی محرومی کیا ہوسکتی ہے؟ یہی سبب ہے کہ اکابر امت کو "بدعت" سے سخت تنفر تھا۔ امام غزالیؒ امور عادیہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور اتباع سنت کی تاکید کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ امور عادیہ میں اتباع سنت کی ترغیب کیلئے بیان کیا تھا۔ اور جن اعمال کو عبادت سے تعلق ہے اور ان کا اجرو ثواب بیان کیا گیا ہے ان میں بلاعذر اتباع سنت چھوڑ دینے کی تو سوائے کفر خفی یا حماقت جلی کے اور کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آتی"

(تبلیغ دین ترجمہ اربعین ص ۴۲)

اور امام ربانی مجدد الف ثانیؒ لکھتے ہیں:

از حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ بتضرع و زاری و التجاء و افتقار و ذل و انکسار در سر و جہار مسائت می نماید کہ ہرچہ در دین محدث شدہ است و مبتدع گشتہ کہ در زمان خیر البشر و خلفائے راشدین اور بنودہ ـــــ علیہ و علیہم الصلوات والتسلیمات ـــــ اگرچہ آں چیز در روشنی حکم فلق صبح بود ایں ضعیف را باجمعے کہ باد مستند اند گرفتار آں عمل محدث نگر داند. و مفتون حسن آں مبتدع نکناد۔ بحرمتہ

بندہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ سے تضرع اور زاری، التجاء و افتقار اور ذلت و انکسار کے ساتھ، خفیہ اور علانیہ درخواست کرتا ہے کہ دین میں جو بات بھی نئی پیدا کی گئی ہے، اور جو بدعت بھی گھڑلی گئی ہے جو کہ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں نہیں تھی اگرچہ وہ چیز روشنی میں سفیدہ صبح کی طرح ہو اللہ تعالیٰ اس بندہ ضعیف اور اس کے متعلقین کو اس نئے

سید المختار و آلہ الابرار علیہ و علیہم الصلوٰۃ والسلام"۔
(دفتر اول مکتوب ۱۸۶)

ایجاد شدہ کام میں گرفتار نہ فرمائے۔ اور اس کے حسن پر فریفتہ نہ کرے۔ بطفیل سید مختار اور آل ابرار کے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

یہ ناکارہ حضرت مجددؒ کی یہ دعاء اپنے لئے، آپ کے لئے اور تمام مسلمانوں کے لئے دہراتا ہے۔

چہارم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا ارشاد گرامی سُحْقًا سُحْقًا لِمَنْ غَيَّرَ بَعْدِيْ۔ (پھٹکار پھٹکار ان لوگوں پر جنہوں نے میرے بعد میرا طریقہ بدل دیا) سے "بدعت" کے مذموم ہونے کی ایک اور وجہ بھی معلوم ہوگئی۔ اور وہ یہ کہ "بدعت" سے دین میں تحریف و تغیر لازم آتا ہے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے یہ دین قیامت تک کے لئے نازل کیا ہے، اور قیامت تک آنے والی ساری انسانیت کو اس کا مکلف کیا ہے۔ یہ تکلیف اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب کہ یہ دین اپنی اصلی شکل میں محفوظ بھی ہو۔ اور جس طرح پہلے دین لوگوں کو آراء و خواہشات کی نذر ہو کر مسخ ہوگئے، اور ان کا خلیہ ہی بگڑ گیا اس دین کو یہ حادثہ پیش نہ آئے۔

پس جو لوگ بدعات ایجاد کرتے ہیں وہ دراصل دین اسلام کے چہرے کو مسخ کرتے ہیں اور اس میں تحریف اور تغیر و تبدل کا راستہ کھولتے ہیں، مگر چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس دین کی حفاظت کا خود وعدہ فرمایا ہے اس لئے اس نے اپنی رحمت سے اس بات کا خود ہی انتظام فرما دیا ہے کہ یہ دین ہر دور میں انسانی خواہشات کی آمیزش اور بدعات کی ملاوٹ سے پاک رہے اور اہل بدعت جب بھی اس کے حسین چہرے پر بدعات کا گرد و غبار ڈالنے کی کوشش کریں، علمائے ربانیین کی ایک جماعت فوراً اسے جھاڑ پونچھ کر صاف کردے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهُ، يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ (مشکوٰۃ ص۳۶)

ترجمہ:۔ ہر آئندہ نسل میں اس علم کے حامل ایسے عادل لوگ ہوتے رہیں گے جو اس سے غلو کرنے والوں کی تحریف. باطل پرستوں کے غلط دعوؤں اور جاہلوں کی تاویلوں کو صاف کرتے رہیں گے۔ (مشکوٰۃ ص۳۶)

اس لئے الحمد للہ اس کا تو اطمینان ہے کہ اہل باطل اس دین کے حسین چہرے کو مسخ کرنے میں کامیاب نہیں ہوں گے۔ کیونکہ حق تعالیٰ شانہ نے اس کا خود کار نظام پیدا فرمادیا ہے۔ البتہ اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ نئی نئی گھڑتیں اور بدعتیں ایجاد کر کے نہ صرف اپنی شقاوت میں اضافہ کرتے ہیں. بلکہ بہت سے جاہلوں کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔

(۸) شائد آپ دریافت کریں گے کہ یہ لوگ دین میں نئی نئی جدتیں کیوں نکالتے ہیں؟ اور ان کو خدا کا خوف اس سے کیوں مانع نہیں ہوتا؟ اس کو سمجھنے کے لئے مناسب ہوگا کہ ایجاد بدعت کے اسباب و محرکات کا مختصر سا جائزہ لیا جائے۔

اول: ایجاد بدعت کا پہلا سبب جہل ہے. شرح اس کی یہ ہے کہ بدعت میں ایک ظاہری اور نمائشی حسن ہوتا ہے. اور آدمی اس کی ظاہری شکل و صورت کو دیکھ کر اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اور نفس یہ تاویل سمجھا دیتا ہے کہ یہ تو بڑی اچھی چیز ہے. شریعت میں اس کی ممانعت کیسے ہو سکتی ہے؟ بس اس کے ظاہری حسن اور اپنی پسند کو معیار بنا کر آدمی اس پر ریجھ جاتا ہے اور اس کے باطن میں جو قباحتیں اور خرابیاں ہیں ان پر اس کی نظر نہیں جاتی ــــ اس کی مثال بالکل ایسے سمجھئے کہ کسی بدصورت مبروص کو اچھا لباس پہنا دیا جائے تو جو لوگ اس کی اندرونی کیفیت سے ناواقف ہیں اس کی خوش نما لباس کو دیکھ کر اسے جنت کی حور تصور کریں گے اور دور ہی سے اس کی خوبصورتی کے نادیدہ عاشق ہو جائیں گے عوام کی نظریں چونکہ ظاہری سطح تک محدود ہوتی ہیں. اس لئے وہ سنت نبوی ؐ کے اتنے عاشق نہیں ہوتے جس قدر کہ بدعات و خرافات پر فریفتہ

ہوتے ہیں ــــــ اور جو لوگ عوام کی اس نفسیاتی کمزوری سے آگاہ ہیں انہیں بدعات کی ایجاد کے لئے تیار شدہ فصل مل جاتی ہے۔

دوم: دوسرا سبب شیطان کی تسویل و تزویر ہے۔ آپ کو علم ہے کہ شیطان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دین، آپؐ کی سنت اور آپؐ کے مبارک طریقوں سے سب سے زیادہ دشمنی ہے وہ جانتا ہے کہ اولاد آدمؑ کے جنت میں جانے کا بس یہی ایک راستہ ہے۔ وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ بڑی محنت و جانفشانی سے وہ لوگوں کہ بہکا بہکا کر ان سے گناہ کرواتا ہے مگر گناہ کا کانٹا ان کے دل سے کسی طرح نہیں نکل پاتا اور وہ ایک بار اللہ کے دربار میں حاضر ہو کر سچی توبہ کر لیتے ہیں تو اس کے سارے کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ شیطان جب راندہ درگاہ ہوا تو اس لعین نے قسم کھا کر کہا کہ یااللہ! آپ نے آدم (علیہ السلام) کی وجہ سے مجھے مردود بنادیا ہے، میں بھی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک دم میں دم ہے اس کی اولاد کو گمراہ کروں گا۔ حق تعالیٰ شانہ نے اس کے جواب میں فرمایا، میں بھی اپنی عزت اور بلندی مرتبت کی قسم کھاتا ہوں کہ انہوں نے خواہ کتنے ہی بڑے بڑے گناہ کئے ہوں جب تک میری بارگاہ میں آکر معافی مانگتے رہیں گے کہ یااللہ! ہم سے حماقت ہوئی، معاف کردیجئے میں ان کو معاف کرتا رہوں گا۔ (مشکوٰۃ ص ۲۰۴)

الغرض توبہ و استغفار نے شیطان کی کمر توڑ رکھی تھی۔ اور اسے بڑے بڑے پاپ کرانے کے بعد بھی انسانوں کے بارے میں یہ خطرہ رہتا تھا کہ

تردامنی پہ اپنی اے زاہد نہ جائیو!
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

اس لئے شیطان نے انسانیت کو گمراہ کرنے کے لئے "بدعات" کا بے خوف و خطر راستہ ایجاد کیا، جن سے انہیں کبھی توبہ کی توفیق نہ ہو۔

شیطان معلم ملکوت رہ چکا ہے اور وہ ہر جائز کو ناجائز، اور ہر ناروا کو روا ثابت کرنے

کی اتنی تاویلیں جانتا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کی ذریت بھی اس کو استاذ مان جائے۔ اور پھر وہ ہر شخص کی نفسیات کا ماہر ہے۔ وہ ہر طبقہ، ہر گروہ اور ہر فرد کو الگ انداز میں گمراہ کرتا ہے جیسا کہ آج کے دور میں آپ دیکھتے ہیں کہ پروپیگنڈے کے زور سے کس طرح سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ کر دیا جاتا ہے، ظالم کو مظلوم اور مظلوم کو ظالم بنادیا جاتا ہے حق کو باطل اور باطل کو حق دکھایا جاتا ہے، یہ شیطان کے کرتب کا ادنیٰ نمونہ ہے مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوا کرتی ہے کہ دین کی وہ باتیں جن کا ثبوت آفتاب نصف النہار سے زیادہ روشن ہے لوگ بڑی ڈھٹائی سے ان کا انکار کر دیتے ہیں اور ان کے بارے میں شکوک و شبہات کا دفتر کھول دیتے ہیں، لیکن ایسی باتیں جن کا خلاف دین اور خلاف عقل ہونا ایسی بدیہی بات ہے کہ ایک بچہ بھی اسے سمجھ سکتا ہے اس کو قرآن و حدیث کھول کھول کر لوگ دین ثابت کرتے ہیں اب اس کو شیطان کی تسویل کے سوا اور کس چیز کا نام دیا جائے؟ قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا: "زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ"۔ کہ شیطان نے ان کے اعمال کو ان کے سامنے آراستہ کر دیا ہے۔

الغرض دین حق کے بارے میں لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا اور نئی نئی نظریاتی اور عملی بدعتوں کو ان کی نظر میں مزین کر دینا یہ شیطان کا وہ کاری حربہ ہے جس سے وہ اللہ کی مخلوق کو بلاخوف و خطر گمراہ کر سکتا ہے۔ یہ نکتہ ایک ضخیم کتاب کا موضوع ہے۔ اور امام غزالیؒ، امام ابن جوزیؒ اور امام شعرانیؒ جیسے اکابر نے اس پر مستقل رسائل اور کتابیں لکھی ہیں۔

سوم: بدعات کی ایجاد کا تیسرا سبب حب جاہ اور شہرت پسندی کا مرض ہے، یہ ایک نفسیاتی چیز ہے کہ لوگ جدت پسندی میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اور ہر نئی چیز کو (بشرطیکہ اس پر کوئی خوش نما غلاف چڑھا دیا جائے) دوڑ کر اچکتے ہیں۔ اس لئے شہرت پسندی کے مریض دین کے معاملہ میں بھی نئی نئی جدتیں تراشتے رہتے ہیں۔ حدیث میں ارشاد ہے کہ آخری زمانے میں بہت سے جھوٹے دجال (فریبی) ہوں گے۔ وہ تمہیں ایسی باتیں سنائیں گے جو نہ کبھی تم نے سنی ہوں گی۔ نہ تمہارے باپ دادا نے۔ ان سے

بچتے رہو. وہ تمہیں گمراہ نہ کر دیں. اور فتنے میں نہ ڈال دیں۔ (مشکوٰۃ ص ۲۸)

چہارم: بدعات کی اختراع و ایجاد کا ایک اہم سبب غیر اقوام کی تقلید ہے. تمدن و معاشرت کا یہ ایک فطری اصول ہے کہ جب مختلف تہذیبوں کا امتزاج ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر ایک دوسری کو متاثر کرتی ہیں. جو قوم اپنے تہذیبی خصائص کے تحفظ کا اہتمام نہیں کرتی وہ اپنے بہت سے امتیازی اوصاف کھو بیٹھتی ہے ـــــ خصوصیت کے ساتھ جو تہذیب مفتوح و مغلوب ہو وہ غالب تہذیب کے سامنے سپر ڈال دیتی ہے۔ مسلمان جب تک غالب و فاتح تھے. اور ان میں اپنے تہذیبی خصائص کے تحفظ کی تب و تاب تھی اس وقت تک وہ دوسری تہذیبوں پر اثر انداز ہوتے رہے لیکن جب ان کی ایمانی حرارت ٹھنڈی ہوگئی. دلوں کی انگیٹھیاں سرد پڑ گئیں۔ اور ان میں من حیث القوم اپنے خصائص کے تحفظ کا ولولہ نہ رہا تو وہ خود دوسری تہذیبوں سے متاثر ہونے لگے۔ دور جدید میں مسلمانوں کا انگریزی تہذیب سے متاثر ہونا اس کی کافی شہادت ہے ـــــ اس اجنبی اثر پذیری کا نتیجہ بسا اوقات یہ بھی ہوا کہ غیر اقوام کے رسوم و رواج کو دینی حیثیت دیدی گئی. اور اس کے جواز و استحسان کے ثبوت پیش کئے جانے لگے۔ یہی راز ہے کہ ہر علاقے کے مسلمانوں میں الگ الگ بدعات رائج ہیں. ہندوستان میں جو بدعات رائج ہیں وہ عرب علاقوں میں نہیں۔ اور مصر و شام کی بہت سی بدعات ہندوستان میں رائج نہیں ہوسکیں۔

ہندوستان میں اسلام بڑی کثرت سے پھیلا مگر افسوس ہے کہ ان نو مسلموں کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام نہ ہوسکا. اس لئے وہ لوگ جو ہندو مذہب چھوڑ کر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے اپنے سابقہ رسم و رواج سے آزادہ نہ ہوسکے. بلکہ ہندو معاشرہ سے شدید اختلاط کی بناء پر ان مسلمانوں میں بھی بہت سی یہ چیزیں در آئیں جو باہر سے آئے تھے ـــــ چنانچہ شادی اور مرگ کے موقعہ پر ہندوستان کے مسلمانوں میں جو خلاف شرع رسمیں رائج ہیں. اور جن کو مردوں سے زیادہ عورتیں جانتی ہیں وہ سب ہندو مذہب کے جراثیم ہیں۔ جیسا کہ ایک نو مسلم عالم مولانا عبید اللہ نے ”تحفۃ

الہند" میں تحریر فرمایا ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں کہ خدانخواستہ ہندوستانی مسلمان کی ساری چیزیں ہندوانہ ہیں اور نہ یہ مطلب ہے کہ سارے مسلمان ان میں مبتلا ہیں. بلکہ میری مراد ان رسوم و عادات سے ہے جن کا ثبوت ہماری اسلامی شریعت میں نہیں۔ بلکہ ہندو معاشرے میں ملتا ہے۔ بہت سے ایسے علاقے جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی مسلمان وہاں بہت ہی قلیل تعداد میں تھے اور ان کو اسلامی تعلیم و تربیت کا موقعہ میسر نہیں آتا تھا ان کے نام تک ہندوانہ تھے. وہ سر میں چوٹی تک رکھتے تھے۔ ظاہر ہے جن لوگوں کی یہ حالت ہو وہ بے چارے ہندوانہ بدعات میں مبتلا نہ ہوتے تو اور کر بھی کیا سکتے تھے ____ اس سے دوسرے ممالک کے مغلوب مسلمانوں کی حالت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے. اور پھر چونکہ یہ رسوم و عادات گویا ان کی فطرت ثانیہ بن گئی ہیں اس لئے وہ اسلامی تعلیم کو ایک نئی چیز سمجھتے ہیں. بہت سی عورتوں اور ناواقف مردوں کو جب اسلامی مسائل سے مطلع کیا جائے تو انہیں یہ کہتے سنا گیا ہے "نئے نئے مولوی. نئے نئے مسئلے" ۔ گویا وہ رسم و رواج جو ہندو معاشرے سے وراثت میں ملا ہے وہ تو ایک مستقل دین کی حیثیت رکھتا ہے. اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات. جن سے وہ ہمیشہ غافل اور ناواقف رہے ہیں ان کے نزدیک ایک نیا دین ہے۔

یہ تھے وہ چند اسباب جو اسلامی معاشرے میں بدعات کے فروغ کا سبب بنے. اور مجھے افسوس ہے کہ اس میں قصور عوام سے زیادہ ان اہل علم کا ہے۔ جنہوں نے اسلام کی پاسبانی کا فریضہ انجام دینے اور دین قیم کو بدعات کی آلائش سے پاک رکھنے کے بجائے سیلاب بدعات میں بہ جانے کو کمال سمجھ لیا۔

(۹) اب میں چند اصول عرض کرتا ہوں جن سے سنت و بدعت کے امتیاز میں مدد مل سکے گی ____ اس کا اصل الاصول تو اوپر عرض کرچکا ہوں کہ جو چیز سلف صالحین کے زمانہ میں نہیں تھی اسے دین سمجھ کر اختیار کرنا "بدعت" کہلاتا ہے. تاہم اس اصول کو چند ذیلی اصولوں کے تحت ضبط کیا جاسکتا ہے۔

اول: شریعت نے ایک چیز ایک موقعہ پر تجویز کی ہے۔ جب ہم محض اپنی رائے اور

خواہش سے اس کو دوسرے موقعہ پر تجویز کریں گے تو وہ بدعت بن جائے گی مثلاً درود شریف نماز کے آخری التحیات میں پڑھا جاتا ہے۔ اگر ہم اجتہاد لڑائیں کہ درود شریف کوئی بری چیز تو نہیں اگر اس کو پہلی "التحیات" میں پڑھ لیا جائے۔ تو کیا حرج ہے؟ تو ہمارا یہ اجتہاد غلط ہو گا۔ اور پہلی التحیات میں درود شریف پڑھنا بدعت کہلائے گا. فقہاء امت نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی شخص بھولے سے پہلی التحیات میں درود شریف شروع کر لے تو اگر صرف "اللہم صل علیٰ" تک پڑھا تھا تو سجدہ سہوہ واجب نہیں ہو گا. کیونکہ یہ فقرہ مکمل نہیں ہوا لیکن اگر "علیٰ محمد" تک پڑھ لیا ہے تو سجدہ سہوہ واجب ہو جائے گا۔ اگر سجدہ سہو نہیں کیا تو نماز دوبارہ لوٹانی ہوگی۔

یا مثلاً کوئی شخص یہ اجتہاد کرے کہ "الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ" روضہ اقدس پر پڑھا جاتا ہے۔ اگر کوئی اپنے وطن میں بیٹھا ہی پڑھتا رہے تو کیا حرج ہے؟ اس کا یہ اجتہاد بھی "بدعت" کہلائے گا۔ اس لئے کہ فقہائے امت نے ان الفاظ کے ساتھ سلام بھیجنے کا ایک خاص موقعہ مقرر کر دیا ہے. اگر اس موقعہ کے علاوہ بھی یہ صحیح ہوتا تو شریعت اس کی اجازت دیتی اور سلف صالحین اس پر عمل کرتے۔

اسی کی ایک مثال یہ ہے کہ حضرت سالم بن عبید صحابیؓ کی مجلس میں ایک صاحب کو چھینک آئی تو اس نے کہا "السلام علیکم" آپ نے فرمایا "تجھ پر بھی اور تیری ماں پر بھی" وہ صاحب اس سے ذرا بگڑے. تو آپ نے فرمایا کہ میں نے تو وہی بات کہی ہے جو ایسے موقعہ پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تھے۔ آپؐ کی مجلس میں کسی کو چھینک آتی اور وہ ــــ "السلام علیکم" کہتا تو آپ فرماتے "تجھ پر بھی اور تیری ماں پر بھی" ــــ اور پھر ارشاد فرماتے کہ جب کسی کو چھینک آئے اسے "الحمد للہ" کہنا چاہئے۔ سننے والوں کو "یرحمک اللہ" کہنا چاہئے۔ اور اسے جواب میں پھر "یغفر اللہ لی ولکم" کہنا چاہئے۔ (مشکوٰۃ شریف ص ۴۰۶)

مطلب یہ کہ "السلام علیکم" کا جو موقعہ شریعت نے تجویز کیا ہے۔ اس سے ہٹ کر دوسرے موقعہ پر سلام کہنا "بدعت" ہے۔

اسی کی ایک مثال قبر پر اذان کہنا ہے. سب جانتے ہیں کہ شریعت نے نماز پنج گانہ اور جمعہ کے سوا عیدین. کسوف و خسوف. استسقاء اور جنازہ کی نمازوں کے لئے بھی اذان و اقامت تجویز نہیں کی۔ اب اگر کوئی شخص اجتہاد کرے کہ جیسے پانچ نمازوں کے اعلان و اطلاع کے لئے اذان کی ضرورت ہے وہی ضرورت یہاں بھی موجود ہے لہٰذا ان نمازوں میں اذان کہنی چاہئے۔ تو اس کا یہ اجتہاد صریح غلط ہو گا۔ اس لئے کہ جو مصلحت اس کی عقل شریف میں آئی ہے اگر وہ لائق اعتبار ہوتی تو شریعت ان موقعوں پر بھی ضرور اذان کا حکم دیتی۔

یا مثلاً کوئی شخص یہ اجتہاد کرے کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اذان سنتے ہی شیطان بھاگ جاتا ہے۔ چونکہ مردے کے پاس سے شیطان کو بھگانا ضروری ہے اس لئے دفن کے بعد قبر پر بھی اذان کہی جائے۔ تو یہ اجتہاد بھی بالکل انکل پچو سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اول تو شیطان کا اغواء مرنے سے پہلے تک تھا۔ جو مر گیا شیطان کو اس سے کیا کام؟ دوسرے. اگر یہ مصلحت صحیح ہوتی ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کی سمجھ میں بھی آ سکتی تھی. مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین سے قبر پر اذان کہنا ثابت نہیں. اسی بناء پر فقہاء اہلسنت نے اس کو "بدعت" کہا ہے۔ علامہ شامیؒ "باب الاذان" میں لکھتے ہیں کہ خیر رملی نے "بحر الرائق کے حاشیے میں لکھا کہ بعض شافعیہ نے اذان مولود پر قیاس کر کے دفن میت کے وقت اذان کہنے کو مندوب کہا ہے مگر ابن حجر نے شرح عباب میں اس قیاس کو رد کیا ہے۔ (رد المحتار ص ۳۸۵ ج ۱ طبع جدید)

اور دفن میت کے بیان میں فرماتے ہیں کہ مصنف نے دفن میت کا صرف مسنون طریقہ ذکر کرنے پر اکتفاء کیا ہے۔ اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میت کی قبر میں اتارنے کے موقعہ پر اذان کہنا مسنون نہیں۔ جس کی آج کل عادت ہو گئی ہے۔ اور ابن حجر

نے اپنے فتاویٰ میں تصریح کی ہے کہ یہ "بدعت" ہے۔ (ص ۲۳۵ ج ۲)

اس کی ایک مثال نمازوں کے بعد مصافحہ کا رواج ہے۔ شریعت نے باہر سے آنے والے کے لئے سلام اور مصافحہ مسنون ٹھہرایا ہے۔ مگر مجلس میں بیٹھے بیٹھے لوگ اچانک ایک دوسرے سے مصافحہ و معانقہ کرنے لگیں سلف صالحین میں اس لغو حرکت کا رواج نہیں تھا۔ بعد میں نہ جانے کس مصلحت کی بناء پر بعض لوگوں میں فجر، عصر، عیدین اور دوسری نمازوں کے بعد مصافحہ کا رواج چل نکلا. جس پر علمائے اہل سنت کو اس کے "بدعت" ہونے کا فتویٰ دینا پڑا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی شرح مشکوٰۃ باب المصافحہ میں لکھتے ہیں:

آنکہ بعضے مردم مصافحہ مے کنند بعد از نماز یا بعد از جمعہ چیزے نیست، بدعت است از جہت تخصیص وقت"

یہ جو لوگ عام نمازوں کے بعد، یا نماز جمعہ کے بعد مصافحہ کرتے ہیں۔ یہ کوئی سنت نہیں، بدعت ہے (اشعۃ اللمعات ص ۲۲ ج ۴)

علامہ علی قاری شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:

وَلِهٰذَا صَرَّحَ بَعْضُ عُلَمَائِنَا بِأَنَّهَا مَكْرُوْهَةٌ، وَحِيْنَئِذٍ إِنَّهَا مِنَ الْبِدَعِ الْمَذْمُوْمَةِ (حاشیہ مشکوٰۃ ص ۴۰۱)

ترجمہ: اسی بناء پر ہمارے بعض علماء نے صراحت کی کہ یہ مکروہ ہے. اس صورت میں یہ مذموم بدعتوں میں سے ہے۔

علامہ ابن عابدین شامی لکھتے ہیں:

وَقَدْ صَرَّحَ بَعْضُ عُلَمَائِنَا وَغَيْرُهُمْ بِكَرَاهَةِ الْمُصَافَحَةِ الْمُعْتَادَةِ عَقِيْبَ الصَّلٰوتِ، مَعَ اَنَّ الْمُصَافَحَةَ سُنَّةٌ وَمَا ذَاكَ إِلَّا لِكَوْنِهَا لَمْ تُؤْثَرْ فِيْ خُصُوْصِ هٰذَا الْمَوْضِعِ (ردالمحتار ص ۲۳۵ ج ۵)

ترجمہ: اور ہمارے بعض علماء (احناف) اور دیگر حضرات نے صراحت کی ہے کہ نمازوں کے بعد جو مصافحہ کرنے کی عادت ہو گئی ہے یہ مکروہ ہے باوجودیکہ اصل مصافحہ سنت ہے اس کے مکروہ و بدعت ہونے کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اس خاص موقعہ پر مصافحہ سلف صالحین سے منقول

نہیں۔

یہ میں نے اس قاعدے کی چند مثالیں ذکر کی ہیں ورنہ اس کی بیسیوں مثالیں میرے سامنے موجود ہیں. خلاصہ یہ کہ شریعت نے جس چیز کا جو موقعہ تجویز کیا ہے اس کے بجائے دوسری جگہ اس کام کو کرنا "بدعت" ہوگا۔

دوم: شریعت نے جو چیز مطلق رکھی ہے اس میں اپنی طرف سے قیود لگا لینا بدعت ہے۔

مثلاً شریعت نے زیارت قبور کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔ اب کسی بزرگ کی قبر پر جانے کے لئے ایک وقت مقرر کرلینا اور اسی کو ضروری سمجھنا بدعت ہوگا۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی" سے سوال کیا گیا کہ زیارت قبور کے لئے دن معین کرنا. یا ان کے عرس پر جانا. جو کہ ایک معین دن ہوتا ہے درست ہے یا نہیں؟ جواب میں حضرت شاہ صاحب" لکھتے ہیں.

برائے زیارت قبور روز معین نمودن بدعت است. اصل زیارت جائز..... وتعین وقت در سلف نبود. و ایں بدعت ازاں قبیل است کی اصلش جائز است و خصوصیت وقت بدعت..... مانند مصافحہ بعد عصر کہ در ملک توران وغیرہ رائج است ـــــ درروز عرس برائے یاد و یابندن وقت دعا برائے میت اگر باشد مضائقہ ندارد لیکن التزام آں نیز بدعت است از ہماں قبیل کو گذشت

(فتاویٰ عزیزی ص ۸۹ ج ۱)

قبروں پر جانے کے لئے دن معین کر لینا بدعت ہے۔ اور اصل زیارت جائز ہے ـــــ وقت کا تعین سلف صالحین میں نہیں تھا اور یہ بدعت اس طرح کی ہے کہ اس کی اصل تو جائز ہے مگر خصوصیت وقت بدعت ہے۔ اس کی مثال عصر کی نماز کے بعد مصافحہ ہے جس کا ملک توران وغیرہ میں رواج ہے ..... اور اگر میت کے لئے دعا کی یاددہانی کی خاطر عرس کا دن ہو تو مضائقہ نہیں لیکن اس کو لازم کرلینا بھی بدعت ہے. اسی قبیل سے جو کہ ابھی گزرا۔

اور آج کل بزرگوں کے عرس پر جو خرافات ہوتی ہیں. اور جس طرح میلے لگتے ہیں

اس کو تو کوئی عقلمند بھی صحیح اور جائز نہیں کہہ سکتا۔

اسی طرح شریعت نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، بزرگان دین اور عام مسلمانوں کے ایصال ثواب کے لئے کوئی وقت مقرر نہیں کیا۔ آدمی جب چاہے ایصال ثواب کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس کے لئے خاص خاص اوقات اور خاص خاص صورتیں تجویز کرلینا اور انہی کی پابندی کو ضروری سمجھنا بدعت ہوگا۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے سوال کیا گیا کہ ربیع الاول میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پر فتوح کے ایصال ثواب کے لئے اور محرم میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور دیگر اہل بیت کے ایصال ثواب کے لئے کھانا پکانا صحیح ہے یا نہیں؟ اس کے جواب میں حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

برائے ایں کار وقت وروز تعین نمودن ومقرر کردن بدعت است، آرے اگر وقتے بعمل آرند کہ در آں ثواب زیادہ شود مثل ماہ رمضان کہ عمل بندہ مومن بہ ہفتاد ودرجہ ثواب زیادہ دارد مضائقہ نیست، زیرا کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم بر آں ترغیب فرمودہ اند بقول حضرت امیر المؤمنین علی مرتضیٰؓ دہر چیز کہ بر آں ترغیب صاحب شرع وعین وقت نباشد آں فعل عبث است ومخالف سنت خیرالانام ــــــ ومخالف سنت حرام است، ہرگز روا نباشد، واگر دلش خواہد مخلی خیرات کنند دربر روز یکہ باشد، تانمود نشود۔

فتاویٰ عزیزی ص ۹۳)

اس کام کے لئے، دن وقت اور مہینہ مقرر کرلینا بدعت ہے۔ ہاں! اگر ایسے وقت عمل کیا جائے جس میں ثواب زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً ماہ رمضان کہ اس میں بندہ مومن کا عمل ستر گنا بڑھ جاتا ہے۔ تو مضائقہ نہیں کیونکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترغیب فرمائی ہے۔ بقول امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ جو چیز کہ صاحب شریعت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس کی ترغیب نہیں دی اور اس کا وقت مقرر نہیں فرمایا وہ فعل عبث ہے، اور خیر الانام صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مخالف رہے ــــــ اور جو چیز مخالف سنت ہو وہ حرام ہے، ہرگز روا نہ ہوگی اور اگر کسی کا جی چاہتا

ہے تو خفیہ طور پر خیرات کر دے، جس دن بھی چاہے۔ تاکہ نمود و نمائش نہ ہو۔

اسی قاعدے کی بناء پر علماء اہل سنت نے تیجا، ساتواں نواں، چالیسواں کرنے کی رسم کو بدعت کہا ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ شرح سفر السعادت میں لکھتے ہیں:

عادت نبوی نہ بود کہ برائے میت در غیر وقت نماز جمع شوند، وقرآن خوانند وختمات خوانند، نہ بر سر گور ونہ غیر آں۔ وایں مجموعہ بدعت است ومکروہ۔ نعم تعزیت اہل میت و تسلیہ وصبر فرمودن سنت ومستحب است، اما ایں اجتماع مخصوص روز سوم و ارتکاب تکلفات دیگر و صرف اموال بے وصیت از حق یتامیٰ بدعت است و حرام (ص ۲۷۳)

عادت نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تھی کہ میت کے لئے وقت نماز کے علاوہ جمع ہوں۔ اور قرآن خوانی کریں۔ اور ختم پڑھیں، نہ قبر پر اور نہ کسی دوسری جگہ —— یہ ساری چیزیں بدعت اور مکروہ ہیں ہاں اہل میت کی تعزیت کرنا، ان کو تسلی دلانا اور صبر کی تلقین کرنا سنت ومستحب ہے لیکن یہ تیسرے دن کا خاص اجتماع اور دوسرے تکلفات۔ اور مردہ کا مال جو یتیموں کا حق بن چکا ہے۔ بغیر وصیت کے خرچ کرنا بدعت اور حرام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں جو "رسم قل" کی جاتی ہے۔ برادری کے لوگ جمع ہوتے ہیں، ختم پڑھا جاتا ہے۔ اور دیگر رسمیں ادا کی جاتی ہے۔ یہ رسمیں خلاف شریعت اور بدعت ہیں۔ اپنی اپنی جگہ ذکر و تسبیح، تلاوت، درود شریف اور صدقہ خیرات کے ذریعہ میت کو ایصال ثواب جتنا چاہے کرے، اور میت کو ثواب بخشے، یہ بلاشبہ صحیح اور درست ہے، لیکن میت کے گھر جمع ہونا، اور اس کے مال سے کھانا تیار کرا کر خود بھی کھانا اور دوسروں کو بھی کھلانا شریعت کے خلاف ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ اپنے وصیت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں:

بعد مردن من رسوم دنیوی مثل دہم و بستم ششماہی و برسینی ہیچ نکنند کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ از سہ روز ماتم کردن جائز نداشتہ اند و حرام ساختہ اند۔ (مالا بدمنہ ص ۱۶۰)

میرے مرنے کے بعد دنیوی رسمیں، جیسے دسواں، بیسواں، ششماہی اور برسی، کچھ نہ کریں، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن سے زیادہ سوگ کرنے کو جائز نہیں رکھا، بلکہ حرام قرار دیا ہے۔

علامہ شامیؒ فتح القدیر کے حوالے سے لکھتے ہیں:

وَيُكْرَهُ الضِّيَافَةُ مِنَ الطَّعَامِ مِنْ اَهْلِ الْمَيِّتِ، لِاَنَّهٗ شُرِعَ فِي السُّرُوْرِ لَا فِي الشُّرُوْرِ وَهِيَ بِدْعَةٌ مُسْتَقْبَحَةٌ رَوَى الْاِمَامُ اَحْمَدُ وَابْنُ مَاجَةَ بِاِسْنَادٍ صَحِيْحٍ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ كُنَّا نَعُدُّ الْاِجْتِمَاعَ اِلَى اَهْلِ الْمَيِّتِ وَصُنْعَهُمُ الطَّعَامَ مِنَ النِّيَاحَةِ (ردالمحتار صہ ۲۴۰ ج ۲).

ترجمہ:۔ اہل میت کی طرف سے کھانے کی دعوت مکروہ ہے، اس لئے یہ تو خوشی کے موقعہ پر مشروع ہے نہ کہ غمی کے موقعہ پر ـــــ امام احمد اور ابن ماجہ حضرت جریر بن عبداللہ صحابیؓ سے بسند صحیح روایت کرتے ہیں کہ ہم میت کے گھر جمع ہونے اور ان کے کھانا تیار کرنے کو نوحہ میں شمار کرتے تھے۔ ردالمحتار ص ۲۴۰ ج ۲)

نیز علامہ شامی فتاویٰ بزازیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"مکروہ ہے کھانا تیار کرنا پہلے دن، تیسرے دن اور ہفتہ کے بعد، اور تہوار کے موقعہ پر قبر کی طرف کھانا لے جانا۔ اور قرات قرآن کے لئے دعوت کا اہتمام کرنا، اور ختم کے لئے یا سورہ انعام یا سورہ اخلاص کی قرات کے لئے بزرگوں اور قاریوں کو جمع کرنا حاصل یہ کہ قرآت

قرآن کے وقت کھانا کھلانا مکروہ ہے"۔

آگے چل کر شامی" لکھتے ہیں:

"ہمارے اور شافعیہ کے مذہب میں یہ افعال مکروہ (تحریمی) ہیں خصوصاً جب کے وارثوں میں نابالغ یا غیر حاضر لوگ بھی ہوں۔ قطع نظر ان بہت سے منکرات کے، جو اس موقعہ پر کئے جاتے ہیں۔ مثلاً بہت سی شمعیں اور قندیلیں جلانا، ڈھول بجانا، خوش الحانی کے ساتھ گیت گانا۔ عورتوں اور بے ریش لڑکوں کا جمع ہونا۔ ختم اور قرات قرآن کی اجرت لینا، وغیرہ ذلک، جن کا ان زمانوں میں مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اور ایسی چیز کے حرام اور باطل ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں" (حوالہ مذکورہ)

سوم: شریعت نے جو عبادت جس خاص کیفیت میں مشروع کی ہے اس کو اسی طرح ادا کرنا لازم ہے۔ اور اس کی کیفیت میں تبدیلی کرنا حرام اور بدعت ہے۔

مثلاً دن کی نمازوں میں شریعت نے قرات آہستہ تجویز کی ہے۔ اور رات کی نمازوں میں نیز جمعہ اور عیدین میں جہری قرات مقرر فرمائی ہے۔ اگر کوئی شخص خوش الحانی کے شوق میں ظہر عصر کی نمازوں میں بھی اونچی قرات کرنے لگے تو اس کا یہ فعل ناجائز اور بدعت ہوگا۔

یا مثلاً جہری نمازوں میں بھی سبحانک اللہم۔ اعوذ باللہ۔

آہستہ پڑھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص ان کی بھی جہراً قرات کرنے لگے تو یہ جائز نہیں۔ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے نے ان سے دریافت کیا کہ نماز میں سورۂ فاتحہ سے پہلے بلند آواز سے بسم اللہ شریف پڑھنا کیسا ہے؟ فرمایا: بیٹا! یہ بدعت ہے۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکر و عمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتداء میں نماز پڑھی ہے وہ بلند آواز سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نہیں پڑھا کرتے تھے۔

یا مثلاً نماز ختم ہونے کے بعد احادیث طیبہ میں مختلف اورادو اذکار اور دعاؤں کا حکم فرمایا گیا. مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ یہ ذکر اور دعا باآواز بلند نہیں کیا کرتے تھے. بلکہ ہر شخص اپنے منہ میں پڑھا کرتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کو ان اورادو اذکار اور دعاؤں میں یہی کیفیت مطلوب ہے۔ اور امت کو اسی کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس بعض مساجد میں آپ نے دیکھا ہو گا کہ لوگ سر میں سر ملا کر اونچی آواز سے کلمہ شریف کا ورد کرتے ہیں. یہ طریقہ نبویؐ اور مطلوب شرعی کے خلاف ہونے کی وجہ سے بدعت ہے۔

چہارم: جس عبادت کو شریعت نے انفرادی طور پر مشروع فرمایا ہے اس کو اجتماعی طور پر کرنا بدعت ہے۔ مثلاً فرض نماز تو اجتماعی طور پر پڑھی جاتی ہے۔ اور شریعت کو ان کا اجتماعی طور پر ادا کرنا ہی مطلوب ہے۔ مگر نفلی نماز الگ الگ پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ اس لئے نفلی نماز اجتماعی طور پر پڑھنے کو ہمارے فقہائے نے مکروہ اور بدعت لکھا ہے۔

علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

وَلِذَا مَنَعُوْا عَنِ الْاِجْتِمَاعِ بِصَلٰوةِ الرَّغَائِبِ الَّتِیْ اَحْدَثَهَا بَعْضُ الْمُتَعَبِّدِیْنَ، لِاَنَّهَا لَمْ تُؤْثَرْ عَلٰی هٰذِهِ الْكَيْفِيَّةِ فِیْ تِلْكَ اللَّيَالِی الْمَخْصُوْصَةِ وَاِنْ كَانَتِ الصَّلٰوةُ خَيْرَ مَوْضُوْعٍ. (ردالمختار ص۲۳۵ ج۲)

ترجمہ:۔ اسی بنا پر فقہائے امت نے نماز "رغائب" کے لئے جمع ہونے سے منع کیا ہے. جو کہ بعض متعبدین نے ایجاد کی ہے. کیونکہ ان مخصوص راتوں میں اس کیفیت سے نماز پڑھنا منقول نہیں۔ اگرچہ نماز بذات خود خیر ہی خیر ہے۔ (ردالمختار ص ۲۳۵ ج ۲)

اسی سے شب برات. شب معراج اور شب قدر میں نمازوں کے لئے جمع ہونے اور ان کو اجتماعی شکل میں ادا کرنے کا حکم معلوم ہو سکتا ہے۔

یا مثلاً شریعت کا حکم یہ ہے کہ جو عبادت اجتماعی طور پر ادا کی گئی ہے اس کے بعد تو دعا اجتماعی طور پر کی جائے مگر جو عبادت الگ الگ ادا کی گئی ہو اس کے بعد

دعا بھی بھی انفرادی طور پر ہونی چاہئے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین سے یہ منقول نہیں ہے کہ وہ سنن و نوافل کے بعد اجتماعی دعا کرتے ہوں۔ اس لئے ہمارے لئے یہاں جو رواج ہے کہ لوگ سنتیں نفل پڑھنے کے بعد امام کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں۔ سنن و نوافل سے فارغ ہونے کے بعد امام دعا کرتا ہے اور لوگ ــــ اس پر آمین آمین کہتے ہیں یہ صحیح نہیں ــــ اگر اتفاقاً کسی بزرگ کی دعا میں شریک ہونے کے لئے ایسا ہو جائے تو مضائقہ نہیں مگر اس کی عادت بنالینا بدعت ہے۔

یا مثلاً نماز کے علاوہ شریعت نے ذکر و تسبیح اور درود شریف وغیرہ اجتماعی طور پر پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ ہر شخص کو الگ الگ جو پڑھنا ہو پڑھے. اب ان اذکار کو اجتماعی طور پر مل کر پڑھنا بدعت ہوگا۔

فتاویٰ عالمگیری میں "محیط" سے نقل کیا ہے:

قِرَاءَةُ الْكَافِرُوْنَ اِلَى الْآخِرِ مَعَ الْجَمْعِ مَكْرُوْهَةٌ لِاَنَّهَا بِدْعَةٌ لَمْ تُنْقَلْ عَنِ الصَّحَابَةِ وَلَا عَنِ التَّابِعِيْنَ۔ (ص ۲۱۷)

ترجمہ:۔ سورۂ الکافرون سے آخر تک مجمع کے ساتھ پڑھنا مکروہ ہے کیونکہ یہ بدعت ہے. صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول نہیں۔ (ص ۲۱۷)

فتاویٰ بزازیہ میں فتاویٰ قاضی خاں کے حوالے سے نقل کیا ہے:

رَفْعُ الصَّوْتِ بِالذِّكْرِ حَرَامٌ وَقَدْ صَحَّ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّهُ سَمِعَ قَوْمًا اِجْتَمَعُوْا فِيْ مَسْجِدٍ يُهَلِّلُوْنَ وَيُصَلُّوْنَ عَلَيْهِ، عَلَيْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ جَهْرًا. فَرَاحَ اِلَيْهِمْ فَقَالَ مَا عَهِدْنَا ذٰلِكَ عَلٰى عَهْدِهٖ عَلَيْهِ السَّلَامُ، وَلَا اَرَاكُمْ اِلَّا مُبْتَدِعِيْنَ، فَمَازَالَ يَذْكُرُ ذٰلِكَ حَتّٰى اَخْرَجَهُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ۔ (بزازیہ برحاشیہ فتاویٰ عالمگیری ص ۳۷۵ ج ۶)

بلند آواز سے ذکر کرنا حرام ہے. حضرت ابن مسعودؓ سے بسند صحیح منقول ہے کہ آپ نے سنا کہ کچھ

لوگ مسجد میں جمع ہو کر بلند آواز سے کلمہ طیبہ اور درود شریف کا ورد کر رہے ہیں۔ آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا. ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں یہ چیز نہیں دیکھی۔ میرا خیال ہے کہ تم بدعت کر رہے ہو۔ آپ بار بار یہی بات کہتے رہے یہاں تک کہ انہیں مسجد سے نکال دیا۔ (بزازیہ حاشیہ فتاویٰ عالمگیری ص ۳۷۸ ج ۶)

اس سے معلوم ہوا ہو گا آج کل مسجدوں میں زور زور سے کلمہ طیبہ پڑھنے اور گا گا کر درود و سلام پڑھنے کا جو بعض لوگوں نے رواج نکالا یہ بدعت ہے۔ اور اس سے مساجد کو پاک کرنا لازم ہے۔

یا مثلاً شریعت نے نماز جنازہ کا ایک خاص طریقہ تجویز فرمایا ہے مگر نماز جنازہ کے بعد اجتماعی طور پر دعا کرنے کی تعلیم نہیں دی۔ اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین اس موقعہ پر اجتماعی دعا کیا کرتے تھے۔ اس لئے جنازہ کے بعد اجتماعی دعا کرنا، اور اس کو ایک سنت بنالینا بدعت ہو گا۔ جنازے کے بعد دعا کرنی ہو تو نماز جنازہ کے بعد فوراً کسی تاخیر کے بغیر جنازہ اٹھاتے اور لے جاتے ہوئے ہر شخص اپنے طور پر دعا کرے

دعا مانگنا ہو تو قبر پر خوب مانگی جائے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازے کی جو کیفیت منقول ہے اس میں ردوبدل کی اجازت نہیں۔ (ناشر)

مجھے توقع ہے کہ موٹی موٹی بدعات انہی اصولوں کے ذیل میں آجاتی ہیں۔ اور ان سب کا اصل الاصول وہی ہے جو پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یعنی جو فعل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ سے منقول نہ ہو اسے دین کی حیثیت سے کرنا بدعت ہے، اس لئے اسی پر اکتفاء کرتے ہوئے یہاں چند ضروری فوائد لکھ دینا چاہتا ہوں۔

اول: بعض لوگ غلط سلط روایات سے بعض بعض بدعات کا جواز ثابت کیا کرتے ہیں، اس لئے وہ قاعدہ یاد رکھنا چاہئے جو صاحب درمختار نے خیر رملی سے اور ابن عابدین شامیؒ نے تقریب سیوطیؒ سے نقل کیا ہے کہ کمزور روایت پر عمل کرنے کی تین شرطیں ہیں، ایک یہ کہ وہ روایت بہت زیادہ کمزور نہ ہو مثلاً اس کا

کوئی راوی جھوٹا یا جھوٹ سے متہم ہو، دوسرے یہ کہ وہ چیز شریعت کے کسی عام اصول کے تحت داخل ہو۔ تیسرے یہ کہ اس کو سنت نہ سمجھا جائے۔ (ردالمختار ص ۱۲۸ ج ۱)

بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ اذان واقامت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سن کر انگوٹھے چومتے ہیں اور اس کے ثبوت میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل کی جاتی ہے بدقسمتی سے اس میں مذکورہ بالا تین شرطوں میں سے ایک بھی نہیں پائی جاتی۔

اول تو وہ روایت ایسی مہمل ہے کہ ماہرین علم حدیث نے اس کو موضوع اور من گھڑت کہا ہے۔

دوسرے، یہ روایت اصل دین میں سے کسی اصل کے تحت داخل نہیں۔

تیسرے، اس کو کرنے والے نہ صرف سنت سمجھتے ہیں بلکہ دین کا اعلیٰ ترین شعار تصور کرتے ہیں، اور علامہ شامیؒ اور دیگر اکابر نے ایسا کرنے کو افتراء علی الرسول قرار دیا ہے۔

جس شخص نے یہ روایت گھڑی ہے اس نے اپنی کم عقلی کی وجہ سے یہ نہیں سوچا کہ اذان واقامت دن میں ایک مرتبہ نہیں بلکہ روزانہ دس مرتبہ دہرائی جاتی ہے۔ اب اگر اذان واقامت کے وقت انگوٹھے چومنا سنت ہوتا تو جس طرح اذان واقامت مسلمانوں میں متواتر چلی آتی ہے۔ اور مناروں پر گونجتی ہے اسی طرح یہ عمل بھی مسلمانوں میں متواتر ہوتا۔ حدیث کو ساری کتابوں میں اس کو درج کیا جاتا۔ اور مشرق سے مغرب تک پوری امت اس پر عمل پیرا ہوتی۔

علمائے امت نے تصریح کی ہے امت کے عملی تواتر کے مقابلے میں صحیح ترین حدیث بھی موجود ہو تو اس کو یا تو منسوخ سمجھا جائے گا. یا اس کی کوئی مناسب تاویل کی جائے گی۔ بہرحال ایک متواتر عمل کے مقابلے میں کسی روایت پر عمل کرنا صحیح نہیں، امام ابو بکر جصاص رازیؒ نے "احکام القرآن" میں اس قاعدے کو بڑی تفصیل سے لکھا

ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اسی بنا پر ہمارے آئمہ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر مطلع بالکل صاف ہو تو رمضان اور عید کے چاند کے لئے ایک دو آدمیوں کی شہادت کافی نہیں۔ بلکہ شہادت دینے والی اتنی بڑی جماعت ہونی چاہئے کہ غلطی کا احتمال نہ رہے۔ اس لئے کہ اکا دکا آدمی کی شہادت پر اعتماد کرنے کا مطلب یہ ہو گا کہ ہم اس علاقے کے لاکھوں انسانوں کو گویا اندھا فرض کر رہے ہیں۔ (احکام القرآن ص)

امام سرخسیؒ کسی روایت کے انقطاع معنوی کی چار صورتیں قرار دیتے ہیں:

اول: وہ کتاب اللہ کے خلاف ہو۔

دوم: سنت متواترہ یا مشہورہ کے خلاف ہو۔

سوم: ایسے مسئلہ میں، جس کی ضرورت ہر خاص و عام کو ہے، وہ امت کے تعامل کے خلاف ہو۔

چہارم: سلف میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا۔ مگر کسی نے اس کا حوالہ نہ دیا۔

(اصول السرخسی ص ۳۶۴ ج ۱)

دوسری صورت کے بارے میں لکھتے ہیں:

وَكَذٰلِكَ الْغَرِيْبُ مِنْ أَخْبَارِ الْآحَادِ إِذَا خَالَفَ السُّنَّةَ الْمَشْهُوْرَةَ فَهُوَ مُنْقَطِعٌ فِيْ حُكْمِ الْعَمَلِ بِهٖ ـ لِأَنَّ مَا يَكُوْنُ مُتَوَاتِرًا مِنَ السُّنَّةِ أَوْ مُسْتَفِيْضًا أَوْ مُجْمَعًا عَلَيْهِ فَهُوَ بِمَنْزِلَةِ الْكِتَابِ فِيْ ثُبُوْتِ عِلْمِ الْيَقِيْنِ، وَمَا فِيْهِ شُبْهَةٌ فَهُوَ مَرْدُوْدٌ فِيْ مُقَابَلَةِ عِلْمِ الْيَقِيْنِ ـ (ص ۳۶۶)

ترجمہ:۔ اسی طرح اسی خبر واحد، جس کا راوی صرف ایک ہو۔ جب سنت مشہورہ کے خلاف ہو تو (وہ صحیح الاسناد ہونے کے باوجود) عمل کے حق میں منقطع تصور ہوگی کیونکہ جو سنت کہ متواتر، مستفیض اور مجمع علیہ ہو وہ علم الیقین کے ثبوت میں بمنزلہ کتاب اللہ کے ہے۔ اور جس چیز میں شبہ ہو وہ علم الیقین کے مقابلہ میں مردود ہے۔ (ص ۳۶۶)

اس ذیل میں امام سرخسیؒ نے پتے کی بات لکھی ہے۔ اور دراصل اسی کو یہاں

نقل کرنا چاہتا ہوں وہ فرماتے ہیں:

فَفِيْ هٰذَا النَّوْعَيْنِ مِنَ الْإِنْتِقَادِ لِلْحَدِيْثِ عِلْمٌ كَثِيْرٌ وَصِيَانَةٌ لِلدِّيْنِ بَلِيْغَةٌ، فَإِنَّ أَصْلَ الْبِدَعِ وَالْأَهْوَاءِ إِنَّمَا ظَهَرَ مِنْ قِبَلِ تَرْكِ عَرْضِ أَخْبَارِ الْآحَادِ عَلَى الْكِتَابِ وَالسُّنَّةِ الْمَشْهُوْرَةِ۔

ترجمہ:۔ روایات کو ان دونوں طریقوں سے پرکھنا بہت بڑا علم ہے۔ اور دین کی بہترین حفاظت ــــ کیونکہ بدعات و خواہشات کی اصل یہیں سے ظاہر ہوئی کہ ان افواہی روایات کو کتاب اللہ اور سنت مشہورہ سے نہیں جانچا گیا۔

آپ غور کریں گے تو تمام بدعات کا سرمنشا یہی ہے کہ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ اور امت کے عملی تواتر سے آنکھیں بند کر کے ادھر ادھر سے گری پڑی باتوں کو اٹھا کر انہیں دین بنالیا گیا، اور پھر کتاب و سنت کو اس پر چسپاں کیا جانے لگا۔ امام سرخسی لکھتے ہیں۔

فَإِنَّ قَوْمًا جَعَلُوْهَا أَصْلًا مَعَ الشُّبْهَةِ فِيْ اِتِّصَالِهَا بِرَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَعَ إِنَّهَا لَا تُوْجِبُ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ثُمَّ تَأَوَّلُوْا عَلَيْهَا الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ الْمَشْهُوْرَةَ وَجَعَلُوا التَّبَعَ مَتْبُوْعًا، وَجَعَلُوا الْأَسَاسَ مَا هُوَ غَيْرُ مُتَيَقَّنٍ بِهٖ، فَوَقَعُوْا فِي الْأَهْوَاءِ وَالْبِدَعِ (ص۳۶۷)

ترجمہ:۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے ان شاذ روایات کو اصل بنالیا۔ حالانکہ ان کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت مشتبہ تھی۔ اور باوجودیکہ ان سے یقینی علم حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اور پھر کتاب اللہ اور سنت مشہورہ میں تاویلیں کر کے اس پر چسپاں کرنا شروع کر دیا پس انہوں نے تابع کو متبوع اور غیر یقینی چیز کو بنیاد بنالیا۔ اس طرح اہوا و بدعات کے گڑھے میں جاگرے۔

ٹھیک اسی معیار پر انگوٹھے چومنے کی اس بے اصل روایت کا قصہ بالکل جعلی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کو صحیح سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم صحابہ و تابعین اور بعد کی ساری امت کے تعامل کو جھٹلا رہے ہیں۔ کیونکہ اگر اس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہوتی تو ناممکن تھا کہ صحابہ و تابعین کی پوری

جماعت دن میں دس مرتبہ اس پر عمل نہ کرتی۔ اور ناممکن تھا کہ تمام کتب حدیث میں اس کو جگہ نہ ملتی۔

دوم: جو عمل بذات خود مباح ہو مگر اس میں بدعت کی آمیزش ہو جائے یا اس کو سنت سمجھا جانے لگے تو اس کا کرنا جائز نہیں۔

حدیث و فقہ کی کتابوں میں اس قاعدے کی بہت سی مثالیں مذکور ہیں. ان میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے آئمہ احناف نے نمازوں کے بعد سجدہ شکر ادا کرنے کو مکروہ لکھا ہے۔ (عالمگیری ص۱۳۶ ج ۱، شامی ص ۲۰ ج ۱۲)

در مختار (قبیل صلوٰۃ المسافر) وغیرہ میں ہے

سَجْدَۃُ الشُّکْرِ مُسْتَحَبَّۃٌ. بِہٖ یُفْتیٰ، لٰکِنَّہَا تُکْرَہُ بَعْدَ الصَّلٰوۃِ، لِاَنَّ الْجَھَلَۃَ یَعْتَقِدُوْنَہَا سُنَّۃً اَوْوَاجِبَۃً، وَکُلُّ مُبَاحٍ یُؤَدِّیْ اِلَیْہِ فَھُوَ مَکْرُوْہٌ۔

ترجمہ:۔ سجدہ شکر مستحب ہے۔ اسی پر فتویٰ ہے لیکن نمازوں کے بعد مکروہ ہے، کیونکہ جاہل لوگ اس کو سنت یا واجب سمجھ بیٹھیں گے، اور ہر مباح جس کا یہ نتیجہ ہو وہ مکروہ ہے۔

علامہ شامیؒ اس پر یہ اضافہ کرتے ہیں کہ یہ مکروہ تحریمی ہے اس لئے کہ یہ ایک ایسی بات کو، جو دین نہیں، دین میں ٹھونسنے کے مترادف ہے۔

(ردالمختار ص ۱۲۰ ج ۲)

سوم: ایک چیز بذات خود مستحب اور مندوب ہے۔ مگر اس کا ایسا التزام کرنا کہ رفتہ رفتہ اس کو ضروری سمجھا جانے لگے اور اس کے تارک کو ملامت کی جانے لگے تو وہ فعل مستحب کے بجائے گناہ اور بدعت بن جاتا ہے۔

مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سلام پھیرنے کے بعد اکثر و بیشتر داہنی جانب سے گھوم کر مقتدیوں کی طرف متوجہ ہوا کرتے تھے، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنی نماز میں شیطان کا حصہ نہ لگالے کہ دائیں جانب سے گھومنے ہی کو ضروری سمجھنے لگے میں نے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے کہ آپ بسااوقات بائیں جانب سے گھوم کر متوجہ ہوا کرتے تھے۔ (مشکوۃ ص ۸۵)

چہارم: جس فعل میں کفار و فجار اور اہل بدعت کا تشبہ پایا جائے اس کا ترک لازم ہے. کیونکہ بہت سی احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار و فجار کی مشابہت سے منع فرمایا ہے۔

ایک حدیث میں ہے:

مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ۔ (مشکوۃ صہ ۳۷۵)

ترجمہ:۔ جو شخص کسی قوم کی مشابہت کرے وہ انہی میں شمار ہو گا۔

اسی قاعدے کے تحت علمائے اہل سنت نے محرم میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے "تذکرہ شہادت" سے منع کیا ہے۔ اصول الصفار اور جامع الرموز میں ہے:

سُئِلَ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ عَنْ ذِکْرِ مَقْتَلِ الْحُسَیْنِ فِیْ یَوْمِ عَاشُوْرَا أَیَجُوْزُ اَمْ لَا، قَالَ لَا، لِاَنَّ ذٰلِکَ مِنْ شِعَارِ الرَّوَافِضِ۔ (بحوالہ الجنۃ لاھل السنۃ صہ ۱۴۰)

ترجمہ:۔ آپ سے دریافت کیا گیا کہ آیا دس محرم کو شہادت حسینؓ کا تذکرہ جائز ہے یا نہیں؟ فرمایا، جائز نہیں کیونکہ یہ رافضیوں کا یہ شعار ہے۔ (بحوالہ الجنۃ لاھل السنۃ ص ۱۴۰)

اس قاعدے سے معلوم ہوا کہ وہ تمام افعال جو اہل بدعت کا شعار بن جائیں ان کا ترک لازم ہے۔

پنجم: جب کسی فعل کے سنت و بدعت ہونے میں تردد ہو جائے تو ترکِ سنت فعل بدعت سے بہتر ہے۔ (البحر الرائق ص ۲۱ ج ۲) اور ردالمحتار ص ۶۴۲ ج ۱ میں ہے:

اِذَا تَرَدَّدَ الْحُکْمُ بَیْنَ سُنَّۃٍ وَبِدْعَۃٍ کَانَ تَرْکُ السُّنَّۃِ رَاجِحًا عَلٰی فِعْلِ الْبِدْعَۃِ۔

ترجمہ:۔ جب کسی حکم میں تردد ہو جائے کہ یہ سنت ہے یا بدعت؟ تو سنت کا ترک کر دینا بہ نسبت بدعت کرنے کے راجح ہے۔

اس قاعدے سے ان تمام امور کا حکم معلوم ہو جاتا ہے جن کے سنت اور بدعت ہونے میں اختلاف ہو۔ بعض اسے سنت بتاتے ہوں اور بعض بدعت۔

سنت و بدعت کے سلسلہ میں جو نکات میں نے ذکر کئے ہیں اگر ان کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو آپ کو یہ فیصلہ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ اہل سنت کون ہیں۔ میں اس بحث کو حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کی وصیت پر ختم کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:

"وآں راہ دیگر بزعم فقیر التزام متابعت سنت سنیہ است عَلٰی صَاحِبِهَا الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَالتَّحِيَّةُ واجتناب از اسم و رسم بدعت ــــ تا از بدعت حسنہ در رنگ بدعت سیئہ احتراز ننماید بوئے ازیں دولت بمشام جان اونرسد وایں معنی امروز متعسر است کہ عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است و بظلمات بدعت آرام گرفتہ، کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند، و باحیائے سنت لب کشائد۔

اکثر علماء ایں وقت رواج دہند ہائے بدعت اند و محو کنند ہائے سنت۔ بدعتہائے پہن شدہ راتعامل خلق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آن فتویٰ می دہند۔ و مردم رابہدعت دلالت می نمایند۔ (مکتوبات امام ربانی دفتر دوم مکتوب ۵۴

ترجمہ:۔ وصول الی اللہ کا دوسرا راستہ (جو ولایت سے بھی قریب تر ہے) اس فقیر کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنا اور بدعت کے نام و رسم سے بھی اجتناب کرنا ہے آدمی جب تک بدعت سیئہ کی طرح بدعت حسنہ سے بھی پرہیز نہ کرے اس دولت کی بو بھی اس کے مشام جان تک نہیں پہنچ سکتی اور یہ بات آج کل از بس دشوار

ہے۔ کیونکہ جہانؑ کا جہان دریائے بدعت میں ڈوبا ہوا اور بدعت کی تاریکیوں میں آرام پکڑے ہوئے ہے۔ کس کی مجال ہے کہ بدعت کی مخالفت کا دم مارے؟ یا کسی سنت کو زندہ کرنے میں لب کشائی کرے۔

اس دور کے اکثر علماء بدعات کو رواج دینے والے اور سنت کو مٹانے والے ہیں۔ جو بدعتیں چاروں طرف پھیل گئی ہیں ان کو مخلوق کا تعامل سمجھ کر ان کے جواز بلکہ استحسان کا فتویٰ دیتے ہیں، اور بدعات کی طرف لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں۔ "

حق تعالیٰ شانہ مجھے، آپ کو، آپ کے رفقاء اور تمام مسلمانوں کو حضرت مجددؒ کی اس وصیت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

(۵) مولانا مودودی:

آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ آپ کے رفقاء میں ایک گروہ مولانا مودودی کا مداح ہے۔ اور یہ حضرات مولانا موصوف کے سوا کسی کو عالم ہی نہیں جانتے اس بارے میں بھی آپ میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔

میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار اپنے دو مضامین ——— "تنقید اور حق تنقید" اور "الامام المجاہد" میں کر چکا ہوں۔ تاہم آپ کے حکم کی تعمیل میں یہاں بھی کچھ مختصراً عرض کرتا ہوں۔

مولانا مودودی کی تمام ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کا کھلے دل سے اعتراف کرتے ہوئے مجھے موصوف سے بہت سی باتوں میں اختلاف ہے۔ جزئیات تو بے شمار ہیں، مگر چند کلیات حسب ذیل ہیں:

اول: مولانا مودودی کے قلم کی کاٹ اور شوخی ان کی سب سے بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔ مگر اس ناکارہ کے نزدیک ان کی سب سے بڑی خامی شائد یہی ہے۔ ان کا قلم مؤمن و کافر دونوں کے خلاف یکساں کاٹ کرتا ہے۔ اور وہ کسی فرق و امتیاز کا روا دار نہیں۔ جس طرح وہ ایک لادین سوشلسٹ کے خلاف چلتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح ایک مومن مخلص اور خادم دین کے خلاف بھی، وہ جس جرأت کے ساتھ اپنے کسی معاصرہ پر تنقید کرتے ہیں (جس کا انہیں کسی درجہ میں حق ہے) اسی "عبارت" کے ساتھ وہ سلف صالحین کے کارناموں پر بھی تنقید کرتے ہیں ——— وہ جب تہذیب جدید اور الحاد و زندقہ کے خلاف قلم اٹھاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کا شیخ الحدیث گفتگو کر رہا ہے اور دوسرے ہی لمحے جب وہ اہل حق کے خلاف خامہ فرسائی کرتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ مولانا نے مسٹر پرویز یا غلام احمد قادیانی کا قلم چھین لیا ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ نبوت و رسالت کا مقام کتنا نازک ہے؟

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می اید جنید و بایزید ایں جا

کسی نبی (علیہ السلام) کے بارے میں کوئی ایسی تعبیر روا نہیں جو ان کے مقام رفیع کے شایان شان نہ ہو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ کا اسوہ حسنہ ہمارے سامنے ہے، پورا ذخیرہ حدیث دیکھ جایئے ایک لفظ ایسا نہیں ملے گا جس میں کسی نبی کی شان میں کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ کمی کا شائبہ پایا جاتا ہو، لیکن مولانا مودودی کا قلم حریم نبوت تک پہنچ کر بھی ادب ناآشنا رہتا ہے اور وہ بڑی بے تکلفی سے فرماتے ہیں:-

الف:- "موسیٰ علیہ السلام کی مثال اس جلد باز فاتح کی سی ہے۔ جو اپنے اقتدار کا استحکام کئے بغیر مارچ کرتا ہوا چلا جائے اور پیچھے جنگل کی آگ کی طرح مفتوحہ علاقہ میں بغاوت پھیل جائے" (رسالہ ترجمان القرآن ج ۲۹ عدد ۵ص)

ب:۔ "حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے عہد کی اسرائیلی سوسائٹی کے عام رواج سے متاثر ہو کر اوریا سے طلاق کی درخواست کی تھی" (تفہیمات حصہ دوم ص ۴۲ طبع دوم)

ج:۔ "حضرت داؤد علیہ السلام کے فعل میں خواہش نفس کا کچھ دخل تھا۔ اس کا حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا، اور کوئی ایسا فعل تھا جو حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرمانروا کو زیب نہ دیتا تھا"۔

(تفہیم القرآن ج ۴ سورہ ص ص ۳۲۷ طبع اول اکتوبر ۱۹۶۶ء)

د:۔ نوح علیہ السلام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقع پر نبی جیسا اعلیٰ و اشرف انسان بھی تھوڑی دیر کے لئے اپنی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے .... لیکن جب اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ فرماتا ہے کہ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا اس کو محض اس لئے اپنا سمجھنا کہ وہ تمہاری صلب سے پیدا ہوا ہے محض ایک جاہلیت کا جذبہ ہے تو وہ اپنے دل سے بے پرواہ ہو کر اس طرز فکر کی طرف پلٹ آتے ہیں جو اسلام کا مقتضا ہے"۔

ا۔ (تفہیم القرآن ج ۲ ص ۳۴۴ طبع سوم ۱۹۶۴ء)

ہ:۔ سیدنا یوسف علیہ السلام کے ارشاد۔ اجْعَلْنِيْ عَلٰى خَزَآئِنِ الْاَرْضِ (مجھے زمین مصر کے خزائن کا نگران مقرر کر دیجئے) کے بارے میں فرماتے ہیں:۔

"یہ محض وزیر مالیات کے منصب کا مطالبہ نہیں تھا، جیسا کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہ ڈکٹیٹر شپ کا مطالبہ تھا۔ اور اس کے نتیجے میں سیدنا یوسف علیہ السلام کو جو پوزیشن حاصل ہوئی وہ قریب قریب وہی پوزیشن تھی جو اس وقت اٹلی میں مسولینی کو حاصل ہے"۔

(تفہیمات حصہ دوم ص ۱۲۲ طبع پنجم ۱۹۷۰ء)

ا۔ پہلے ایڈیشن میں اس عبارت کا مختصر مفہوم ذکر کیا گیا تھا۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس کی بجائے اصل عبارت درج کی جائے۔

و۔ "حضرت یونس علیہ السلام سے فریضہ رسالت کی ادائیگی میں کچھ کوتاہیاں ہو گئی تھیں۔ غالباً انہوں نے بے صبر ہو کر قبل از وقت اپنا مستقر بھی چھوڑ دیا تھا" (تفہیم القرآن ج ۲ سورہ یونس حاشیہ ص ۳۱۳، ۳۱۲) (طبع سوم ۱۹۶۴ء)

ممکن ہے مولانا مودودی اور ان کے مداحوں کے نزدیک "جلد باز فاتح" ــــ "خواہش نفس کی بناء پر" ــــ "حاکمانہ اقتدار کا نامناسب استعمال" ــــ "بشری کمزوریوں سے مغلوب" "جذبہ جاہلیت کا شکار"۔ فریضہ رسالت کی ادا میں کچھ کوتاہیاں"۔ اور "ڈکٹیٹر شپ" جیسے الفاظ میں سوء ادب کا کوئی پہلو نہ پایا جاتا ہو۔ اس لئے وہ انبیاء علیہم السلام کے بارے میں ایسے الفاظ کا استعمال صحیح سمجھتے ہوں ــــ لیکن اس کا فیصلہ دو طرح ہو سکتا ہے ــــ ایک یہ کہ اسی قسم کے الفاظ اگر خود مولانا موصوف کے حق میں استعمال کئے جائیں تو ان کو یا ان کے کسی مداح کو ان سے ناگواری تو نہیں ہوگی؟ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ مولانا ڈکٹیٹر ہیں۔ اپنے دور کے ہٹلر ہیں۔ اور مسولینی ہیں۔ وہ خواہش نفس سے کام کرتے ہیں۔ جذبہ جاہلیت سے مغلوب ہو جاتے ہیں، حاکمانہ اقتدار کا نامناسب استعمال کر جاتے ہیں، اور انہوں نے اپنے فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہیاں کی ہیں وغیرہ وغیرہ تو میرا خیال ہے کہ مولانا کا کوئی عقیدت مند ان "الزامات" کو برداشت نہیں کرے گا۔ اگر یہ الفاظ مولانا مودودی کی ذات سیادت مآب کے شایان شان نہیں۔ بلکہ یہ مولانا کی تنقیص اور سوئے ادب ہے، تو انصاف فرمائیے کہ کیا ایسے الفاظ انبیاء کرام علیہم السلام کی شان میں زیبا اور شائستہ ہیں؟ اسی نوعیت کا ایک فقرہ اور سن لیجئے۔

"یہاں اس بشری کمزوری کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہئے جو آدم علیہ السلام سے ظہور میں آئی تھی ...... بس ایک فوری جذبے نے جو شیطانی تحریص کے زیر اثر ابھر آیا تھا ان پر ذہول طاری کر دیا، اور ضبط نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں

جاگرے" ___ (تفہیم القرآن ص ۱۳۳ ج ۲)

اس عبارت سے سیدنا آدم علیہ السلام کا اسم گرامی حذف کر کے اس کی جگہ اگر مولانا مودودی کا نام لکھ دیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ ان کے حلقہ میں کہرام مچ جائے گا اور پاکستان میں طوفان برپا ہو جائے گا اس سے ثابت ہے کہ یہ فقرہ شائستہ نہیں۔ بلکہ گستاخی اور سوء ادب ہے۔

اسی کی ایک مثال امہات المومین کے حق میں موصوف کا یہ فقرہ ہے:

"وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کچھ زیادہ جری ہو گئی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زبان درازی کرنے لگی تھیں"۔

(ہفت روزہ ایشیا لاہور مورخہ ۱۹ نومبر ۱۹۷۶ء)

مولانا موصوف نے یہ فقرہ ازواج النبی صلی اللہ علیہ و علیہن وسلم کے بارے میں فرمایا ہے مگر میں اس کو مضاف سے زیادہ مضاف الیہ کے حق میں سوء ادب سمجھتا ہوں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ مولانا محترم کی اہلیہ محترمہ امہات المومنین سے بڑھ کر مہذب اور شائستہ نہیں، نہ وہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مقدس ہیں۔ اب اگر ان کا کوئی عقیدت مند یہ کہہ ڈالے کہ مولانا کی اہلیہ مولانا کے سامنے زبان درازی کرتی ہیں تو مولانا اس فقرے میں اپنی خفت اور ہتک عزت محسوس فرمائیں گے، پس جو فقرہ خود مولانا کے حق میں گستاخی تصور کیا جاتا ہے میں نہیں سمجھتا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور امہات المومنین کے حق میں سوء ادب کیوں نہیں؟

الغرض مولانا موصوف کے قلم سے انبیاء کرام علیہم اسلام کے حق میں جو ادبی شہ پارے نکلے ہیں وہ سوء ادب میں داخل ہیں یا نہیں؟ اس کا ایک معیار تو یہی ہے کہ اگر ایسے فقرے خود مولانا کے حق میں سوء ادب میں شمار ہو کر ان کے عقیدت مندوں کی دل آزاری کا موجب ہو سکتے ہیں تو ان کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ یہ انبیاء کرام علیہم

السلام کے حق میں بھی سوء ادب ہیں۔ اور جو لوگ نبوت ورسالت پر ایمان رکھتے ہیں ان کی دل آزاری کا سبب ہیں۔

دوسرا معیار یہ ہو سکتا ہے کہ آیا اردو میں جب یہ فقرے استعمال کئے جائیں تو اہل زبان ان کا کیا مفہوم سمجھتے ہیں۔ اگر ان دونوں معیاروں پر جانچنے کے بعد یہ طے ہو جائے کہ واقعی ان کلمات میں سوء ادب ہے تو مولانا کو ان پر اصرار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ ان سے توبہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ انبیاء کرام کے حق میں ادنیٰ سوء ادب بھی سلب ایمان کی علامت ہے۔

(۲) انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد انسانیت کا سب سے مقدس گروہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے۔ خصوصاً حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا منصب تو انبیاء کرام علیہم السلام اور امت کے درمیان برزخ کی حیثیت رکھتا ہے ـــــ اس لئے "تجدید و احیائے دین"۔ "خلافت و ملوکیت" اور تفہیم القرآن وغیرہ میں خلیفہ مظلوم سیدنا عثمان ذوالنورین حضرت علی۔ حضرت طلحہ۔ حضرت زبیر۔ حضرت عائشہ۔ حضرت معاویہ۔ حضرت ابو موسیٰ اشعری۔ حضرت عمرو بن العاص۔ حضرت عقبہ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے بارے میں مولانا مودودی کے قلم سے جو کچھ نکلا ہے اور جس کی صحت پر ان کو اصرار ہے میں اسے خالص رفض و تشیع سمجھتا ہوں اور مولانا کی ان تحریروں کے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ جس طرح بارگاہ نبوت کے ادب ناشناس ہیں اسی طرح مقام صحابیت کی رفعتوں سے بھی ناآشنا ہیں۔ کاش انہوں نے امام ربانی مجدد الف ثانی" کا ایک ہی فقرہ یاد رکھا ہوتا۔

"ہیچ ولی بمرتبہ صحابی نرسد۔ اویس قرنی باں رفعت شان کہ بشرف صحبت خیر البشر عَلَيْهِ وَعَلٰى آلِهِ الصَّلٰوتُ وَالتَّسْلِيْمَاتُ نرسیدہ بمرتبہ ادنیٰ صحابی نرسد۔ شخصے از عبد اللہ بن المبارک رضی اللہ عنہ پرسید۔ اَيُّهُمَا اَفْضَلُ، مُعَاوِيَةُ اَمْ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ؟

درجواب فرمود:

اَلْغُبَارُ الَّذِیْ دَخَلَ اَنْفَ فَرَسِ مُعَاوِیَۃَ
مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَیْرٌ مِّنْ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِیْزِ
کَذَا مَرَّۃً (مکتوبات دفتر اول مکتوب ۲۰۷)

ترجمہ:۔ کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا۔ اویس قرنیؒ اپنی تمام تر بلندی شان کے باوجود چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کے شرف صحبت سے مشرف نہ ہوسکے اس لئے کسی ادنیٰ صحابی کے مرتبہ کو بھی نہ پہنچ سکے۔ کسی شخص نے امام عبداللہ بن مبارکؒ سے دریافت کیا کہ حضرت معاویہؓ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ؟ فرمایا: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت معاویہؓ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار داخل ہوا وہ بھی عمر بن عبدالعزیزؒ سے کئی گنا بہتر ہے"۔

یہاں یہ نکتہ عرض کردینا ضروری ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت و رفاقت کا جو شرف حاصل ہوا ہے پوری امت کے اعمال حسنہ مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ ذرا تصور کیجئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی دو رکعتیں، جن میں صحابہ کرامؓ کو شرکت کی سعادت نصیب ہوئی کیا پوری امت کی نمازیں مل کر بھی ان کے دو رکعتوں کے ہم وزن ہوسکتی ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر جو کسی صحابی نے ایک سیر جو اللہ تعالیٰ کے راستے میں دیئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ سے انہیں شرف قبول عطا ہوا بعد کی امت اگر پہاڑ برابر سونا بھی خیرات کردے تو کیا یہ شرف اسے حاصل ہوسکتا ہے؟ باقی تمام حسنات کو اسی پر قیاس کرلیجئے۔

اس شرف مصاحبت سے بڑھ کر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مدرسہ نبوت کے ایسے طالب علم تھے جن کے معلم و ہادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، جن کا نصاب تعلیم ملاء اعلیٰ میں مرتب ہوا تھا۔ جن کی تعلیم و تربیت کی نگرانی براہ راست وحی آسمانی کررہی تھی، اور جن کا امتحان علام الغیوب

نے لیا، اور جب ان کی تعلیم و تربیت کا ہر پہلو سے امتحان ہو چکا تو حق تعالیٰ شانہ نے نہیں "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" کی ڈگری عطا فرما کر آنے والی پوری انسانیت کی تعلیم و تربیت اور تلقین و ارشاد کا منصب ان کو تفویض کیا، "اور "کُنتُمْ خَیْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ" کے مسند ان کے لئے آراستہ فرمائی۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد صرف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت ایسی ہے جن کی تعلیم و تربیت بھی وحی الٰہی کی نگرانی میں ہوئی اور ان کو سند فضیلت بھی خود خداوند قدوس نے عطا فرمائی۔

مولانا مودودی کے عقیدت کیش یہ کہ کر دل بہلا لیتے ہیں کہ مولانا نے جو کچھ لکھا ہے تاریخ کے حوالوں سے لکھا ہے۔ اور یہ ان کے قلم کا شاہکار ہے کہ انہوں نے منتشر ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک مربوط تاریخ مرتب کر ڈالی ــــــ میں ان کی خدمت میں بہ ادب گزارش کروں گا کہ ان کا یہ بہلاوا بہ چند وجوہ غلط ہے۔

اول: مولانا کا یہ قلمی شاہکار نہ تاریخی صداقت ہے، نہ صحابہ کرامؓ کی زندگی کی صحیح تصویر ہے، بلکہ یہ ایک "افسانہ" ہے جس میں مولانا کے ذہنی تصورات و نظریات نے رنگ آمیزی کی ہے۔ آج کل "افسانہ نگاری" کا ذوق عام ہے۔ عام طبائع تاریخی صداقتوں میں اتنی دلچسپی نہیں لیتیں جتنی کہ رنگین افسانوں میں۔ اس لئے مولانا کی جولانی طبع نے صحابہ کرامؓ پر بھی "خلافت و ملوکیت" کے نام سے ایک افسانہ لکھ دیا۔ جس کا حقائق کی دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ آج اگر کوئی صحابیؓ دنیا میں موجود ہوتا تو شیخ سعدیؒ کی زبان میں مولانا کے قلم سے یہ شکایت ضرور کرتا۔

بخندید و گفت آں نہ شکل من است
ولیکن قلم در کف دشمن است

اگر مولانا کو صحابہ کرامؓ کا پاس ادب ملحوظ ہوتا تو قرآن کریم کے صریح اعلان ــــــ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ ــــــ کے بعد وہ صحابہ کرامؓ کی بلند و بالا شخصیتوں کو افسانہ نگاری کا موضوع نہ بناتے۔

"دوم: یورپ میں اسلام نابغہ شخصیتوں کو مسخ کرنے اور ان کی سیرت و کردار کا حلیہ بگاڑنے کا کام بڑی خوبصورتی اور پرکاری سے ہو رہا ہے، اور یہودی مستشرقین کی کھیپ کی کھیپ اس کام پر لگی ہوئی ہے"۔ وہ بھی ٹھیک اسی طرح بزعم خود تاریخ کے منتشر ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک فرضی تصویر تیار کرتے ہیں۔

اور دنیا کو باور کراتے ہیں کہ وہ پوری غیر جانبداری کے ساتھ اور کسی قسم کے تعصب کی آمیزش کے بغیر تاریخی حقائق دنیا کے سامنے لا رہے ہیں مگر اپنے اس لفظی ادعاء کے برعکس وہ جس طرح مسلمہ تاریخی حقائق کو چھپاتے ہیں۔ جس طرح بالکل سیدھی بات کی الٹ تعبیر کرتے ہیں، جس طرح بات کا بتنگڑ اور رائی کا پہاڑ بنا کر اسے پیش کرتے ہیں اور جس طرح اپنی بدفہمی یا خوش فہمی سے وہ اس میں رنگ آمیزی اور حاشیہ آرائی کرتے ہیں اس سے ان کا تعصب اور اسلام سے ان کی عداوت چھپائے نہیں چھپتی۔

ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی ایسا شخص جو خدا اور رسول پر ایمان رکھتا ہو ٹھیک ٹھیک مستشرقین کے نقش پا کا تتبع کرے گا ـــــ لیکن بدقسمتی سے مولانا کا مودودی کی کتاب ـــــ خلافت و ملوکیت ـــــ کا بالکل یہی رنگ ڈھنگ ہے پڑھنے والا مسکین یہ سمجھتا ہے کہ مولانا تاریخی حقائق جمع کر رہے ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ وہ تاریخ سے کیا لے رہے ہیں، کیا چھوڑ رہے ہیں۔ اور کیا اپنی طرف سے اضافہ فرما رہے ہیں۔ الغرض جس طرح ہزار دل فریبیوں کے باوجود مستشرقین عداوت اسلام کے روگ کو چھپانے سے قاصر رہتے ہیں، اسی طرح مولانا مودودی بھی اپنے اس استشراقی شاہکار میں ہزار رکھ رکھاؤ کے باوصف، عداوت صحابہؓ کو چھپا نہیں سکتے۔ اب اگر مولانا محترم یا ان کے عقیدتمندوں کی تاویلات صحیح ہیں۔ تو مستشرقین کا کارنامہ ان سے زیادہ صحیح کہلانے کا مستحق ہے۔ اور اگر یہودی مستشرقین کا طرز عمل غلط ہے تو اسی دلیل سے مولانا مودودی کا رویہ بھی غلط ہے۔

سوم: کہا جاتا ہے کہ صحابہ کرامؓ انسان ہی تھے، فرشتے نہیں تھے، وہ معصوم عن

الخطاء نہیں تھے. ان سے لغزشیں اور غلطیاں کیا. بڑے بڑے گناہ ہوئے ہیں. یہ کہاں کا دین و ایمان ہے کہ ان کی غلطی کو غلطی نہ کہا جائے۔

میں پہلے تو یہ عرض کروں گا کہ مولانا مودودی کو تو صحابہ کرامؓ کی غلطیاں چھانٹنے کے لئے واقدی اور کلبی وغیرہ کا سہارا ڈھونڈنے کی ضرورت پڑی ہے لیکن خدائے علام الغیوب صحابہ کرامؓ کے ہر ظاہر و باطن سے باخبر تھے۔ ان کے قلب کی ایک ایک کیفیت اور ذہن کے ایک ایک خیال سے واقف تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یہ انسان ہیں، معصوم نہیں، انہیں یہ بھی علم تھا کہ آئندہ ان سے کیا کیا لغزشیں صادر ہوں گی۔ ان تمام امور کا علم محیط رکھنے کے باوجود جب اللہ تعالیٰ نے ان کو "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" کا اعزاز عطا فرمایا تو ان کی غلطیاں بھی۔

ع ایں خطا از صد صواب اولیٰ تراست

کا مصداق ہیں۔ اس کے بعد مولانا مودودی کو ان اکابر کی خردہ گیری و عیب چینی کا کیا حق پہنچتا ہے؟ کیا یہ خدا تعالیٰ سے صریح مقابلہ نہیں کہ وہ تو ان تمام لغزشوں کے باوجود صحابہ کرامؓ سے اپنی رضائے دائمی کا اعلان فرما رہے ہیں۔ مگر مولانا مودودی ان اکابر سے راضی نامہ کرنے پر تیار نہیں؟

دوسری گزارش میں یہ کروں گا کہ چلئے! فرض کر لیجئے کہ صحابہ کرامؓ سے غلطیاں ہوئی ہوں گی مگر سوال یہ ہے کہ آپ چودہ سو سال بعد ان اکابر کے جرائم کی دستاویز مرتب کر کے اپنے نامہ اعمال کی سیاہی میں اضافہ کے سوا اور کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ اکابر دنیا میں موجود ہوتے تب تو آپ انہیں ان کی غلطیوں کا نوٹس دے ڈالتے. مگر جو قوم تیرہ چودہ سو سال پہلے گزر چکی ہے اس کے عیوب و نقائص کو غلط سلط حوالوں سے چن چن کر جمع کرنا اور اس ساری غلاظت کا ڈھیر قوم کے سامنے لگا دینا اس کا مقصد اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں کے دل میں صحابہ کرامؓ سے جو حسن عقیدت ہے اسے مٹا دیا جائے۔ اور اس کی جگہ قلوب پر صحابہؓ سے بغض و نفرت کے نقوش ابھارے جائیں؟ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر یہ

کس عقل و دانش اور دین و ایمان کا تقاضہ ہے؟

چہارم: خلافت و ملوکیت میں مولانا مودودی نے جس نازک موضوع پر قلم اٹھایا ہے اسے ہماری عقائد و کلام کی کتابوں میں "مشاجرات صحابہؓ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور یہ باب ایمان کا ایسا پل صراط ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے، اس لئے سلف صالحین نے ہمیشہ یہاں پاس ادب ملحوظ رکھنے اور زبان و قلم کو لگام دینے کی وصیت کی ہے، کیونکہ بعد کی نسلیں ہی نہیں بلکہ صحابہ کرامؓ کے زمانے سے سطح بین لوگ بھی اسی وادی پرخار میں دامن ایمان تار تار کر چکے ہیں، اکابر امت ہمیشہ ان بد دینوں کے پھیلائے ہوئے کانٹوں کو صاف کرتے آئے ہیں۔ لیکن مولانا مودودی سلف صالحین کو "وکیل صفائی" کہہ کر دھتکار دیتے ہیں۔ ان کے ارشادات کو "خواہ مخواہ کی سخن سازیاں" اور "غیر معقول تاویلات" قرار دے کر رد کرتے ہیں۔ اور ان تمام کانٹوں کو، جن میں الجھ کر روافض اور خوارج نے اپنا دین و ایمان غارت کیا تھا، سمیٹ کر نئی نسل کے سامنے لاڈالتے ہیں، انصاف فرمایئے کہ اسے اسلام کی خدمت کہا جائے یا اسے رافضیت و خارجیت میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کا نام دیا جائے؟ اور مولانا مودودی اور ان کے معتقدین اس کارنامے کے بعد کیا یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان کا حشر اہلسنت ہی میں ہوگا، رافضیوں اور خارجیوں میں نہیں ہوگا؟ میں ہزار سوچتا ہوں مگر اس معمہ کو حل نہیں کر پاتا کہ مولانا موصوف نے یہ کتاب نئی نسل کی راہنمائی کے لئے لکھی ہے، یا انہیں صراط مستقیم سے برگشتہ کرنے کے لئے؟

پنجم: سب سے بڑھ کر تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ تیرہ چودہ سو سال کے واقعہ کی "تحقیقات" کے لئے مولانا "عدالت شرعیہ" قائم کرتے ہیں۔ جس کے صدر نشین وہ خود بنتے ہیں۔ اکابر صحابہ کو اس عدالت میں ملزم کی حیثیت سے لایا جاتا ہے، واقدی و کلبی وغیرہ سے شہادتیں لی جاتی ہیں۔ صدر عدالت خود ہی جج بھی ہے اور خود ہی وکیل استغاثہ بھی، اگر سلف صالحین اکابر صحابہؓ کی صفائی میں کچھ عرض معروض

کرتے ہیں تو اسے وکیل صفائی کے خواہ مخواہ سخن سازی اور غیر معقول تاویلات کہ کر رد کر دیا جاتا ہے ـــــ اس طرح یکطرفہ کارروائی کے بعد مولانا اپنی تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرتے ہیں، اور اسے "خلافت و ملوکیت" کے نام سے قوم کی بارگاہ میں پیش کر دیتے ہیں۔

اس امر سے قطع نظر کہ ان "تحقیقات" میں دیانت و امانت کے تقاضوں کو کس حد تک ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ شہادتوں کی جرح و نقد میں کہاں تک احتیاط برتی گئی ہے اور اس سے بھی قطع نظر کہ فاضل جج نے خود اپنے ذہنی تصورات کو واقعات کا رنگ دینے میں کس حد تک سلامتی، فکر کا مظاہرہ کیا ہے، مجھے بہ ادب یہ عرض کرنا ہے کہ آیا مولانا کی اس خود ساختہ عدالت کو اس کیس کی سماعت کا حق حاصل ہے؟ کیا یہ مقدمہ جس کی تیرہ چودہ سو سال بعد مولانا تحقیقاتی رپورٹ مرتب کرنے بیٹھے ہیں ان کے دائرہ اختیار میں آتا ہے؟ کیا ان کی یہ حیثیت ہے کہ وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں کا مقدمہ نمٹانے بیٹھ جائیں؟

مجھے معلوم نہیں کہ مولانا کے مداحوں کی اس بارے میں کیا رائے ہے۔ مگر میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کے مقدمہ کی سماعت ان سے اوپر کی عدالت ہی کر سکتی ہے، اور وہ یا تو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یا خود احکم الحاکمین۔ ان کے سوا ایک مولانا مودودی نہیں، امت کا کوئی فرد بھی اس کا مجاز نہیں کہ وہ قدوسیوں کے اس گروہ کے معاملہ میں مداخلت کرے۔ صحابہ کرامؓ کے باہمی معاملات میں آج کے کسی بڑے سے بڑے شخص کا لب کشائی کرنا اس کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ کوئی بھنگی بازار میں عدالت جما کر بیٹھ جائے اور وہ ارکان مملکت کے بارے میں اپنے بے لاگ فیصلے لوگوں کو سنانے لگے۔ ایسے موقعوں پر ہی کہا گیا ہے۔ ایاز! قدر خویش بشناس!

ششم: یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ حضرات صحابہ کرام علیہم الرضوان کو حق تعالیٰ شانہ نے امت کے مرشد و مربی اور محبوب و متبوع کا منصب عطا فرمایا ہے۔

قرآن وحدیث میں ان کے نقش قدم کی پیروی کرنے اور ان سے عقیدت و محبت رکھنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اور ان کی برائی و عیب جوئی کو ناجائز و حرام بلکہ موجب لعنت فرمایا گیا ہے۔ خود مولانا مودودی کو اعتراف ہے کہ

"صحابہ کرام کو برا بھلا کہنے والا میرے نزدیک صرف فاسق ہی نہیں بلکہ اس کا ایمان بھی مشتبہ ہے مَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِیْ اَبْغَضَهُمْ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھنے کی بنا پر ان سے بغض رکھا۔ (ترجمان القرآن اگست ۱۹۶۱ء)

جن لوگوں نے مولانا کی کتاب "خلافت و ملوکیت" پڑھی ہے وہ شہادت دیں گے کہ اس میں صحابہ کرامؓ کو صاف صاف برا بھلا کہا گیا ہے، اور صحابہ کرامؓ سے مصنف کا بغض و نفرت بالکل عیاں ہے۔ مثلاً "قانون کی بالاتری کا خاتمہ" کے زیر عنوان مولانا مودودی لکھتے ہیں:

الف۔ "ایک اور نہایت مکروہ بدعت حضرت معاویہؓ کے عہد میں یہ شروع ہوئی کہ وہ خود اور ان کے حکم سے ان کے گورنر۔ خطبوں میں بر سر منبر حضرت علی رضی اللہ عنہ پر سب و شتم کی بوچھاڑ کرتے تھے۔ حتیٰ کہ مسجد نبوی میں منبر رسول پر عین روضہ نبوی کے سامنے حضور کے محبوب ترین عزیز کو گالیاں دی جاتی تھیں۔ اور حضرت علیؓ کی اولاد اور ان کے قریب ترین رشتہ دار اپنے کانوں سے یہ گالیاں سنتے تھے ـــــ کسی کے مرنے کے بعد اس کو گالیاں دینا، شریعت تو درکنار انسانی اخلاق کے بھی خلاف تھا۔ اور خاص طور پر جمعہ کے خطبے کو اس گندگی سے آلودہ کرنا تو دین و اخلاق کے لحاظ سے سخت گھناؤنا فعل تھا۔" (خلافت و ملوکیت ص ۱۴۷)

ب:- "مال غنیمت کی تقسیم کے معاملہ میں بھی حضرت معاویہؓ نے کتاب اللہ و سنت رسول اللہ ﷺ کی صریح احکام کی خلاف ورزی کی ـــــ کتاب و سنت کی رو سے پورے مال غنیمت کا پانچواں حصہ بیت المال میں داخل ہونا چاہئے اور باقی چار حصے اس فوج میں تقسیم کئے جانے چاہئیں جو لڑائی میں شریک ہوئی ہو، لیکن حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ مال غنیمت میں سے چاندی سونا ان کے لئے الگ نکال لیا جائے پھر باقی مال شرعی قاعدے سے تقسیم کیا جائے"۔ (حوالہ بالا)

ج:- "زیاد بن سمیہ کا استلحاق بھی حضرت معاویہؓ کے ان افعال میں سے ہے جن میں انہوں نے سیاسی اغراض کے لئے شریعت کے ایک مسلم قاعدے کی خلاف ورزی کی ...... یہ ایک صریح ناجائز فعل تھا"۔ (ص ۱۷۵)

د:- حضرت معاویہؓ نے اپنے گورنروں کو قانون سے بالاتر قرار دیا اور ان کی زیادتیوں پر شرعی احکام کے مطابق کارروائی کرنے سے صاف صاف انکار کر دیا" (ایضاً)

مولانا مودودی کی ان عبارتوں میں سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کو بدنام کرنے کے لئے جو کچھ لکھا ہے، وہ قطعاً خلاف واقعہ ہے۔ اور علمائے کرام اس کی حقیقت واضح کر چکے ہیں، مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ جو لوگ مولانا مودودی کی بات پر ایمان لاکر مولانا کی اس افسانہ طرازی کو حقیقت سمجھیں گے وہ حضرت معاویہؓ اور اس دور کے تمام اکابر صحابہ و تابعین سے محبت رکھیں گے یا بغض؟ ان کی اقتدا پر فخر کریں گے یا ان پر لعنت بھیجیں گے؟ اور خود مولانا موصوف نے ان عبارتوں میں حضرت معاویہؓ کو برا بھلا نہیں کہا تو کیا ان کی قصیدہ خوانی فرمائی ہے؟ اگر میں یہ گزارش کروں کہ خود انہی کی نقل کی ہوئی حدیث کے مطابق "وہ

فاسق ہی نہیں بلکہ ان کا ایمان بھی مشتبہ ہے" تو کیا یہ گستاخی بے جا ہوگی؟ مولانا مودودی سے مجھے توقع نہیں کہ وہ اپنی غلطی پر کبھی نادم ہوں گے مگر میں یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کا انجام نہایت ہی خطرناک ہے۔

کتابوں میں لکھا ہے کہ شیعوں کے ایک عالم محقق طوسی نے اپنی کتاب تجرید العقائد کے آخر میں صحابہ کرامؓ پر تبرا کیا تھا۔ مرنے لگا تو غلام احمد قادیانی کی طرح منہ کے راستے سے نجاست نکل رہی تھی ا۔ اس کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا، ایں چیست؟ (یہ کیا ہے) کوئی خوش عقیدہ عالم وہاں موجود تھے، بولے۔

"ایں ہماں ریداست — یہ وہی گندگی ہے جو تو نے
کہ در آخر تجرید خوردی — تجرید کے آخر میں کھائی تھی۔

حق تعالیٰ شانہ ہمیں ان اکابر کے سوء ادب سے محفوظ رکھے۔ امین

(۳) جب اسلام کا سب سے مقدس ترین گروہ —— صحابہ کرام علیہم الرضوان —— بھی مولانا مودودی کی نگہ بلند میں نہ جچا ہو تو بعد کے سلف صالحین۔ اکابر امت، فقہاء و محدثین اور علماء و صوفیاء کی ان کی بارگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی ہے؟ چنانچہ موصوف نے اکابر امت پر تنقید کرنے کو اپنے نیاز مندوں کے لئے جزو ایمان ٹھہرا دیا۔ "دستور جماعت اسلامی" کی دفعہ ۳ میں کلمہ طیب کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> "رسول خدا کے سوا کسی انسان کو معیار حق نہ بنائے، کسی کو تنقید سے بالاتر نہ سمجھے، کسی کی "ذہنی غلامی" میں مبتلا نہ ہو۔ ہر ایک کو خدا کے بتائے ہوئے اسی معیار کامل پر جانچے اور پرکھے، اور جو اس معیار کے لحاظ سے جس درجہ میں ہے اس کو اسی درجہ پر رکھے"۔ (ص ۲۴ طبع سوم ۱۹۶۲ء)

"ذہنی غلامی" کی اصطلاح مولانا نے "تقلید" کے معنی میں استعمال فرمائی ہے۔ یعنی کسی فرد یا گروہ کے علم و عمل اور دیانت و تقویٰ پر اس قدر وثوق و اعتماد

کرلینا کہ اس کی ہربات پر طلب دلیل کی حاجت نہ رہے۔ یہ مولانا کے نزدیک "ذہنی غلامی" ہے، گویا ان کی جماعت کا کوئی فرد اگر رسول خدا کے سوا کسی جماعت، گروہ یا فرد پر اعتماد کر بیٹھا، اس کے طریقہ کو حق سمجھ لیا، اور اس پر "تنقید" کا فریضہ ادا نہ کیا تو مولانا کے نزدیک خدانخواستہ وہ اسلام ہی سے خارج ہے۔ مولانا کے نزدیک اسلام میں داخل ہونے کی شرط اولین یہ ہے کہ ہر شخص خدا کے بتائے ہوئے معیار کامل کو سامنے رکھ کر پوری امت اسلامیہ پر تنقید کرے۔ پھر جب مولانا نے یہ فریضہ ادا کرنے کیلئے امت اسلامیہ پر تنقیدی نگاہ ڈالی تو انہیں یہ دیکھ کر بڑی مایوسی ہوئی کہ یہ امت صدر اول سے لیکر آج تک بانجھ چلی آتی ہے اور اس میں ایک بھی "مرد کامل" پیدا نہیں ہوا ـــــ اپنی مشہور کتاب "تجدید واحیائے دین" میں "خلاف راشدہ" کے زیر عنوان تحریر فرماتے ہیں:

"خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سارا کام ۲۳ سال کی مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچا دیا، آپ کے بعد ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما، دو ایسے کامل "لیڈر" اسلام کو میسر آئے جنہوں نے اسی جامعیت کے ساتھ آپ کے کام کو جاری رکھا۔ پھر زمام قیادت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف منتقل ہوئی اور ابتداء چند سال تک وہ پورا نقشہ بدستور جما رہا جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے قائم کیا تھا"۔ (ص ۳۶ طبع ششم ۱۹۵۵ء)

اس کے بعد "جاہلیت کا حملہ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"مگر ایک طرف حکومت اسلامی کی تیز رفتار وسعت کی وجہ سے کام روز بروز زیادہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ اور دوسری طرف حضرت عثمان جن پر اس کار عظیم کا بار رکھا گیا تھا، ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان کے جلیل القدر پیش رووں کو عطا ہوئی تھیں، اس لئے ان کے زمانہ خلافت میں جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی میں گھس آنے کا موقعہ مل گیا،

حضرت عثمان نے اپنا سر دے کر اس خطرے کا راستہ روکنے کی کوشش کی مگر وہ نہ رکا. اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور انہوں نے اسلام کے سیاسی اقتدار کو جاہلیت کے تسلط سے بچانے کی انتہائی کوشش کی مگر ان کی جان کی قربانی بھی اس انقلاب معکوس کو نہ روک سکی۔ آخر خلافت علیٰ منہاج النبوت کا دور ختم ہوگیا ملک عضوض نے اس کی جگہ لے لی اور اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہوگئی۔

حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد جاہلیت نے مرض سرطان کی طرح اجتماعی زندگی میں اپنے ریشے بتدریج پھیلانے شروع کر دیئے، کیونکہ اقتدار کی کنجی اب اسلام کے بجائے اس کے ہاتھ میں تھی، اور اسلام زور حکومت سے محروم ہونے کے بعد اس کے اثر و نفوذ کو بڑھنے سے نہ روک سکتا تھا. سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ جاہلیت بے نقاب ہو کر سامنے نہ آئی تھی بلکہ "مسلمان" بن کر آئی تھی۔ کھلے دہریے یا مشرکین و کفار سامنے ہوتے تو شائد مقابلہ آسان ہوتا، مگر وہاں تو آگے آگے توحید و رسالت کا اقرار، صوم و صلوٰۃ پر عمل، قرآن و حدیث سے استشہاد تھا اور اس کے پیچھے جاہلیت اپنا کام کر رہی تھی"۔ (ص ۳۶۔ ۳۷)

یہ نقشہ مولانا موصوف. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بیس پچیس سال بعد کا کھینچ رہے ہیں. جب بقول ان کے "جاہلیت" نے اسلام کا نقاب اوڑھ کر اقتدار کی کنجیاں اپنے ہاتھ میں لے لیں اور عالم اسلام میں اسلام کے بجائے جاہلیت کا سکہ چلنے لگا تو اسلام اور مسلمانوں پر کیا گزری؟ اس کی داستان مولانا ہمیں یوں سناتے ہیں:

"جاہلی امارت کی مسند اور جاہلی سیاست کی راہنمائی پر "مسلمان" کا جلوہ افروز ہونا. جاہلی تعلیم کے مدرسے میں "مسلمان" کا معلم ہونا

جاہلیت کی سجادہ پر "مسلمان" کا مرشد بن کر بیٹھنا. وہ زبردست دھوکا ہے جس کے فریب میں آنے سے کم ہی لوگ بچ سکتے ہیں۔

اس معکوس انقلاب کا سب سے زیادہ خطرناک پہلو یہی تھا کہ اسلام کا نقاب اوڑھ کر تینوں قسم کی جاہلیتوں نے اپنی جڑیں پھیلانی شروع کر دیں۔ اور ان کے اثرات روز بروز زیادہ پھیلتے چلے گئے۔

(۱) جاہلیت خالصہ نے حکومت اور دولت پر تسلط جمایا. نام خلافت کا تھا اور اصل میں وہی بادشاہی تھی جس کو اسلام مٹانے کے لئے آیا تھا. بادشاہوں کو الٰہ کہنے کی ہمت کسی میں باقی نہ تھی اس لئے "السُّلطانُ ظِلُّ اللهِ" کا بہانہ تلاش کیا گیا۔ اور اس بہانے سے وہی مطاع مطلق کی حیثیت بادشاہوں نے اختیار کی جو الٰہ کی ہوتی ہے۔

(۲) جاہلیت مشرکانہ نے عوام پر حملہ کیا اور توحید کے راستہ سے ہٹا کر ان کو ضلالت کی بے شمار راہوں میں بھٹکا دیا۔ ایک صریح بت پرستی تو نہ ہو سکتی تھی، باقی کوئی قسم شرک کی ایسی نہ رہی جس نے "مسلمانوں" میں رواج نہ پایا۔

(۵) جاہلیت راہبانہ نے علماء مشائخ زہاد و پاکباز لوگوں پر حملہ کیا، اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کر دیں جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔ اس جاہلیت کے اثر سے اشراقی فلسفہ، راہبانہ اخلاقیات اور زندگی کے ہر پہلو میں مایوسانہ نقطہ نظر مسلم سوسائٹی میں پھیلا اور اس نے نہ صرف ادبیات اور علوم کو متاثر کیا، بلکہ فی الواقع سوسائٹی کے اچھے عناصر کو "مارفیا کا انجکشن" دیکر ست کر دیا، بادشاہی کے جاہلی نظام کو مضبوط کیا، اسلامی علوم و فنون میں جمود اور تنگ خیالی پیدا کی، اور ساری دینداری کو چند خاص مذہبی اعمال میں محدود کر کے رکھ دیا"۔ (ص ۳۸۔ ۴۱)

مولاناکی اس ساری داستاں سرائی کو ایک بار پھر پڑھئے اور دل پر ہاتھ رکھ کر بتایئے کہ جب صحابہ و تابعین کی موجودگی میں جاہلیت نے اسلام کو پچھاڑ دیا اور اقتدار کی کنجیاں تب سے اب تک اسلام کو واپس نہیں مل سکیں تو امت مسلمہ سے زیادہ ناکام کوئی امت ہو سکتی ہے؟ آج کے دہریئے، کمیونسٹ اور لادین عناصر جو اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں کیا وہ ہی سب کچھ خود مولانا مودودی نہیں فرما رہے ہیں؟

اس کے بعد مولانا "مجددین کی ضرورت" کے زیر عنوان ہمیں بتاتے ہیں کہ:

"انہی تینوں اقسام کی جاہلیت کے ہجوم سے اسلام کو نکالنا اور پھر سے چمکا دینا وہ کام تھا جس کے لئے دین کو مجددین کی ضرورت پیش آئی" (ص ۴۱)

اور پھر صفحہ ۴۸ سے ۵۰ تک "کار تجدید" کے عنوان سے مولانا ان شعبوں کی تفصیل بتاتے ہیں جن میں تجدید کا کام ہونا چاہئے، وہ انہی کے الفاظ میں حسب ذیل نو شعبے ہیں (۱) اپنے ماحول کی صحیح تشخیص (۲) اصلاح کی تجویز (۳) خود اپنے حدود کا تعین (۴) ذہنی انقلاب (۵) عملی اصلاح کی کوشش (۶) اجتہاد فی الدین (۷) دفاعی جدوجہد (۸) احیائے نظام اسلامی (۹) عالمگیر انقلاب کی کوشش

ان نو شعبوں کی تشریح کے بعد وہ بتاتے ہیں کہ:

"ان شعبوں پر غائر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدائی تین مدات تو ایسی ہیں جو ہر اس شخص کے لئے ناگریز ہیں جو تجدید کی خدمت انجام دے، لیکن باقی چھ مدیں ایسی ہیں جن کا جامع ہونا مجدد ہونے کے لئے شرط نہیں، بلکہ جس نے ایک یا دو، تین یا چار شعبوں میں کوئی نمایاں کارنامہ انجام دیا ہو وہ بھی مجدد قرار دیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس قسم کا مجدد جزوی ہوگا۔ کامل مجدد نہ ہوگا۔ کامل مجدد صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو ان تمام شعبوں میں پورا کام انجام دے کر وراثت نبوت کا حق ادا کر دے"۔ (ص ۵۰)

سوال یہ ہے کہ اسلام کی جاہلیت کے نرغے سے نکالنے کے لئے اس امت میں کوئی کامل مجدد بھی ہوا یا نہیں؟ اور کسی بندہ خدا کو بھی "وراثت نبوت کا حق" ادا کرنے کی ہمت ملی یا نہیں؟ اس کا جواب مولانا مودودی نفی میں دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ:

"تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی کامل مجدد پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے ان میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے میں یا چند شعبوں ہی میں کام کیا ——— مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے۔ فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا "لیڈر" پیدا ہو. خواہ اس دور میں پیدا ہو یا زمانے کی ہزاروں گردشوں کے بعد پیدا ہو. اسی کا نام "الامام المھدی" ہو گا (ص ۵۱)

یہ ہے وہ خلاصہ جو میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ مولانا مودودی کی تنقیدی نظر میں آج تک کوئی مرد کامل اس امت میں پیدا نہیں ہوا. ظاہر ہے کہ آپ کسی شخص پر اعتماد تو جبھی کریں گے جب کہ اسے کسی درجے میں بھی "معیاری آدمی" سمجھیں گے جب مولانا کے نزدیک امت میں کوئی معیاری آدمی ہوا ہی نہیں تو وہ پوری امت کو تنقید سے بالاتر کیوں سمجھیں گے اور اس پر اعتماد کیوں کرینگے؟

البتہ مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کی ہمت لائق داد ہے۔ مولانا ہمیں بتاتے ہیں۔ کہ صحابہ کرامؓ کے ابتدائی دور سے لیکر اسلام پر جاہلیت کا قبضہ چلا آتا ہے۔ بادشاہ الٰہ بنے بیٹھے ہیں۔ عوام مشرکانہ جاہلیت کے دام میں گرفتار ہیں علماء مشائخ لوگوں کو "مارفیا" کے انجکشن دے رہے ہیں۔ اسلام جاہلیت کے چنگل میں پھڑ پھڑا رہا ہے مگر کوئی صحابی۔ کوئی تابعی . کوئی امام۔ کوئی محدث. کوئی مجدد ایسا نہیں اٹھتا جو آگے بڑھ کر جاہلیت سے اقتدار کی کنجیاں چھین لے۔ گویا چودہ سو سال کی پوری

امت وراثت نبوت کا حق ادا کرنے سے محروم ہے۔ یا تو خود جاہلیت کے گماشتہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے یا جاہلیت کے فریب اور دھوکے میں مبتلا ہے۔ اس امت میں مجدد بھی آتے ہیں تو بس جزوی قسم کے کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ ان میں کرنے کا اصل کام ایک بھی نہیں کرتا۔ بلکہ مولانا کے بقول پوری امت "وراثت نبوت کا حق ادا کرنے" سے محروم رہتی ہے۔ بتایئے! اس سے بڑھ کر اس امت کے اپاہج اور بانجھ ہونے کی کوئی اور تعبیر ہو سکتی ہے؟ مولانا نے اس امت کی جو تصویر کھینچی ہے میں دوسروں کی بات نہیں کرتا کم از کم اپنے اسلاف کے بارے میں مولانا کا مرتب کردہ نقشہ دیکھ کر شرم کے مارے سر جھک جاتا ہے۔ میں مولانا مودودی اور ان کے رفقاء کی حوصلہ مندی کی داد دیتا ہوں کہ ان ساری باتوں کے باوجود اس اپاہج امت میں اپنے آپ کو شمار کرتے ہوئے انہیں ذرا جھجک اور شرم محسوس نہیں ہوتی۔

مولانا نے امت مرحومہ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان پر مفصل بحث کا موقعہ نہیں۔ مختصراً اتنا عرض کروں گا کہ اگر اس کہانی کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو یہ امت "خیر امت" نہیں رہتی۔ بلکہ نعوذ باللہ شرامت بن جاتی ہے۔ اس لئے مولانا کی یہ ساری کہانی ایک تخیلاتی کہانی ہے۔ جو رافضی طرز فکر سے مستعار لی گئی ہے۔ اسلاف امت کو بدنام کرنے اور نئی نسل کا ذہنی رابطہ ان سے کاٹنے کے سوا اس کا کوئی مقصد اور کوئی نتیجہ نہیں۔ جو شخص مولانا مودودی کے تصورات و افکار پر ایمان بالغیب رکھتا ہو وہ ایسے صحیح سمجھتا ہے تو سمجھا کرے۔ لیکن جو شخص اسلام کی ابدیت۔ قرآن و سنت کی نصوص قطعیہ اور نبوت محمدیہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی صداقت پر ایمان رکھتا ہو وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مولانا کی اس ژولیدہ فکری پر ایمان نہیں لا سکتا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ گزشتہ صدیوں کی پوری امت فرشتہ صفت رہی۔ اور کسی فرد سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوئی نہ میں کج کلاہ بادشاہوں، کجرو عوام یا کج طینت علمائے سوء اور دوکاندار صوفیوں کی وکالت کرنا چاہتا ہوں۔ میں جس چیز کے خلاف احتجاج

کر رہا ہوں وہ مولانا کی یہ منطق ہے کہ یہ امت مجموعی طور پر اسلام کے بجائے جاہلیت کی نمائندہ بن گئی تھی. اسلام اس کے نزدیک محض ثانوی چیز بن گیا تھا. اور چند گنے چنے افراد ہی اپنی انفرادی زندگی میں اسلامی تعلیمات کے حامل تھے ... مولانا کے بقول:

" جو مقصد اصل انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا تھا اس کے لئے یہ دونوں چیزیں ناکافی تھیں. نہ یہ بات کافی تھی کہ اقتدار جاہلیت کے ہاتھ میں ہو اور اسلام محض ایک ثانوی قوت کی حیثیت سے کام کرے. اور نہ یہی بات کافی تھی کہ چند افراد یہاں اور چند وہاں محدود انفرادی زندگیوں میں اسلام کے حامل بنے رہیں. اور وسیع تر اجتماعی زندگی میں اسلام اور جاہلیت کے مختلف النوع مرکبات پھیلے رہیں۔ لہذا دین کو ہر دور میں ایسے طاقت ور اشخاص. گروہوں اور اداروں کی ضرورت تھی اور ہے جو زندگی کی بگڑی ہوئی رفتار کو بدل کر پھر سے اسلام کی طرف پھیر دیں" ۔ (تجدید و احیائے دین ص ۴۲)

مولانا صراحت کے ساتھ کہہ رہے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ربع صدی بعد میں پوری کی پوری امت انبیاء کرام کی بعثت کے اصلی مقصد کو فراموش کر بیٹھی تھی. اور یہ ایک ایسا جرم ہے جو پوری امت اور اس کے تمام اکابر کو بدترین مجرم کی حیثیت دیتا ہے۔ اس لئے دو باتوں میں سے ایک بہر حال غلط ہے۔ یا تو مولانا مودودی. انبیاء کرام علیہم السلام کے اصل مشن کو نہیں سمجھے. یا انہوں نے اس امت کے بارے میں صحت فکر سے کام نہیں لیا۔ اور نئی نسل کے سامنے صحابہ کرام تابعینؒ عظام اور اکابر امت کو مجرم کی حیثیت سے پیش کر کے نہ صرف امت مرحومہ سے بلکہ خود اپنی سلامتی فکر سے بھی بے انصافی کی ہے۔ نئی نسل کو اسلاف امت سے بدظن کرنا کوئی ایسا بڑا کارنامہ نہیں جس کے لئے ہمیں مولانا مودودی کے قلم کی احتیاج ہوتی۔ یہ کام شیعہ. روافض وغیرہ تو شروع ہی سے کرتے آرہے تھے۔ چنانچہ

دور میں قادیانی۔ چکڑالوی، پرویزی۔ کمیونسٹ اور سارے ملاحدہ یہی کچھ کر رہے ہیں۔ جس کو کسی نئے فکر کی بنیاد ڈالنی ہو وہ سب سے پہلے اسلاف امت ہی سے ٹکراتا ہے، بدقسمتی سے یہی خدمت مولانا مودودی کے تیز رو قلم نے انجام دی ہے۔

(۴) پوری امت کو اپاہج اور ناکارہ باور کرانے کے بعد امت کے جلیل القدر قائدین کے کارناموں میں کیڑے نکالنے بھی ضروری تھا۔ تاکہ نئی نسل کے دل و دماغ میں کسی بزرگ کی عقیدت و احترام کا داغ دھبہ باقی نہ رہے۔ اور خدانخواستہ مولانا کا کوئی نیاز مند اسلاف امت میں سے کسی کی "ذہنی غلامی" کا شکار نہ ہو جائے. چنانچہ مولانا نے یہ فریضہ بھی بڑی بلند آہنگی سے انجام دیا۔ امت اسلامیہ میں چند ہی افراد ایسے تھے جن کا تجدیدی کارنامہ مولانا کے نزدیک لائق ذکر تھا۔ یعنی خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز۔ ائمہ اربعہ (امام ابو حنیفہ"، امام مالک"، امام شافعی". امام احمد بن حنبل") امام غزالی"۔ امام ابن تیمیہ"۔ امام ربانی مجدد الف ثانی امام الہند شاہ ولی اللہ دہلوی"۔ امیر المومنین سید احمد بریلوی اور مولانا محمد اسماعیل شہید" اقدس اللہ اسرار ھم۔ ——

ہم سیدنا عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں تو مولانا کا ارشاد پہلے گزر چکا ہے کہ "قریب تھا کہ عمر بن عبدالعزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر۔ وہ کامیاب نہ ہو سکے"

ائمہ اربعہ" کا کارنامہ ان کے نزدیک صرف یہ ہے کہ انہوں نے اصول دین سے اسلام کے قوانین کو تفصیلی شکل میں مرتب کر دیا. لیکن مولانا کے بقول انبیاء علیہم السلام کے مشن کے لئے انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ گویا کرنے کا جو اصلی کام تھا اس کو انہوں نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔

امام غزالی" کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

"امام غزالی" کے تجدیدی کام میں علمی و فکری حیثیت سے چند نقائص بھی تھے۔ اور وہ تین عنوانات پر تقسیم کئے جاسکتے ہیں۔ ایک قسم ان نقائص کی جو حدیث کے علم میں کمزور ہونے کی وجہ سے ان کے کام میں

پیدا ہوئے۔ دوسری قسم ان نقائص کی جو ان کے ذہن پر عقلیات کے غلبہ کی وجہ سے تھے، اور تیسری قسم ان نقائص کی جو تصوف کی طرف ضرورت سے زیادہ مائل ہونے کی وجہ سے تھے"۔ (تجدید واحیائے دین ص ۷۸)

امام غزالیؒ کے بعد شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ کا نام آتا ہے۔ ان کے تجدیدی کام کا اختتام یہاں ہوتا ہے:

"تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ اٹھاسکے جس سے نظام حکومت میں انقلاب برپا ہوتا اور اقتدار کی کنجیاں جاہلیت کے قبضہ سے نکل کر اسلام کے ہاتھ میں آجاتیں"۔ (ص ۸٦)

ابن تیمیہؒ کے بعد مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ اور مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ کے تجدیدی کارناموں کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے:

"پہلی چیز جو مجھ کو حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وقت سے شاہ صاحب اور ان کے خلفاء تک کے تجدیدی کام میں کھٹکی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے تصوف کے بارے میں مسلمانوں کی بیماری کا پورا اندازہ نہیں لگایا. اور نادانستہ ان کو پھر وہی غذا دیدی جس سے مکمل پرہیز کرانے کی ضرورت تھی۔ حاشا کہ مجھے فی نفسہ اس تصوف پر اعتراض نہیں ہے جو ان حضرات نے پیش کیا. وہ بجائے خود اپنی روح کے اعتبار سے اسلام کا اصل تصوف ہے. اور اس کی نوعیت احسان سے کچھ مختلف نہیں لیکن جس چیز کو میں لائق پرہیز کہہ رہا ہوں وہ متصوفانہ رموز واشارات اور متصوفانہ زبان کا استعمال اور متصوفانہ طریقے سے مشابہت رکھنے والے طریقوں کو جاری رکھنا ہے ......" (ص ۱۳۱)

مولانا کو تصوف کے نام. اس کی اصطلاحات اور اس کے طور وطریق سے چڑ ہے۔ وہ ان اکابر کے تصوف کو "غیر اسلامی" کہنے کی جرات تو کر نہیں سکتے. مگر ان کے

تصوف کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"پس جس طرح پانی جیسی حلال چیز بھی اس وقت ممنوع ہو جاتی ہے جب وہ مریض کے لئے نقصان دہ ہو۔ اسی طرح یہ قالب بھی مباح ہونے کے باوجود اسی بناء پر قطعی چھوڑ دینے کے قابل ہو گیا ہے اس لباس میں مسلمانوں کو "افیون کا چسکا لگایا گیا ہے۔ اور اس کے قریب جاتے ہی ان مزمن مریضوں کو پھر وہی "چنیا بیگم" یاد آجاتی ہے جو صدیوں تک ان کو تھپک تھپک کر سلاتی رہی ہے"۔ (ص ۱۳۲)

"مسلمانوں کے اس مرض سے نہ حضرت مجدد ناواقف تھے۔ نہ شاہ صاحب۔ دونوں کے کلام میں اس پر تنقید موجود ہے۔ مگر غالبًا اس مرض کی شدت کا انہیں پورا اندازہ نہ تھا یہی وجہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے ان بیماروں کو پھر وہی غذا دے دی جو اس مرض میں مہلک ثابت ہو چکی تھی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ دونوں کا حلقہ پھر اسے پرانے مرض سے متاثر ہوتا چلا گیا" (ص ۱۳۳)

"اگرچہ مولانا اسماعیل شہید رحمتہ اللہ علیہ نے اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ کر ٹھیک وہی روش اختیار کی جو ابن تیمیہ" کی تھی۔ لیکن شاہ ولی اللہ صاحب کے لٹریچر میں تو یہ سامان موجود تھا۔ جس کا کچھ اثر شاہ اسماعیل شہید کی تحریروں میں بھی باقی رہا اور پیری مریدی کا سلسلہ بھی سید صاحب کی تحریک میں چل رہا تھا۔ اس لئے "مرض صوفیت" کے جراثیم سے۔ یہ تحریک پاک نہ رہ سکی۔" (ص ۱۳۴)

یہ امت محمدیہ کے وہ اکابر ہیں جن کو پوری امت کے چیدہ اور منتخب افراد کی حیثیت میں مولانا نے پیش کیا ہے۔ ان کے بارے میں مولانا نے جو تنقید کی ہے کوئی احمق ہی ہو گا جو مولانا کی تنقید کو حق بجانب سمجھنے کے بعد ان اکابر پر اعتماد کرے اور ان کی روش کو لائق تقلید سمجھے۔ مولانا نے "تجدید" کے جن نو شعبوں کا تذکرہ کیا ہے اسے ایک بار پھر پلٹ کر دیکھ لیجئے۔ ان میں سب سے پہلے نمبر پر مولانا نے "اپنے ماحول کی صحیح تشخیص" کو ذکر کیا تھا۔ اور حافظ ابن تیمیہ کو مستثنیٰ کرنے کے بعد امام غزالیؒ

" سے شاہ اسمٰعیل شہید" تک تمام اکابر کے بارے میں ان کی رائے یہ ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے مرض کا صحیح اندازہ ہی نہیں لگایا۔ بلکہ انہیں پھر "مارفیا کے انجکشن" دیتے رہے۔ ان دونوں باتوں کو ایک ساتھ ملاحظہ کیجئے تو معلوم ہو گا کہ یہ حضرات مجدد تو کیا ہوتے اس کی پہلی شرط کو پورا کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھے۔ کیونکہ یہ تمام اکابر خود صوفی تھے. اور مولانا کے نزدیک "صوفیت" ہی مسلمانوں کی اصل بیماری ہے۔ گویا یہ حضرات تو خود ہی صوفیت کے مریض تھے اور "چینا بیگم" سے شغل فرماتے تھے. وہ امت مسیحائی کیا کرتے —— جب اس امت کے ان چیدہ و برگزیدہ افراد کا یہ حال ہے. جنہیں دنیا مجدد اسلام مانتی ہے اور جن کی عظمت کے سامنے خود مولانا کے قلم کا سر بھی خم ہے تو امت کے باقی علماء و صلحاء کا کیا حال ہو گا؟ اس کا اندازہ مولانا مودودی کے نقطۂ نظر سے خود ہی کر لیجئے۔ ع

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

(۵) جب پوری امت کے اکابر مولانا مودودی اور ان کے نیاز مندوں کے اعتماد واحترام سے محروم ہوئے تو ان کے ذریعہ اور واسطہ سے جو اسلامی علوم ہم تک پہنچے ان پر اعتماد کیسے ممکن تھا؟ چنانچہ مولانا نے علوم اسلامی میں سے ایک ایک کا نام لے کر اس پر بے اعتمادی کا اظہار فرمایا. اپنے نیاز مندوں کے ذہن میں یہ بات خوب اچھی طرح راسخ کر دی کہ تمام اسلامی علوم میں نئے اجتہاد کی ضرورت ہے. علم تفسیر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"قرآن کے لئے کسی تفسیر کی حاجت نہیں۔ ایک اعلیٰ درجہ کا پروفیسر کافی ہے جس نے قرآن کا بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہو اور جو جدید طرز پر قرآن پڑھانے اور سمجھانے کی اہلیت رکھتا ہو —— وہ اپنے لکچروں سے انٹرمیڈیٹ میں طلبہ کے اندر قرآن فہمی کی ضروری استعداد پیدا کرے گا. پھر بی اے میں ان کو پورا قرآن اس طرح پڑھا دے گا کہ وہ عربیت میں بھی کافی ترقی کر جائیں گے۔ اور اسلام کی روح سے بھی بخوبی واقف

ہو جائیں گے" (تنقیحات ص ۱۹۳ طبع چہارم)

علم حدیث کے بارے میں تفہیمات میں صفحہ ۲۸۷ سے صفحہ ۲۹۸ تک "مسلک اعتدال" کے عنوان سے مولانا کا ایک مضمون ہے اس میں موصوف نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی حدیث کا "صحیح" ہونا حضرات محدثین کی تصریح پر موقوف نہیں بلکہ دراصل مزاج شناسی رسول پر موقوف ہے۔ مشہور منکر حدیث مسٹر غلام احمد پرویز نے ایک موقعہ پر لکھا تھا کہ حدیث کے بارے میں میری رائے بھی اس سے زیادہ سخت نہیں جو مولانا نے ظاہر فرمائی ہے۔ مولانا کی رائے کا خلاصہ انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"محدثین رحہم اللہ کی خدمات مسلم. یہ بھی مسلم کہ نقد حدیث کے لئے جو مواد انہوں نے فراہم کیا ہے وہ صدر اول کے اخبار و آثار کی تحقیق میں بہت کار آمد ہے۔ کلام اس میں نہیں بلکہ صرف اس امر میں ہے کہ کلیتہً ان پر اعتماد کرنا کہاں تک درست ہے؟ وہ بہرحال تھے تو انسان ہی. انسانی علم کے لئے جو حدیں فطرۃً اللہ نے مقرر کر رکھی ہیں ان سے آگے تو وہ نہیں جا سکتے تھے۔ انسانی کاموں میں جو نقص فطری طور پر رہ جاتا ہے اس سے تو ان کے کام محفوظ نہ تھے۔ پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ جس کو وہ صحیح قرار دیتے ہیں وہ حقیقت میں بھی صحیح ہے؟ (ص ۲۹۲ طبع چہارم)

چونکہ مولانا کو صحابہ کرامؓ سے خاص عقیدت ہے اس لئے وہ صحابہ کرام پر جرح کا کوئی نہ کوئی موقع تلاش کر لیتے ہیں۔ احادیث کا مدار چونکہ راویوں پر ہے۔ اور حدیث کے سب سے پہلے راوی چونکہ صحابہ کرامؓ تھے اس لئے حدیث کے سلسلہ سند کو مشکوک کرنے کے لئے دیگر راویان حدیث کے علاوہ خود صحابہ کرامؓ پر خاک اڑانا ضروری تھا۔ چنانچہ مولانا لکھتے ہیں:

"اول تو رواۃ کی سیرت اور ان کے حافظہ اور ان کی دوسری باطنی

خصوصیات کے متعلق بالکل صحیح علم حاصل ہونا مشکل. دوسرے خود وہ لوگ جو ان راویوں کے متعلق رائے قائم کرنے والے تھے. انسانی کمزوریوں سے مبرا نہ تھے" (ص ۲۹۲۔ ۲۹۳)

اس ضمن میں آگے لکھتے ہیں:

"ان سب سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ بسا اوقات صحابہ رضی اللہ عنہم پر بھی بشری کمزوریوں کا غلبہ ہو جاتا تھا اور وہ ایک دوسرے پر چوٹیں کر جایا کرتے تھے"۔ (ص ۲۹۴)

چونکہ مولانا کے نزدیک علم حدیث لائق اعتبار نہیں جب تک کہ وہ ان کی مزاج شناسی رسول پر پورا نہ اترے اس لئے وہ صحیح. مستند اور پوری امت کی مسلمہ احادیث تک کو بلا تکلف ٹھکرا دیتے ہیں۔ اس کی متعدد مثالیں میرے سامنے ہیں. مگر طوالت کے خوف سے ان کو قلم انداز کرتا ہوں۔

علم تفسیر و حدیث کے بعد علوم اسلامیہ میں سب سے اہم اور عظیم الشان علم. فقہ ہے. اس سے تو مولانا کو اس حد تک نفرت ہے کہ بعض اوقات وہ اس پر دوزخ کی وعیدیں تک سنا دیتے ہیں:۔۔۔۔ " حقوق الزوجین " میں ایک بحث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"قیامت کے روز حق تعالیٰ کے سامنے ان گناہ گاروں کے ساتھ ساتھ ان کے دینی پیشوا بھی پکڑے ہوئے آئیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے پوچھے گا کہ کیا ہم نے تم کو علم و عقل سے اس لئے سرفراز کیا تھا کہ تم اس سے کام نہ لو. کیا ہماری کتاب اور ہمارے نبی کی سنت تمہارے پاس اس لئے تھی کہ تم اس کو لئے بیٹھے رہو اور مسلمان گمراہی میں مبتلا ہوتے رہیں۔

ہم نے اپنے دین کو یسر بنایا تھا۔ تم کو کیا حق تھا کہ اسے عسر بنا دو. ہم نے قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا تم پر یہ کس

نے فرض کیا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو، ا۔
ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا۔ تم سے کس نے کہا کہ قرآن
کو ہاتھ نہ لگاؤ، اور اپنے لئے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو۔
اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنزالدقائق،
ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی، البتہ
جہلاء کو جواب دہی کرنے کا یہ موقعہ ضرور مل جائے گا کہ ۲۔

رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۞ رَبَّنَآ
اٰتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيْرًا ۞ (حقوق الزوجین ص۹۱)

مولانا کی یہ پوری عبارت اسلاف امت اور فقہائے امت کے بارے میں ان کی قلبی کیفیت کا آئینہ ہے اس کے ایک ایک لفظ سے بغض و نفرت کی وہ کیفیت ٹپک رہی ہے جو کسی مسلمان کو ادنیٰ مسلمان سے نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ اسلاف امت سے؟ قرآن کریم کی جو دو آیتیں مولانا نے اس مقام پر لکھی ہے ۳؎ وہ کفار کے بارے میں ہیں کہ وہ قیامت کے دن خدا کے حضور یہ کہیں گے کہ یااللہ! ہم کو انبیاء علیہم السلام کی دعوت پر لبیک کہنے سے ہمارے سرداروں اور بڑوں نے روکا تھا ہم ان کے زیر اثر تھے، اس لئے اصل قصور ان کا ہے، انہیں دوہرا عذاب دیجئے۔ اور ان کو سخت لعنت کا مورد بنایئے۔

اکابر امت کے بارے میں میں مولانا کی یہ تحریر پڑھتا ہوں تو مجھے یہ فیصلہ کرنا

ا۔ گویا مولانا نے پہلے یہ طے کر رکھا ہے کہ امت اسلامیہ کے سلف صالحین قرآن و حدیث کی پیروی نہیں کرتے تھے بلکہ ان کے فتوے قرآن و حدیث کے خلاف ہوتے تھے۔ استغفراللہ۔

۲۔ ان دونوں آیتوں کا ترجمہ مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں کیا ہے "اے رب ہمارے ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں راہ راست سے بے راہ کر دیا۔ اے رب! ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر" (تفہیم القرآن جلد ۴ ص ۱۳۴ طبع ششم جون ۱۹۷۳ء)

۳۔ نئے ایڈیشن میں یہ آیتیں حذف کر دی گئی ہیں۔

مشکل ہو جاتا ہے کہ مولانا یہ عبارت لکھتے وقت غنودگی کی حالت میں تھے یا وہ خارجیوں کی طرح اسلاف امت کو واقعتہً خارج اسلام ہی سمجھتے ہیں۔ کنزالدقائق، ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین تو (اپنی جلالت قدر کے باوجود) محض ناقل ہیں۔ ان کا جرم تو بس اتنا ہے کہ انہوں نے یہ مسائل اپنی اپنی کتابوں میں نقل کر دیئے ہیں۔ ورنہ یہ مسائل خود ان کے نہیں۔ بلکہ ائمہ اجتہاد (امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد رحمہم اللہ) کے ہیں جو انہوں نے قرآن و سنت سے نکالے ہیں۔ کیا مولانا کے نزدیک یہی اکابر "کافروں کے سردار" ہیں جن کو دوہرا عذاب دینے اور ان پر سخت لعنت کرنے کا قرآن کریم نے ذکر کیا ہے۔

صد حیف کہ آج کا ایک لکھا پڑھا آدمی جو بدقسمتی سے منصب اجتہاد کی بلندیوں سے ناآشنا ہے اور جس کے لئے ائمہ سلف کی عبارت کا صحیح سمجھنا اور اسے اپنی زبان میں منتقل کرنا بھی مشکل ہے۔ وہ امت کے ائمہ اجتہاد کو "کافروں کے سرداروں" میں شامل کر دیتا ہے کیوں؟ محض اس لئے کہ اسے اپنی رائے کی تائید میں ائمہ اجتہاد کا کوئی فتویٰ نہیں ملتا۔ انصاف کیجئے کیا عقل و دانش کی رو سے صرف۔ اتنی بات اس بات کا جواز پیدا کر دیتی ہے کہ اکابر امت کو اتنی بڑی گالی دے ڈالی جائے؟

میں قبل ازیں بتا چکا ہوں کہ اس علم نما جہل کے دور میں دین پر ثابت قدم رہنے کے لئے اسلاف امت اور ائمہ اجتہاد کی انگلی پکڑ کر چلنا لازم ہے. یہ سہارا نہ ہو تو آج کا علم آدمی کے دین و ایمان کی حفاظت کے لئے کافی نہیں کیونکہ اگر اسلاف امت پر اعتماد نہ کیا جائے تو شیطان بہت جلد آدمی کے نفس امارہ کو علم کے ٹٹو پر سوار کر کے ہوا و ہوس کی وادیوں میں بھٹکا دیتا ہے. اور کسی کو پرویز. کسی کو چکڑالوی. اور کسی کو غلام احمد قادیانی بنا دیتا ہے ـــــ لیکن صد حیف! کہ مولانا مودودی اسلاف امت کی اتباع کو. جو تریاق ایمان ہے. ہر گناہ سے بڑا گناہ ٹھہراتے ہیں۔ اور "ذہنی غلامی" کہہ کر اس کا مذاق اڑاتے ہیں. ملاحظہ ہو:

"میرے نزدیک صاحب علم آدمی کے لئے تقلید ناجائز اور گناہ بلکہ اس سے بھی کچھ شدید تر چیز ہے۔ مگر یہ یاد رہے کہ اپنی تحقیق کی بنا پر کسی ایک سکول کے طریقے اور اصول کی اتباع کرنا اور چیز ہے۔ اور تقلید کی قسم کھا بیٹھنا بالکل دوسری چیز ہے۔ اور یہی آخری چیز ہے جسے میں صحیح نہیں سمجھتا" ____

(رسائل و مسائل ص ۲۴۴ ج ۱ طبع سوم ۱۹۵۷ء)

مولانا کی یہ رائے بھی خود رائی ہے۔ اور اس غلط رائے کا اصل منشایہ غلطی ہے کہ مولانا ہر حرف خواں کو صاحب علم سمجھتے ہیں۔ اور ہر صاحب علم کو مجتہد کا منصب تفویض کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں مولانا نے اگر ذرا بھی غور و تامل سے کام لیا ہوتا تو انہیں نظر آتا کہ اجتہاد کا مقام بہت بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چوتھی صدی کے بعد مجدد الف ثانیؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تک پوری امت تقلید پر متفق چلی آتی ہے کیا یہ سارے اکابر مولانا کے نزدیک "صاحب علم آدمی" نہیں تھے؟ اور کیا وہ ائمہ اجتہاد کی تقلید کر کے مولانا کے بقول "ناجائز گناہ بلکہ اس سے کچھ شدید تر چیز کے مرتکب تھے ____؟

اصل بات وہی ہے جس کو میں عرض کرتا آرہا ہوں کہ مولانا کو صحابہ کرامؓ سے لیکر بعد کی صدیوں تک کے اکابر امت میں سے کسی پر اعتماد نہیں۔ اس لئے ان کے واسطے سے جو علوم نبوت ہم تک پہنچے ہیں مولانا ان پر بھی اعتماد کرنے کو تیار نہیں۔

علم فقہ کے بعد دین کا ایک اہم ترین شعبہ۔ جس کو پورے دین کی روح کہنا بے جا نہ ہو گا۔ علم تصوف ہے۔ جس کو حدیث جبرئیلؑ میں "احسان" کے لفظ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

قرآن کریم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تین فرائض نبوت بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) آیات کی تلاوت (۲) کتاب و حکمت کی تعلیم (۳) تزکیہ ____ یہ

تینوں فرائض اپنی جگہ اہم ترین مقاصد ہیں۔ مگر ان میں بھی الاہم فالاہم کی ترتیب ہے۔ چنانچہ تلاوت آیات تمہید ہے تعلیم کتاب و حکمت کی۔ اور تعلیم کتاب و حکمت تمہید ہے تزکیہ کی۔ گویا نبوت کا کام تلاوت آیات سے شروع اور تزکیہ پر ختم ہوتا ہے. اس لئے مقاصد نبوت میں سب سے بڑا. سب سے عالی سب سے اہم اور غایت الغایات مقصد تزکیہ ہے۔ جسے دوسرے الفاظ میں تعمیر سیرت یا انسان سازی کہا جاتا ہے۔ بلاشبہ تلاوت آیات بھی ایک اہم مقصد ہے۔ کوئی شک نہیں کہ کتاب و حکمت کی تعلیم بھی بہت بڑا عالی شان منصب ہے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ اہم مقصد ہونے کے باوجود تزکیہ کے لئے تمہید اور مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے ــــ شائد یہی نکتہ ہے کہ قرآن کریم میں ان کا سہ گانہ فرائض نبوت کا ذکر کرتے ہوئے تلاوت آیات کو ہمیشہ مقدم رکھا گیا ہے۔ جب کہ تزکیہ کو ایک جگہ تعلیم کتاب و حکمت سے مؤخر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ہر جگہ اسے مقدم کیا گیا ہے۔ یا اشارہ ہے کہ تلاوت آیات کے بغیر نبوت کے کام کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ کہ علوم نبوت کا اول و آخر اور مبدا و غایت تزکیہ ہے۔ واللہ اعلم

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی بیک وقت ان تمام فرائض کی متکفل تھی۔ آپؐ صحابہ کرامؓ کو خود قرآن کریم کے الفاظ بھی پڑھاتے تھے۔ اس کے مفہوم و معانی اور احکام و مسائل کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ اور ان کا تزکیہ اور اصلاح و تربیت فرماتے تھے۔

آپؐ کے بعد جب یہ وراثت نبوت امت کے سپرد ہوئی تو ان تینوں شعبوں پر الگ الگ کام ہونے لگا۔ اگرچہ اکابر امت میں بہت سی ہستیاں ایسی بھی ہوئیں جو بیک وقت تینوں کی جامع تھیں. مگر عام طور پر تلاوت آیات کا شعبہ ایک مستقل جماعت نے سنبھالا. تعلیم کتاب و حکمت کے مختلف النوع شعبوں کے الگ الگ رجال کار پیدا ہوئے اور ایک جماعت اصلاح و تربیت اور تزکیہ نفوس کی خدمت میں لگ گئی. جن اکابر امت نے اپنے آپ کو اس تیسرے شعبے کے لئے وقف کر دیا وہ صوفیاء کرام اور

پیران طریقت کے نام سے معروف ہوئے اور ان کا شعبہ کا نام "سلوک و تصوف" ٹھہراء۔

اس مختصر سی وضاحت سے معلوم ہوا ہو گا کہ تصوف. شریعت محمدیہ وعلیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و السلام) سے کوئی الگ چیز نہیں. اور نہ صوفیاء کرام ہی کسی اور جہان کی مخلوق ہیں۔ جن کے نام سے بد کا جائے. بلکہ تصوف وراثت نبوت کا ایک مستقل شعبہ اور وظائف نبوت میں سے ایک مستقل وظیفہ ہے اور صوفیاء کرام اس وراثت نبوت کے امین اور اس عظیم الشان شعبہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم اور آپ کے جانشین ہیں۔ اور یہ شعبہ اس قدر اہم اور اتنا نازک ہے کہ نہ اس کے بغیر مقاصد نبوت کی تکمیل ہوتی ہے. اور نہ یہ امت ہی اپنے اس فریضہ سے عہدہ بر آ ہوتی ہے جو اس کے ذمہ عائد کیا گیا ہے۔

حضرات صوفیاء کرام پوری امت کی جانب سے تشکر و امتنان اور جزائے خیر کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس نازک ترین فریضہ کو سنبھالا. اور نہایت خاموشی اور یکسوئی کے ساتھ افراد امت کی اصلاح و تربیت. تزکیہ. نفوس اور انسان سازی کا کام کیا. اگر یہ نہ ہوتا تو یہ امت وراثت نبوت کے اس شعبہ سے محروم. عالم نما جاہلوں کی بھیڑ ہوتی۔

امت کو اگر میدان جہاد میں سربکف جانبازوں کی ضرورت ہے. اگر مکاتب و مدارس اور دانش کدوں میں لائق اساتذہ کی ضرورت ہے. اگر ایوان عدالت میں عدل پرور قاضیوں اور ججوں کی ضرورت ہوتی ہے. اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے شعبہ میں تحقیق کرنے والوں کی ضرورت ہے. اگر ہر شعبہ زندگی کو زندہ و توانا. رکھنے کے لئے الگ الگ متخصصین کی ضرورت ہے تو یقیناً انسان سازی کے کارخانوں میں انسانوں کو انسان بنانے والوں کی ضرورت ہے انسان سازی کے یہ کارخانے خانقاہیں ہیں۔ اور جو حضرات انسان سازی کا کام کر رہے ہیں انہیں صوفیاء کہا جاتا ہے۔ میری طرح مولانا مودودی نے چونکہ اس کوچہ میں گھوم پھر کر نہیں دیکھا. ادھر بدقسمتی سے زمانے کی فضا کچھ ایسی ہے کہ دنیا کو انسان کے گرد و پیش پھیلی ہوئی چیزوں کی ضرورت تو نظر آتی ہے مگر خود

"انسان" کی انسانیت کو ایک بے ضرورت چیز سمجھ لیا گیا ہے۔ اس لئے عام ذہن یہ بن گیا ہے کہ صوفیاء کرام اور ان کی خانقاہیں دنیا کی سب سے زیادہ بے ضرورت چیز ہیں۔ آخر اس ترقی کے دور میں انہوں نے انسان سازی کی فیکٹریاں کیوں کھول رکھیں ہیں؟ زمانے کی اس فضا سے متاثر ہو کر مولانا مودودی بھی صوفیائے کرام سے بے حد ناراض ہیں اور وہ علم تصوف کا ایسا مذاق اڑاتے ہیں جس کی توقع کم از کم کسی عالم دین سے نہیں کی جا سکتی وہ سمجھتے ہیں کہ جس نے قرآن و حدیث کے نقوش پڑھ لئے اس کی اصلاح آپ سے آپ ہو جاتی ہے اور اسے کسی کے جوتوں میں جا کر بیٹھنے کی ضرورت نہیں. حالانکہ اگر حرف خوانی کا نام نام علم ہوتا. اور اگر اسی سے اصلاح و تزکیہ ہو جایا کرتا تو امام غزالیؒ کو نظامیہ چھوڑ کر مارے مارے پھرنے اور "المنقذ من الضلال" میں اپنی سرگزشت لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اگر علم. صرف "خواندان" کا نام ہوتا تو آج کے مغربی مستشرقین. مولانا سے زیادہ وہ عالم کہلانے کے مستحق ہوتے۔

(۶) چونکہ مولانا مودودی کی نظر میں پوری امت نالائق اعتماد اور اس کے ذریعہ حاصل ہونے والے سارے علوم محل نقد و نظر تھے اس لئے مولانا کو دین فہمی کے لئے صرف اپنے علم و فہم اور اپنی صلاحیتوں پر انحصار کرنا پڑا. وہ لکھتے ہیں:

"میں اپنا دین معلوم کرنے کے لئے چھوٹے یا بڑے علماء کی طرف دیکھنے کا محتاج نہیں ہوں بلکہ خود خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے معلوم کر سکتا ہوں کہ دین کے اصول کیا ہیں۔ اور یہ بھی تحقیق کر سکتا ہوں کہ اس ملک میں جو لوگ دین کے علمبردار سمجھے جاتے ہیں وہ کسی خاص مسئلہ میں صحیح مسلک اختیار کر رہے ہیں یا غلط؟ اس لئے میں اپنی جگہ پر مجبور ہوں کہ جو کچھ قرآن و سنت سے حق پاؤں اسے حق سمجھوں بھی اور اس کا اظہار بھی کر دوں"۔

(روئداد اجتماع جماعت اسلامی الہ آباد ص ۴۳۔ ترجمان القرآن مئی ۱۹۴۶ء

"میں نے دین کو حال یا ماضی کے اشخاص سے سمجھنے کے بجائے ہمیشہ قرآن و سنت ہی سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے میں نے کبھی یہ معلوم کرنے کے لئے کہ خدا کا دین مجھ سے اور ہر مومن سے کیا چاہتا

ہے. یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کہ فلاں اور فلاں بزرگ کیا کہتے ہیں اور کیا کرتے ہیں۔ بلکہ صرف یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں کہ قرآن مجید کیا کہتا ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا کہا"۔ (روئداد جماعت اسلامی حصہ سوم ص ۱۰۲) طبع سوم. مارچ ۱۹۶۳ء)

بغیر واسطہ اسلاف کے دین فہمی کی کوشش ہی دراصل ان تمام فتنوں کی جڑ ہے جو آج ہمارے گردو پیش میں منڈلا رہے ہیں. ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ ہم قرآن و سنت سے دنیا دین معلوم کر رہے ہیں. لیکن ہوتا یہ ہے کہ برعکس اس کے اسلاف امت سے بے نیاز ہو کر لوگ قرآن و سنت کو "معیار حق" بنانے کے بجائے دراصل اپنے فکر و فہم کو "معیار حق" قرار دیتے ہیں۔ مثلاً مسٹر غلام احمد پرویز کا یہ دعویٰ ہے کہ ان کے تمام نظریات کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے (پرویز صاحب حدیث کو نہیں مانتے مگر "سنت" کو ماننے کا دعویٰ وہ بھی کرتے ہیں" قادیانی امت کا دعویٰ ہے کہ وہ جو کچھ کہتی ہے قرآن و سنت سے کہتی ہے. اور ٹھیک یہی دعویٰ مولانا مودودی کا ہے کہ وہ جو کچھ لیتے ہیں بلاواسطہ قرآن و سنت سے لیتے ہیں ـــــ یہ تین فریق جو اپنے نظریات کے کتاب و سنت پر مبنی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں. لفظی طور پر قرآن و سنت کے ماننے سے ان میں سے کسی کو انکار نہیں. بحث یہ ہے کہ قرآن و سنت کے نام سے ہمارے سامنے جو کچھ پیش کیا جاتا ہے وہ صحیح ہے یا غلط؟ اس کے جانچنے کا معیار ہمارے پاس کیا ہے؟ ہم کس کسوٹی پر پرکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا مودودی کے نظریات صحیح ہیں اور مسٹر پرویز اور قادیانی امت کے نظریات غلط ہیں؟ یہ کسوٹی اور یہ معیار اسلاف امت کا فہم ہے. یعنی قرآن و سنت کا جو مفہوم سلف صالحین اور اکابر امت نے سمجھا وہ صحیح ہے.

اور جو اس کے خلاف ہو وہ غلط ہے۔ اس کے برعکس قادیانی. پرویز اور خود مولانا مودودی اس معیار کے قائل نہیں. وہ اس پیمانے کو توڑ دینا چاہتے ہیں. اور دین فہمی میں. حال یا ماضی کے اشخاص کے زیر بار احسان نہیں رہنا چاہتے۔ بلکہ براہ راست

قرآن و سنت سے انہیں جو کچھ سمجھ آئے اسے "دین" سمجھنے پر بضد ہیں. کتاب و سنت سے براہ راست جو کچھ انہوں نے سمجھا ہے وہ ان کے نزدیک حق ہے۔ اور جو اس کے خلاف ہو وہ باطل ہے۔ گویا حق و باطل کا اصل معیار قرآن و سنت نہ ہوا بلکہ قرآن و سنت کا وہ فہم ہوا. جس کا ہر ایک کو دعویٰ ہے۔

یہ ہے وہ اصل نکتہ جس پر مولانا مودودی سے مجھے اختلاف ہے. میرے نزدیک "معیار حق" قرآن و سنت کا وہ فہم ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے زمانے سے آج تک نسلاً بعد نسل متوارث چلا آتا ہے۔ اور مولانا مودودی کے نزدیک حال یا ماضی کے اشخاص کو درمیان میں واسطہ بنانا ہی غلط ہے۔ اس لئے ان کے نزدیک "معیار حق" خود ان کا ذاتی فہم ہے جو براہ راست انہیں قرآن و سنت میں حاصل ہے۔

(۷) سلف صالحین کے بجائے خود اپنی ذاتی رائے اور ذاتی علم و فہم پر اعتماد کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ سلف صالحین کے نزدیک دین کا جو تصور تھا. مولانا کا دینی تصور اس سے مختلف ہوتا. سلف صالحین قرآن حکیم کو جس نقطہ نظر سے دیکھتے تھے. مولانا کا زاویہ نظر اس سے الگ ہوتا۔ ان اکابر کی نظر میں دین کا جو خاکہ. جو نقشہ اور جو نظام تھا. مولانا کے ذہن میں دین کا خاکہ اس سے جدا ہوتا. ایسا ہونا ایک ناگریز امر تھا. اور یہی ہوا.

مولانا مودودی کے نزدیک دین اسلام ایک سیاسی تحریک کا نام ہے جو زمین پر خدا تعالیٰ کا اقتدار اعلیٰ قائم کرنے کے لئے برپا کی گئی۔ مولانا لکھتے ہیں:

> "اسلامی تحریک میں ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ تنہا لیڈر ہیں جن کی زندگی میں ہم کو اس تحریک کی ابتدائی دعوت سے لے کر اسلامی اسٹیٹ کے قیام تک اور قیام کے بعد اس اسٹیٹ کی شکل و دستور تک ایک ایک مرحلے اور ایک ایک پہلو کی پوری پوری تفصیلات اور نہایت مستند تفصیلات ملتی ہیں"۔

"اس دوران میں تحریک کے "لیڈر" نے اپنی تحریک کے اصول کا اور ہر اس چیز کا جس کے لئے یہ تحریک اٹھی تھی. پورا پورا مظاہرہ کیا ہے"۔

"مگر جس لیڈر کو اللہ نے راہنمائی کے لئے مقرر کیا تھا. اس نے دنیا کے اور خود اپنے ملک کے ان بہت سے مسائل میں سے کسی ایک مسئلہ کی طرف بھی توجہ نہ دی ا ۔ بلکہ دعوت اس چیز کی طرف دی کہ خدا کے سوا تمام الٰہوں کو چھوڑ دو اور صرف اسی اللہ کی بندگی قبول کرو"۔

(اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے ص ۲۳ ص ۲۴ ص ۳۲)

اسلام کو ایک سیاسی تحریک کی حیثیت سے پیش کرنا اور انبیاء کرام کو اس تحریک کے "لیڈر" قرار دینا دین کا وہ تصور ہے جس سے اس کی روح مسخ ہو کر رہ جاتی ہے. اور اس کا پورا نظام کچھ کا کچھ بن جاتا ہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور ارشاد گرامی ہے۔ جس کو ہر عام و خاص جانتا ہے کہ اسلام کی بناء پانچ چیزوں پر ہے۔ (۱) کلمہ شہادت کا اقرار (۲) نماز قائم کرنا (۳) زکوٰۃ دینا (۴) بیت اللہ کا حج کرنا (۵) ماہ رمضان کے روزے رکھنا ــــــ

اسلام کے پانچ بنیادی ارکان خود مقصود بالذات ہیں۔ اور دین کا سارا نظام انہی پانچ کے گرد گھومتا ہے۔ حتیٰ کہ جہاد ہے تو ان پانچ کے لئے ہجرت ہے تو ان پانچ کی خاطر۔ اور سیاست و حکومت ہے تو ان پانچ ارکان کے لئے ــــــ دین کے باقی تمام اعمال و اخلاق گویا انہی پانچ سے نکلتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جو عظمت ان ارکان خمسہ کی ہے وہ کسی اور عمل کی نہیں۔ لیکن مولانا کے دینی خاکہ میں اصل الاصول زمین پر اسلام کی سیات و حکمرانی قائم کرنا ہے اور دین کا سارا نظام

ا ۔ اسی فلسفہ کی روشنی میں مولانا انگریز کے خلاف آزادی کی تحریک میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ بلکہ حصہ لینے کو بھی غلط سمجھتے تھے۔

عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، معاشرت حتیٰ کہ یہ ارکان خمسہ بھی اسی محور کے گرد گھومتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں یوں کہا جائے کہ پورا دین خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ایک سیاسی نظام ہے، جس کا مقصد حکومت الہیہ قائم کرنا ہے، یہ دین کی روح ہے اور باقی سب اس کے مختلف مظاہر یا اس کی ٹریننگ ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:-

"سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام محض چند منتشر خیالات اور منتشر طریق ہائے عمل کا مجموعہ نہیں ہے۔ جس میں ادھر ادھر سے مختلف چیزیں ملا کر جمع کر دی گئی ہوں۔ بلکہ یہ ایک باضابطہ نظام ہے۔ جس کی بنیاد چند مضبوط اصولوں پر رکھی گئی ہے۔ اس کے بڑے بڑے ارکان سے لیکر چھوٹے چھوٹے جزئیات تک ہر چیز اس کے بنیادی اصولوں کے ساتھ ایک منطقی ربط رکھتی ہے۔ انسانی زندگی کے تمام مختلف شعبوں کے متعلق اس نے جتنے قاعدے اور ضابطے مقرر کئے ان سب کی روح اور ان کا جوہر اس کے اصول اولیہ ہی سے ماخوذ ہے۔ ان اصول اولیہ سے پوری اسلامی زندگی اپنی مختلف شاخوں کے ساتھ بالکل اسی طرح نکلتی ہے جس طرح درخت میں آپ دیکھتے ہیں کہ بیج سے جڑیں۔ جڑوں سے تنہ اور تنہ سے شاخیں اور شاخوں سے پتیاں پھوٹتی ہیں اور خوب پھیل جانے کے باوجود اس کی ایک ایک پتی اپنی جڑ کے ساتھ مربوط رہتی ہے۔ پس آپ اسلامی زندگی کے جس شعبے کو سمجھنا چاہیں آپ کے لئے ناگزیر ہے کہ اس کی جڑ کی طرف رجوع کریں کیونکہ اس کے بغیر آپ اس کی روح کو نہیں پاسکتے"۔

(اسلامی ریاست ص ۲۰ ص ۲۱ طبع اول مارچ ۱۹۶۲ء)

دین کی اس جڑ اور روح کی نشاندہی کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:-

"انبیاء علیہم اسلام نے انسانی زندگی کے لئے جو نظام مرتب کیا ہے اس کا مرکز و محور، اس کی روح اور اس کا جوہر یہی عقیدہ ہے اور اسی پر

اسلام کے نظریہ سیاسی کی بنیاد بھی قائم ہے۔ اسلامی سیاست کا سنگ بنیاد یہ قاعدہ ہے کہ حکم دینے اور قانون بنانے کے اختیارات تمام انسانوں سے فرداً فرداً اور مجتمعاً سلب کر لئے جائیں اور کسی شخص کا یہ حق تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ حکم دے اور دوسرے اس کی اطاعت کریں. وہ قانون بنائے اور دوسرے اس کی پابندی کریں. یہ اختیار صرف اللہ کو ہے"۔ (ص ۳۴)

مولانا کے نزدیک سیاسی اقتدار قائم کرنا ہی اصل عبادت ہے اور نماز روزہ وغیرہ عبادات کی حیثیت محض فوجی مشقوں کی ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"یہ ہے اس عبادت کی حقیقت جس کے متعلق لوگوں نے سمجھ رکھا ہے کہ وہ محض نماز روزہ اور تسبیح و تہلیل کا نام ہے اور دنیا کے معاملات سے اسے کوئی سروکار نہیں. حالانکہ دراصل صوم و صلوٰۃ اور حج و زکوٰۃ اور ذکر و تسبیح انسان کو اس بڑی عبادت کے لئے مستعد کرنے والی تمرینات ہیں"۔ (تفہیمات طبع چہارم ص ۵۶)

یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ دین اسلام کے مختلف شعبے ہیں جن کو عقائد. عبادات. اخلاق. معاشرت. معاملات اور سیاست کے بڑے بڑے عنوانات پر تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے سیاست بھی بلاشبہ دین کا ایک حصہ ہے۔ شریعت نے اس کے احکام و قوانین بھی دیئے ہیں مگر پورے دین کو ایک سیاسی تحریک بنا دینا اور اس کے سارے شعبوں کو اسی محور پر گھمانے کی کوشش کرنا اور عقائد و عبادات تک کو اسی سیاست کے خادم کی حیثیت دے ڈالنا اتنی خطرناک غلطی ہے جسے میں نرم سے نرم الفاظ میں "فکری کجروی" سے تعبیر کرنے سے مجبور ہوں ...... مولانا کی فکری کجروی ہی کا نتیجہ ہے کہ جن عبادات اور جن اخلاق کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے زیادہ اہمیت دی تھی جن کے بے شمار فضائل بیان فرماتے تھے اور جن پر جنت کی بشارتیں سنائی تھیں وہ مولانا کی نظر میں نہ صرف ایک ثانوی مقصد بن کر

رہ جاتے ہیں. بلکہ مولانا ان عبارات کا اس طرح تمسخر اڑاتے ہیں کہ روح ایمان کانپ جاتی ہے ـــــ ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر پڑھئے!

"خواص نے اس کے برعکس دوسرا راستہ اختیار کیا۔ وہ تسبیح و مصلی لے کر حجروں میں بیٹھ گئے۔ خدا کے بندے گمراہی میں مبتلا ہیں۔ دنیا میں ظلم پھیل رہا ہے. حق کی روشنی پر باطل کی ظلمت چھا رہی ہے۔ خدا کی زمین پر ظالموں اور باغیوں کا قبضہ ہو رہا ہے۔ الٰہی قوانین کے بجائے شیطانی قوانین کی بندگی خدا کے بندوں سے کروائی جا رہی ہے۔ مگر یہ ہیں کہ نفل پر نفل پڑھ رہے ہیں۔ تسبیح کے دانوں کو گردش دے رہے ہیں۔ ہو حق کے نعرے لگا رہے ہیں۔ قرآن پڑھتے ہیں محض ثواب تلاوت کی خاطر. حدیث پڑھتے ہیں مگر صرف تبرکاً. سیرت پاک اور اسوہ صحابہؓ پر وعظ فرماتے ہیں مگر قصہ گوئی کا لطف اٹھانے کے سوا کچھ مقصود نہیں۔ دعوت الی الخیر اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کا سبق نہ ان کو قرآن میں ملتا ہے۔ نہ حدیث میں. نہ سیرت پاک میں نہ اسوہ صحابہ میں. کیا یہ عبادت ہے؟"۔

(تفہیمات ص ۵۹ طبع چہارم ۱۹۴۷ء)

میں یہاں اس پر بحث نہیں کرتا کہ علمائے امت نے کب دعوت الی الخیر. امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور جہاد فی سبیل اللہ کے فریضہ سے کوتاہی کی ہے؟ میں اس بحث کو بھی چھوڑتا ہوں کہ مولانا اور ان کے نیازمندوں نے آج تک غلط سلط لٹریچر پھیلانے اور قوم کے نوجوانوں کو چند نعروں کے سلوگن دینے کے سوا وہ کون سا تیر مارا ہے جس سے "خواص" محروم رہے ہیں؟ میں اس بحث سے بھی قطع نظر کرتا ہوں کہ جب علمائے امت انگریزی طاغوت کے خلاف سینہ سپر ہو کر مصروف جہاد تھے اور قید و بند اور دار و رسن کی تاریخ خامہ و قرطاس سے نہیں بلکہ جہد و عمل سے لکھ رہے تھے۔ تب مولانا اور ان کے رفقاء "حکومت الٰہیہ" کے خیالی سفر پر تھے اور ان د

ایک دن کے لئے بھی طاغوت کے خلاف میدان جہاد میں اترنے کی توفیق نہیں ہوئی بلکہ ان مجاہدین کے خلاف فتوے صادر فرماتے رہے۔ میں ان ساری باتوں کو یہاں چھوڑتا ہوں۔ میں یہاں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر تقسیم کار کے طور پر اللہ کے کچھ بندے ذکر و تسبیح کی مشق کرانے میں لگے ہوئے ہوں. کچھ قرآن کریم کی تلاوت و تعلیم کی خدمت میں انجام دے رہے ہوں۔ کچھ دینی علوم کے تحفظ کا فریضہ بجا لا رہے ہوں. کچھ بقول آپ کے تسبیح و مصلی لے کر حجروں میں بیٹھ گئے ہوں اور نفل پر نفل پڑھ کر امت محمدیہ کی دعاؤں سے مدد کر رہے ہوں۔

کیا آپ کے سیاسی اسلام میں یہ سب اس لئے گردن زدنی ہیں کہ وہ باہر سڑکوں پر نکل کر "اسلامی نظام. اسلامی نظام" کے نعرے کیوں نہیں لگاتے؟ میں بہ ادب پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ ان کی کس بات کا مذاق اڑا رہے ہیں؟ کیا آپ کے نزدیک تسبیح و مصلیٰ، نفل پر نفل، تلاوت قرآن، حدیث پاک کا درس و تدریس سیرت پاک اور اسوہ صحابہؓ کا وعظ یہ ساری چیزیں ایسی بے قیمت ہیں کہ آپ ان کا مذاق اڑانے لگیں؟

کیا آپ نے اپنے رسالہ "ترجمان القرآن" پڑھنے پر کبھی کسی کا مذاق اڑایا ہے؟ کیا تلاوت قرآن کی اہمیت آپ کے رسالے کی تلاوت جتنی بھی نہیں؟ اسلامی عبادات کا مذاق اڑانے کے بارے میں فقہائے امت کی تصریحات واضح ہیں اور یہ حرکت اسی شخص سے صادر ہو سکتی ہے جس کا دل ایمان کے نور اور عبادت کی عظمت سے خالی ہو. لیکن مولانا کے نزدیک اسلام ایک سیاسی تحریک کا نام ہے (لادین الا السیاستہ) اس لئے وہ کسی بڑی سے بڑی عبادت کو اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں دیتے جب تک کہ وہ سیاسی تحریک کے لئے مفید نہ ہو۔ اس لئے وہ بات بات پر عبادات کا مذاق اڑاتے ہیں۔ "تجدید و احیائے دین" میں امام مہدی کے بارے میں فرماتے ہیں:-

"مسلمانوں میں جو لوگ "الامام المہدی" کے قائل ہیں وہ بھی ان متجددین سے جو اس کے قائل نہیں. اپنی غلط فہمیوں میں کچھ پیچھے

نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ امام مہدی کوئی اگلے وقتوں کے مولویانہ و صوفیانہ وضع قطع کے آدمی ہوں گے. تسبیح ہاتھ میں لئے یکایک کسی مدرسے یا خانقاہ کے حجرے میں بر آمد ہوں گے. آتے ہی انا المہدی کا اعلان کریں گے۔ علماء اور مشائخ کتابیں لئے پہنچ جائیں گے اور لکھی ہوئی علامتوں سے ان کے جسم کی شناخت وغیرہ کا مقابلہ کر کے انہیں شناخت کر لیں گے. پھر بیعت ہوگی. اور اعلان جہاد کر دیا جائے گا۔ چلے کھینچے ہوئے درویش اور پرانے طرز کے "بقیۃ السلف" ان کے جھنڈے تلے جمع ہونگے. تلوار تو محض شرط پوری کرنے کے لئے برائے نام چلائی پڑے گی۔ اصل میں سارا کام برکت اور روحانی تصرف سے ہو گا۔ پھونکوں اور وظیفوں کے زور سے میدان جیتے جائیں گے۔ جس کافر پر نظر مار دیں گے تڑپ کر بے ہوش ہو جائے گا اور محض بد دعاء کی تاثیر سے ٹینکوں اور ہوائی جہازوں میں کیڑے پڑ جائیں گے"۔ (ص ۵۵ طبع ششم مارچ ۱۹۵۵)

میں کسی طرح یقین نہیں کر پاتا کہ ایسی سوقیانہ افسانہ طرازی کسی عالم دین کے قلم سے بھی نکل سکتی ہے. مگر مولانا کو اہل اللہ کی شکل و صورت سے جو نفرت ہے. اور ان کے اعمال و اشغال سے جو بغض و عداوت ہے اس نے انہیں ایسے غیر سنجیدہ مذاق پر مجبور کر دیا ہے۔

کسی احمق نے ان سے کہا ہے کہ "اصل میں سارا کام برکت اور تصرف سے ہو گا" ؟ لیکن کیا مولانا کہہ سکتے ہیں کہ سارا کام بغیر برکت اور تصرف کے ہو جائے گا؟ جس طرح انہوں نے "الامام المہدی" کی وضع قطع اور ان کی برکت و تصرف کا مذاق اڑایا ہے کیا یہی طرز فکر کوئی شخص نعوذ باللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختیار کرے اور اسی طرح معاذ اللہ آپؐ کی وضع و قطع اور آپؐ کی برکت و تصرف کا مذاق اڑانے لگے تو مولانا مودودی اسے کیا جواب دیں گے؟ کیا مولانا. انبیاء

کرامؑ کے معجزات اور اولیاء اللہ کی کرامت کے بھی منکر ہیں؟

جنگ بدر کا جو میدان لشکر جرار کے مقابلے میں دو گھوڑوں آٹھ تلواروں اور تین سو تیرہ جانبازوں کے ذریعہ جیتا گیا تھا کیا وہ برکت و تصرف کے بغیر ہی جیت لیا گیا تھا؟ "العریش" میں خدا کا پیغمبر ـ فِدَاہُ اَبِیْ وَاُمِّیْ وَرُوْحِیْ وَجَسَدِیْ ﷺ جو ساری رات بلبلاتا رہا، اور جس نے بے خودی اور ناز کی کیفیت میں خدا تعالیٰ کی بارگاہ صمدیت میں یہ تک کہہ دیا تھا۔

اَللّٰھُمَّ اِنْ تُھْلِكْ ھٰذِہِ الْعِصَابَةَ فَلَنْ تُعْبَدَ بَعْدَ الْیَوْمِ۔

ترجمہ:۔ اے اللہ! اگر یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد تیری عبادت نہیں ہوگی۔

کیا خدا کی نصرت اس "برکت اور تصرف" کے بغیر نازل ہوگئی تھی؟ اور "شاہت الوجوہ کہہ کر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکریوں کی مٹھی پھینکی تھی، جس کو قرآن کریم نے۔

وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔

ترجمہ:۔ وہ مٹھی جب آپؐ نے پھینکی تھی تو دراصل آپؐ نے نہیں بلکہ اللہ نے پھینکی تھی۔

- کیا مولانا کے نزدیک یہ "برکت و تصرف" نہیں تھا؟ اگر مولانا "الامام المہدی" کی "برکت و تصرف" کا مذاق اڑاتے ہیں تو کیا کوئی دوسرا ملحد ذرا آگے بڑھ کر "یوم الفرقان" (جنگ بدر کا دن، جسے قرآن کریم نے فیصلے کا دن فرمایا ہے۔) اسی طرح افسانہ طرازی قرار دے کر اس کا مذاق نہیں اڑاسکتا؟ صد حیف! دین اور اہل دین کا اس سوقیانہ انداز میں مذاق اڑانے والے "مفکر اسلام" بنے بیٹھے ہیں

ع

"تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو!"

اب ذرا "الامام المہدی" کے بارے میں مولانا کی رائے بھی سن لیجئے!

ارشاد ہوتا ہے:۔

"میرا اندازہ یہ ہے کہ آنے والے اپنے زمانے میں بالکل "جدید ترین

طرز کا لیڈر" ہو گا، وقت کے تمام علوم جدیدہ پر اس کو مجتہدانہ بصیرت
حاصل ہوگی۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ کو وہ خوب سمجھتا ہو گا۔
عقلی و ذہنی ریاست، سیاسی تدبر اور جنگی مہارت کے اعتبار سے وہ تمام
دنیا پر اپنا سکہ جمادے گا اور اپنے عہد تمام جدیدوں سے بڑھ جدید
ثابت ہو گا، مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی جدتوں کے خلاف مولوی اور صوفی
صاحبان ہی سب سے پہلے شورش برپا کریں گے"۔ (ص ۵۵)

یہاں اس امر سے بحث نہیں کہ ایک منصوص چیز جو ابھی پردہ مستقبل میں ہے، اس کے بارے میں مولانا کو اپنی اٹکل اور اندازے سے پیش گوئی کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ کیا وہ "الامام المہدی" کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو کافی نہیں سمجھتے؟ اور یہ کہ مستقبل کے بارے میں کوئی پیش گوئی یا توکشف و الہام سے کی جاتی ہے، یافراست صحیحہ سے، یا کچھ لوگ علم نجوم کے ذریعہ الٹی سیدھی ہانکتے ہیں، مولانا نے "الامام المہدی" کے بارے میں جو "اندازہ" لگایا ہے اس کی بنیاد آخر کس چیز پر ہے؟

اور میں مولانا کے اس اندیشہ کے بارے میں بحث نہیں کرتا کہ امام مہدی کی "جدتوں" کے خلاف غریب مولوی اور صوفی صاحبان ہی سب سے پہلے کیوں شورش برپا کریں گے۔ کیا مولانا کے خیال میں "الامام المہدی" کی یہ "جدتیں" دین کے مسائل میں ہوں گی یا دنیا کے انتظام میں؟ اگر دین کے مسائل میں ہوں گی تو وہ مجدد ہوں گے یا خود مولانا کی اصطلاح کے مطابق متجدد؟ ـــــــ اور اگر مولانا کی مفروضہ "جدتیں" دنیا کے انتظامی امور میں ہوں گی تو مولانا کو کیسے اندیشہ ہوا کہ غریب مولوی اور صوفی اس کی مخالفت کریں گے؟

ان تمام امور سے قطع نظر جو بات میں مولانا سے یہاں دریافت کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بقول ان کے "الامام المہدی" کو برکت و تصرف کی تو ضرورت نہ ہوگی۔ نہ وہاں تسبیح و سجادہ کا گذر ہو گا، نہ ذکر و تہلیل کا قصہ چلے گا، بلکہ بقول مولانا کے

الامام المہدی ایک ماڈرن قسم کے لیڈر ہوں گے علوم جدیدہ میں ان کو مجتہدانہ بصیرت ہوگی۔ زندگی کے مسائل مہمہ کو خوب خوب سمجھتے ہوں گے سیاست و ریاست اور جنگی تدبیروں میں ان کی دھوم مچی ہوگی۔ اس طرح وہ ساری دنیا پر اپنا سکہ جمادیں گے۔

سوال یہ ہے کہ مولاناکی ذات گرامی میں آخر کس چیز کی کمی ہے۔ یہ ساری باتیں جو مولانا نے "الامام المہدی" کے لئے لکھی ہیں، ایک ایک کر کے ماشاء اللہ خود مولانامیں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہ خدا کے فضل سے جدید ترین طرز کے لیڈر بھی ہیں۔ تمام علوم جدیدہ میں ان کو مجتہدانہ بصیرت بھی حاصل ہے۔ زندگی کے سارے مسائل مہمہ پر نہ صرف ان کی نظر ہے بلکہ ایک ایک مسئلے پر ان کے قلم نے لکھ لکھ کر کاغذوں کا ڈھیر لگادیا ہے اور سیاسی تدبر کی ساری باتیں بھی انہوں نے ذہن سے کاغذ پر منتقل کر دی ہیں۔ آخر کیابات ہے کہ "الامام المہدی" کے بارے میں ذکر کردہ ساری صفات کے ساتھ متصف ہونے کے باوجود ان کی تحریک کاغذی گھوڑے دوڑانے سے آگے نہیں بڑھ سکی اور ساری دنیا پر کیا، نصف صدی کی لگاتار خامہ فرسائی کے نتیجہ میں ایک پاکستان پر بھی ان کا سکہ نہ جم سکااور پاکستان کیا، ایک چھوٹی سی بستی میں (بلکہ اپنے منصورہ میں) بھی وہ آج تک حکومت الٰہیہ قائم نہیں کر سکے۔ آخر الامام المہدی بقول مولانا کے کوئی مافوق الفطرت ہستی تو نہیں ہوں گے۔ اب اگر برکت و تصرف ذکر و دعاء تسبیح و مصلیٰ اور حق تعالیٰ سے مانگنااور لینا، یہ ساری صفات ان کی زندگی سے خارج کر دی جائیں تو آخر وہ اپنی "جدتوں" کے کرشمے سے ساری دنیا پر اپنا سکہ کیسے جمادیں گے؟ کیا مولانا نے مستقبل کے بارے میں اٹکل پچو تخمینے لگاتے وقت اس سوال پر بھی غور فرمایا ہے؟

دراصل مولانا کو "الامام المہدی" کی آڑ میں اہل اللہ کی وضع قطع، خانقاہ و مدرسہ، برکت اور روحانی تصرف کا مذاق اڑانا تھااور بس ورنہ مولانااپنی قیاس آرائی کی عقلی و منطقی توجیہ سے شائد خود بھی قاصر ہیں۔

کاش! جب مولانا "الامام المہدی" کی آڑ میں محض اپنے اندازوں اور قیاسوں کی بنا پر شعائر دین کا مذاق اڑا رہے تھے کوئی شخص ان کے کان میں شیخ سعدیؒ کا شعر کہہ دیتا:

نہ ہرجائے مرکب تواں تاختن
کہ جاہا سپر باید انداختن

(۸) شریعت اسلامیہ کا ماخذ چار چیزیں ہیں جنہیں "اصول اربعہ" کہا جاتا ہے یعنی قرآنِ کریم، حدیث نبویؐ، اجماع امت اور مجتہدین امت کا اجتہاد و استنباط۔ اسلاف امت سے بے نیاز ہو کر جب مولانا مودودی نے اسلام کا "آزاد مطالعہ" کیا تو ان چاروں ماٰخذ کے بارے میں ان کا رویہ بڑا عبرت آمیز تھا۔ قرآن کریم کے بارے میں تو موصوف نے یہ فرمایا کہ رفتہ رفتہ اس کی اصلِ تعلیم ہی بھول بھلا گئی تھی اور اپنے زمانہ نزول کے بعد یہ کتاب نعوذ باللہ بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ اپنے رسالہ "قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں" میں وہ لکھتے ہیں کہ "الٰہ، رب، دین، عبادت یہ چار لفظ قرآن کی اصطلاحی زبان میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں" اور بنیادی اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ:-

"قرآن کی تعلیم کو سمجھنے کے لئے ان چار اصطلاحوں کا صحیح اور مکمل مفہوم سمجھنا بالکل ناگزیر ہے۔ اگر کوئی شخص یہ جانتا ہو کہ الٰہ اور رب کا مطلب کیا ہے؟ عبادت کی کیا تعریف ہے اور دین کسے کہتے ہیں تو دراصل اس کے لئے پورا قرآن بے معنی ہو جائے گا۔ وہ نہ توحید کو جان سکے گا۔ نہ شرک کو سمجھ سکے گا۔ نہ عبادت کو اللہ کے لئے مخصوص کر سکے گا اور نہ دین ہی اللہ کے لئے خالص کر سکے گا۔ اسی طرح اگر کسی کے ذہن میں ان اصطلاحوں کا مفہوم غیر واضح اور نامکمل ہو تو اس کے لئے قرآن کی پوری تعلیم غیر واضح ہوگی اور قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود اس کا عقیدہ اور عمل دونوں نامکمل رہ جائیں گے۔" ص ۱۰،۹

مختصراً ان چار بنیادی اصطلاحوں کی جو اہمیت مولانا نے ذکر کی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ان چار اصطلاحوں کا مفہوم ٹھیک معلوم نہ ہو تو دراصل اس کے لئے پورا قرآن بے معنی ہو جائے گا"۔

اس کے بعد مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ عرب میں جب قرآن پیش کیا گیا اس وقت ہر شخص جانتا تھا کہ ان الفاظ کا اطلاق کس مفہوم پر ہوتا ہے اور صرف مسلمان ہی نہیں، کافر تک قرآن کی ان اصطلاحات کے عالم تھے ـــــ لیکن

"لیکن بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ کے وہ اصل معنی جو نزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے، بدلتے چلے گئے، یہاں تک کہ ہر ایک اپنی پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود بلکہ مبہم مفہومات کے لئے خاص ہو گیا۔ اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے تھے ان کے لئے الٰہ اور رب اور دین اور عبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے، انہی دونوں وجوہ سے دور اخیر کی کتب لغت و تفسیر میں اکثر قرآنی الفاظ کی تشریح اصل معانی لغوی کے بجائے ان معانی سے کی جانے لگی جو بعد میں مسلمان سمجھتے تھے" ـــــ (ص ۱۲)

اور ان چار بنیادی اصطلاحوں سے امت کی غفلت و جہالت کا نتیجہ کیا ہوا؟

"پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی بدولت قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم بلکہ حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہو گئی"۔ (ص ۱۴ طبع دہم)

ممکن ہے مولانا کے نیاز مندوں کے نزدیک ان کی یہ تحقیق ایک لائق قدر علمی انکشاف کہلانے کی مستحق ہو مگر میں اسے قرآن کریم کے حق میں گستاخی اور امت

اسلامیہ کے حق میں سوءِ ظن، بلکہ تہمت سمجھنے اور کہنے پر مجبور ہوں۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ زمانہ نزول قرآن کے غیر مسلم تک قرآن کی ان چار اصطلاحوں کا مطلب سمجھتے تھے، لیکن بعد کی پوری امت مسلمہ قرآن سے جاہل رہی اور قرآن کریم معاذ اللہ ــــــ ایک بے معنی اور مہمل کتاب کی حیثیت سے پڑھا جاتا رہا۔ خدانخواستہ مولانا مودودی عالم وجود میں قدم نہ رکھتے اور قرآن کریم کی ان چار اصطلاحوں کی گرہ نہ کھولتے تو کوئی بندہ خدا، خدا کی بات ہی نہ سمجھ پاتا۔

مولانا کا یہ نظریہ نہ صرف پوری امت کی تضلیل و تذلیل ہے، بلکہ قرآن کریم کے بارے میں ایک ایسے مایوسانہ نقطۂ نظر کا اظہار ہے جس سے ایمان بالقرآن کی بنیادیں متزلزل ہوجاتی ہیں۔ کیا خدا کی آخری کتاب کے بارے میں تصور کیا جاسکتا ہے کہ ایک مختصر سے عرصہ کے بعد اس کی تعلیم اور اس کی حقیقی روح دنیا سے گم ہوجائے، قرآن ایک بے معنی کتاب کی حیثیت سے لوگوں کے ہاتھ میں رہ جائے اور اس کی حقیقی تعلیم ایک بھولی بسری کہانی بنکر رہ جائے؟ مجھے مولانا کا پاس ادب ملحوظ نہ ہوتا تو میں اس نظریہ کو خالص جہل بلکہ جنون سے تعبیر کرتا۔

قرآن کریم کی تعلیم کا آفتاب قیامت تک چمکنے کے لئے طلوع ہوا ہے، لیل و نہار کی لاکھوں گردشیں، تہذیب و معاشرت کی ہزاروں بوقلمونیاں اور زمانے کے سینکڑوں انقلاب بھی اس آفتاب صداقت کو دھندلانے میں کامیاب نہیں ہوسکتے اس لئے مولانا کا یہ نظریہ قطعاً غلط اور گمراہ کن ہے۔

مولانا کی اس غلطی کا منشاء تین چیزیں ہیں:۔

اول:۔ یہ کہ انہوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ط

ترجمہ:۔ بے شک ہم نے ہی یہ "الذکر" نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنیوالے ہیں۔

اور اس حفاظت سے قرآن کریم کے صرف الفاظ و نقوش کی حفاظت مراد نہیں، بلکہ اس کے مفہوم و معنی، اس کی دعوت و تعلیم اور اس کے پیش کردہ عقائد و اعمال کی حفاظت مراد ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وہ تمام اسباب و ذرائع جن کی عالم اسباب میں حفاظت کر یہ کہنا صحیح ہو گا کہ وہ تمام اسباب و ذرائع جن کی عالم کی عالم اسباب میں حفاظت قرآن کے لئے کسی درجہ میں بھی ضرورت تھی آیت کریمہ میں ان سب کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ "الذکر" کی حفاظت کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس کے حروف و الفاظ بھی باقی رہیں گے، اس کے مفہوم و معانی بھی قائم و دائم رہیں گے اور اس کی تعلیم بھی اعتقاداً و عملاً و حالاً و قالاً ہر اعتبار سے باقی رہے گی۔ اس لئے مولانا کا یہ کہنا کہ رفتہ رفتہ یہ کتاب امت کے لئے ایک بے معنی اور مہمل کتاب بنکر رہ گئی تھی دراصل حفاظت قرآن کا انکار ہے۔

دوسرے، مولانا نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کی تعلیم غیر متبدل شکل میں قیامت تک دائم و قائم رہے اور اس کا سلسلہ ایک لمحہ کے لئے بھی ٹوٹنے نہ پائے۔ کیونکہ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی کسی مسئلہ میں تعلیم نبوت اٹھ جائے تو نبی اور امت کے درمیان ایک ایسا خلا پیدا ہو جاتا ہے جس کو پاٹنا ممکن نہیں اور اس منطق سے دین اسلام کی ایک ایک چیز مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے، لیکن مولانا بتاتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد قرآن کی تین چوتھائی سے زیادہ تعلیم گم ہو گئی۔ مولانا کا یہ نظریہ بالواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خاتمیت اور دین اسلام کی حقانیت کے دوام و بقا کا انکار ہے۔

تیسرے، مولانا نے یہ نہیں سوچا کہ جس نظریہ کو بڑے خوبصورت الفاظ میں پیش کر رہے ہیں دور قدیم کے ملاحدہ و باطنیہ سے لیکر دور جدید کے باطل پرستوں تک سب نے اسی نظریہ کا سہارا لیا ہے اور اسی کے ذریعہ دین میں تحریف و تاویل کا راستہ اختیار کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے انکار کی تین صورتیں ہیں۔

اول:۔ یہ کہ قرآن کریم کے الفاظ و آیات کے منزل من اللہ ہونے کا انکار کر دیا جائے۔

دوم:۔ یہ کہ اسے منزل من اللہ تو مانا جائے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ اس کا مطلب نہیں سمجھے تھے، بلکہ ہم نے اسے سمجھا ہے۔

سوم:۔ یہ کہ قرآن کریم کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس کا جو مفہوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ نے سمجھا تھا وہ بعد کی صدیوں میں محفوظ نہیں رہا، اس لئے آج امت کے سامنے تفسیر و حدیث کی شکل میں قرآن کریم کا جو مفہوم محفوظ ہے اور جسے مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک پوری امت صحیح سمجھتی ہے۔ یہ قرآن کا اصل منشاء اور صحیح مفہوم وہ ہے جسے ہم پیش کر رہے ہیں۔

انکار قرآن کی پہلی دو صورتیں تو اتنی واضح کفر تھیں کہ کوئی بڑے سے بڑا زندیق بھی اسلامی معاشرے میں ان کا بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں رکھتا تھا۔ اس لئے ملاحدہ کو یہ جرات تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اپنے مخفی کفر کا برملا اعلان کر دیں اور قرآن کریم کی آیات و الفاظ کا صاف صاف انکار کر ڈالیں۔ ان میں اتنی اخلاقی جرات بھی نہیں تھی کہ قرآن کریم کا جو مفہوم تواتر کے ساتھ نسلاً بعد نسل امت میں منقول چلا آتا ہے اس کے بارے میں یہ تسلیم کر لیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ قرآن کے اسی مفہوم کے قائل تھے اور اسی کو منشائے خدا سمجھتے تھے مگر ہم اس کے قائل نہیں ــــــ اگر ملاحدہ ان دونوں میں سے کوئی ایک راستہ اختیار کرتے تو ان کے الحاد کی رگ ہی کٹ جاتی اور ان کا کفر عریاں رقص کرنے لگتا، اس لئے وہ انکار قرآن کا تیسرا راستہ اختیار کرتے ہیں کہ بعد کی صدیوں میں قرآن کا صحیح مطلب محفوظ نہیں رہا اور نعوذ باللہ "مولویوں" نے قرآن کو نئے معنی پہنا دیئے۔ گویا جس طرح رات کی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر چور خود گھر والے کا ہاتھ پکڑ کر "چور چور" کا شور مچا دیتا ہے

ناواقف لوگ اسی کی مرمت شروع کر دیتے ہیں اور چور وہاں سے کھسکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے. اسی طرح ان ملاحدہ نے اکابر امت پر قرآن کریم کے مفہوم کو بدلنے کا الزام دھر کر گزشتہ صدیوں کے ائمہ ہدیٰ کو پٹوادیا، اور خود معصوم بن بیٹھے۔

مسٹر غلام احمد پرویز اور قادیانیوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ پرویز کا کہنا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں "اللہ و رسول" کی اطاعت کا ذکر آیا ہے اس سے مراد ہے کہ مرکز ملت کی اطاعت ــــ "اللہ و رسول" کا جو مطلب ملا سمجھتا ہے یہ عجمی ذہن کی پیداوار ہے ــــ نعوذ باللہ۔

یا قادیانی کہتے ہیں کہ "خاتم النبیین" کے معنی "مولوی صاحبان" نے نہیں سمجھے۔ یہ آیت نبوت بند کرنے کے لئے نہیں۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مہر کے ساتھ جاری کرنے کے لئے ہے۔

یا یہ کہ قرآن کریم کی آیت "بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا رفع جسمانی مراد نہیں. بلکہ اس سے مراد ہے عزت کی موت ــــ اور مولوی صاحبان جو معنی کرتے ہیں وہ بعد کی صدیوں میں بنالئے گئے ــــ اور جب ان ملاحدہ کے سامنے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ کی تصریحات پیش کی جائیں تو ان کا جواب ہوتا ہے کہ یہ سب بعد کے لوگوں کی تصنیف ہے ــــ دراصل ان تمام ملاحدہ کو قرآن کریم کا انکار ہی مقصود ہے مگر صاف صاف انکار کی جرأت نہ پاکر وہ لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ قرآن کریم کے یہ مسلمہ معنی بعد کی صدیوں میں لوگوں نے بنائے ہیں ــــ جب قرآن کریم کے متواتر معنی کا انکار کر دیا جائے تو نتیجہ وہی انکار قرآن ہے۔

بدقسمتی سے ٹھیک یہی راستہ ــــ شعوری یا غیر شعوری طور پر ــــ مولانا مودودی نے اپنایا. وہ ہمیں بتاتے ہیں کہ قرآن کے ان چار الفاظ کے جو معنی صدیوں سے مسلمان سمجھتے چلے آرہے ہیں یہ عجمی ذہن کی پیداوار ہے. جن کو عربیت کا ذوق

نہیں تھا اور ان چار الفاظ کے اصل معنی گم ہو جانے کی وجہ سے پورا قرآن بے معنی ہو کر رہ گیا ـــــ مولانا کا یہ نظریہ سن کر مسٹر پرویز اور قادیانی صاحبان ضرور کہتے ہیں ہوں گے.

ماد مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق
او بصحرا رفت. وما در کوچہ ہار رسوا شدیم

اور لطف یہ ہے کہ مولانا خود عجمی نژاد ہونے کے باوصف ذوق عربیت کی کمی کی تہمت ان ائمہ عربیت پر لگا رہے ہیں جو لغت عرب کے حافظ نہیں. "دائرۃ العارف" تھے اور جو ایک ایک لفظ کے سینکڑوں معنی ہر ایک کے محل استعمال اور بیسیوں شواہد کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ ان کے سامنے تاج العروس اور لسان العرب نہیں تھی۔ جس کی ورق گردانی کر کے وہ الفاظ کے معانی تلاش کرتے ہوں. بلکہ ان کا اپنا حافظہ بجائے خود تاج العروس اور لسان العرب تھا ـــــ ان اکابر کے بارے میں کس سادگی سے فرمایا جاتا ہے کہ قرآن کے فلاں فلاں الفاظ کا مفہوم ان کی نظر سے اوجھل ہو گیا تھا اور قرآن ان کے لئے ایک بے معنی کتاب بن کر رہ گیا تھا۔ لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّۃَ اِلَّا بِاللہِ۔ بہرحال مولانا نے قرآن کریم کے بارے میں جو نظریہ پیش کیا ہے میں اسے انکار قرآن ہی کی ایک صورت اور الحاد و زندقہ کی اصل بنیاد سمجھتا ہوں۔

(۹)۔ قرآن کریم کے بعد حدیث نبوی اور سنت رسول کا درجہ ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) مولانا کے نظریات اس کے بارے میں بھی ایسے مبہم اور لچک دار ہیں جن کی بناء پر وہ حدیث و سنت کو آسانی سے اپنی رائے میں ڈھال سکتے ہیں. تفصیل کی گنجائش نہیں یہاں مختصراً چند امور کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔

اول: علمائے امت کے نزدیک حدیث اور سنت دونوں ہم معنی لفظ ہیں لیکن مسٹر غلام احمد پرویز اور ڈاکٹر فضل الرحمان وغیرہ سنت اور حدیث کے درمیان فرق کرتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب کا نظریہ بھی یہی ہے کہ سنت اور حدیث دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ رہا یہ کہ ان دونوں کے درمیان فرق کیا ہے، اس کی پوری توضیح

شائد مولانا خود بھی نہ کر سکیں۔

(دیکھئے رسائل و مسائل حصہ اول ص ۳۱۰)

دوم: مولانا کو "فنافی الرسول" اور "مزاج شناس رسول" ہونے کا دعویٰ ہے۔ اس لئے روایات حدیث کے صحیح ہونے نہ ہونے کا فیصلہ بھی خود انہی پر منحصر ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"جس شخص کو اللہ تعالیٰ تفقہ کی نعمت سے سرفراز فرماتا ہے اس کے اندر قرآن اور سیرت رسولؐ کے غائر مطالعہ سے ایک خاص ذوق پیدا ہو جاتا ہے جسکی کیفیت بالکل ایسی ہے جیسے ایک پرانے جوہری کی بصیرت کہ وہ جواہر کی نازک سے نازک خصوصیات تک کو پرکھ لیتی ہے۔ اس کی نظر بہ حیثیت مجموعی شریعت حقہ کے پورے سسٹم پر ہوتی ہے اور وہ اس سسٹم کی طبیعت کو پہچان جاتا ہے۔ اس کے بعد جب جزئیات اس کے سامنے آتے ہیں تو اس کا ذوق اسے بتادیتا ہے کہ کونسی چیز اسلام کے مزاج اور اس کی طبیعت سے مناسبت رکھتی ہے اور کونسی نہیں رکھتی ۔۔۔۔۔ روایات پر جب وہ نظر ڈالتا ہے تو ان میں بھی یہی کسوٹی رد و قبول کا معیار بن جاتی ہے۔ اسلام کا مزاج عین ذات نبویؐ کا مزاج ہے۔ جو شخص اسلام کے مزاج کو سمجھتا ہے اور جس نے کثرت کے ساتھ کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا گہرا مطالعہ کیا ہوتا ہے وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسا مزاج شناس ہو جاتا ہے کہ روایات کو دیکھ کر خوبخود اس کی بصیرت اسے بتادیتی ہے کہ ان میں سے کونسا قول یا کونسا فعل میرے سرکار کا ہو سکتا ہے اور کونسی چیز سنت نبویؐ سے اقرب ہے۔ یہی نہیں بلکہ جن مسائل میں اس کو قرآن و سنت سے کوئی چیز نہیں ملتی ان میں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے فلاں مسئلہ پیش آتا تو آپ اس کا فیصلہ یوں فرماتے یہ اس لئے کہ اس کی روح محمدیؐ

میں گم اور اس کی نظر بصیرت نبوی کے ساتھ متحد ہو جاتی ہے، اس کا دماغ اسلام کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اسی طرح دیکھتا ہے اور سوچتا ہے جس طرح اسلام چاہتا ہے کہ دیکھا اور سوچا جائے۔

اس مقام پر پہنچ جانے کے بعد انسان اسناد کا بہت زیادہ محتاج نہیں رہتا۔ وہ اسناد سے مدد ضرور لیتا ہے مگر اس کے فیصلے کا مدار اس پر نہیں ہوتا۔ وہ بسا اوقات ایک غریب، ضعیف، منقطع، السند، مطعون فیہ حدیث کو بھی لیتا ہے اس لئے کہ اس کی نظر افتادہ پتھر کے اندر ہیرے کی جوت دیکھ لیتی ہے اور بسا اوقات وہ ایک غیر معلل، غیر شاذ، متصل السند مقبول حدیث سے بھی "اعراض" کر جاتا ہے اس لئے کہ اس جام زریں میں جو بادہ معنی بھری ہوئی ہے اور اسے طبیعت اسلام اور مزاج نبوی ؐ کے مناسب نظر نہیں آتی"۔ تفہیمات طبع چہارم ۱۹۴۷ء پٹھانکوٹ ص ۲۹۶/۲۹۷)

سوم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو اہل علم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک قسم سنن ہدیٰ کہلاتی ہے۔ جو امور دینیہ سے متعلق ہے اور جن کی پیروی امت کے لئے لازم ہے، دوسرا حصہ سنن عادیہ کا ہے یعنی وہ کام جو آپ ؐ نے کسی تشریعی حکم کے طور پر نہیں، بلکہ عام انسانی عادت کے تحت کئے۔ ان کی پیروی اگرچہ لازم نہیں تاہم امور عادیہ میں بھی آپ ؐ کی پیروی جس حد تک ممکن ہو سرمایہ سعادت ہے، اور اگر ہم کسی امر میں آپ ؐ کی پیروی نہ کر سکیں۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ لائق اقتداء نہیں۔ بلکہ اس کی وجہ سے ہماری استعداد کا نقص ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم امت کے محبوب و مطاع ہیں اور محبوب کی ایک ایک ادا محبوب ہوا کرتی ہے۔ اس لئے آپ ؐ کی اداؤں کو اپنے اعمال میں ڈھالنا تقاضائے محبت ہے ____ اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سراپا خیر تھی، اللہ

تعالیٰ نے ہر خیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں جمع کر دی تھی اور ہر شر اور برائی سے اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کو پاک رکھا تھا. اس لئے آپ ؐ کی سنت کی پیروی ہر خیر کے حصول اور ہر شر سے حفاظت کی ضمانت ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"چونکہ اصل سعادت یہی ہے کہ تمام حرکات و سکنات میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے اس لئے سمجھ لو کہ تمام افعال کی دو قسمیں ہیں۔ اول عبادات، جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ۔ دوم عادات، مثلاً کھانا پینا، سونا، اٹھنا، بیٹھنا وغیرہ اور مسلمانوں پر لازم ہے کہ دونوں قسم کے افعال میں آپ ؐ کی اقتداء کریں ......" (تبلیغ دین ص ۳۹)

امور عادیہ میں اتباع سنت کی ضرورت کے شرعی و عقلی دلائل بیان کرنے کے بعد امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے. وہ امور عادیہ میں سنت کی ترغیب کے لئے بیان کیا ہے. اور جن اعمال کو عبادات سے تعلق ہے اور ان کا اجر و ثواب بیان کیا گیا ہے ان میں بلا عذر اتباع چھوڑ دینے کی تو سوائے کفر خفی کے یا حماقت جلی کے اور کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہیں آتی۔"
(ص ۴۲)

اس کے برعکس مولانا مودودی نے معاشرتی و تمدنی امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا مذاق نہایت بھونڈے الفاظ میں اڑایا ہے مولانا لکھتے ہیں کہ اکثر دیندار غلطی سے اتباع رسول ؐ اور سلف صالح کی پیروی کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ:۔

"جیسا لباس وہ پہنتے تھے ویسا ہی ہم پہنیں، جس قسم کے کھانے وہ کھاتے تھے اسی قسم کے کھانے ہم بھی کھائیں جیسا طرز معاشرت ان کے گھروں میں تھا بعینہٖ وہ ہی طرز معاشرت ہمارے گھروں میں بھی ہو۔"

مولانا کے نزدیک اتباع سنت کا یہ مفہوم صحیح نہیں بلکہ:

"اتباع کا یہ تصور، جو دور انحطاط کی کئی صدیوں سے[1] دیندار مسلمانوں کے دماغوں پر مسلط رہا ہے، درحقیقت روح اسلام کے بالکل منافی ہے۔ اسلام کی یہ تعلیم ہرگز نہیں ہے کہ ہم "جیتے جاگتے آثار قدیمہ" بن کر رہیں اور اپنی زندگی کو "قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ" بنائے رکھیں۔" (تنقیحات ص ۲۱۰-۲۰۹ پانچواں ایڈیشن)

بلاشبہ جدید تمدن نے جو سہولتیں بہم پہنچائیں ہیں ان سے استفادہ گناہ نہیں، اور حد جواز کے اندر رہتے ہوئے آپ تمدن و معاشرت کے نئے طریقوں کو ضرور اپنا سکتے ہیں۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لباس آپؐ کی وضع قطع اور آپؐ کی طرز معاشرت کو "آثار قدیمہ" اور "قدیم تمدن کا ایک تاریخی ڈرامہ" جیسے مکروہ الفاظ سے یاد کرنا نہ صرف آئین محبت کے خلاف ہے بلکہ تقاضائے ایمان و شرافت سے بھی بعید ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ جس شخص کے دل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذرا بھی عظمت ہو وہ آپؐ کی وضع قطع اور آپؐ کے طرز معاشرت کی اس طرح پھبتی اڑا سکتا ہے۔

" مولانا مودودی کا یہ فلسفہ بھی انوکھا ہے کہ:

" (اسلام) ہم کو قالب نہیں دیتا، بلکہ روح دیتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ زمان و مکان کے تغیرات سے جتنے بھی مختلف قالب قیامت تک پیدا ہوں ان سب میں ہم یہی روح بھرتے چلے جائیں"۔ تنقیحات ص ۱۰)

گویا مولانا کے نزدیک اسلامی قالب کی پابندی ضروری نہیں۔ ہر چیز کا قالب و

---

[1] اس فقرے میں وہی ملحدانہ نظریہ کار فرما ہے کہ بعد کی صدیوں میں اتباع سنت کا "اصل مفہوم" محفوظ نہیں رہا۔

خود تیار کیا کریں گے البتہ اس میں "اسلامی روح" بھر کر اسے مشرف بہ اسلام کریں گے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مولانا کے ہاں وہ کونسی فیکٹری ہے جس میں "اسلامی روح" تیار ہوتی ہے، اور جس کی ایک چٹکی کسی قالب میں ڈال دینے سے وہ قالب اسلامی بن جاتا ہے؟ اس منطق سے مولانا نے سینما کی بھی دو قسمیں کر ڈالی ہیں، اسلامی اور غیر اسلامی ــــ سینما کے قالب میں اگر اسلامی روح پھونک دی جائے تو وہ "اسلامی سینما" بن جاتا ہے۔ یہ ہے مولانا مودودی کا فہم اسلام، اور سنت نبوی کی ان کی نظر میں قدر و قیمت۔

چہارم: میں "سنت و بدعت" کی بحث میں عرض کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ کا نام "سنت" ہے اور آپ کے طریقہ کے خلاف کو "بدعت" کہا جاتا ہے۔ مگر مولانا مودودی چونکہ صرف "اسلامی روح" کے قائل ہیں۔ اس لئے ان کے نزدیک "اسلامی قالب" پر بھی بدعت کا اطلاق ہوتا ہے۔ گویا ان کے فلسفہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی "سنت دائمہ" بدعت بن جاتی ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

- "میں اسوہ اور سنت اور بدعت وغیرہ اصطلاحات، کے ان مفہومات کو غلط بلکہ دین میں تحریف کا موجب سمجھتا ہوں جو بالعموم آپ حضرات کے ہاں رائج ہیں ا۔ آپ کا یہ خیال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی ڈاڑھی رکھتے تھے اتنی ہی بڑی ڈاڑھی رکھنا سنت رسول یا اسوہ کامل ہے، یہ معنی رکھتا ہے کہ آپ عادات رسول کو وہ سنت سمجھتے ہیں۔ جس کے جاری اور قائم کرنے کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام مبعوث کئے جاتے رہے ہیں۔ مگر میرے نزدیک صرف یہی نہیں کہ یہ سنت کی صحیح تعریف نہیں۔ بلکہ میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر زور دینا ایک سخت قسم کی "بدعت" ایک خطرناک تحریف دین ہے، جس

ا۔ یہاں وہی ملحدانہ نظر سے کارفرما ہے کہ لوگوں نے اصطلاحات شرعیہ کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔

سے نہایت برے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے"۔ (رسائل و مسائل حصہ اول ص ۲۰۷، ص ۲۰۸ تیسرا ایڈیشن ۵۷ء)

یہاں مولانا کو دو غلط فہمیاں ہوئی ہیں، ایک یہ کہ انہوں نے ڈاڑھی رکھنے کو "عادات رسول" کہ کر اس کے سنت ہونے سے انکار کیا ہے۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو فطرت اور انبیاء کرام کی متفق علیہ سنت فرمایا ہے۔ امت کو اس کی اقتداء کا صاف صاف حکم فرمایا ہے اور اس کی علت بھی ذکر فرمادی ہے۔ یعنی کفار کی مخالفت ـــــ اس لئے اس کو سنن عادیہ میں شمار کرنا اور اس کے سنت کہنے کو دین کی تحریف تک کہہ ڈالنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں بیہودہ جسارت ہے۔ فقہائے امت نے منشائے نبوی کو ٹھیک ٹھیک سمجھ کر اسے سنن واجبہ میں شمار کیا ہے۔

دوسری غلطی مولانا مودودی کو یہ ہوئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی کے بڑھانے کا حکم تو ضرور دیا ہے۔ مگر اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں فرمائی، اس لئے بقول ان کے ڈاڑھی کی کوئی خاص مقدار سنت نہیں۔ حالانکہ یہ بات از خود غلط ہے اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی کے بڑھانے کا حکم دیا ہے۔ اس کے کاٹنے کا کہیں حکم نہیں فرمایا نہ اس کی اجازت دی ہے۔

اس کا مقتضیٰ تو یہ تھا کہ اس کا کاٹنا کسی حد پر بھی جائز نہ ہوتا۔ مگر بعض صحابہؓ کے اس عمل سے کہ وہ ایک قبضہ سے زائد بال کٹوا دیا کرتے تھے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کم از کم حد یہ مقرر فرمائی تھی۔ اگر اس سے کم بھی جائز ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ضرور اجازت دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہائے امت میں سے کسی نے بھی ایک مشت سے کم ڈاڑھی رکھنے کو جائز نہیں رکھا شیخ ابن ہمام "شرح ہدایہ" میں لکھتے ہیں:۔

وَاَمَّا الْاَخْذُ مِنْهَا وَهِيَ دُوْنَ ذٰلِكَ كَمَا يَفْعَلُهُ بَعْضُ الْمَغَارِبَةِ

وَمُخَنَّثَةُ الرِّجَالِ فَلَمْ يُبِحْهُ اَحَدٌ (فتح القدیر ص ۲۷۰ ج ۲)

ترجمہ:۔ لیکن ایک مشت سے کم ڈاڑھی کے بال کاٹنا. جیساکہ مغرب کے بعض لوگوں اور عورت نمامردوں کا معمول ہے. اس کی کسی نے اجازت نہیں دی۔

صد حیف کہ ایسی سنت متواترہ کو مولانا مودودی محض خود رائی سے نہ صرف مسترد کر دیتے ہیں۔ بلکہ الٹا اسے "تحریف دین" تک کہہ ڈالتے ہیں اور "ڈاڑھی کا طول کتنا ہے" کے طنزیہ فقرے سے اس کا مذاق اڑاتے ہیں (رسائل و مسائل ص ۱۸۷ ج ۱)

جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے مقابلہ میں اتنا جری ہو کیا وہ عالم دین کہلانے کا مستحق ہے؟

پنجم: میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ حضرات خلفائے راشدینؓ کی سنت بھی سنت نبویؐ کا ایک حصہ ہے اور یہ بھی امت کے لئے واجب الاتباع ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں ایک اہم ترین نکتہ عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ اجماع امت کی اصل بنیاد خلفائے راشدین کے فیصلے ہیں۔ کتاب و سنت کے منصوص احکام کے علاوہ جن مسائل پر امت کا اجماع ہوا ہے ان کا بیشتر حصہ وہ ہے جن کے بارے میں خلفائے راشدینؓ نے فیصلہ کیا اور فقہائے صحابہؓ نے ان سے اتفاق کیا. اس طرح صدر اول ہی میں امت اس پر متفق ہوگئی۔

خلفائے راشدینؓ کے بعد شاذ و نادر ہی کسی کے مسئلہ پر امت کا اجماع ہوا ہے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں:

"و معنیٰ اجماع کے بر زبانِ علماء شنیدہ باشی ایں نیست کہ ہمہ مجتہدان لا یشذ فرد در عصر واحد بر مسئلہ اتفاق کنند، زیرا کہ ایں صورتے است غیر واقع، بل غیر ممکن عادی۔ بلکہ معنیٰ اجماع حکم خلیفہ است بچیزے بعد مشاورہ ذوی الرائے یا بغیر آں۔ و نفاذ آں حکم تا آنکہ شائع شد و در عالم ممکن گشت۔"

"قَالَ النَّبِيُّ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ مِنْ بَعْدِيْ" (ازالۃ الخفاء ص ۲۹ ج ۱)

ترجمہ:۔ اور اجماع کا لفظ جو تم نے علماء کی زبان سے سنا ہو گا اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایک زمانے کے سارے مجتہد، بایں طور پر ایک فرد بھی باہر نہ رہے، کسی مسئلہ پر اتفاق کرلیں، کیونکہ یہ صورت نہ صرف یہ کہ واقع نہیں بلکہ عادۃً ممکن بھی نہیں، بلکہ اجماع کے معنی یہ ہیں کہ خلیفہ ذورائے لوگوں سے مشورہ کرکے یا بغیر مشورے کے کسی چیز کا حکم کرے اور وہ حکم نافذ ہو جائے۔ یہاں تک کہ وہ شائع ہو جائے اور دنیا میں اس کے پاؤں جم جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لازم پکڑو میری سنت کو اور میرے بعد میرے خلفائے راشدینؓ کی سنت کو۔

مگر ارشاد نبویؐ کے برعکس مولانا مودودی کی رائے یہ ہے کہ

" خلفائے راشدین کے فیصلے بھی اسلام میں قانون قرار نہیں پائے۔ جو انہوں نے قاضی کی حیثیت سے کئے تھے"۔ (ترجمان القرآن جنوری ۵۸ء)

قرآن کریم، سنت نبوی، خلفائے راشدین کی سنت (جو اجماع امت کی اصل بنیاد ہے) کے بارے میں مولانا مودودی کے ان نظریات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ اصول دین اور شریعت اسلامیہ کے مآخذ کے بارے میں ان کا ذہن کس قدر الجھا ہوا ہے۔ باقی رہا اجتہاد! تو مولانا اپنے سوا کسی کے اجتہاد کو لائق اعتماد نہیں جانتے۔ اس لئے ان کی دین فہمی کا سارا مدار خود ان کی عقل و فہم اور صلاحیت اجتہاد پر ہے۔

ان چند نکات سے مولانا مودودی کے دینی تفکر اور ان کے زاویہ نظر کو سمجھا جاسکتا ہے۔ ورنہ جیسا کہ پہلے عرض کرچکا ہوں کہ ان کی غلط فہمیوں یا خوش فہمیوں کی فہرست طویل ہے۔ میرے نزدیک مولانا مودودی کا شمار ان اہل حق میں نہیں جو سلف صالحین کا تتبع اور مسلک اہل سنت کی پیروی کرتے ہیں، بلکہ انہوں نے اپنی عقل و فہم سے دین کا جو تصور قائم کیا ہے وہ اسی کو حق سمجھتے ہیں، خواہ وہ سلف صالحین سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، مولانا کے دینی تفکر میں نقص کے بڑے بڑے اسباب میرے نزدیک حسب ذیل ہیں:

اول: انہوں نے دین کو کسی سے پڑھا اور سیکھا نہیں۔ بلکہ اسے بطور خود سمجھا ہے۔ اور شائد مولانا کے نزدیک دین، کسی سے سیکھنے اور پڑھنے کی چیز بھی نہیں۔ بلکہ ان کے خیال میں ہر لکھا پڑھا آدمی اپنے ذاتی مطالعہ سے خود ہی دین سیکھ سکتا

ہے۔

دوم: ناپختہ عمری میں مولانا کو بعض ملاحدہ سے صحبت رہی، جس نے ان کی شخصیت کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کیا، خود مولانا اپنی کہانی اس طرح بیان کرتے ہیں:

ڈیڑھ سال کے تجربات نے یہ سبق دیا کہ دنیا میں عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہونا ضروری ہے اور؟ استقلال کے لئے جدوجہد کے بغیر چارہ کار نہیں، فطرت نے تحریر و انشاء کا ملکہ ودیعت فرمایا تھا عام مطالعے سے اس کو اور تحریک ہوئی، اسی زمانہ میں جناب نیاز فتحپوری سے دوستانہ تعلقات ہوئے اور ان کی صحبت بھی وجہ تحریک بنی غرض ان تمام وجوہ سے یہ فیصلہ کیا کہ قلم ہی کو وسیلہ معاش قرار دینا چاہئے۔ مولانا مودودی (ص ۷۲) اسعد گیلانی

سوم: دنیا کی ذہین ترین شخصیتوں کو عموماً یہ حادثہ پیش آیا ہے کہ اگر ان کی صحیح تہذیب و تربیت نہ ہو پائے تو وہ اپنا راستہ خود تلاش کرتی ہیں، اور اپنے آپ کو اتنی قد آور اور بلند و بالا سمجھنے لگتی ہے کہ باقی سب دنیا انہیں پستہ قد نظر آتی ہے۔ یہی حادثہ مولانا مودودی کو بھی پیش آیا۔ حق تعالیٰ نے ان کو بہترین صلاحیتوں سے نوازا تھا، لیکن بدقسمتی سے انہوں نے دل کا کام بھی دماغ سے لیا۔ اور خوش فہمی کی اتنی بلندی پر پہنچ گئے کہ تمام اکابر امت انہیں بالشتیے نظر آنے لگے۔ اور انہوں نے یہ محسوس کیا کہ دین کا جو فہم ان کو عطا ہوا ہے وہ ان سے پہلے کسی کو عطا نہیں ہوا تھا۔ یہی خوش فہمی ان کی خودرائی اور اعجاب بالنفس کا ذریعہ بن گئی۔

چہارم: ان کے ذہن پر دور جدید کا کچھ ایسا رعب چھایا کہ انہیں دین اسلام کو اس کی اصل شکل میں پیش کرنا مشکل نظر آیا۔ اس لئے انہوں نے اس کی اصلاح و ترمیم کرکے دور جدید کے اذہان کو مطمئن کرنا ضروری سمجھا خواہ اسلام کی ہیئت ہی کیوں نہ بدل جائے ــــــ جیسا کہ آج "جمہوریت" دنیا کے دماغ پر ایسی چھائی ہوئی ہے کہ لوگ کوشش کرکے اسلام کے نظام حکومت کو جمہوریت پر چسپاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پنجم۔ ان تمام امور کے ساتھ جب ان کے زور قلم اور شوخی تحریر کی آمیزش ہوئی تو انہیں اکابر امت کے حق میں حد ادب عبور کرنے پر آمادہ کیا، اور اس بے ادبی کی نحوست ان کی ساری تحریر پر غالب آگئی۔

کاش! مولانا مودودی جیسے ذہین و فطین آدمی کی صحیح تربیت ہوئی ہوتی تو ان کا وجود امت کے لئے باعث برکت اور اسلام کے لئے لائق فخر ہوتا۔

غنی روز سیاہ پیر کنعان راتماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخارا

جواب سوال دوم:

آپ نے خطیب صاحب کا تذکرہ کیا ہے جو جمعہ کے بعد کی سنتیں نہیں پڑھتے۔ اور عموماً عربوں کا ذوق نقل کیا ہے کہ وہ سنن و نوافل کا کوئی خاص اہتمام نہیں کرتے۔ اس سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

اول: حق تعالیٰ شانہ نے نوافل کو فرائض کی کمی پورا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے شریعت نے سنن و نوافل کو فرائض کی کمی پورا کرنے کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لئے شریعت نے سنن و نوافل کی بہت ہی ترغیب دی ہے، اور احادیث طیبہ میں ان کے بہت سے فضائل ارشاد فرمائے ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص فرض کے علاوہ روزانہ بارہ رکعتوں کی پابندی کرے گا حق تعالیٰ شانہ اس کے لئے جنت میں گھر بنائیں گے۔ چار ظہر سے پہلے، دو ظہر کے بعد دو مغرب کے بعد، دو عشاء کے بعد دو فجر کی نماز سے پہلے۔ (مشکوٰۃ ص ۱۰۳)

دوم: سنن و نوافل کے بارے میں لوگوں میں عموماً دو قسم کی کوتاہیاں پائی جاتی ہیں، ایک ان پڑھ لوگوں میں اور دوسری پڑھے لکھے لوگوں میں، ان پڑھ لوگوں کی کوتاہی تو یہ ہے کہ فرض اور نفل کے درمیان فرق نہیں سمجھتے۔ بلکہ نفل کو بھی فرض کی طرح سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور

اس کو آپ اس طرح سمجھ سکتے ہیں کہ ایک شخص سارا دن نوافل پڑھتا رہے لیکن فرض نماز نہ پڑھے تو وہ عنداللہ مجرم ہوگا۔ اور اگر صرف فرائض پڑھ لے، سنن نوافل ترک کر دے تو وہ مجرم نہیں بلکہ محروم کہلائے گا۔ ایک شخص سارے سال کے روزے رکھے رمضان المبارک کا ایک روزہ جان بوجھ کر چھوڑ دے تو یہ شخص گنہ گار ہوگا۔ اور اگر رمضان مبارک کے روزے پورے رکھے لیکن سال بھر میں کوئی نفلی روزہ نہ رکھے تو محروم کہلائے گا، گنہ گار نہیں کہلائے گا یا مثلاً ایک شخص ساری رات عبادت کرتا رہے مگر فجر کی نماز جماعت کیساتھ ادا نہ کرے تو یہ گنہ گار ہوگا۔ کیونکہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنا واجب ہے۔ اور ایک شخص ساری رات سویا رہے مگر جماعت کی نماز میں اہتمام سے شریک ہوا تو یہ گنہ گار نہیں ہوگا۔ خلاصہ یہ کہ فرائض کا تارک مجرم ہے۔ سنن مؤکدہ کا تارک ملامت کا مستحق ہے، اور نوافل کا تارک خیر و برکت سے محروم ہے مگر مستحق ملامت نہیں۔ عوام بیچارے فرض و واجب اور سنت و مستحب کے فرق کو نہیں جانتے۔ اس لئے وہ فرض کے تارک سے نفرت نہیں کرتے، مگر کسی سنت و مستحب کے تارک کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ــــــ لکھے پڑھے حضرات کی غلطی یہ ہے کہ وہ سنن و نوافل کے اہتمام ہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ فرض تو ہے نہیں، اس لئے ان کی ادائیگی میں تساہل کرتے ہیں حالانکہ فرائض کی مثال تو گلی بندھی ڈیوٹی کی ہے کہ وہ نوکر کو بہرحال ادا کرنی ہی ہے، حق تعالیٰ سے بندہ کا تعلق دراصل سنن اور نوافل کے میدان ہی میں واضح ہو جاتا ہے کہ اسے کتنی محبت اور کتنا تعلق ہے۔

سوم: جمعہ کے بعد کی سنتوں کے بارے میں روایات مختلف آئی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص جمعہ کے بعد نماز پڑھے وہ چار رکعتیں پڑھے۔ (صحیح مسلم۔ مشکوٰۃ ص ۱۰۴) ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے بعد گھر جاکر دو رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ جمعہ سے پہلے اور جمعہ کے بعد چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے، حضرت علی کرم

اللہ وجہہ. جمعہ کے بعد چھ رکعتیں پڑھنے کا حکم فرماتے تھے. حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جمعہ کے بعد گھر میں جاکر دو رکعتیں پڑھنا نقل کرتے ہیں) خود جمعہ کے بعد پہلے دو اور پھر چار رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ (ترمذی شریف)

چہارم: گذشتہ بالا روایت سے تین صورتیں سامنے آتی ہیں، اول دو رکعتیں۔ یہ امام شافعیؒ کا مسلک ہے۔ دوسرے چار رکعتیں یہ امام ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے. تیسرے، چھ رکعتیں۔ یہ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا مسلک ہے۔ اور حنفی مذہب میں اسی پر فتویٰ ہے. مگر اس کا اختیار ہے کہ دو رکعتیں پہلے پڑھے. یا چار پہلے پڑھے۔ عرب حضرات چونکہ عموماً شافعیؒ یا حنبلی ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے امام کے مسلک پر عمل کرتے ہیں ان کے یہاں سنن و نوافل کچھ کم ہیں، ہمارے حنیفہ کو جمعہ کے بعد چھ رکعتیں ہی پڑھنی چاہئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک عمل پسند کرنے اور چاہنے کے باوجود اس کی پابندی اس لئے نہیں فرماتے تھے کہ کہیں امت پر لازم نہ ہوجائے۔

جواب سوال سوم:

تیسرے سوال میں آپ نے قبروں پر فاتحہ خوانی. ایصال ثواب. گیارہویں شریف اور ختم شریف کا حکم دریافت فرمایا ہے۔ قبروں پر فاتحہ خوانی کا مسئلہ میں پہلے سوال کے ضمن میں عرض کرچکا ہوں دیگر مسائل پر یہاں عرض کرتا ہوں۔

ایصال ثواب:

(۱) ایصال ثواب کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کوئی نیک عمل کریں اور وہ حق تعالیٰ کے یہاں قبول ہوجائے تو اس پر جو ثواب آپ کو ملنے والا تھا آپ یہ نیت یا دعاء کرلیں کہ اس عمل کا ثواب فلاں زندہ یا مرحوم کو عطا کردیا جائے۔ ایصال ثواب کی یہ

حقیقت معلوم ہونے سے آپ کو تین مسئلے معلوم ہوجائیں گے۔

ایک یہ کہ ایصال ثواب کسی ایسے عمل کا کیا جاسکتا ہے جس پر آپ کو خود ثواب ملنے کی توقع ہو. ورنہ اگر آپ ہی کو اس کا ثواب نہ ملے تو آپ دوسرے کو کیا بخشیں گے؟ پس جو عمل کہ خلاف شرع اور خلاف سنت کیا جائے وہ ثواب سے محروم رہتا ہے۔ اور ایسے عمل کے ذریعہ ثواب بخشنا خوش فہمی ہے۔

دوم: یہ کہ ایصال ثواب زندہ اور مردہ دونوں کو ہوسکتا ہے۔ مثلاً آپ دو رکعتیں نماز پڑھ کر اس کا ثواب اپنے والدین کو یا پیرومرشد کو ان کی زندگی میں بخش سکتے ہیں. اور ان کی وفات کے بعد بھی ـــــ عام رواج مردوں کو ایصال ثواب کا اس وجہ سے ہے کہ زندہ آدمی کے اپنے اعمال کا سلسلہ جاری ہے جب کہ مرنے کے بعد صدقہ جاریہ کے سوا آدمی کے ـــــ اپنے اعمال کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے. اس لئے مرحوم کو ایصال ثواب کا محتاج سمجھا جاتا ہے۔ یوں بھی زندوں کی طرف سے مردوں کے لئے کوئی تحفہ اگر ہوسکتا ہے تو ایصال ثواب ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ قبر میں مردے کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص دریا میں ڈوب رہا ہو اور لوگوں کو مدد کے لئے پکار رہا ہو۔ اسی طرح مرنے والا اپنے ماں باپ بہن بھائی اور دوست احباب کی طرف سے دعا کا منتظر رہتا ہے۔ اور جب وہ اس کو پہنچتی ہے تو اسے دنیا اور دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب ہوتی ہے اور حق تعالیٰ شانہ زمین والوں (یعنی زندوں) کی دعاؤں کی بدولت اہل قبور کو پہاڑوں برابر رحمت عطا فرماتے ہیں۔ اور مردوں کے لئے زندوں کا تحفہ استغفار ہے۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ مشکوٰۃ ص ۲۰۶)

ایک اور حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جنت میں نیک بندے کا درجہ بلند فرمادیتے ہیں تو وہ عرض کرتا ہے کہ یاالٰہی! مجھے یہ درجہ کیسے ملا؟ ارشاد ہوتا ہے، "تیرے لئے تیرے بیٹے کے استغفار کی بدولت" ۔ (رواہ احمد و مشکوٰۃ ص ۲۰۶)

امام سفیان ثوریؒ فرمایا کرتے تھے کہ زندہ لوگ کھانے پینے کے جتنے محتاج ہیں

مردے دعا کے اس سے بڑھ کر محتاج ہیں۔ (شرح صدور سیوطی" ص ۱۲۷)
بہرحال ہمارے وہ بزرگ، احباب اور عزیز و اقارب جو اس دنیا سے رخصت ہو گئے ان کی مدد و اعانت کی یہی صورت ہے کہ ان کے لئے ایصال ثواب کیا جائے یہی ان کی خدمت میں ہماری طرف سے تحفہ ہے۔ اور یہی ہمارے تعلق و محبت کا تقاضا ہے۔

سوم: تیسرا مسئلہ یہ معلوم ہوا کہ جس عمل کا ثواب کسی کو بخشا منظور ہو یا تو اس کام کے کرنے سے پہلے اس کی نیت کر لی جائے یا عمل کرنے کے بعد دعا کر لی جائے کہ حق تعالیٰ شانہ اس عمل کو قبول فرما کر اس کا ثواب فلاں صاحب کو عطا فرمائیں۔

(۲) میت کو ثواب صرف نفلی عبادات کا بخشا جا سکتا ہے، فرائض کا ثواب کسی دوسرے کو بخشا صحیح نہیں۔

(۳) جمہور امت کے نزدیک ہر نفلی عبادت کا ثواب بخشا صحیح ہے۔ مثلاً دعا و استغفار، ذکر و تسبیح، درود شریف، تلاوت قرآن مجید، نفلی نماز و روزہ، صدقہ و خیرات، حج و قربانی وغیرہ۔

(۴) یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ ایصال ثواب کے لئے جو چیز صدقہ و خیرات کی جائے وہ بعینہ میت کو پہنچتی ہے۔ نہیں! بلکہ صدقہ و خیرات کا جو ثواب آپ کو ملنا تھا ایصال ثواب کی صورت میں وہی ثواب میت کو ملتا ہے۔

گیارہویں کی رسم: ہر قمری مہینے کی گیارہویں رات کو حضرت محبوب سبحانی غوث صمدانی شیخ المشائخ شاہ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ کے نام پر جو کھانا تیار کیا جاتا ہے وہ "گیارہویں شریف" کے نام سے مشہور ہے۔ اس سلسلہ میں چند امور لائق توجہ ہی۔

اول: گیارہویں شریف کا رواج کب سے شروع ہوا؟ مجھے تحقیق کے باوجود اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں ہو سکی، تاہم اتنی بات تو معلوم ہے کہ سیدنا شاہ عبدالقادر جیلانی

(نور اللہ مرقدہ) جن کے نام کی گیارہویں دی جاتی ہے، ان کی ولادت ۴۷۰ھ میں ہوئی اور نوے سال کی عمر میں ان کا وصال ۵۶۱ھ میں ہوا. ظاہر ہے کہ گیارہویں کا رواج ان کے وصال کے بعد ہی کسی وقت شروع ہوا ہوگا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین۔ ائمہ دین خصوصاً امام ابو حنیفہؒ اور خود حضرات پیران پیرؒ اپنی گیارہویں نہیں دیتے ہوں گے؟

اب آپ خود ہی فیصلہ فرماسکتے ہیں کہ جس عمل سے اسلام کی کم از کم چھ صدیاں خالی ہوں کیا اسے اسلام کا جز تصور کرنا اور اسے ایک اہم ترین عبادت کا درجہ دے ڈالنا صحیح ہوگا؟ اور آپ اس بات پر بھی غور فرماسکتے ہیں کہ جو لوگ گیارہویں نہیں دیتے ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہؓ و تابعینؒ امام ابو حنیفہؒ اور خود حضرت غوث پاک کے نقش قدم پر چل رہے ہیں یا وہ لوگ جو ان اکابر کے عمل کے خلاف کر رہے ہیں؟

دوم: اگر گیارہویں دینے سے حضرت غوث اعظمؒ کی روح پر فتوح کو ثواب پہنچانا مقصود ہے تو بلاشبہ یہ مقصد بہت ہی مبارک ہے، لیکن جس طرح یہ ایصال ثواب کیا جاتا ہے اس میں چند خرابیاں ہیں۔

ایک یہ کہ ثواب تو جب بھی پہنچایا جائے، پہنچ جاتا ہے۔ شریعت نے اس کے لئے کوئی دن اور وقت مقرر نہیں فرمایا، مگر یہ حضرات گیارہویں رات کی پابندی کو کچھ ایسا ضروری سمجھتے ہیں گویا خدائی شریعت ہے ـــــ اور اگر اس کے بجائے کسی اور دن ایصال ثواب کرنے کو کہا جائے تو یہ حضرات اس پر کسی طرح راضی نہیں ہوں گے۔ ان کے اس طرز عمل معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایصال ثواب مقصود نہیں، بلکہ ان کے نزدیک یہ ایک ایسی عبادت ہے جو صرف اسی تاریخ کو ادا کی جاسکتی ہے۔ الغرض ایصال ثواب کے لئے گیارہویں تاریخ کا التزام کرنا ایک فضول حرکت ہے۔ جس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں۔ اور اسی کو ضروری سمجھ لینا خدا و رسول کے مقابلے میں گویا اپنی شریعت بنانا ہے۔

دوسرے، گیارہویں میں اس بات کا خصوصیت سے اہتمام کیا جاتا ہے کہ کھیر ہی پکائی جائے حالانکہ اگر ایصال ثواب مقصود ہوتا تو اتنی رقم بھی صدقہ کی جاسکتی تھی۔ اور اتنی مالیت کا غلہ یا کپڑا کسی مسکین کو چپکے سے اس طرح دیا جاسکتا تھا کہ بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہوتی۔ اور یہ عمل نمود و نمائش اور ریا سے پاک ہونے کی وجہ سے مقبول بارگاہ خداوندی بھی ہوتا، کھیر پکانے یا کھانا پکانے ہی کو ایصال ثواب کے لئے ضروری سمجھنا اور یہ خیال کرنا کہ اس کے بغیر ایصال ثواب ہی نہیں ہوگا۔ یہ بھی مستقل شریعت سازی ہے۔

تیسرے، ثواب تو صرف اتنے کھانے کا ملے گا، جو فقراء و مساکین کو کھلا دیا جائے، مگر گیارہویں شریف پکا کر لوگ زیادہ تر خود ہی کھاپی لیتے ہیں یا اپنے عزیز و اقارب و احباب کو کھلا دیتے ہیں، فقراء و مساکین کا حصہ اس میں بہت ہی کم ہوتا ہے، اس کے باوجود یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جتنا کھانا پکایا گیا پورے کا ثواب حضرت پیران پیرؒ کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ بھی قاعدہ شرعیہ کے خلاف ہے، کیونکہ شرعاً ثواب تو اس چیز کا ملتا ہے جو بطور صدقہ کسی کو دے دی جائے۔ صرف کھانا پکانا تو کوئی ثواب نہیں۔

چوتھے، بہت سے لوگ گیارہویں کے کھانے کو تبرک سمجھتے ہیں، حالانکہ ابھی معلوم ہوچکا کہ جو کھانا خود کھالیا گیا وہ صدقہ ہی نہیں۔ اور نہ حضرت پیران پیرؒ کے ایصال ثواب سے اس کو کچھ تعلق ہے اور کھانے کا جو حصہ صدقہ کر دیا گیا اس کا ثواب بلاشبہ پہنچے گا لیکن صدقہ کو تو حدیث پاک میں "اَوْسَاخُ النَّاسِ" (لوگوں کا میل کچیل" فرمایا گیا ہے، اسی بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی آل کے لئے صدقہ جائز نہیں۔ پس جس چیز کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "میل کچیل" فرما رہے ہوں اس کو "تبرک" سمجھنا، اور بڑے بڑے مالداروں کا اس کو شوق سے کھانا اور کھلانا کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے خلاف نہیں؟ اور پھر اس پر بھی غور فرمایئے کہ ایصال ثواب کے لئے اگر غلہ یا کپڑا دیا جائے کیا اس کو بھی کسی نے کبھی "تبرک" سمجھا ہے؟ تو آخر گیارہویں تاریخ کو دیا گیا کھانا کس اصول شرعی سے

تبرک بن جاتا ہے؟

پانچویں، بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ گیارہویں نہ دینے سے ان کے جان و مال کا (خدانخواستہ) نقصان ہوجاتا ہے، یا مال میں بے برکتی ہوجاتی ہے، گویا نماز، روزہ حج زکوٰۃ جیسے قطعی فرائض میں کوتاہی کرنے سے کچھ نہیں بگڑتا، مگر گیارہویں شریف میں ذرا کوتاہی ہوجائے تو جان و مال کے لالے پڑجاتے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ ایک ایسی چیز جس کا شرع شریف میں اور امام ابو حنیفہؒ کی فقہ میں کوئی ثبوت نہ ہو جب اس کا التزام فرائض شرعیہ سے بھی بڑھ جائے اور اس کے ساتھ ایسا اعتقاد جم جائے کہ خدا تعالیٰ کے مقررہ کردہ فرائض کے ساتھ ایسا اعتقاد نہ ہو تو اس کے مستقل شریعت ہونے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے؟

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط

اور پھر اس پر بھی غور فرمائیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ، ائمہ مجتہدین، اور بڑے بڑے اکابر اولیاء اللہ میں سے کسی کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں کہ اگر ان اکابر کے لئے ایصال ثواب نہ کیا جائے تو جان و مال کا نقصان ہوجاتا ہے، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر حضرت پیران پیرؒ کی گیارہویں نہ دینے ہی سے کیوں جان و مال کو خطرہ لاحق ہوجاتا ہے۔ ہمارے ان بھائیوں نے اگر ذرا بھی غور و فکر سے کام لیا ہوتا تو ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اپنے اس غلو سے حضرت پیران پیرؒ کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

سوم: ممکن ہے عام لوگ ایصال ثواب کی نیت ہی سے گیارہویں دیتے ہوں، مگر ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ گیارہویں حضرت پیران پیرؒ کے ایصال ثواب کے لئے نہیں دیتے ـــــ ایک بزرگ نے اپنے علاقے کے گوالوں کو ایک دفعہ وعظ کہا کہ دیکھو بھئی! گیارہویں شریف تو خیر دیا کرو، مگر نیت یوں کیا کرو کہ ہم یہ چیز خدا تعالیٰ کے نام پر صدقہ کرتے ہیں اور اس کا جو ثواب ہمیں ملے گا وہ حضرت پیران پیرؒ کی روحِ فتوح کو پہنچانا چاہتے ہیں، اس تلقین کا جواب ان کی طرف سے یہ تھا کہ

"مولوی جی! خدا تعالیٰ کے نام کی چیز تو ہم نے پرسوں دی تھی، یہ خدا کے نام کی نہیں، بلکہ حضرت پیران پیر کے نام کی ہے"۔

ان کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گیارہویں، حضرت شیخؒ کے ایصال ثواب کے لئے نہیں دے رہے۔ بلکہ جس طرح صدقہ و خیرات کے ذریعہ حق تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح وہ خود گیارہویں شریف کو حضرتؒ کے دربار میں پیش کر کے آپ کا تقرب حاصل کرنا چاہتے ہیں، اور یہی راز ہے کہ وہ لوگ گیارہویں دینے نہ دینے کو مال و جان کی برکت اور بے برکتی میں دخیل سمجھتے ہیں۔ یہ حضرات اپنی بے سمجھی کی وجہ سے بڑے خطرناک عقیدے میں گرفتار ہیں،

چہارم: جن لوگوں نے حضرت غوث اعظمؒ کی غنیۃ الطالبین اور آپ کے مواعظ شریفہ (فتوح الغیب) وغیرہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت شیخؒ امام احمد بن حنبلؒ کے پیرو تھے۔ گویا آپ کا فقہی مسلک ٹھیک وہی تھا جو آج سعودی حضرات کا ہے جن کو لوگ "نجدی اور وہابی کے لقب سے یاد کرتے ہیں، حضرت شیخؒ اور ان کے مقتدا حضرت امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک جو شخص نماز کا تارک ہو وہ مسلمان نہیں رہتا۔ اگر حضرت غوث اعظمؒ آج دنیا میں ہوتے تو ان لوگوں کو جو نماز روزہ کے تارک ہیں، مگر التزام سے گیارہویں دیتے ہیں، شائد اپنے فقہی مسلک کی بناء پر مسلمان بھی نہ سمجھتے، اور یہ حضرات، نجدیوں کی طرح، حضرت شیخؒ پر "وہابی" ہونے کا فتویٰ دیتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت پیران پیرؒ یا دوسرے اکابر کے لئے ایصال ثواب کرنا سعادت مندی ہے مگر گیارہویں شریف کے نام سے جو کچھ کیا جاتا ہے وہ مذکورہ بالا وجوہ سے صحیح نہیں بغیر تخصیص وقت کے جو کچھ میسر آئے اس کا صدقہ کر کے بزرگوں کو ایصال ثواب کیا جائے۔

کھانے پر ختم:۔ بعض لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ ایصال ثواب کے لئے جو کھانا

دیتے ہیں اس پر میانجی سے کچھ پڑھواتے ہیں۔ اور اس کو بعض لوگ "فاتحہ شریف" اور بعض "ختم شریف" کہتے ہیں۔ بادی النظر میں یہ عمل بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، اور لوگ اس کے اسی ظاہری حسن کے عاشق ہیں، مگر اس میں چند امور توجہ طلب ہیں۔

اول: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور سلف صالحین میں اس کا رواج نہیں تھا۔ اس لئے بلاشبہ یہ طریقہ خلاف سنت ہے اور آپ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے حوالے سے سن چکے ہیں کہ جو چیز خلاف سنت ہو وہ مذموم اور قابل ترک ہے اگر شریعت کی نظر میں یہ طریقہ مستحسن ہوتا تو سلف صالحین اس سے محروم نہ رہتے۔

دوم: عام لوگوں کا خیال ہے کہ جب تک اس طرح ختم نہ پڑھا جائے میت کو ثواب نہیں پہنچتا، بہت سے لوگوں سے آپ نے یہ فقرہ سنا ہوگا "مرگیا مردود، نہ فاتحہ نہ درود" یہ خیال ایک سنگین غلطی ہی نہیں، بلکہ خدا اور رسول کے مقابلے میں گویا نئی شریعت بنانا ہے۔ اس لئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریقہ ایصال ثواب کا نہیں بتایا۔ اور نہ سلف صالحین نے اس پر عمل کیا، اب دیکھئے کہ جو حضرات یہ فقرہ دہراتے ہیں "مرگیا مردود، نہ فاتحہ نہ درود" اس کا پہلا نشانہ کون بنتا ہے ــــ پس یہ کیسی دینداری ہے کہ ایک نئی بدعت گھڑ کر ایسے فقرے چست کئے جائیں جن کی زد میں سلف صالحین آتے ہوں۔ اور ان اکابر کے حق میں ایسے ناروا الفاظ استعمال کئے جائیں۔

سوم: کہا جاتا ہے کہ اگر کھانے پر سورتیں پڑھ لی جائیں تو کیا حرج ہے؟ حالانکہ اس سے بڑھ کر حرج کیا ہوگا کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقہ، آپ کی سنت اور شریعت کے خلاف ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے اکابر اہل سنت نے کھانے پر قرآن کریم پڑھنے کو بے ادبی تصور کیا ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کے فتاویٰ میں ہے:

"سوال: کسے کلام اللہ یا آیت کلام مجید بر طعام خواند چہ حکم است؟

شخصے میگوید کہ کلام اللہ بر طعام آنچناں است کہ کسے در جائے ضرور بخواند۔ نعوذ باللہ منہا۔
جواب: بایں طور گفتن روانیست بلکہ سوء ادبی است، اگر ایں چنیں گفت کہ درہچوں اینجا خواندان سوء ادبی است مضائقہ ندارو۔ وایں، ہم وقتے است کہ بطریق وعظ و پند نہ خواند، و اما بطور وعظ و پند و منع از شرک و بدعت خواندن درہرجاروا است، بلکہ برائے رد بدعت گاہ واجب می شود" فتاویٰ عزیزی ص ۹۲)
ترجمہ: سوال: کوئی شخص کلام اللہ، یا قرآن مجید کی آیت کھانے پر پڑھے تو کیا حکم ہے؟ ایک شخص کہتا ہے کہ کلام اللہ کھانے پر پڑھنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص قضائے حاجت کی جگہ پر پڑھے۔ نعوذ باللہ۔
جواب: ایسا کہنا روا نہیں بلکہ بے ادبی ہے، ہاں اگر یوں کہے کہ "اسی طرح کھانے پر قرآن پڑھنا بھی بے ادبی ہے" تو مضائقہ نہیں اور یہ بے ادبی بھی اس وقت ہے جب کہ بطور وعظ و نصیحت نہ پڑھے، لیکن وعظ و نصیحت کے طور پر اور شرک و بدعت سے منع کرنے کے لئے پڑھنا ہر جگہ درست ہے۔ بلکہ رد بدعت کے لئے بسا اوقات واجب ہے"۔

حضرت شاہ صاحبؒ کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ کھانے پر قرآن مجید پڑھنا ایک طرح کی بے ادبی ہے۔

چہارم: میاں جی کو بلا کر جو کھانے پر ختم پڑھایا جاتا ہے اس میں قباحت یہ ہے کہ میاں جی اپنے ختم کے بدلے میں کھانا لے جاتے ہیں اور گھر والے اپنے کھانے کے بدلے میں میاں جی سے ختم پڑھوا لیتے ہیں۔ اگر میانجی ختم نہ پڑھے تو وہ کھانے سے محروم رہتا ہے اور اگر گھر والے کھانا نہ دیں تو میانجی ختم کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، گویا میانجی کے ختم اور گھر والوں کے کھانے کا باہمی تبادلہ ہوتا ہے اور یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کا معاوضہ بن جاتی ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ قرآن کریم معاوضہ لیکر پڑھا

جائے تو ثواب پڑھنے والے کو بھی نہیں ملتا، اسی طرح جو کھانا معاوضے کے طور پر کھلایا جائے وہ بھی ثواب سے محروم رہتا ہے، ختم پڑھایا تو اس لئے گیا تھا کہ دوہرا ثواب ملے گا۔ مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکہرا ثواب بھی جاتا رہا۔

پنجم: میں نے بعض جگہ دیکھا ہے کہ جب تک کھانے پر ختم نہ دلایا جائے کسی کو کھانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بعض اوقات اگر میانجی صاحب کی تشریف آوری میں کسی وجہ سے تاخیر ہو جائے تو بچوں تک کو کھانے سے محروم رکھا جاتا ہے۔ خواہ وہ کتنا ہی بلبلاتے رہیں ـــــ حالانکہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ ثواب تو اس کھانے کا ملے گا جو کسی غریب محتاج کو خدا واسطے دیدیا گیا، پھر آخر اس پابندی کی کیا وجہ ہے کہ جب تک ختم نہ پڑھ لیا جائے کھانا بچوں تک کے لئے ممنوع قرار پائے۔

ششم: دراصل تیجا، ساتواں، دسویں، گیارہویں، اور ختم کا رواج ہندوستان کے مسلمانوں میں ہندو معاشرے سے منتقل ہوا، یہی وجہ ہے کہ ہندوستان (اور اب پاک و ہند) کے علاوہ دوسرے کسی ملک میں ان رسموں کا رواج نہیں، ہندوؤں کے ایصال ثواب کا طریقہ اور اس کی خاص خاص تاریخوں کو ہمارے مشہور سیاح البیرونی نے "کتاب الہند" میں بہت تفصیل سے لکھا ہے۔ اور مولانا عبیداللہ نومسلم نے، جو پہلے ہندوؤں کے پنڈت تھے، بعد میں حق تعالیٰ نے ان کو نور ایمان نصیب فرمایا، (تحفۃ الہند" میں بھی ہندوانہ ایصال ثواب کے طریقوں کی نشاندہی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "برہمن کے مرنے کے بعد گیارہواں دن، اور کھتری کے مرنے کے بعد تیرہواں دن، اور ویش یعنی بنیئے وغیرہ کے مرنے کے بعد پندرھواں، یا سولہواں دن اور شودر یعنی بالدھی وغیرہ کے مرنے کے بعد تیسواں یا اکتیسواں دن ہے ـــــ از انجملہ ایک چھ ماہی کا دن ہے، یعنی مرنے کے چھ مہینے بعد ـــ ازاں جملہ برسی کا دن ہے، اور ایک دن گائے کو بھی کھلاتے ہیں ـــ ازاں جملہ اسوج کے مہینے کے نصف اول میں ہر سال اپنے بزرگوں کو ثواب پہنچاتے ہیں، لیکن جس تاریخ میں

کوئی مراس تاریخ میں ثواب پہنچانا ضروری جانتے ہیں۔ اور کھانے کے ثواب پہنچانے کا نام سرادھ ہے، اور جب سرادھ کا کھانا تیار ہو جائے تو اول اس پر پنڈت کو بلوا کر کچھ وید پڑھواتے ہیں، جو پنڈت اس کھانے پر وید پڑھتا ہے تو وہ ان کی زبان میں "ابھشر من" کہلاتا ہے۔ اور اسی طرح اور بھی دن مقرر ہیں"۔ (ص ۹۱۔ بحوالہ راہ سنت)

ان چند در چند قباحتوں کی بناء پر میں کھانا سامنے رکھ کر قرآن کریم کی آیات کا ختم پڑھنے کو ایک بے کار رسم سمجھا ہوں، اور اسے ایصال ثواب کا اسلامی طریقہ سمجھنے اور اس کی پابندی کرنے کو "بدعت" سمجھتا ہوں ــــــ تاہم ختم پڑھنے سے کھانا حرام نہیں ہو جاتا، اور نہ اس کو شرک کہنا صحیح ہے۔ البتہ "بدعت" کہنا چاہئے۔ میں ایصال ثواب کا سنت طریقہ اوپر عرض کر چکا ہوں جس کا خلاصہ یہ ہے:

الف: اپنے مرحوم بزرگوں اور عزیزوں کے لئے دعاء و استغفار کی پابندی کی جائے۔

ب: جتنی ہمت ہو درود شریف، تلاوت قرآن مجید، کلمہ شریف اور تسبیحات پڑھ کر ان کو ایصال ثواب کیا جائے۔ اگر ہر مسلمان روزانہ تین مرتبہ درود شریف، سورہ فاتحہ سورہ اخلاص پڑھ کر بخش دیا کرے تو مرحومین کا جو حق ہمارے ذمہ ہے کسی درجے میں وہ ادا ہو سکے۔

ج: نفلی نماز، روزہ، حج، قربانی سے بھی حسب توفیق ایصال ثواب کیا جائے۔

د: صدقہ و خیرات کے ذریعہ بھی ایصال ثواب کا اہتمام کیا جائے۔ مگر اس کے لئے نہ کوئی وقت مقرر کیا جائے۔ نہ کھانا پکانے ہی کا اہتمام کیا جائے۔ نہ میانجی کی ضرورت سمجھی جائے، بلکہ وقتاً فوقتاً جب بھی توفیق ہو روپیہ، پیسہ، غلہ کپڑا، یا جو چیز بھی میسر ہو مرحومین کی طرف سے راہ خدا میں صدقہ کر دی جائے۔

یہ ہے ایصال ثواب کا وہ طریقہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہے اور جس پر ہمارے اکابر اہل سنت سلف صالحین عمل پیرا رہے ہیں۔

حرف آخر

آخر میں چند باتیں نقل کرتا ہوں جن کو ہمارے علمائے اہلسنت نے بدعت قرار دیا ہے۔ تمام اہلسنت کو ان سے پرہیز کرنا ضروری ہے! اور جو لوگ یہ بدعتیں کرتے ہیں وہ اہلسنت نہیں بلکہ "اہل بدعت" ہیں۔ قبروں پر دھوم دھام سے میلے کرنا، پختہ قبریں بنانا۔ قبّے بنانا۔ ان پر چادریں چڑھانا۔ ان کو سجدہ کرنا۔ ان کا طواف کرنا۔ ان کے سامنے نیت باندھ کر کھڑے ہونا۔ ان کو چومنا۔ چاٹنا، آنکھیں ملنا، ان پر نذر و نیاز دینا اور گلگلے وغیرہ چڑھانا۔ بزرگوں کا عرس کرنا۔ ان کی قبروں پر میلے لگانا، قوالی کرانا، ڈوم اور کنجنیوں کو بلانا اور طرح طرح کے کھیل تماشے کرنا بزرگوں کی منتیں کرنا، ان کے نام کے چڑھاوے چڑھانا، ان سے دعائیں مانگنا، ان کی قبروں پر چراغاں کرنا، مجاور بن کر بیٹھنا۔ ۱۲ ربیع الاول کو عید میلاد منانا۔ اس موقعہ پر چراغاں کرنا، محفل میلاد میں من گھڑت روایتیں سنانا غلط سلط نعت خوانی کرنا، جلوس نکالنا، روضہ شریف کی شبیہ بنانا، بیت اللہ شریف کی شبیہ بنانا، اذان و اقامت میں انگوٹھے چومنا، مل کر زور زور سے ذکر کرنا جس سے نمازیوں کی نماز میں خلل ہو۔ قد قامت الصلوٰۃ سے پہلے کھڑے ہونے کو برا سمجھنا۔ نمازوں کے بعد مصافحے کرنا، اذان سے پہلے درود و سلام پڑھنا ـــــ گیارہویں دینا، کھانے پر ختم پڑھنا، تیجا، نواں، دسواں، بیسواں، چالیسواں کرنا، برسی منانا۔ ایصال ثواب کے لئے خاص خاص صورتیں تجویز کرنا اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھنا محرم میں ماتم کرنا، تعزیہ نکالنا، علم اور دلدل نکالنا، سبیلیں لگانا، مرثیے پڑھنا قرآن مجید پڑھنے پر اجرت لینا، قبر پر اذان کہنا، مردہ بخشوانے کے لئے حیلہ اسقاط کرنا، قبروں میں غلہ لے جانا، قل کرنا وغیرہ وغیرہ۔

حق تعالیٰ شانہ سب مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی پیروی کرنے اور تمام بدعات سے بچنے کی توفیق بخشے، اور قیامت کے دن مجھے، آپ کو اور تمام مسلمانوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت و معیت نصیب فرمائے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

محمد یوسف لدھیانوی ۲۲/۶/۹۹ھ

ضمیمہ نمبر ۱

قبروں پر پھول ڈالنا

سوال:

روزنامہ جنگ ۱۲/ دسمبر کی اشاعت میں آپ نے ایک سوال کے جواب میں لکھا تھا کہ قبروں پر پھول چڑھانا خلاف سنت ہے۔ ۱۹/ دسمبر کی اشاعت میں ایک صاحب شاہ تراب الحق قادری نے آپ کو جاہل اور علم کتاب و سنت سے بے بہرہ قرار دیتے ہوئے اس کو سنت لکھا ہے جس سے کافی لوگ تذبذب میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ براہ کرام یہ خلجان دور کیا جائے۔

جواب:

شریعت کی اصطلاح میں "سنت" اس طریقہ کو کہتے ہیں جو دین میں ابتداء سے چلا آتا ہو۔ پس جو عمل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول رہا وہ سنت ہے۔ اسی طرح حضرات خلفائے راشدین اور صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم) نے جو عمل کیا ہو وہ بھی "سنت" ہی کے ذیل میں آتا ہے۔

کسی عمل کے بارے میں یہ معلوم کرنا کہ یہ سنت ہے یا نہیں؟ اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ دیکھ لیا جائے کہ آیا یہ عمل خیر القرون میں رائج تھا یا نہیں؟ جو عمل صدر اول (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاء راشدین اور صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم کے بابرکت زمانوں) میں رائج رہا ہو وہ بلاشبہ سنت ہے۔ اور اس پر عمل کرنے والے "اہل سنت" یا "سنی" کہلانے کے مستحق ہیں۔ اس کے برعکس جو عمل کہ ان بابرکت زمانوں کے بعد ایجاد ہوا ہو اس کو بذات خود مقصد اور کار ثواب سمجھ کر کرنا بدعت ہے۔ اور جو لوگ اس پر عمل پیرا ہوں وہ اہل بدعت یا بدعتی کہلاتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینکڑوں لاڈلے صحابہ کرامؓ کو دفن کیا، ماشاء اللہ مدینہ طیبہ ومطہرہ میں پھولوں کی کمی نہیں تھی۔ کیا آپؐ نے کسی قبر پر پھول چڑھائے؟ پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد کیا خلفائے راشدین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس پر پھول چڑھائے؟ کیا صحابہ کرامؓ نے حضرات خلفائے راشدین کی قبور طیبہ پر اور تابعینؒ نے کسی صحابی کی قبر پر پھول چڑھائے؟ ان تمام سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ اور پورے ذخیرہ حدیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں ملتی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، کسی خلیفہ راشدؓ، کسی صحابیؓ یا کسی تابعیؒ نے قبروں پر پھول چڑھائے ہوں۔ پس جو عمل کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر کسی ادنیٰ تابعی تک سے ثابت نہ ہو اس کو "سنت" کون کہہ سکتا ہے؟ ہاں اگر کوئی صاحب کسی کسی ایسے کام کو بھی "سنت" سمجھا کرتے ہیں جو معمول نبویؐ اور صحابہؓ و تابعینؒ کے معمول کے خلاف ہو تو اس ناکارہ کو اعتراف ہے کہ وہ "سنت" کی اس نئی اصطلاح سے ناواقف ہے۔

ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ایک چیز کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانوں میں وجود نہیں تھا، بلکہ بعد میں وجود میں آئی اور کسی امام مجتہد نے کسی اصل شرعی سے استنباط کرکے اسے جائز یا مستحسن قرار دیا، ایسی چیز کو سنت نبوی تو نہیں کہہ جائے گا، مگر ائمہ اجتہاد کا قیاس و استنباط بھی چونکہ ایک شرعی دلیل ہے اس لئے ایسی چیز کو خلاف شریعت بھی نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ اسے بھی ثابت بالسنہ سمجھا جائے گا۔

زیر بحث مسئلہ میں یہ صورت بھی نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ اول تو پھول اور قبر ایسی چیزیں نہیں جو زمانہ خیر القرون کے بعد وجود میں آئی ہوں۔ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قبریں بھی تھیں، اور پھول بھی تھے۔ اور ان پھولوں کو قبروں پر آسانی سے ڈالا بھی جاسکتا تھا۔ اگر یہ کوئی مستحسن چیز ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قولاً یا فعلاً اس کو رواج دے سکتے تھے۔

پھر فقہ حنفی کی تدوین ہمارے امام اعظم" کے زمانے سے شروع ہوئی اور دوسری صدی سے لیکر دسویں صدی تک بلامبالغہ ہزاروں فقہی کتابیں لکھی گئیں۔ ہمارے فقہاء نے کفن و دفن اور قبر سے متعلق ادنیٰ دانیٰ مستحبات اور سنن و آداب کو بڑی بڑی تفصیل سے قلمبند کیا ہے۔ لیکن دس صدیوں کا پورا فقہی لٹریچر اس سے خالی ہے کہ قبروں پر پھول چڑھانا بھی "سنت" ہے، اب اگر یہ عمل بھی سنت ہوتا تو دس صدیوں کے آئمہ احناب اس "سنت" سے کیوں غافل رہے؟ آخر یہ کیسی سنت ہے جس کا سراغ نہ زمانہ خیر القرون میں ملتا ہے، نہ ذخیرہ حدیث میں، نہ دس صدیوں کے فقہی ذخیرہ میں۔ نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس پر عمل کرتے ہیں۔ نہ خلفاء راشدین۔ نہ صحابہ و تابعین، نہ آئمہ مجتہدین، اور نہ دس صدیوں کے علماء۔

یہاں یہ عرض کر دینا بھی ضروری ہے کہ زمانہ مابعد کے متاخرین کے استحسان سے "سنت" تو کجا؟ جواز بھی ثابت نہیں ہوتا۔ امام ربانی مجدد الف ثانی" فتاویٰ غیاثیہ کے نقل کرتے ہیں:

- قَالَ الشَّیْخُ الْإِمَامُ الشَّهِیْدُ رَحِمَهُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ: لَانَأْخُذُ بِاسْتِحْسَانِ مَشَائِخِ بَلْخ ۔ وَاِنَّمَا نَأْخُذُ بِقَوْلِ أَصْحَابِنَا الْمُتَقَدِّمِیْنَ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ ۔ لِاَنَّ التَّعَامُلَ فِیْ بَلْدَةٍ لَایَدُلُّ عَلَی الْجَوَازِ وَاِنَّمَا یَدُلُّ عَلَی الْجَوَازِ مَایَکُوْنُ مِنَ الصَّدْرِ الْاَوَّلِ لِیَکُوْنَ ذٰلِكَ دَلِیْلًا عَلٰی تَقْرِیْرِ النَّبِیِّ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ اِیَّاهُمْ عَلٰی ذٰلِكَ فَیَکُوْنُ شَرْعًا عَنْهُ عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ وَاَمَّا اِذَا لَمْ یَکُنْ کَذٰلِكَ لَایَکُوْنُ فِعْلُهُمْ حُجَّةً ۔ اِلَّا اِذَا کَانَ ذٰلِكَ مِنَ النَّاسِ کَافَّةً فِی الْبُلْدَانِ کُلِّهَا ۔ لِیَکُوْنَ اِجْمَاعًا وَالْاِجْمَاعُ حُجَّةٌ ۔ اَلَاتَرٰی اَنَّهُمْ لَوْتَعَامَلُوْا عَلٰی بَیْعِ الْخَمْرِ وَعَلَی الرِّبٰوا لَایُفْتٰی بِالْحِلِّ ۔ (مکتوبات امام ربانی دفتر دوم مکتوب ۵۴)

ترجمہ:۔ "شیخ امام شہید" فرماتے ہیں کہ ہم مشائخ بلخ کے استحسان کو نہیں لیتے ہم صرف اپنے متقدمین اصحاب" کے قول کو لیتے ہیں، کیونکہ کسی علاقے میں کسی چیز کا رواج چل نکلنا اس کے جواز کی دلیل نہیں۔ جواز کی دلیل وہ تعامل ہے جو صدر اول سے چلا آتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ" کو اس پر برقرار رکھا۔ اس صورت میں یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تشریع ہوگی۔ لیکن جب کہ ایسا نہ ہو تو لوگوں کا فعل حجت نہیں، اِلّا یہ کہ تمام ملکوں کے تمام انسان اس پر عمل پیرا ہوں تو یہ اجماع ہوگا۔ اور اجماع حجت ہے۔ دیکھئے اگر لوگ شراب فروشی اور سود پر عمل کرنے لگیں تو ان کے حلال ہونے کا فتویٰ نہیں دیا جائے گا"۔

رہی وہ حدیث، جو شاہ صاحب نے پیش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاخ خرما کو دو حصوں میں چیر کر انہیں دو معذب اور مقہور قبروں پر گاڑ دیا تھا۔ اور فرمایا تھا کہ جب تک یہ خشک نہیں ہوں گی امید ہے کہ ان قبروں کے عذاب میں تخفیف رہے گی۔ اس سلسلہ میں چند امور لائق توجہ ہیں۔

اول: یہ کہ یہ واقعہ متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی روایت سے مروی ہے۔ امام نووی" اور قرطبی" کی رائے یہ ہے کہ یہ تمام روایات ایک ہی قصہ کی حکایت ہیں۔ لیکن حافظ ابن حجر" اور علامہ عینی" کی رائے ہے کہ یہ تین الگ الگ واقعات ہیں۔ اس امر کی تنقیح اگرچہ بہت دشوار ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے یا متعدد واقعات۔ لیکن قدر مشترک سب روایات کا یہ ہے کہ قبروں پر شاخیں گاڑنا عام معمول نبی" نہیں تھا۔ بلکہ مقہور و معذب قبروں پر شاخیں گاڑنے کے ایک دو واقعے ضرور پیش آئے۔

دوم: اس میں بھی کلام ہے کہ یہ قبریں مسلمانوں کی تھیں یا کافروں کی؟ ابو موسیٰ مدینی" کہتے ہیں کہ یہ کافروں کی قبریں تھیں۔ اور بعض حضرات نے فرمایا ہے کہ یہ مسلمانوں کی قبریں تھیں۔ حافظ" فرماتے ہیں کہ حدیث جابر" میں بظاہر کافروں کی قبروں کا واقعہ ہے اور حدیث ابن عباس" میں مسلمانوں کی قبروں کا۔ (فتح

الباری ج ۱ ص ۲۵۶)۔

یہ قبریں کافروں کی ہوں یا مسلمانوں کی؟ اتنی بات واضح ہے اور حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ شاخیں گاڑنے کا عمل ان قبروں پر کیا گیا جن کا مقہور و معذب ہونا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی قطعی یا کشف صحیح سے معلوم ہو گیا۔ عام مسلمانوں کی قبروں پر نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شاخیں گاڑیں۔ اور نہ اس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین کے زمانے میں رواج عام ہوا۔ جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ قبر پر شاخ گاڑنا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت عامہ اور سنت مقصودہ نہیں تھی۔

سوم: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "امید ہے کہ جب تک یہ شاخیں خشک نہ ہوں ان قبروں کے عذاب میں تخفیف رہے گی"۔ شارحین نے اس کی توجیہ و تعلیل میں کلام کیا ہے۔ مناسب ہے حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ کی شرح مشکوٰۃ سے اس مقام کی تشریح بلفظہ نقل کر دی جائے۔ شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں:

> "اس حدیث کی توجیہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان شاخوں کے تر رہنے تک تخفیف عذاب کی امید جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہر فرمائی اس کی بنیاد کس چیز پر ہے؟
>
> بعض لوگ اس پر ہیں کہ اس کی بنا اس پر ہے کہ نباتات جب تک تروتازہ رہیں حق تعالیٰ کی تسبیح کہتی ہیں، اور آیت کریمہ: "اور نہیں کوئی چیز مگر تسبیح کہتی ہے اپنے رب کی حمد کے ساتھ" میں شیئی سے زندہ شیئی مراد ہے۔ اور لکڑی کی زندگی اسی وقت تک ہے جب تک کہ وہ خشک نہ ہو۔ اور پتھر کی حیات اس وقت تک ہے جب تک کہ وہ ٹوٹ نہ جائے۔ یا خاص تسبیح زندہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور جو تسبیح کہ ہر چیز کو عام ہے وہ اس کا وجود صانع پر اور اس کی وحدت اور صفات کمال پر

دلالت کرتا ہے۔ اور یہ جماعت اس حدیث سے قبروں پر سبزہ اور پھول ڈالنے میں استدلال کرتی ہے۔

اور امام خطابیؒ نے، جو آئمہ اہل علم اور قدوہ شراح حدیث میں سے ہیں، اس قول کو رد کیا ہے۔ اور اس حدیث سے تمسک کرتے ہوئے قبروں پر سبزہ اور پھول ڈالنے سے انکار کیا ہے۔ اور فرمایا کہ یہ بات کوئی اصل نہیں رکھتی۔ اور صدر اول میں نہیں تھی۔

اور بعض نے کہا کہ اس تحدید و توقیت کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تخفیف عذاب کی شفاعت فرمائی تھی۔ پس آپؐ کی شفاعت شاخ کے خشک ہونے تک کی مدت کے لئے قبول کرلی گئی۔ اور ارشاد نبوی "لَعَلَّ" کا لفظ اسی طرف ناظر ہے۔ واللہ علم (اور صحیح مسلم ص ۴۱۸ ج ۲ میں بروایت جابرؓ اس پر تصریح نبویؐ موجود ہے — ناقل)

اور علامہ کرمانی فرماتے ہیں کہ شاخ کے اندر دفع عذاب کی کوئی خاصیت نہیں، بلکہ یہ عذاب میں تخفیف سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی برکت و کرامت تھی۔

اگر تو دست بسائی بگور مردہ دلاں
روان مردہ در آید بعیش دربدنش [1]

اور بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس کا علم نبوت کے سپرد ہے کہ اس میں کیا راز ہوگا۔ اور جامع الاصول میں بریدہ صحابی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے وصیت فرمائی کہ دو شاخیں ان کی قبر میں

---

[1] اگر آپ مردہ دلوں کی قبر پر ہاتھ رکھ دیں۔ تو مردہ کی جان مزہ سے اس کے بدن میں لوٹ آئے

گاڑ دی جائیں. تاکہ ممکن ہے کہ اس میں کوئی راز ہو. اور وہ سبب نجات ہو جائے۔

ع دل عشاق حیلہ گر باشد ۲ ۔

شیخ کی اس تقریر سے واضح ہو جاتا ہے کہ محققین اس کے قائل ہیں کہ تخفیف عذاب کا سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت یا آپ کے دست مبارک کی برکت و کرامت تھی۔ ورنہ شاخ میں دفع عذاب کی کوئی خاصیت نہیں۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے شاخ تر کے تسبیح پڑھنے کو دفع عذاب کی علت قرار دیا اور پھر اس کو عام سبزہ وگل کی طرف متعدی کیا. ان کو اجتہاد و استنباط کا کوئی مقام حاصل نہیں۔ نہ ان کا یہ قول اہل علم کا نظر میں کوئی قیمت رکھتا ہے۔ بلکہ "ائمہ اہل علم اور قدوہ شراح حدیث" نے ان کے اس تعلل کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے:

"ایں سخن اصلے ندارد۔ و در صدر اول نبود۔"

کہ یہ بالکل بے اصل بات ہے اور صدر اول ــــ خیر القرون ــــ کے معمول کے خلاف ہے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی" مشکوٰۃ کی عربی شرح "لمعات التنقیح" میں مشہور حنفی فقیہ و محدث اور عارف امام فضل اللہ تورپشتی" سے نقل کرتے ہیں:

"تورپشتی کہتے ہیں کہ اس تحدید کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان شاخوں کے تر رہنے کی مدت تک ان قبروں سے تخفیف عذاب کی شفاعت فرمائی تھی۔

رہا ان لوگوں کا قول جنہوں نے یہ کہا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ تر شاخ اللہ تعالیٰ کی تسبیح کہتی ہے جب تک کہ اس میں تری باقی ہے. پس وہ عذاب قبر سے بچانے والی ہوگی۔ تو یہ قول بالکل بے مقصد اور لاطائل ہے۔ اور اہل علم کے نزدیک اس کا کوئی اعتبار نہیں" (لمعات ج ۲ ص ۴۴)

۱۔ عشاق کا دل (وصل محبوب کی کوئی نہ کوئی) تدبیر کرتا ہے۔

حضرت شیخؒ کی تشریح سے واضح ہو جاتا ہے کہ جن مجہول الاسم والرسم لوگوں نے اس حدیث سے قبروں پر سبزہ و گل ڈالنے کا استنباط کیا ہے ائمہ اسلام نے ان کے قول کو بے اصل بے مغز، غیر معتبر اور صدر اول کے خلاف بدعت قرار دیا ہے۔ اگر ان کے قول میں پرپشہ کے برابر بھی وزن ہوتا تو ممکن تھا کہ صحابہؓ و تابعینؒ اور ائمہ مجتہدینؒ اس سے محروم رہتے۔

چہارم: اور اگر ان حضرات کی تعلیل کو ــــ جو اہل علم کے نزدیک بے اصل، لاطائل اور غیر معتبر ہے ــــ علیٰ سبیل التنزل تسلیم بھی کر لیا جائے تب بھی اس سے قبر پر شاخوں کا گاڑنا سنت قرار پاتا ہے۔ نہ کہ قبروں پر پھول بکھیرنا، یا پھولوں کی چادریں چڑھانا۔ چنانچہ علامہ عینیؒ، جو اس تعلیل کو قبول کرتے ہیں، فرماتے ہیں:-

وَكَذٰلِكَ مَا يَفْعَلُهُ اَكْثَرُ النَّاسِ مِنْ وَضْعِهَا فِيْهِ رُطُوْبَةٌ مِنَ الرَّيَاحِيْنِ وَالْبُقُوْلِ وَنَحْوِهِمَا عَلَى الْقُبُوْرِ لَيْسَ بِشَيْئٍ وَاِنَّمَا السُّنَّةُ اَلْغَرْزُ۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۸۷۹)

ترجمہ:- "اور اسی طرح جو فعل کہ اکثر لوگ کرتے ہیں۔ یعنی سبزہ و گل وغیرہ رطوبت والی چیزوں کا قبروں پر ڈالنا یہ کوئی چیز نہیں۔ سنت ہے تو صرف شاخ کا گاڑنا"۔ (عمدۃ القاری ج ۱ ص ۸۷۹)

پنجم: نیز اگر ان حضرات کے اس تعلل کو قبول بھی کر لیا جائے تو اس سے کافروں اور فساق و فجار کی قبروں پر شاخ گاڑنے کا جواز ثابت ہو گا۔ نہ کہ اولیاء اللہ کی قبور طیبہ پر۔ جیسا کہ پہلے تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معذب و مقہور قبروں کے سوا کسی قبر پر شاخ نہیں گاڑی۔ نہ اس کی ترغیب دی۔ اور نہ صحابہؓ و تابعینؒ نے اس پر عمل کیا۔ پس اس تعلل سے صالحین اور مقبولان الٰہی کی قبروں پر پھول ڈالنے کا جواز ثابت نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ اسے سنت یا مستحب کہا

جائے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو معاملہ کافروں اور گنہگاروں کی قبروں کے ساتھ فرمایا وہ اولیاء اللہ کی قبور سے روا رکھا جاتا ہے۔

شارع علیہ السلام نے عام مسلمانوں کی قبروں پر شاخ گاڑنے کی جو سنت جاری نہیں فرمائی شائد واللہ اعلم اس میں یہ حکمت بھی ملحوظ ہو کہ ایسی شاخوں کا گاڑنا قبر کے معذب و مقہور ہونے کی بدشگونی ہے۔ اور شریعت ایسے کسی امر کو پسند نہیں کرتی جس میں کسی مسلمان کے بارے میں سوء ظن یا بدشگونی کا پہلو پایا جائے، اس لئے اس حدیث سے استنباط کرتے ہوئے اولیاء اللہ کی قبور پر پھول ڈالنا بے ادبی ہے۔

دراصل آج جو مزارات پر پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں وہ اس حدیث کی تعمیل کے لئے نہیں۔ بلکہ قبور کی تعظیم اور اہل قبور کے تقرب کے لئے ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی تعظیم اور اہل قبور سے تقرب کے لئے پھول چڑھانے کی ہرگز اجازت نہیں دی۔ اور نہ اس حدیث میں دور دور تک ایسی اجازت کا کوئی سراغ ملتا ہے۔ چنانچہ تعظیم کی خاطر اولیاء اللہ کے مزارات یا قومی لیڈروں کی قبروں پر پھول کی چادریں چڑھانے کی جو رسم ہمارے زمانہ میں رائج ہے متقدمین و متاخرین میں سے کسی نے اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دیا، اس لئے اس کے بدعت سیئہ ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ یہ یہود و نصاریٰ اور ہنود کی رسم ہے جو مسلمانوں میں در آئی ہے۔ بدعت کی خاصیت یہ ہے کہ جب وہ عام اور شائع ہوجاتی ہے تو رفتہ رفتہ علماء کے ذہن و دماغ بھی اس سے متاثر ہوجاتے ہیں۔ اور بدعت کی شناعت و قباحت ان کے ذہن سے محو ہوجاتی ہے۔ اس لئے بعض علماء زمانہ کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح اس کے جواز بلکہ استحسان کی کوئی نہ کوئی سبیل نکالنا چاہتے ہیں۔۔ اس طرح وہ بجائے احیائے سنت کے بدعت کی ترویج و اشاعت میں ممد و معاون بن جاتے ہیں۔

حدیث جریدہ کی اس مختصر تشریح کے بعد اب جناب شاہ تراب الحق صاحب کے نقل کردہ حوالوں کو لیتا ہوں۔

ان میں سے پہلا حوالہ تو حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ کی اشعۃ اللمعات کا ہے۔ اس کا پورا متن اوپر نقل کر چکا ہوں۔ اسے پڑھ کر معمولی عقل و فہم کا آدمی بھی یہ معلوم کر سکتا ہے کہ حضرت شیخ ؒ قبروں پر پھول ڈالنے کا جواز نقل کر رہے ہیں۔ یا اس کو "بے اصل بدعت" فرمارہے ہیں، اور جن لوگوں نے یہ جواز ناروا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، وہ حضرت شیخ ؒ ان کے قول کے تصدیق فرمارہے ہیں یا ان کے قول کو لایعبأ بہ اور بے قیمت وغیر معتبر فرمارہے ہیں؟

شاہ صاحب نے دوسرا حوالہ یہ نقل کیا ہے کہ:

"ملا علی قاری نے مرقات میں اسی حدیث کی شرح کرتے ہوئے فرمایا کہ مزاروں پر تر پھول ڈالنا سنت ہے"۔

شیخ علی قاری ؒ نے اس حدیث کے ذیل میں پہلے تو امام نووی ؒ کا طویل اقتباس نقل کیا ہے، جس کا ایک فقرہ یہ ہے:

"یہ جو لوگ اس حدیث سے تمسک کرتے ہوئے قبروں پر کھجور وغیرہ کے پتے ڈالتے ہیں امام خطابی ؒ نے اس پر نکیر کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اس کی کوئی اصل نہیں"۔

شیخ علی قاری ؒ اس فقرہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"لیکن خطابی ؒ کا انکار کرنا اور یہ کہنا کہ اس کی کوئی اصل نہیں تو اس میں واضح بحث ہے۔ کیونکہ یہ حدیث اس کے لئے اصل بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ پھر میں نے دیکھا کہ ابن حجر ؒ نے اس بحث کی تصریح کی ہے۔ اور کہا ہے "خطابی کا یہ کہنا کہ اس کی کوئی اصل نہیں۔ ممنوع ہے۔ بلکہ یہ حدیث اس کی اصل اصیل ہے۔ اسی بنا پر ہمارے متاخرین اصحاب میں سے بعض آئمہ نے فتویٰ دیا ہے کہ پھول اور شاخیں رکھنے کی جو عادت ہوگئی ہے یہ اس حدیث کی بنا پر سنت ہے"۔

ابن حجر ؒ کا یہ قول نقل کر کے شیخ علی قاری ؒ لکھتے ہیں

"شائد خطابیؒ کے قول کی وجہ یہ ہے کہ یہ حدیث ایک واقعہ حال خاص ہے۔ عموم کا فائدہ نہیں دیتا۔ اسی لئے اس کی گذشت توجیہات کی گئی ہیں۔ سوچ لو، کہ یہ بات محل نظر ہے"۔ (مرقاۃ ص ۳۵۱ ج ۱ مطبوعہ ملتان)

شیخ علی قاریؒ کے اس کلام سے مندرجہ ذیل امور مستفاد ہوئے:۔

۱۔ پھول ڈالنے کو انہوں نے سنت نہیں کہا۔ بلکہ ابن حجر شافعیؒ کا قول نقل کیا ہے کہ بعض متاخرین شافعیہ نے اس کا فتویٰ دیا ہے۔

۲۔ شیخ علی قاریؒ کو آئمہ احناف میں سے کسی کا قول نہیں مل سکا کہ یہ فعل سنت ہے، نہ متقدمین کا اور نہ متاخرین حنفیہ کا اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے آئمہ نے یہ فتویٰ نہیں دیا۔

۳۔ ابن حجر نے جن متاخرین شافعیہ کا فتویٰ نقل کیا ہے نہ وہ مجتہد ہیں۔ اور نہ امام خطابیؒ اور امام نوویؒ کے مقابلہ میں ان کا قول کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ کیونکہ آئمہ شافعیہ میں خطابی اور نووی کا علم و فضل، ورع و تقویٰ اور حدیث و فقہ میں جو مقام ہے ان متاخرین شافعیہ کی ان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں۔

۴۔ شیخ علی قاریؒ خطابیؒ کے قول کی توجیہ صحیح کرتے ہیں۔ اور اس مسئلہ کو محل نظر بتاتے ہیں۔ انہوں نے اس پر جو کچھ لکھا ہے وہ بطور فتویٰ نہیں۔ بلکہ بطور بحث ہے۔ ان تمام امور کو نظر انداز کر کے کہہ دینا کہ ملا علی قاریؒ نے مرقات میں مزارات پر پھول چڑھانے کو سنت کہا ہے، علمی ثقاہت کے خلاف ہے۔

تیسرا حوالہ طحطاوی کے حاشیہ مراقی الفلاح کا دیا ہے کہ:

"ہمارے بعض متاخرین اصحاب نے اس حدیث کی روح سے فتویٰ دیا کہ خوشبو اور پھول قبر پر چڑھانے کی جو عادت ہے۔ وہ سنت ہے"۔

غالباً شاہ صاحب نے طحطاوی کا حاشیہ بچشم خود ملاحظہ نہیں فرمایا۔ ورنہ انہیں نظر آتا کہ یہ طحطاوی کی اپنی عبارت نہیں۔ بلکہ یہ بات انہوں نے ملا علی قاریؒ کی شرح مشکوٰۃ کے حوالے سے نقل کی ہے۔ اور شرح مشکوٰۃ میں (جس کا حوالہ اوپر بحث ہو چکی ہے) ہمارے فقہائے حنفیہ کا فتویٰ نقل نہیں کیا۔ بلکہ ابن حجر شافعی کا حوالہ نقل کیا ہے۔ جس پر اوپر بحث ہو چکی ہے۔ شاہ صاحب کے حوالے میں یہ افسوس ناک غلطی ہوئی ہے کہ متاخرین شافعیہ کے قول کو "ہمارے متاخرین اصحاب کا حدیث کی روح سے فتویٰ" بنا دیا گیا ہے۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

شاہ صاحب نے ایک حوالہ علامہ شامیؒ کا نقل کیا ہے کہ: "انہوں نے اسے مستحب کہا ہے"۔

یہاں بھی نقل میں افسوسناک تساہل پسندی سے کام لیا گیا ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ علامہ شامی نے بحر، درر اور شرح منیہ کے حوالے سے یہ مسئلہ نقل کیا ہے کہ قبرستان سے تر گھاس اور سبزہ اکھاڑنا مکروہ ہے۔ اور "امداد" سے اس کی تعلیل نقل کی ہے کہ وہ جب تک تر رہے اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتا ہے پس میت اس سے انس حاصل کرتا ہے اور اس کے ذکر سے رحمت نازل ہوتی ہے۔ اس کی دلیل میں حدیث جریدہ نقل کر کے علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:۔

> "اس مسئلہ سے اور اس حدیث سے قبر پر شاخ رکھنے کا استحباب اخذ کیا جاتا ہے بطور اتباع کے۔ اور اس پر قیاس کیا جاتا ہے آس کی شاخیں وغیرہ رکھنے کو۔ جس کی ہمارے زمانہ میں عادت ہو گئی ہے۔ اور شافعیہ کی ایک جماعت نے اس کی تصریح بھی کی ہے۔ اور یہ اولیٰ ہے بہ نسبت بعض مالکیہ کے قول کے کہ قبروں کے عذاب کی تخفیف بہ برکت دست نبویؐ یا آپؐ کی دعا سے ہوئی تھی۔ اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا"

علامہ شامیؒ کی اس عبارت میں پھول ڈالنے کا استحباب ذکر نہیں کیا گیا. بلکہ یہ ذکر کیا ہے کہ اس سے بطور اتباع نبویؐ شاخ گاڑنے کا استحباب اخذ کیا جاتا ہے۔ اور اس کی علت وہی ذکر کی ہے جو امام تورپشتیؒ کے ارشاد کے مطابق قطعاً لاطائل اور "اہل علم کے نزدیک غیر معتبر" ہے۔ اور اس بے مقصد اور غیر معتبر تعلل پر قیاس کرنا کس قدر بے مقصد اور غیر معتبر ہوگا اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ اور علامہ شامیؒ کا یہ کہنا کہ یہ تعلل بعض مالکیہ کے قول سے اولیٰ ہے کہ یہ تخفیف عذاب شاخ کھجور کی وجہ سے نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی برکت اور آپؐ کی دعاء و شفاعت کی کرامت تھی۔ اول تو اس قول کو بعض مالکیہ کی طرف منسوب کرنا بہت عجیب ہے۔ آپ سن چکے ہیں کہ ائمہ شافعیہ میں خطابیؒ. سازریؒ. نوویؒ اور بعض دوسرے حضرات اسی کے قائل ہیں۔ اور ہمارے ائمہ احناف میں امام تورپشتیؒ نے اس کو صاف صاف اہل علم کا قول کہا ہے۔ اور اس کے مقابل قول کو "لاطائل تحتہ و غیر معتبر عند اہل العلم" فرمایا ہے۔ امام تورپشتیؒ کے ارشاد سے معلوم ہوجاتا ہے کہ مذاہب اربعہ کے اہل علم اس تعلل کو (جسے علامہ شامی اولیٰ کہہ رہے ہیں) غیر معتبر اور بے مغز سمجھنے پر متفق ہیں۔

علاوہ ازیں جس قول کو علامہ شامیؒ ــــ بعض مالکیہ کی طرف منسوب کر کے ــــ غیر اولیٰ کہہ رہے ہیں اور جس کے مقابلہ میں ایک "غیر معتبر عند اہل العلم" توجیہ کو اولیٰ کہہ رہے ہیں. اس کی تصریح حدیث جابرؓ میں صراحۃً لسان نبوت سے منقول ہے۔

فَاَحْبَبْتُ بِشَفَاعَتِيْ اَنْ يُّرَفَّهَ ذٰلِكَ عَنْهُمَا مَادَامَ الْغُصْنَانِ رَطْبَيْنِ

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۴۱۸)

پس میں نے چاہا کہ میری شفاعت کی بدولت ان کے عذاب میں تخفیف ہو جب تک کہ شاخیں تر رہیں"۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۴۱۸)

اس لئے تسبیح جریدہ کی تعلیل بمقابلہ نص کے سرے سے مردود ہے۔ نہ کہ اولیٰ کتنی عجیب بات ہے کہ فرمودہ نبویؐ کو غیر اولیٰ کہا جائے۔ اور اس کے مقابلہ میں بعض لوگوں کے بے مغز تعلل کو اولیٰ کہہ کر اس پر قیاسی تصریحات بٹھائی جائیں۔

اور اگر بالفرض یہ بات حدیث میں منقول نہ ہوتی۔ بلکہ بعض مالکیہ ہی نے کہی ہوتی تب بھی عشاق رسولؐ کے لئے یہ بات کس قدر اذیت ناک ہے کہ تسبیح جریدہ کی تعلیل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک کی برکت اور آپؐ کی شفاعت کی کرامت سے اولیٰ کہا جائے۔

الغرض علامہ شامیؒ نے اول تو قبروں پر پھول ڈالنے کو مستحب نہیں کہا۔ بلکہ شاخ گاڑنے کا استحباب اخذ فرمایا ہے۔ اور پھر یہ استحباب بھی اس لاطائل اور بے مغز تعلل پر مبنی ہے جسے اہل علم غیر معتبر کہہ کر رد کر چکے ہیں۔

شاہ صاحب نے ایک حوالہ شیخ عبدالغنی نابلسی قدس سرہ کی کشف النور سے نقل کیا ہے۔ یہ رسالہ اس ناکارہ کی نظر سے نہیں گزرا تاکہ اس کے سیاق و سباق پر غور کیا جاتا۔ مگر اتنی بات واضح ہے کہ علامہ شامیؒ ہوں یا شیخ عبدالغنی نابلسیؒ یہ سب کے سب ہماری طرح امام ابو حنیفہؒ کے مقلد ہیں۔ اور مقلد کا کام صاحب مذہب اور ائمہ مجتہدین کی نقل کی اتباع کرنا ہے تقلید خود رائی کا نام نہیں۔ علامہ شامیؒ نے یا شیخ عبدالغنی نابلسیؒ نے یا کسی اور بزرگ نے اگر ہمارے ائمہ متبوعین سے کوئی نقل پیش کی ہے تو سر آنکھوں پر، ورنہ میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے الفاظ میں یہی عرض کر سکتا ہوں:

اینجا قول امام ابی حنیفہ و امام ابی یوسف و امام محمد معتبر است نہ عمل ابی بکر شبلی، و ابی حسن نوری

"یہاں امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف اور امام محمد کا قول معتبر ہے۔ نہ کہ ابو بکر شبلی اور ابوالحسن نوری کا عمل"۔ (مکتوبات امام ربانی دفتر اول مکتوب نمبر ۲۶۵)

جناب شاہ صاحب قبلہ نے اس ہیچمدان کے بارے میں جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں ان کے بارے میں یہی عرض کر سکتا ہوں کہ

بدم گفتی و خرسندم، نکو گفتی عفاک اللہ
جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا ۱؎

لیکن ان سے بہ ادب عرض کروں گا کہ جہال اور عوام کی اختراع کردہ رسموں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہ بنائیں۔ (فداہ ابی وامی وروحی صلی اللہ علیہ وسلم)

آج اولیاء اللہ کے مزارات پر جو کچھ ہو رہا ہے۔ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نہیں۔ نہ خیر القرون میں اس کا وجود تھا۔ بلکہ یہ شر القرون کی پیداوار ہے۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ؒ کے بقول:

بسا اعمال و افعال از صناع کہ در زمان سلف از مکروہات بودہ در آخر زمان از مستحبات گشتہ، و اگر جہال و عوام چیزے کنند یقین کہ ارواح بزرگان ازاں راضی نخواہد بود۔ وساحتِ کمال و دیانت و نورانیت ایشاں منزہ است ازاں۔

"بہت اعمال و افعال اور طریقے جو سلف صالحین کے زمانہ میں مکروہ و ناپسندیدہ تھے وہ آخری زمانہ میں مستحسن ہو گئے ہیں۔ اور اگر جہال و عوام کوئی کام کرتے ہیں تو یقین رکھنا چاہئے کہ بزرگوں کی ارواح طیبہ اس سے خوش نہیں ہوں گی۔ اور ان کے کمال و دیانت اور نورانیت۔ کی بارگاہ ان سے پاک اور منزہ ہے"۔ (شرح سفر السعادہ ص ۲۷۲)

۱؎ مجھے برا کہا تو نے اور خوش ہوں میں۔ اچھی بات کہی تو نے۔ معاف کریں تجھے اللہ تعالیٰ ۔۔۔ کڑوا جواب زیب دیتا ہے شکر چباتے لب معشوق کو

افسوس ہے کہ شاہ صاحب انہی جہال و عوام کی اختراع کردہ رسوم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ جن کا کوئی وجود نہ زمانہ سلف میں تھا۔ اور نہ ہمارے دس صدیوں کے فقہی لٹریچر میں۔ کیونکہ شاہ صاحب کو اطمینان ہے کہ جہال و عوام کے غوغا کے سامنے کس کو مجال ہو سکتی ہے کہ ان مخترعہ رسوم کے بارے میں لب کشائی کرے۔ حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ علیہ نے صحیح لکھا ہے:

تااز بدعت حسنہ در رنگ بدعت سیہہ احتراز ننماید بوئے ازیں دولت بمشام جان او نرسد۔ وایں معنی امروز متعسر است کہ عالم در دریائے بدعت غرق گشتہ است و بظلمات بدعت آرام گرفتہ۔ کرا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند۔ و بہ احیائے سنت لب کشاید اکثر علماء ایں وقت رواج دہند ہائے بدعت اند۔ و محو کندہائے سنت۔ بدعتہائے پہن شدہ راتعامل خلق دانستہ بجواز بلکہ باستحسان آن فتویٰ مے دہند و مردم رابدعت دلالت میمایند۔ (دفتر دوم مکتوب ۵۴)

"جب تک آدمی بدعت حسنہ سے بھی بدعت سیہہ کی طرح احتراز نہ کرے اس دولت (اتباع سنت) کی بو بھی اس کے مشام جان تک نہیں پہنچ سکتی۔ اور یہ بات آج بہت ہی دشوار ہے کیونکہ جہاں دریائے بدعت میں غرق ہوچکا ہے۔ اور بدعت کی تاریکیوں میں آرام پکڑے ہوئے ہے۔ کس کی مجال ہے کہ کسی بدعت کے اٹھانے میں دم مارے۔ اور سنت کو زندہ کرنے میں لب کشائی کرے۔ اس وقت کے اکثر علماء بدعت کو رواج دینے والے اور سنت کو مٹانے والے ہیں۔ جو بدعات پھیل جاتی ہیں تو مخلوق کا تعامل جان کر ان کے جواز بلکہ استحسان کا فتویٰ دے ڈالتے ہیں اور بدعت کی طرف لوگوں کی راہنمائی کرتے ہیں"۔

ضمیمہ نمبر ۲
داڑھی کا مسئلہ

س۔ داڑھی کی شرعی حیثیت کیا ہے، واجب ہے یا سنت؟ اور داڑھی منڈانا جائز ہے۔ یا مکروہ یا حرام؟ بہت سے حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ داڑھی رکھنا ایک سنت ہے۔ اگر کوئی رکھے تو اچھی بات ہے اور نہ رکھے تب بھی کوئی گناہ نہیں۔ یہ نظریہ کہاں تک صحیح ہے؟

۲۔ شریعت میں داڑھی کی کوئی مقدار مقرر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کتنی؟

۳۔ بعض حفاظ کی عادت ہے کہ وہ رمضان مبارک سے کچھ پہلے داڑھی رکھ لیتے ہیں۔ اور رمضان المبارک کے بعد صاف کر دیتے ہیں۔ ایسے حافظوں کو تراویح میں امام بنانا جائز ہے یا نہیں؟ اور ان کے پیچھے نماز درست ہے یا نہیں؟

۴۔ بعض لوگ داڑھی سے نفرت کرتے ہیں اور اسے نظر حقارت سے دیکھتے ہیں، اگر اولاد یا اعزہ میں سے کوئی داڑھی رکھنا ہے تو اسے روکتے ہیں، اور طعنے دیتے ہیں، اور کچھ لوگ شادی کے لئے داڑھی صاف ہونے کی شرط لگاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کیا حکم ہے؟

۵۔ بعض لوگ سفر حج کے دوران داڑھی ــــ رکھ لیتے ہیں۔ اور حج سے واپسی پر صاف کرا دیتے ہیں اور بعض سفر حج میں بھی داڑھی صاف کرتے ہیں، کیا ایسے لوگوں کا حج صحیح ہے؟

۶۔ بعض حضرات اس لئے داڑھی نہیں رکھتے کہ اگر ہم داڑھی رکھ کر کوئی غلط کام کریں گے تو اس سے داڑھی والوں کی بدنامی اور داڑھی کی بے حرمتی ہوگی۔ ایسے حضرات کے بارے میں کیا حکم ہے؟

سائل:۔ صوفی محمد مسکین کمیشن ایجنٹ

زکریا لین جوڑیا بازار کراچی نمبر ۲

جواب سوال اول. داڑھی منڈانا یا کترانا (جب کہ ایک مشت سے کم ہو) حرام اور گناہ کبیرہ ہے اس سلسلہ میں پہلے چند احادیث لکھتا ہوں اس کے بعد ان کے فوائد ذکر کروں گا۔

۱۔ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَشْرٌ مِّنَ الْفِطْرَةِ قَصُّ الشَّارِبِ، وَاِعْفَاءُ اللِّحْيَةِ۔ الحدیث

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۲۹)

ترجمہ:۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دس چیزیں فطرت میں داخل ہیں۔ مونچھوں کا کٹوانا اور داڑھی کا بڑھانا الخ

۲۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ احْفُوا الشَّوَارِبَ وَاَعْفُوا اللُّحٰى۔

وَفِيْ رِوَايَةٍ اَنَّهٗ اَمَرَ بِاِحْفَاءِ الشَّوَارِبِ وَاِعْفَاءِ اللِّحْيَةِ (ایضاً)

۳۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ۔ اَوْفِرُوا اللحٰى وَاَحْفُوا الشَّوَارِبَ

(متفق علیہ مشکوٰۃ صہ ۳۸۰)

۲۔ ترجمہ:۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مونچھوں کو کٹواؤ اور داڑھی بڑھاؤ۔

اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے مونچھوں کو کٹوانے اور داڑھی کو بڑھانے کا حکم فرمایا۔

۳۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مشرکوں کی مخالفت کرو۔ داڑھیاں بڑھاؤ اور مونچھیں کٹاؤ۔

۴۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جُزُّوا الشَّوَارِبَ وَاَرْخُوا اللُّحٰى۔ خَالِفُوا الْمَجُوْسَ۔

(صحیح مسلم صہ ۱۲۹)

۴۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

مونچھیں کٹواؤ اور داڑھیاں بڑھاؤ مجوسیوں کی مخالفت کرو۔

۵۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَرْقَمَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ مَنْ لَّمْ يَأْخُذْ مِنْ شَارِبِهٖ فَلَيْسَ مِنَّا (رواہ احمد والترمذی والنسائی، مشکوٰۃ ص۳۸۱)

۵۔ زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو مونچھیں نہ کٹوائے وہ ہم میں سے نہیں۔

۶۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ تَعَالٰى عَنْهُمَا قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَعَنَ اللهُ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَاءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَاءِ بِالرِّجَالِ۔ (رواہ البخاری، مشکوٰۃ ص۳۸۰)

۶۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کی لعنت ہو ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت کرتے ہیں اور اللہ کی لعنت ہو ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت کرتی ہیں۔

فوائد

۱۔ پہلی حدیث سے معلوم ہوا کہ مونچھیں کٹانا اور داڑھی بڑھانا انسان کی فطرت سلیمہ کا تقاضا ہے، اور مونچھیں بڑھانا اور داڑھی کٹانا خلاف فطرت ہے۔ اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ فطرت اللہ کو بگاڑتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے کہ شیطان لعین نے خدا تعالیٰ سے کہا تھا کہ میں اولاد آدم کو گمراہ کروں گا اور میں ان کو حکم دوں گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بگاڑا کریں گے۔ تفسیر حقانی اور تفسیر بیان القرآن وغیرہ میں ہے کہ داڑھی منڈانا بھی تخلیق خداوندی کو بگاڑنے میں داخل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مردانہ چہرے کو فطرۃً داڑھی کی زینت و وجاہت عطا فرمائی ہے۔ پس جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں وہ اغوائے شیطان کی وجہ سے نہ صرف اپنے چہرے کو بلکہ اپنی فطرت کو مسخ کرتے ہیں۔

چونکہ حضرات انبیاء کرام کا طریقہ ہی صحیح فطرت انسانی کا معیار ہے اس لئے فطرت سے مراد انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ اور ان کی سنت بھی ہو سکتی ہے اس

. صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مونچھیں کٹوانا اور داڑھی بڑھانا ایک لاکھ چوبیس ہزار (یا کم و بیش) انبیاء کرام علیہم السلام کی متفقہ سنت ہے اور یہ وہ مقدس جماعت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اقتداء کا حکم دیا گیا ہے (اولئک الذین ہدی اللہ فبھدا ھم اقتدہ سورہ انعام ۹۰) اس لئے جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں وہ انبیاء کرام علیہم السلام کے طریقہ کی مخالفت کرتے ہیں۔ گویا اس حدیث میں تنبیہہ فرمائی گئی ہے کہ داڑھی منڈانا تین گناہ کا مجموعہ ہے۔ (۱) انسانی فطرت کی خلاف ورزی۔ (۲) اغواء شیطان سے اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بگاڑنا (۳) اور انبیاء کرام علیہم السلام کی مخالفت۔ پس ان تین وجوہ سے داڑھی منڈوانا حرام ہوا۔

۲۔ دوسری حدیث میں مونچھیں کٹوانے اور داڑھی بڑھانے کا حکم دیا ہے اور حکم نبوی ؐ کی تعمیل ہر مسلمان پر واجب اور اس کی مخالفت حرام ہے پس اس وجہ سے بھی داڑھی رکھنا واجب اور اس کا منڈانا حرام ہوا۔

۳۔ تیسری اور چوتھی حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ مونچھیں کٹوانا اور داڑھی رکھنا مسلمانوں کا شعار ہے. اس کے برعکس مونچھیں بڑھانا اور داڑھی منڈانا مجوسیوں اور مشرکوں کا شعار ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو مسلمانوں کا شعار اپنانے اور مجوسیوں کے شعار کی مخالفت کرنے کی تاکید فرمائی ہے۔ اسلامی شعار کو چھوڑ کر کسی گمراہ قوم کا شعار اختیار کرنا حرام ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ (جامع صغیر ص ۸ ج ۲)

جو شخص کسی قوم کی مشابہت کرے وہ انہیں میں سے ہوگا۔

پس جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں وہ مسلمانوں کا شعار ترک کر کے اہل کفر کا شعار اپناتے ہیں جس کی مخالفت کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے اس لئے ان وعید نبوی ؐ سے ڈرنا چاہئے کہ ان کا حشر بھی قیامت کے دن انہی غیر قوموں میں نہ ہو۔ نعوذ باللہ۔

۴۔ پانچویں حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ مونچھیں نہیں کٹواتے وہ ہماری جماعت میں شامل نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہی حکم داڑھی منڈانے کا ہے پس یہ ان لوگوں کے لئے بہت ہی سخت وعید ہے جو محض نفسانی خواہش یا شیطانی اغوا کی وجہ سے داڑھی منڈاتے ہیں، اور اس کی وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اپنی جماعت سے خارج ہونے کا اعلان فرما رہے ہیں کیا کوئی مسلمان جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ذرا بھی تعلق ہے اس دھمکی کو برداشت کر سکتا ہے؟

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو داڑھی منڈانے کے گناہ سے اس قدر نفرت تھی کہ جب شاہ ایران کے قاصد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی داڑھیاں منڈی ہوئی مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔

فَكَرِهَ النَّظْرَ اِلَيْهِمَا۔ وَقَالَ وَيْلَكُمَا مَنْ اَمَرَكُمَا بِهٰذَا؟ قَالَا اَمَرَنَا رَبُّنَا يَعْنِيَانِ كِسْرٰى، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلٰكِنْ رَبِّيْ اَمَرَنِيْ بِاِعْفَاءِ لِحْيَتِيْ وَقَصِّ شَارِبِيْ (البدایۃ والنہایہ ج ۴ ص ۲۶۹، حیاۃ الصحابہ ج ۱ ص ۱۱۵)

ترجمہ:۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف نظر کرنا بھی پسند نہ کیا اور فرمایا تمہاری ہلاکت ہو تمہیں یہ شکل بگاڑنے کا کس نے حکم دیا ہے؟ وہ بولے کہ یہ ہمارے رب یعنی شاہ ایران کا حکم ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لیکن میرے رب نے تو مجھے داڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم فرمایا ہے۔

پس جو لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کے حکم کی خلاف ورزی کر کے مجوسیوں کے خدا کے حکم کی پیروی کرتے ہیں ان کو "سوبار" سوچنا ہے کہ وہ قیامت کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں کیا منہ دکھائیں گے؟ اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں کہ تم اپنی شکل بگاڑنے کی وجہ سے ہماری جماعت سے خارج ہو تو شفاعت کی امید کس سے رکھیں گے؟

۵۔ اس پانچویں حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مونچھیں بڑھانا اور اسی طرح

داڑھی منڈانا اور کترانا حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی گناہ کبیرہ پر ہی ایسی وعید فرماسکتے ہیں کہ ایسا کرنے والا ہماری جماعت میں سے نہیں ہے۔

۶۔ چھٹی حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے ان مردوں پر جو عورتوں کی مشابہت کریں اور ان عورتوں پر جو مردوں کی مشابہت کریں۔ اس حدیث کی شرح میں ملا علی قاری" صاحب مرقاۃ لکھتے ہیں کہ "لعن اللہ" کا فقرہ، جملہ بطور بد دعا بھی ہوسکتا ہے یعنی ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اور جملہ خبریہ بھی ہوسکتا ہے یعنی ایسے لوگوں پر اللہ تعالیٰ لعنت فرماتے ہیں۔

داڑھی منڈانے میں گذشتہ بالا قباحتوں کے علاوہ ایک قباحت عورتوں سے مشابہت کی بھی ہے، کیونکہ عورتوں اور مردوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے داڑھی کا امتیاز رکھا ہے۔ پس داڑھی منڈانے والا اس امتیاز کو مٹا کر عورتوں سے مشابہت کرتا ہے جو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لعنت کا موجب ہے۔

ان تمام نصوص کے پیش نظر فقہاء امت اس پر متفق ہیں کہ داڑھی بڑھانا واجب ہے اور یہ اسلام کا شعار ہے اور اس کا منڈانا یا کترانا (جب کہ حد شرعی سے کم ہو) حرام اور گناہ کبیرہ ہے جس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت وعیدیں فرمائی ہیں اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس فعل حرام سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جواب سوال دوم:۔ احادیث میں داڑھی کے بڑھانے کا حکم دیا گیا ہے اور ترمذی کتاب الادب (ص ۱۰۰ ج ۲) کی ایک روایت میں، جو سند کے اعتبار سے کمزور ہے یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ریش مبارک کے طول و عرض سے زائد بال کاٹ دیا کرتے تھے۔ اس کی وضاحت صحیح بخاری کتاب اللباس (ج ۲ ص ۸۷۵) کی روایت سے ہوتی ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما حج و عمرہ سے فارغ ہونے کے موقعہ پر احرام کھولتے تو داڑھی مٹھی میں لے کر زائد حصہ کاٹ دیا

کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی اسی مضمون کی روایت منقول ہے۔ (نصب الرایہ ص ۴۵۸ ج ۲) اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ داڑھی کی شرعی مقدار کم از کم ایک مشت ہے (ہدایہ کتاب الصوم) پس جس طرح داڑھی منڈانا حرام ہے اسی طرح داڑھی ایک مشت سے کم کرنا بھی حرام ہے درمختار میں ہے۔

وَاَمَّا الْاَخْذُ مِنْهَا وَهِيَ دُوْنَ ذَالِكَ كَمَا يَفْعَلُهُ بَعْضُ الْمَغَارِبَةِ وَمُخَنَّثَةُ الرِّجَالِ فَلَمْ يُبِحْهُ اَحَدٌ۔ وَاَخْذُ كُلِّهَا فِعْلُ يَهُوْدِ الْهِنْدِ وَمَجُوْسِ الْاَعَاجِمِ (شامی طبع جدید ص ۴۱۸ ج ۲)

ترجمہ:۔ اور داڑھی کترانا۔ جب کہ وہ ایک مشت سے کم ہو جیسا کہ بعض مغربی لوگ اور ہیجڑے قسم کے آدمی کرتے ہیں۔ پس اس کو کسی نے جائز نہیں کہا اور پوری داڑھی صاف کردینا تو ہندوستان کے یہودیوں اور عجم کے مجوسیوں کا فعل تھا۔

یہی مضمون فتح القدیر (ص ۷۷ ج ۲) اور البحرالرائق (ص ۳۰۲ ج ۲) میں ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی" اشعتہ اللمعات میں لکھتے ہیں:

حلق کردن لحیہ حرام است و گذاشتن آں بقدر قبضہ واجب است۔ (ص ۲۲۸ ج ۱)

داڑھی منڈانا حرام ہے اور ایک مشت کی مقدار اس کو بڑھانا واجب ہے (پس اگر اس سے کم ہو تو کترانا بھی حرام ہے)

امدادالفتاوی میں ہے

داڑھی رکھنا واجب ہے اور قبضہ سے زائد کٹانا حرام ہے۔

لِقَوْلِهِ عَلَيْهِ السَّلَامُ خَالِفُوا الْمُشْرِكِيْنَ اَوْفِرُوا اللُّحٰى متفق علیہ۔

فِي الدُّرِّ الْمُخْتَارِ يَحْرُمُ عَلَى الرَّجُلِ قَطْعُ لِحْيَتِهِ وَفِيْهِ السُّنَّةُ فِيْهَا الْقَبْضَةُ (ص ۲۲۳ ج ۴)

کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مشرکین کی مخالفت کرو۔ داڑھی بڑھاؤ (بخاری و مسلم) اور درمختار میں ہے کہ مرد کے لئے داڑھی کا کاٹنا حرام ہے اور اس کی مقدار مسنون ایک مشت ہے۔

جواب سوال سوم:۔ جو حافظ ڈاڑھی منڈاتے یا کتراتے ہوں وہ گناہ کبیرہ کے مرتکب اور فاسق ہیں۔ تراویح میں بھی ان کی امامت جائز نہیں، اور ان کی اقتداء میں نماز مکروہ تحریمہ (یعنی عملاً حرام) ہے اور جو حافظ صرف رمضان مبارک میں ڈاڑھی رکھ لیتے ہیں اور بعد میں صاف کرا دیتے ہیں ان کا بھی یہی حکم ہے۔ ایسے شخص کو فرض نماز اور تراویح میں امام بنانے والے بھی فاسق اور گنہگار ہیں۔

جواب سوال چہارم:۔ اس سوال کا جواب سمجھنے کے لئے یہ اصول ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ اسلام کے کسی شعار کا مذاق اڑانا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت کی تحقیر کرنا کفر ہے جس سے آدمی ایمان سے خارج ہو جاتا ہے اور یہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کو اسلام کا شعار اور انبیاء کرام علیہم السلام کے متفقہ سنت فرمایا ہے، پس جو لوگ مسخ فطرت کی بناء پر داڑھی سے نفرت کرتے ہیں، اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، ان کے اعزہ میں سے اگر کوئی داڑھی رکھنا چاہے اسے روکتے ہیں یا اس پر طعنہ زنی کرتے ہیں اور جو لوگ دولہا کے داڑھی منڈائے بغیر رشتہ دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے ایسے لوگوں کو اپنے ایمان کی فکر کرنی چاہئے۔ ان کو لازم ہے کہ توبہ کریں اور اپنے ایمان اور نکاح کی تجدید کریں۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی "اصلاح الرسوم" ص ۱۰ میں لکھتے ہیں:

> "من جملہ ان رسوم کے داڑھی منڈانا یا کٹانا، اس طرح کہ ایک مشت سے کم رہ جائے، یا مونچھیں بڑھانا، جو اس زمانے میں اکثر نوجوانوں کے خیال میں خوش وضعی سمجھی جاتی ہے۔ حدیث میں ہے کہ "بڑھاؤ داڑھی کو اور کتراؤ مونچھوں کو" روایت کیا اس کو بخاری و مسلم نے
>
> حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صیغہ امر سے دونوں حکم فرمائے ہیں امر

حقیقتاً وجوب کے لئے ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ یہ دونوں حکم واجب ہیں اور واجب کا ترک کرنا حرام ہے پس داڑھی کا کٹانا اور، مونچھیں بڑھانا دونوں فعل حرام ہیں۔ اس سے زیادہ دوسری حدیث میں مذکور ہے۔ ارشاد فرمایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "جو شخص اپنی لبیں نہ لے وہ ہمارے گروہ سے نہیں"۔ (روایت کیا اس کو احمد اور ترمذی اور نسائی نے) جب اس کا گناہ ہونا ثابت ہو گیا تو جو لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں اور اس کو پسند کرتے ہیں۔ اور داڑھی بڑھانے کو عیب جانتے ہیں، بلکہ داڑھی والوں پر ہنستے ہیں اور اس کی ہجو کرتے ہیں ان سب مجموعہ امور سے ایمان کا سالم رہنا از بس دشوار ہے۔ ان لوگوں کو واجب ہے کہ اپنی اس حرکت سے توبہ کریں اور ایمان اور نکاح کی تجدید کریں اور اپنی صورت موافق حکم اللہ اور رسول کے بناویں"۔

جواب سوال پنجم:۔ جو حضرات سفر حج کے دوران یا حج سے واپس آکر داڑھی منڈاتے یا کتراتے ہیں، ان کی حالت عام لوگوں سے زیادہ قابل رحم ہے۔ اس لئے کہ وہ خدا کے گھر میں بھی کبیرہ گناہ سے باز نہیں آتے حالانکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہی حج مقبول ہوتا ہے جو گناہوں سے پاک ہوا۔ اور بعض اکابر نے حج مقبول کی علامت یہ لکھی ہے کہ حج سے آدمی کی زندگی میں دینی انقلاب آجائے یعنی وہ حج کے بعد طاعات کی پابندی اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرنے لگے جس شخص کی زندگی میں حج سے کوئی تغیر نہیں آیا، اگر پہلے فرائض کا تارک تھا تو اب بھی ہے۔ اور اگر پہلے کبیرہ گناہوں میں مبتلا تھا تو حج کے بعد بھی بدستور گناہوں میں ملوث ہے ایسے شخص کا حج درحقیقت حج نہیں محض سیر و تفریح اور چلت پھرت ہے گو فقہی طور پر اس کا فرض ادا ہو جائے گا، لیکن حج کے ثواب اور برکات و ثمرات سے وہ محروم رہے گا۔ کتنی حسرت و افسوس کا مقام ہے کہ آدمی ہزاروں روپے کے مصارف بھی

اٹھائے۔ اور سفر کی مشقتیں بھی برداشت کرے۔ اس کے باوجود اسے گناہوں سے توبہ کی توفیق نہ ہو۔ اور جیسا گیا تھا ویسا ہی خالی ہاتھ واپس آجائے۔ اگر کوئی شخص سفر حج کے دوران زنا اور چوری کا ارتکاب کرے اور اسے اپنے اس فعل پر ندامت بھی نہ ہو اور نہ اس سے توبہ کرے تو ہر شخص سوچ سکتا ہے کہ اس کا حج کیسا ہو گا۔ داڑھی منڈانے کا کبیرہ گناہ ایک اعتبار سے چوری اور بدکاری سے بھی بدتر ہے کہ وہ وقتی گناہ ہیں۔ لیکن داڑھی منڈانے کا گناہ چوبیس گھنٹے کا گناہ ہے۔ اور آدمی داڑھی منڈا کر نماز پڑھتا ہے، روزہ رکھتا ہے۔ حج کا احرام باندھے ہوئے ہے لیکن اس کی منڈی ہوئی داڑھی عین نماز، روزہ اور حج کے دوران بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اس پر لعنت بھیج رہی ہے اور وہ عین عبادت کے دوران بھی حرام کا مرتکب ہے۔ حضرت شیخ قطب العالم مولانا محمد زکریا کاندھلوی ثم مدنی نور اللہ مرقدہ اپنے رسالہ "داڑھی کا وجوب" میں تحریر فرماتے ہیں:

"ایسے لوگوں کو (جو داڑھی منڈاتے ہیں) دیکھ کر یہ خیال ہوتا تھا کہ موت کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اور اس حالت میں (جب کہ داڑھی منڈی ہوئی ہو) اگر موت واقع ہوئی تو قبر میں سب سے پہلے سید الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ انور کی زیارت ہو گی تو کس منہ سے چہرہ انور کا سامنا کریں گے۔

اس کے ساتھ ہی بار بار یہ خیال آتا تھا کہ گناہ کبیرہ زنا، لواطت شراب نوشی، سود خوری وغیرہ تو بہت ہیں۔ مگر وہ سب وقتی ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لَا یَزْنِیْ الزَّانِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ الخ

ترجمہ:۔ یعنی جب زنا کار زنا کرتا ہے تو اس وقت مومن نہیں ہوتا۔

مطلب اس حدیث کا مشائخ نے یہ لکھا ہے کہ زنا کے وقت ایمان کا نور اس سے جدا ہو جاتا ہے، لیکن زنا کے بعد وہ نور ایمانی مسلمان کے

پاس واپس آجاتا ہے۔ مگر قطع لحیہ (داڑھی منڈانا اور کترانا) ایسا گناہ ہے جو ہروقت اس کے ساتھ رہتا ہے، نماز پڑھتا ہے تو بھی یہ گناہ ساتھ ہے روزہ کی حالت میں، حج کی حالت میں۔ غرض ہر عبادت کے وقت یہ گناہ اس کے ساتھ لگا رہتا ہے" (ص ۴)

پس جو حضرات حج و زیارت کے لئے تشریف لے جاتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ خدا اور رسول کی پاک بارگاہ میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے مسخ شدہ شکل کو درست کریں اور اس گناہ سے سچی توبہ کریں اور آئندہ ہمیشہ کے لئے اس فعل حرام سے بچنے کا عزم کریں۔ ورنہ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ شیخ سعدیؒ کے اس شعر کے مصداق بن جائیں۔

خر عیسیٰ گرش بمکہ رود　　چو بیاید ہنوز خر باشد

(عیسیٰ کا گدھا اگر مکے بھی چلا جائے جب واپس آئے گا تب بھی گدھا ہی رہے گا۔)

انہیں یہ بھی سوچنا چاہئے کہ وہ روضہ اطہر پر سلام پیش کرنے کے لئے کس منہ سے حاضر ہوں گے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی بگڑی ہوئی شکل دیکھ کر کتنی اذیت ہوتی ہوگی؟

جواب سوال ششم:۔ ان حضرات کا جذبہ بظاہر بہت اچھا ہے۔ اور اس کا منشا داڑھی کی حرمت و عظمت ہے لیکن اگر ذرا غور و تأمل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ خیال بھی شیطان کی ایک چال ہے جس کے ذریعہ شیطان نے بہت سے لوگوں کو دھوکا دے کر اس فعل حرام میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک مسلمان دوسروں سے دغا فریب کرتا ہے جس کی وجہ سے پوری اسلامی برادری بدنام ہوتی ہے۔ اب اگر شیطان اسے یہ پٹی پڑھائے کہ تمہاری وجہ سے اسلام اور مسلمان بدنام ہو رہے ہیں، اسلام کی حرمت کا تقاضا یہ ہے کہ تم نعوذ باللہ اسلام کو چھوڑ کر سکھ بن جاؤ۔ تو کیا اس وسوسہ کی وجہ سے اس کو اسلام چھوڑ دینا

چاہئے ؟یانہیں۔ بلکہ اگر اس کے دل میں اسلام کی واقعی حرمت و عظمت ہے تو وہ اسلام کو نہیں چھوڑے گا۔ بلکہ ان برائیوں سے کنارہ کشی کرے گا جو اسلام اور مسلمانوں کی بدنامی کا موجب ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر شیطان یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اگر تم داڑھی رکھ کر برے کام کرو گے تو داڑھی والے بدنام ہوں گے اور یہ چیز داڑھی کی حرمت کے خلاف ہے تو اس کی وجہ سے داڑھی کو خیرباد نہیں کہا جائے گا۔ بلکہ ہمت سے کام لے کر خود ان برے افعال سے بچنے کی کوشش کی جائے گی جو داڑھی کی حرمت کے منافی ہیں۔ اور جن سے داڑھی والوں کی بدنامی ہوتی ہے۔

ان حضرات نے آخر یہ کیوں فرض کرلیا ہے کہ ہم داڑھی رکھ کر اپنے برے اعمال نہیں چھوڑیں گے ؟ اگر ان کے دل میں واقعی اس شعار اسلام کی حرمت ہے تو عقل اور دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ داڑھی رکھیں۔ اور یہ عزم کریں کہ انشاء اللہ اس کے بعد کوئی کبیرہ گناہ ان سے سرزد نہیں ہو گا۔ اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس شعار اسلام کی حرمت کی لاج رکھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ بہر حال اس موہوم اندیشہ کی بناء پر کہ کہیں ہم داڑھی رکھ کر اس کی حرمت کے قائم رکھنے میں کامیاب نہ ہوں۔ اس عظیم الشان شعار سے محروم ہو جانا کسی طرح بھی صحیح نہیں اس لئے تمام مسلمانوں کو لازم ہے۔ کہ شعار اسلام کو خود بھی اپنائیں۔ اور معاشرہ میں اس کو زندہ کرنے کی پوری کوشش کریں تاکہ قیامت کے دن مسلمانوں کی شکل و صورت میں ان کا حشر ہو، اور وہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور حق تعالیٰ شانہ کی رحمت کا مورد بن سکیں۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ كُلُّ اُمَّتِیْ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ اَبٰی. قَالُوْا مَنْ یَّاْبٰی؟ قَالَ مَنْ اَطَاعَنِیْ دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ اَبٰی. (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۸۲)

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

میری امت کے سارے لوگ جنت میں جائیں گے. مگر جس نے انکار کر دیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ انکار کون کرتا ہے؟ فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہو گا، اور جس نے میری حکم عدولی کی اس نے انکار کر دیا۔

ضمیمہ نمبر ۳
داڑھی کی مقدار کا مسئلہ

(از جناب مولانا سید احمد صاحب عروج قادری مدیر ماہنامہ "زندگی" رام پور)

"امید ہے کہ جناب بخیریت ہوں گے، ایک دو پرچے زندگی کے اس جگہ آتے ہیں، جو بندہ کے لئے جناب کے تعارف کا ذریعہ ہیں داڑھی کے مسئلہ کی تحقیق کے لئے جناب سے التماس کر رہا ہوں امید ہے کہ توجہ فرما کر شکریئے کا موقع عنایت فرمائیں گے۔ آج تک دیوبندی، بریلوی، اہلحدیث حضرات ہر طبقہ کے بزرگوں سے ہی سنا گیا ہے کہ داڑھی رکھنا بہت اہم ہے،

سنت مؤکدہ اور واجب کا درجہ ہے بلکہ اب تو ایک شعار کی حیثیت رکھتی ہے اور داڑھی کی مقدار جو مسنون ہے وہ ایک قبضہ سے زائد ہے قبضہ سے کم جائز نہیں ہے کم از کم ایک قبضہ ہونی چاہئے۔ صاحب در مختار اور شیخ ابن ہمام اس پر اجماع کا دعویٰ کرتے ہیں بلکہ یہ بھی سنا گیا ہے کہ شیخ ابن ہمام نے تحریر فرمایا ہے کہ ایک قبضہ سے کم داڑھی مخنثوں کا طریقہ ہے بر خلاف اس کے جماعت اسلامی کے رفیق داڑھی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ بڑے بڑے سرگرم ارکان کے لئے داڑھی رکھنا بڑا ہی بوجھ ہے بالکل ذرا ذرا سی داڑھی وہ بھی مجبور ہو کر. امراء تک کا یہ حال ہے کہ اگر کہا جائے تو فرماتے ہیں کہ داڑھی کی کوئی خاص مقدار متعین نہیں ہے جتنی کسی نے داڑھی رکھ لی، وہی مسنون ہے۔ اس سلسلے میں ترجمان القرآن کا دسمبر کا تازہ پرچہ جناب نے ملاحظہ فرمایا ہو گا داڑھی کے متعلق جناب غلام علی صاحب کا

مضمون ہے انہوں نے اجماع وغیرہ کو غلط قرار دیا ہے اسے جناب سے گزارش ہے کہ اس مسئلہ میں رہنمائی فرمائیں۔

اس مضمون حسب ذیل ہے:

"دوسرا اعتراض مولانا مودودی کے خلاف یہ ہے کہ وہ مشت بھر ڈاڑھی کو مسنون نہیں سمجھتے حالانکہ اس پر اجماع امت ہے اس اعتراض کا بھی جواب دینے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا مودودی کی اصل عبارت سامنے رکھی جائے۔ مولانا نے رسائل و مسائل حصہ اول میں لکھا ہے: "داڑھی کے متعلق نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی۔ صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے۔ آپ اگر داڑھی رکھنے میں فاسقین کی وضعوں سے پرہیز کریں اور اتنی داڑھی رکھ لیں جس پر عرف عام میں داڑھی رکھنے کا اطلاق ہوتا ہے (جسے دیکھ کر اس شبہ میں مبتلا نہ ہو شائد چند روز سے آپ نے داڑھی نہیں مونڈی تو شارع کا منشا پورا ہو جاتا ہے خواہ اہل فقہ کی استنباطی شرائط پر وہ پوری اترے یا نہ اترے۔

اس امر سے انکار کی گنجائش نہیں ہے کہ کسی صحیح حدیث سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی کی کسی خاص مقدار کی تعیین فرمائی ہو۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم عام ہے کہ داڑھی بڑھاؤ اور مونچھیں گھٹاؤ۔ جہاں تک اس حکم کی بجا آوری کی عملی صورت کا تعلق ہے اس میں استنباط سے کام لیا گیا ہے اور استنباط میں اختلاف بھی رونما ہوا ہے۔ بعض کے نزدیک داڑھی کو بلا نہایت بڑھانا اور اسے اپنے حال پر چھوڑ دینا مقتضائے سنت ہے۔ بعض کے نزدیک مٹھی بھر داڑھی مسنون ہے اور لمبی داڑھی مکروہ ہے۔ بعض کے نزدیک کوئی خاص حد مقرر نہیں، بس داڑھی رکھنا مشروع ہے۔ جو حضرات ایک مشت داڑھی کو مسنون سمجھتے ہیں ان کا بیشتر انحصار حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کے عمل پر ہے کیونکہ وہ قبضے سے زائد داڑھی کو ترشوا دیا کرتے تھے یا صحیح تر روایت کے بموجب انہوں نے حج اور عمرے کے موقع پر ایسا کیا تھا۔ خود حضرت ابن عمرؓ سے کوئی صراحت ایسی مروی نہیں جس سے معلوم ہو کہ آیا وہ ایک قبضہ داڑھی ہی کو مسنون سمجھتے تھے اور مسنون ہونے کی صورت میں ان کے نزدیک یہ مقدار کم سے کم حد تھی یا زیادہ سے زیادہ کی۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کے اس فعل کو اتباع سنت پر محمول کرنے کی صورت میں بھی اس سے دونوں طرح کے استنباط کی گنجائش موجود ہے۔ اگر انکے اس فعل کو حج یا عمرے کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے تو اس سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے۔ کہ یہ مقدار ان کے نزدیک کم سے کم کا درجہ رکھتی تھی اور بالعموم آپ اس سے بڑی داڑھی رکھتے تھے۔ اور اگر ان کا عام عمل یہ مانا جائے کہ وہ ایک مشت سے زائد کو ترشوالیا

اوپر کی سطریں ایک خط کا اقتباس ہے جو مغربی پاکستان سے راقم الحروف کے نام آیا ہے۔ جن صاحب کے خط کا اقتباس ہے ان کا ایک دوسرا خط بھی آیا ہے جس میں انہوں نے اپنے اس احساس کا اظہار کیا ہے کہ خود مولانا مودودی اپنی تمام عظمتوں کے وجود داڑھی کو اہمیت نہیں دیتے اور انہیں کا اثر جماعت اسلامی پر ہے. مکتوب نگار نے اپنے بارے میں لکھا ہے کہ وہ جماعت اسلامی کے عقیدت مند اور اس کے حلقہ متفقین سے متعلق ہیں۔ علماء و عوام کی ایک بھیڑ تو وہ ہے جو اصلاً کچھ دوسرے وجوہ سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی مخالفت کرتی ہے لیکن وہ لوگ اس اصل وجوہ مخفی رکھتے اور داڑھی اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو آڑ بنا کر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اگر اس گروہ کے کسی فرد کا خط آتا تو میں اسے پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا. لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو جماعت اسلامی سے اتفاق رکھتے اور سنجیدگی سے اس مسئلے کو سمجھنا چاہتے ہیں۔

کرتے تھے اور داڑھی کو مٹھی بھر سے زیادہ بڑھنے نہیں دیا کرتے تھے تو اس سے یہ استدلال بھی کیا جاسکتا ہے کہ یہ مقدار ان کے نزدیک زیادہ سے زیادہ حد تک تھی۔ اس طرح کی استنباط کی بنا پر اگر بعض فقہاء قبضے سے زائد داڑھی ترشوا دینے کو واجب قرار دے سکتے ہیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ قبضے سے کم مقدار کو جائز یا مباح سمجھ لینے میں کونسا امر شرعی مانع ہے؟

باقی رہا صاحب درمختار وغیرہ کا یہ فرمانا کہ مٹھی بھر داڑھی کی مقدار پر اجماع ہے اور اس سے کم کو کسی نے بھی مباح قرار نہیں دیا تو یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس کا اثبات بڑا مشکل ہے۔ میں دوسرے مذاہب فقہیہ کو چھوڑ کر سردست یہاں علامہ عینی حنفی کی تصنیف عمدۃ القاری. کتاب اللباس. باب "تقلیم الاظفار" میں سے کچھ حصہ عبارت کا نقل کرتا ہوں جس میں وہ توفیر لحیہ والی حدیث کی شرح کرتے ہوئے امام طبری کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

قَدْ ثَبَتَ الْحُجَّةُ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى خُصُوْصِ هٰذَا الْخَبَرِ اَنَّ اللِّحْيَةَ مَحْظُوْرٌ اِعْفَاءُهَا وَوَاجِبٌ قَصُّهَا عَلٰى

مکتوب نگار بھی اس سنجیدہ گروہ میں داخل ہیں۔ ان کے خط میں ایک بات غلط فہمی پر مبنی ہے اس لئے راقم الحروف پہلے اسی کا ازالہ مناسب سمجھتا ہے۔ یہ بات جو انہوں نے لکھی ہے کہ جماعت اسلامی کے رفقاء یا خود مولانا مودودی داڑھی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے بالکل خلاف واقعہ ہے۔ مولانا مودودی مدظلہ نے اب تک اس مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے اس کا مقصد یہ بالکل نہیں ہے کہ داڑھی رکھنے کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ

اختِلَافٌ مِّنَ السَّلَفِ فِیْ قَدْرِ ذٰلِکَ وَحَدِّہٖ فَقَالَ بَعْضُھُمْ حَدُّ ذٰلِکَ اَنْ یُّزَادَ عَلٰی قَدْرِ الْقَبْضَۃِ طُوْلًا وَاَنْ یَّنْتَشِرَ عَرْضُھَا فَیَقْبَحُ ذٰلِکَ وَقَالَ اٰخَرُوْنَ یَاْخُذُہٗ مِنْ طُوْلِھَا وَعَرْضِھَا مَالَمْ یَفْحُشْ اَخْذُہٗ وَلَمْ یَحُدُّوْا فِیْ ذٰلِکَ حَدًّا۔

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات کی دلیل ثابت ہے کہ "داڑھی بڑھانے کے متعلق) حدیث کا حکم عام نہیں بلکہ اس میں تخصیص ہے اور داڑھی کا اپنے حال پر چھوڑ دینا ممنوع اور اس کا ترشوانا واجب ہے۔ البتہ سلف میں اس کی مقدار اور حد کے معاملے میں اختلاف ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ اس کی حد یہ ہے کہ وہ لمبائی میں ایک قبضے سے بڑھ جائے اور چوڑائی میں بھی پھیل جانے کی وجہ سے بری معلوم ہو...... بعض دیگر اصحاب اس بات کے قائل ہیں کہ لمبائی اور چوڑائی میں کم کرائے بشرطیکہ بہت چھوٹی نہ ہو جائے۔ انہوں نے اس بارے میں کوئی حد مقرر نہیں کی) اس کے بعد فرماتے ہیں۔

(البتہ اس کا مطلب میرے نزدیک یہ ہے کہ داڑھی کا ترشوانا اس حد تک جائز ہے کہ وہ عرف عام سے خارج نہ ہو جائے)

اب اگر ایک شخص انصاف کی نظر سے اور تعصب سے خالی ہو کر دیکھے تو وہ خود بآسانی اندازہ کر سکتا ہے کہ مولانا مودودی کی مذکورہ بالا عبارت اور عمدۃ القاری کی اس عبارت میں آخر کونسا ایسا بڑا فرق ہے جس کی بنا پر ایک کو تو گوارا کر لیا جائے اور دوسری کی تردید میں مخالفانہ مہم چلانا ضروری سمجھا جائے"۔

(ملاحظہ ہو ترجمان القرآن ج ۵۹ عدد ۳ ص ۱۸۳ تا ۱۸۵)

اس کے بر خلاف اس کی اہمیت کے سلسلے میں ان کی بعض تحریریں بڑی ایمان افروز ہیں۔ معلوم نہیں مکتوب نگار نے رسائل و مسائل حصہ اول میں مولانا کی تمام تحریریں پڑھی ہیں یا نہیں۔ اس کتاب میں "داڑھی کے متعلق ایک سوال" کے عنوان سے جو سوال و جواب درج ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ مکتوب نگار اسے ضرور پڑھ لیں اور اگر پڑھ چکے ہوں تو دوبارہ پڑھ لیں۔ مولانا کی اس تحریر کو پڑھ کر کوئی منصف مزاج یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ داڑھی کو غیر اہم سی چیز سمجھتے ہیں۔ ان کی جن تحریروں سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے وہ ان علماء و مشائخ کے مقابلے میں لکھی گئی ہیں جنہوں نے داڑھی کے طول و عرض کو پورے دین کے طول و عرض کا پیمانہ سمجھ رکھا ہے۔ اس مسئلے میں ان کی جو انفرادی رائے ہے وہ یہ ہے کہ شرعاً اس کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے اس لئے کم از کم ایک قبضے کی مقدار کو سنت مئوکدہ یا واجب کہنا صحیح نہیں ہے۔ اور جہاں تک مجھے معلوم ہے جماعت اسلامی کا کوئی رکن ایسا نہیں ہے، جو داڑھی رکھنے ہی کو غیر اہم سمجھتا ہو۔

مکتوب نگار نے اس بات کی طرف بھی توجہ نہیں کی کہ اگر مولانا مودودی کے نزدیک داڑھی رکھنا غیر اہم ہوتا تو پھر ان سے متاثر ارکان کو ذرا ذرا سی داڑھی رکھنے پر بھی کون سی چیز مجبور کرتی اور سینکڑوں جدید تعلیم یافتہ لوگ جو پہلے داڑھیاں منڈواتے تھے. اب داڑھیاں کیوں رکھنے لگے۔ یہ میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ مقدار کے مسئلے میں بہت سے ارکان مولانا کی رائے سے متاثر ہیں. لیکن یہ سمجھنا کہ اس مسئلے میں تمام ارکان ان کی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں. صحیح نہیں ہے۔ پاکستان کا حال تو مجھے نہیں معلوم لیکن جماعت اسلامی ہند جو اب ایک مستقل بالذات تنظیم ہے اس کے متعدد ارکان مولانا کی تحریریں پڑھنے کے باوجود ان کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے۔ راقم الحروف کو بھی مولانا کی اس رائے سے اختلاف ہے۔ مکتوب نگار چونکہ سنجیدگی کے ساتھ اس مسئلے پر غور کرنا چاہتے ہیں اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اس مسئلہ میں اپنی رائے تفصیل سے عرض کروں۔

اس مسئلے پر غور کرنے کے لئے ذیل میں چند نکات درج کئے جارہے ہیں انہیں کے تحت اظہار خیال ہو گا۔

۱۔ اعفاء لحیہ کا حکم کیوں دیا گیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کا منشاء کیا ہے؟

۲۔ اعفاء کے معنی کیا ہیں اور اس کے ہم معنی دوسرے کون سے الفاظ مروی ہیں؟

۳۔ مقدار لحیہ کے مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

۴۔ اعفوا اللحی کا حکم اپنے عموم پر ہے یا اس میں تخصیص بھی ہوئی ہے؟

۵۔ کیا تخصیص کے قائل فقہاء میں سے کوئی فقیہ ایک مشت سے کم مقدار کو بھی مباح قرار دیتا ہے؟

۶۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مدظلہ کی رائے پر اظہار خیال۔

(۱) لحیہ اور مقدار لحیہ کے مسئلے پر غور کرتے وقت یہ بات سامنے آتی ہے کہ جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اعفاء لحیہ کا حکم دیا اس وقت آپ خود داڑھی رکھتے تھے. تمام صحابہ کرام داڑھی رکھتے تھے۔ پورے جزیرۃ العرب کے باشندے داڑھی رکھتے تھے. بلکہ عرب کے قریبی ممالک میں بھی داڑھی مونڈنے کا رواج نہ تھا۔ تمام کے تمام لوگ اس کو مرد اور عورت کے چہروں کے درمیان مابہ الامتیاز سمجھتے تھے اور مردانگی و مردانہ حسن کی علامت قرار دیتے تھے۔ طبعی طور پر کسی کے چہرے پر داڑھی نہ نکلنے یا بالقصد اسے مونڈ دینے کو عیب سمجھا جاتا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے ماحول میں داڑھی بڑھانے کا حکم کیوں دیا گیا اور اس کا منشاء کیا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک حدیث دیتی ہے جو لحیہ اور مقدار لحیہ دونوں ہی کی شرعی حیثیت جاننے کے لئے ایک بنیادی اور اہم حدیث ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ جُزُّوا الشَّوَارِبَ وَاَرْخُوا اللُّحٰی خَالِفُوا الْمَجُوْسَ (مسلم شریف)

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مونچھیں کاٹو اور داڑھیاں لمبی کرو (اور اس طرح) مجوس کی مخالفت کرو۔

یہی حدیث حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ان الفاظ میں مروی ہے:۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ خَالِفُوا الْمُشْرِکِیْنَ وَوَفِّرُوا اللُّحٰی وَاحْفُوا الشَّوَارِبَ (بخاری شریف، کتاب اللباس)

ترجمہ: حضرت عبداللہ بن عمر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپؐ نے فرمایا مشرکین کی مخالفت کرو۔ داڑھیاں خوب بڑھاؤ اور مونچھوں کے بال کاٹ کر کم کرو۔

اس حدیث میں مشرکین کا لفظ مجوس ہی کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ علامہ عینی لکھتے ہیں:۔

خَالِفُوا الْمُشْرِکِیْنَ اَرَادَ بِهِمُ الْمَجُوْسَ یَدُلُّ عَلَیْهِ رِوَایَةُ مُسْلِمٍ خَالِفُوا الْمَجُوْسَ۔

ترجمہ:۔ مشرکین سے مراد مجوس ہیں۔ اس بات پر مسلم کی روایت خالفوا المجوس دلیل ہے۔

اس حدیث سے وہ وجہ معلوم ہو گئی جس کی بناء پر اعفاء لحیہ کا حکم دیا گیا۔ عرب کے پڑوسی ممالک میں سب سے پہلے فارس کے مجوسیوں نے اس مردانہ حسن ــــ داڑھی پر حملہ کیا۔ چونکہ اس وقت تک داڑھی مونڈنے کو عیب شمار کیا جاتا تھا اس لئے مجوسیوں نے اپنے اندر یکایک داڑھیاں مونڈنے کی ہمت نہ پائی اور ابتداءً وہ اپنی داڑھیاں چھوٹی کرنے لگے اور رفتہ رفتہ ان میں کچھ لوگ اپنی داڑھیاں مونڈنے بھی لگے۔ عین ممکن ہے کہ مجوسیوں سے متاثر ہو کر جزیرۃ العرب کے کچھ مشرکین بھی داڑھیاں چھوٹی کرانے یا مونڈنے لگے ہوں اگرچہ اس وقت مسلمان

داڑھی رکھ رہے تھے لیکن ان پر اس کی دینی و شرعی حیثیت واضح نہ تھی. خطرہ تھا کہ کہیں آگے چل کر ان میں کچھ لوگ مجوسی تہذیب سے متاثر نہ ہو جائیں چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے حکم سے اس کی شرعی حیثیت واضح فرمادی اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس معاملہ میں مجوس کی مخالفت کرنا تم پر لازم ہے۔ داڑھی کا معاملہ محض رواج اور عادت سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ اسلامی معاشرے کا ایک اسلامی تہذیب کا ایک نشان ہے۔

یہ بات تمام محدثین لکھتے ہیں کہ اس وقت مجوسی عام طور پر داڑھیاں مونڈتے نہ تھے بلکہ چھوٹی کراتے تھے۔ ابو شامہ کے وقت میں جب کچھ لوگوں نے داڑھیاں مونڈیں تو انہوں نے بڑے رنج و غم کے ساتھ کہا:۔

"اب کچھ لوگ ایسے پیدا ہو رہے ہیں جو اپنی داڑھیاں منڈوادیتے ہیں۔ یہ فعل اس سے بھی زیادہ شدید ہے جو مجوسیوں کے بارے میں منقول ہے کیونکہ وہ اپنی داڑھیاں چھوٹی کراتے تھے۔ (فتح الباری. ج

امام نووی لکھتے ہیں:۔

وَكَانَ مِنْ عَادَةِ الْفُرْسِ قَصُّ اللِّحْيَةِ فَنَهَى الشَّرْعُ عَنْ ذَالِكَ (ح مسلم)

ترجمہ:۔ فارسیوں (مجوسیوں) کی عادت تھی کہ وہ داڑھی کے بال کاٹ کر، کم کرتے تھے لہٰذا شریعت نے اس سے منع کیا۔

ان میں کچھ لوگ اپنی داڑھیاں منڈوانے بھی لگے تھے جیساکہ علامہ عینی نے لکھا ہے۔

لِاَنَّهُمْ كَانُوْا يُقَصِّرُوْنَ لِحَاهُمْ وَمِنْهُمْ مَنْ كَانَ يَحْلِقُهَا۔

ترجمہ:۔ اس لئے کہ وہ لوگ اپنی داڑھیاں چھوٹی کراتے تھے اور ان میں کچھ لوگ مونڈ ڈالتے تھے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اس حدیث نے اعفاء لحیہ کے حکم کی علت کے

ساتھ یہ واضح اشارہ بھی دیا ہے کہ داڑھی کی مقدار کتنی ہونی چاہئے اور اعفاء لحیہ کے حکم کا منشاء کب پورا ہو گا۔ مجوسی جب اپنی داڑھیاں چھوٹی کراتے تھے اور مسلمانوں کو ان کی مخالفت کا حکم دیا گیا تو اتنی بات تو معلوم ہو گئی کہ ان کی داڑھیاں مجوسیوں کی داڑھیوں سے لمبی ہونی چاہئیں۔ لیکن بات پھر بھی مجمل ہے اس اجمال کی تبیین نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عمل سے ہوئی آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔ ابھی قول رسول کی تفصیل جان لینی چاہئے۔

(۲) داڑھی بڑھانے کے حکم میں جو الفاظ احادیث میں مروی ہیں ان سے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منشاء ظاہر ہوتا ہے۔ احادیث میں پانچ الفاظ ملتے ہیں اعفاء۔ القاء ارجاء۔ ارخاء۔ توفیر۔ کسی حدیث میں اعفواء ہے کسی میں اوفواء کہیں ارجوا کسی میں ارخوے اور کہیں وفروا۔

ان سب الفاظ کے بارے میں نووی لکھتے ہیں:۔ وَمَعْنَاهَا كُلِّهَا تَرْكُهَا عَلَى حَالِهَا (اور ان سب الفاظ کے معنی یہ ہیں:۔ کہ داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے)۔

حافظ ابن حجر وفروا کے معنی بیان کرتے ہیں اترکوھاوا فرۃ (داڑھی چھوڑو بایں حال کی وہ وافر ہو) اوفوا کے معنی بیان کرتے ہیں اترکوھا وافیۃ (اسے چھوڑ دو بایں حال کی وہ پوری ہو) ارخوا کے معنی بتاتے ہیں اَطِیْلُوْهَا (داڑھی لمبی کرو) اعفاء کے معنی امام بخاری اور دوسرے محدثین نے تکثیر کے بیان کئے ہیں۔ اس سلسلے میں ابن دقیق العید کہتے ہیں:۔

تَفْسِيْرُ الْإِعْفَاءِ بِالتَّكْثِيْرِ مِنْ إِقَامَةِ السَّبَبِ مَقَامَ الْمُسَبَّبِ لِأَنَّ حَقِيْقَةَ الْإِعْفَاءِ التَّرْكُ وَتَرْكُ التَّعَرُّضِ لِلِّحْيَةِ يَسْتَلْزِمُ تَكْثِيْرَهَا (فتح الباری ج ۱)

اعفاء کی تفسیر تکثیر سے کرنا اس اصول کے تحت ہے کہ سبب کو سبب کی جگہ پر رکھا گیا ہے کیونکہ اعفاء کی حقیقت ترک کرنا اور جب داڑھی سے تعرض ترک کیا جائے گا تو لازماً اس میں

تکثیر ہوگی۔

یہ تمام الفاظ اور ان کی تشریحات صاف بتارہی ہیں کہ حدیث کا منشاء محض ڈارھی رکھ لینا نہیں ہے بلکہ اس کو بڑھانا اور لمبا کرنا ہے۔

(۳) اب آیئے اس پر غور کریں کہ مقدار لحیہ کے مسئلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

علمائے اصول نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال کی متعدد قسمیں بیان کی ہیں اور تفصیل سے ان پر لکھا ہے اولاً اجمالی طور پر آپ کے افعال کی دو قسمیں بنتی ہیں ایک وہ افعال جن کا قربت و عبادت سے تعلق نہیں بلکہ وہ عادت و جبلت سے متعلق ہیں جیسے کھانا پینا بیٹھنا اٹھنا پہننا اوڑھنا ایسے افعال کا شرعی حکم اباحت ہے یعنی ان سے کسی چیز کا مباح ہونا ثابت ہوتا ہے۔

دوسری قسم کے افعال وہ ہیں جن کا تعلق عادت و جبلت سے نہیں بلکہ قربت و عبادت سے ہے۔ اس قسم کے افعال کی متعدد قسمیں ہیں ان میں ایک قسم وہ ہے جس کا مسئلہ زیر بحث سے براہ راست تعلق ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ افعال جو کتاب اللہ میں مذکور احکام یا خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوامر کی تبیین کرتے ہیں۔ اس قسم کے افعال کا حکم وہی ہوتا ہے جو ان احکام و اوامر کا جن کی تبیین ان افعال سے ہوتی ہے۔ ان افعال کی حیثیت بیان کی ہوتی ہے۔ اگر مبین (وہ امر جس کی تبیین و توضیح کی گئی) واجب ہو تو بیان (وہ فعل جس سے توضیح و تبیین ہوئی) بھی واجب ہوگا اور اگر وہ مندوب ہو تو فعل بھی مندوب ہوگا۔ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے بیان کے تمام انواع واقسام ثابت ہوتے ہیں، اس سے مجمل کی توضیح بھی ہوتی ہے، عموم کی تخصیص بھی ہوتی ہے، ظاہر کی تاویل بھی ہوتی ہے اور کسی امر سابق کا نسخ بھی ثابت ہوتا ہے۔

اس متفقہ و مسلمہ اصول شرعی کو مسئلہ زیر بحث پر منطبق کیجئے یہ بات ہر شبہہ سے بالاتر ہے کہ اعفواء اللحی (داڑھی کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دو) کے حکم کی تبیین حضور

کے عمل نے کی ہے اور آپ کے فعل و عمل کو اس حکم کے بیان کی حیثیت حاصل ہے۔ اب اگر اعفاء لحیہ کا حکم واجب ہے تو حضور کا فعل بھی واجب ہو گا اور اگر مندوب ہے تو فعل بھی مندوب ہو گا۔ تمام علمائے حق اس بات پر متفق ہیں کہ اعفائے لحیہ سنت مؤکدہ ہے اور داڑھی اسلامی شعار میں داخل ہے۔

احادیث و سیر میں ریش مبارک کے بارے میں جو تفصیل ملتی ہے اس سے یہ بات بالیقین معلوم ہوتی ہے کہ اس کی مقدار ایک مشت سے زیادہ تھی، کم ہرگز نہ تھی۔ کسی روایت میں آتا ہے کہ آپ "کثیر شعر اللحیہ" تھے۔ یعنی آپ کی ریش مبارک میں بال بہت تھے۔ کسی روایت میں کہا گیا ہے کہ آپ "کث اللحیہ" تھے یعنی آپ کی ریش مبارک گھنی تھی۔ اور کسی روایت میں ہے کہ آپ کی گھنی داڑھی آپ کے منور سینے کو بھرے ہوئے تھی اور کسی روایت میں آپ کو "عظیم اللحیہ" کہا گیا ہے یعنی آپ کی داڑھی بڑی تھی۔ یہی بات سیر و سوانح کی کتابوں میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی داڑھیوں کے بارے میں بھی ملتی ہیں۔ مدارج النبوت میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں:۔

لحیہ امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ پر می کرد سینہ را دہمچنیں	امیرالمومنین علی رضی اللہ عنہ کی داڑھی ان کے سینہ کو بھر دیتی تھی۔
لحیہ امیرالمومنین عمرو عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔	اسی طرح امیرالمومنین عمر و عثمان رضی اللہ عنہما کی داڑھیاں ان کے سینوں کو بھر دیتی تھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا گیا ہے: كَانَ كَثَّ اللِّحْيَةِ (استیعاب) حضرت عثمان کے رضی اللہ عنہ کے بارے میں ہے كَانَ عَظِيمَ اللِّحْيَةِ (اصحابہ)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کی عملی توضیح مقدار لحیہ کے بارے میں یہ تھی کہ اتنی وافر ہو کہ اس پر عظیم و کثیر کا لفظ صادق

آ سکے۔

(۴) اعفوا اللحیٰ کا حکم اپنے عموم پر ہے یا اس میں تخصیص بھی ہوئی ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت اس حکم کو عام رکھتی ہے اور اس میں تخصیص کی قائل نہیں ہے۔

طبری نے کہا ہے کہ فقہا کی ایک جماعت. ظاہر حدیث کی طرف گئی ہے اور اس کے نزدیک داڑھی کے طول و عرض سے کچھ حصہ کٹوانا بھی مکروہ ہے۔ (فتح الباری جلد ۱۰)

امام نووی نے شرح مسلم میں دو جگہ اس پر گفتگو کی ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

هٰذَا هُوَ الظَّاهِرُ مِنَ الْحَدِيْثِ الَّذِىْ تَقْتَضِيْهِ اَلْفَاظُهٗ وَهُوَ الَّذِىْ قَالَهٗ جَمَاعَةٌ مِّنْ اَصْحَابِنَا وَغَيْرُهُمْ مِّنَ الْعُلَمَاءِ

ترجمہ:۔ حدیث سے یہی ظاہر ہے اور یہی اس کے الفاظ کا اقتضاد ہے۔ اور یہی ہمارے اصحاب کی ایک جماعت اور دوسرے علماء کا قول ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں:۔

وَالْمُخْتَارُ تَرْكُ اللِّحْيَةِ عَلٰى حَالِهَا وَاَنْ لَّا يَتَعَرَّضَ لَهَا بِتَقْصِيْرِ شَيْءٍ اَصْلًا۔

ترجمہ:۔ مختار قول یہی ہے کہ داڑھی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کیا جائے۔

صاحب تحفۃ الاحوذی تخصیص کے قائلین کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

فَاَسْلَمُ الْاَقْوَالِ هُوَ قَوْلُ مَنْ قَالَ بِظَاهِرِ اَحَادِيْثِ الْاِعْفَاءِ وَكَرِهَ اَنْ يُّؤْخَذَ شَيْءٌ مِّنْ طُوْلِ اللِّحْيَةِ وَعَرْضِهَا۔

ترجمہ:۔ ان لوگوں کا قول. محفوظ ترین قول ہے جو احادیث اعفاء کے ظاہر کی وجہ سے داڑھی کے

طول و عرض میں کچھ حصہ کٹوانے کو بھی مکروہ کہتے ہیں۔

علامہ شوکانی کا مسلک بھی وہی ہے جو امام نووی کا ہے وہ بھی حدیث کے عموم کے قائل ہیں وہ حضرت ابن عمرؓ کے عمل کو مخصص نہیں مانتے اور نہ عمرو بن شعیب کی حدیث کو قابل احتجاج سمجھتے ہیں۔ (نیل ج ۱ ص ۱۴۲)

اس جماعت کی دلیل یہ ہے کہ حدیث کے عموم کو خاص کرنے والی کوئی چیز نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ثابت ہے اور نہ فعل سے۔ قولی حدیث میں تو موجود ہی نہیں ہے اور فعلی حدیث ضعیف ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تخصیص کا قول اس درجہ ثابت شدہ نہیں ہے کہ تمام فقہاء اس پر متفق ہوگئے ہوں بلکہ فقہاء کی ایک جماعت جس میں نووی جیسے اساطین علم داخل ہیں تخصیص کا انکار کرتی ہے۔

فقہاء کی دوسری جماعت حدیث کو عام نہیں رکھتی بلکہ اس حکم میں تخصیص کی قائل ہے۔ تخصیص کے قائلین متعدد جماعتوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ حافظ ابن حجرؒ امام طبری کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

> "اور ایک جماعت کا قول یہ ہے کہ داڑھی جب ایک مشت سے زیادہ ہوجائے تو زائد حصے کو کٹوا دیا جائے اس رائے کے لئے طبری نے اپنی سند سے تین حدیثیں پیش کی ہیں۔ نمبر۱ عبداللہ بن عمرؓ نے ایسا کیا ہے۔ نمبر۲ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کے ساتھ یہ معاملہ کیا کہ اس کی ایک مشت سے زائد داڑھی کو کٹوا دیا۔ نمبر۳ حضرت ابوہریرہؓ نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ اس کے علاوہ ابو داؤد نے سند حسن کے ساتھ حضرت جابرؓ کی یہ حدیث روایت کی ہے:۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ داڑھی کو اپنے حال پر چھوڑے رکھتے ہیں اِلّا یہ کہ حج یا عمرہ کے موقع پر اس کا کچھ حصہ ترشوا دیتے تھے۔ حضرت جابرؓ کی حدیث سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرامؓ صرف حج یا عمرے کے موقع پر اپنی داڑھیاں کچھ چھوٹی کراتے

تھے۔ پھر طبری نے اس اختلاف کا ذکر کیا ہے کہ داڑھی کے بال کٹوانے کی کوئی حد ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں انہوں نے تین مسلکوں کا ذکر کیا ہے۔

نمبرا ایک جماعت کہتی ہے کہ ایک مُشت سے زیادہ جو بال بڑھ جائیں صرف انہیں کٹوایا جائے نمبر۲ حسن بصریؒ کا قول یہ ہے کہ داڑھی طول و عرض سے اس حد تک کٹوائی جائے کہ قطع و برید بہت بڑھ جائے اور عطاء نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے۔ داڑھی کٹوانے کی ممانعت کو ان لوگوں نے اس بات پر محمول کیا ہے کہ جس مقدار میں عجمی لوگ کٹواتے اور اسے ہلکی کر دیتے ہیں اس مقدار میں اسے نہ کٹوایا جائے۔

نمبر۳ ایک جماعت کے نزدیک حج یا عمرے کی علاوہ کسی وقت بھی داڑھی کے بال کٹوانا پسندیدہ اور مکروہ فعل ہے امام طبریؒ نے خود حضرت عطاء کے قول کو اختیار کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی داڑھی کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دے اور اس سے مطلق تعرض نہ کرے یہاں تک کہ اس کا طول و عرض فاحش (بہت زیادہ) ہو جائے تو وہ اپنے آپ کو لوگوں کے تمسخر کا ہدف بنالے گا۔ طبری نے اس مسئلے میں عمرو بن شعیب کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک کے طول و عرض سے کچھ بال کٹوا دیتے تھے۔ یہ حدیث ترمذی نے نقل کی ہے لیکن بخاری نے کہا ہے کہ یہ حدیث منکر ہے اس لئے کہ اس حدیث کے ایک راوی عمر بن ہارون ہیں اور ان کو محدثین کی ایک جماعت نے ضعیف قرار دیا ہے۔ قاضی عیاض کہتے ہیں کہ داڑھی کو مونڈنا. کٹوانا اور کم کرانا ناجائز ہے. ہاں اگر طول و عرض بہت بڑھ جائے تو اطراف سے کچھ کٹوا دینا چاہئے بلکہ جس طرح تقصیر (بہت چھوٹا کرانا) مکروہ ہے اسی طرح تعظیم (بہت بڑھا دینا) بھی

مکروہ ہے لیکن نووی نے قاضی عیاض کی یہ بات رد کر دی ہے اور کہا ہے کہ یہ قول ظاہر حدیث کے خلاف ہے اس لئے کہ حدیث میں توفیر لحیہ (داڑھی بڑھانے) کا حکم ہے۔ مختار مسلک یہ ہے کہ داڑھی کو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اس سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ نووی کی مراد یہ ہے کہ حج یا عمرے کے علاوہ، دوسرے اوقات میں تعرض نہ کیا جائے اس لئے کہ امام شافعیؒ نے حج یا عمرے میں داڑھی کے کچھ بال کٹوانے کو مستحب کہا ہے۔

(فتح الباری جلد۱۰۔ باب تقلیم الاظفار)

میں نے فتح الباری کا یہ لمبا حوالہ یہاں اس لئے دیا ہے کہ اس میں تخصیص کے قائلین کے تمام اقوال اور ان کے مشہور دلائل سمیٹ لئے گئے ہیں۔ ان اقوال میں سب سے پہلے میں حسن بصری و عطاء رحمہما اللہ کے قول کی توضیح کرنا چاہتا ہوں، اسی قول کو امام طبریؒ نے بھی اختیار کیا ہے۔ بعض لوگوں نے یَاْخُذُ مِنْ طُوْلِهَا وَعَرْضِهَا مَالَمْ يَفْحُشْ کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ ڈاڑھی ایک مشت سے بھی کم کی جا سکتی ہے۔ راقم الحروف کے نزدیک اس قول کا یہ مطلب نکالنا صحیح نہیں ہے۔ اس کی دو بڑی وجہیں ہیں ایک یہ کہ امام طبریؒ نے خود اس مسلک کو واضح کر دیا ہے۔ انہوں نے اس مسلک کو اختیار کرنے کے لئے دو دلیلیں دی ہیں۔ ایک دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی داڑھی سے بالکل تعرض نہ کرے اور بڑھنے کے لئے چھوڑ دے تو اس کا طول و عرض بہت بڑھ جائے گا۔ اور چہرہ مضحکہ انگیز بن جائے گا۔ معلوم ہوا کہ حسن بصریؒ و عطاؒ کے قول کا مطلب بھی یہی ہے کہ داڑھی کو اس قدر نہ بڑھنے دیا جائے کہ وہ لوگوں کے تمسخر کا سبب بن جائے۔ ظاہر ہے کہ طول و عرض ایک مشت سے بڑھ کر ہی سبب تمسخر بن سکتا ہے۔ نہ کہ ایک مشت کی صورت میں۔ دوسری دلیل طبری نے ترمذی کی حدیث سے پیش کی ہے وہ اس بات کے لئے اور زیادہ مضبوط دلیل ہے کہ ان کے قول کا مطلب ایک مشت سے کم کا جواز نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ریش مبارک ہرگز اتنی کم نہیں کراتے تھے کہ وہ ایک مشت سے بھی کم رہ جائے۔

دوسری بڑی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ان کے قول کا مطلب اگر یہ لیا جائے کہ داڑھی ایک مشت سے کم رکھی جاسکتی ہے تو پھر یہ قول خالفوا المجوس کے صریح حکم کے خلاف ہوگا۔ اس کے علاوہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی عملی توضیح کے خلاف بھی ہوگا بقدر یکمشت والے قول سے۔ حضرت عطاء کے قول کا اختلاف اس جہت سے نہیں ہے کہ ان کے نزدیک داڑھی یکمشت سے بھی کم کی جاسکتی ہے بلکہ اس کے برعکس وہ داڑھی کے طول کو ایک مشت تک محدود کرنے کو صحیح نہیں سمجھتے. ان کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک مشت سے بھی زیادہ رکھی جاسکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ اتنی نہ بڑھادی جائے کہ سبب مضحکہ بن جائے۔ صاحب تحفۃ الاحوذی نے بھی حسن بصری و عطا کے قول کا مطلب یہی سمجھا ہے وہ لکھتے ہیں:

قُلْتُ لَوْثَبَتَ حَدِيْثُ عَمْرِو بْنِ شُعَيْبٍ لَكَانَ قَوْلُ الْحَسَنِ وَعَطَاءٍ اَحْسَنَ الْأَقْوَالِ وَاَعْدَلَهَا لٰكِنَّهٗ حَدِيْثٌ ضَعِيْفٌ لَا يَصْلُحُ لِلْاِحْتِجَاجِ بِهٖ (تحفۃ الاحوذی)

ترجمہ:۔ میں کہتا ہوں کہ اگر عمرو بن شعیب کی حدیث ثابت ہوتی تو حسن و عطا کا قول سب سے زیادہ بہتر اور معتدل قول ہوتا لیکن وہ حدیث ضعیف ہے اور اس سے احتجاج درست نہیں۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ حسن بصری و عطاء کے قول کا ماخذ عمرو بن شعیب کی حدیث ہے۔ اگر ان کے قول کا مطلب یہ ہوتا کہ داڑھی ایک مٹھی سے کم رکھی جاسکتی ہے تو صاحب تحفہ کبھی اس کو احسن الاقوال نہ کہتے۔ جہاں تک میرا مطالعہ ہے کسی فقیہ نے بھی حسن بصری و عطاء کے قول کو ایک مٹھی سے کم مقدار کو جائز قرار دینے کے لئے بطور دلیل پیش نہیں کیا ہے اور نہ ان کے قول کی یہ توضیح کی ہے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کی ایک دلیل قاضی عیاض کی وہ عبارت بھی ہے جس میں انہوں نے مذاہب سلف بیان کئے ہیں۔ امام نووی قاضی عیاض کے حوالہ سے لکھتے ہیں:۔

قَالَ الْقَاضِیْ عِیَاضٌ وَقَدِ اخْتَلَفَ السَّلَفُ هَلْ لِذٰلِكَ حَدٌّ فَمِنْهُمْ مَنْ لَمْ یُحَدِّدْ شَیْئًا فِیْ ذٰلِكَ اِلَّا اَنَّهٗ لَا یَتْرُکُهَا لِحَدِّ الشُّهْرَةِ وَیَاْخُذُ مِنْهَا وَکَرِهَ مَالِكٌ طُوْلَهَا جِدًّا وَمِنْهُمْ مَنْ حَدَّدَ بِمَا زَادَ عَلَی الْقَبْضَةِ فَیُزَالُ وَمِنْهُمْ مَنْ کَرِهَ الْاَخْذَ مِنْهَا اِلَّا فِیْ حَجٍّ اَوْ عُمْرَةٍ (شرح مسلم)

ترجمہ:۔ قاضی عیاض نے کہا سلف کا اس میں اختلاف ہے کہ داڑھی کی لمبائی کی کوئی حد ہے یا نہیں تو ان میں سے کچھ لوگوں نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی اِلّا یہ کہ کوئی شخص حد شہرت تک داڑھی نہ چھوڑے بلکہ اس سے کچھ حصہ کٹوادے۔ امام مالکؒ داڑھی کے بہت لمبا ہونے کو مکروہ سمجھتے تھے اور ان میں کچھ لوگوں نے طول کی حد ایک قبضہ مقرر کی ہے اس سے زیادہ کٹوادیا جائے اور ان میں سے کچھ لوگوں نے حج یا عمرے کے سوا کسی اور وقت داڑھی کے بال کٹوانے کو مکروہ کہا ہے۔ (شرح مسلم)

قاضی عیاض نے پہلی جس جماعت کا ذکر کیا ہے حسن بصری اور عطاء بھی اسی میں داخل ہیں۔ اسی جماعت کے مسلک کو حافظ ابن حجرؒ نے طبری کے حوالہ سے حسن بصری و عطا کی طرف منسوب کیا ہے اور علامہ عینی نے طبری ہی کے حوالے سے حضرت عطاء کی طرف منسوب کیا ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ فقہاء سلف میں اختلاف یہ تھا کہ طول لحیہ کی کوئی حد ہے یا نہیں، اور اس مسئلے میں صرف دو ہی قول ہیں ایک یہ کہ طول لحیہ کی حد ایک مشت ہونی چاہیئے اور دوسرا یہ کہ ایک مشت پر اقتصار صحیح نہیں داڑھی اس سے بھی لمبی ہو سکتی ہے لیکن اتنی لمبی نہ ہو جائے کہ حد شہرت تک پہنچ کر مضحکہ خیز بن جائے۔

سلف میں سے کسی کے خیال میں بھی شائد یہ بات نہ ہوگی کہ داڑھی کی مقدار ایک مشت سے بھی کم جائز قرار پا سکتی ہے۔ ان میں سے کسی کی صراحت کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔

دو جماعتوں کے مسلک کی توضیح ہو چکی ہے۔ ایک جماعت تو وہ حدیث کے عموم میں کسی تخصیص کی قائل ہی نہیں ہے۔ دوسری وہ جو حد شہرت تک داڑھی کے طول و

عرض کو بڑھا دینے کی مخالف ہے۔ تیسری جماعت وہ ہے جو داڑھی کے طول کو ایک مشت تک محدود کرتی ہے اس کا خیال ہے کہ ایک مشت سے زائد جو مقدار ہو اسے کاٹ دینا چاہئے۔ اس مسلک کی بھی تھوڑی تفصیل ضروری معلوم ہوتی ہے کیونکہ عام طور پر فقہاء احناف بھی ایک مشت کی مقدار کو مقدار مسنون کہتے ہیں۔

میرے مطالعہ سے جو کتابیں اب تک گزری ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک مشت کے قائلین دو گروہوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ ان میں کا چھوٹا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ایک مشت سے زائد مقدار کو کٹوا دینا ضروری اور واجب ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ ایک مشت مقدار مسنون کی آخری حد ہے، اس سے کم کرنا جائز نہیں۔ اس سے زیادہ صرف یہی نہیں کہ جائز ہے بلکہ اولیٰ بھی ہے۔ ان میں سے پہلے گروہ کے قول کی کوئی شرعی دلیل موجود نہیں اس لئے اس پر گفتگو بے کار ہے۔ البتہ دوسرے گروہ کا قول مدلل بھی ہے اور مناسب بھی۔

جیسا کہ اوپر گزر چکا بقدر ایک قبضہ والے قول کے استدلال میں طبری نے تین صحابیوں کے آثار پیش کئے ہیں لیکن ان میں اعلیٰ درجے کی سند سے صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا عمل ثابت ہے اس لئے اسی کو اصل متدل قرار دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ امام بخاریؒ نے کتاب اللباس باب تقلیم الاظفار میں لکھا ہے:۔ كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَجَّ أَوِ اعْتَمَرَ قَبَضَ عَلَى لِحْيَتِهِ فَمَا فَضَلَ أَخَذَهُ۔

ترجمہ:۔ ابن عمرؓ جب حج یا عمرہ کرتے تو داڑھی کا جو حصہ ایک قبضے سے زیادہ ہوتا اسے کٹوا دیتے۔

حافظ ابن حجرؒ نے موطا امام مالکؒ کی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے:۔

كَانَ ابْنُ عُمَرَ إِذَا حَلَقَ رَأْسَهُ أَخَذَ مِنْ لِحْيَتِهِ وَشَارِبِهِ۔

ترجمہ:۔ ابن عمرؓ جب حج یا عمرے میں اپنا سر منڈواتے تو اپنی داڑھی اور مونچھ کے بھی کچھ بال ترشواتے۔

بخاری کی روایت نے وہ مقدار واضح کر دی ہے جسے حج یا عمرے کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ کٹوادیتے تھے، اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ فقہاء کی ایک جماعت ابن عمرؓ کے اس عمل کو یہ درجہ نہیں دیتی کہ اس سے حدیث مرفوع اعفوااللحی کے عموم میں تخصیص پیدا کی جاسکے۔ لیکن فقہاء کی دوسری دو جماعتیں ان کے اس فعل کو مخصص مانتی ہیں ایک جماعت نے ایک مشت تک داڑھی کے بال کٹوانے کو صرف حج اور عمرے کے ساتھ مخصوص کیا ہے جیسا کہ بخاری اور مئوطا امام مالکؒ کی صحیح تر روایت سے ظاہر ہوتا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی اور حالت میں اس جماعت کے نزدیک اس حد تک بھی داڑھی کٹوانا جائز نہیں ہے۔ اور دوسری جماعت اس تخصیص کو حج یا عمرے کے ساتھ محدود نہیں مانتی بلکہ عام حالات میں بھی اس حد تک داڑھی کے بال کٹوانے کو جائز قرار دیتی ہے۔ جیسا کہ اوپر گزر چکا اس کے لئے یہ جماعت متعدد حدیثیں پیش کرتی ہے۔ جو لوگ حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے صحابہ کے عمل کو بالکل نظر انداز کرتے ہیں ان کا نقطہ نظر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ صحابہؓ کے عمل کو کم سے کم جواز پر محمول کرنا تو لازمی ہے۔ فقہاء احناف نے اگر متعدد صحابہ کے عمل سے یہ سمجھا کہ ایک مشت مقدار مسنون کی آخری حد ہے تو غلط نہیں سمجھا۔

فقہاء و محدثین نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل کی متعدد توجیہیں کی ہیں اور متعدد محمل نکالے ہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک سب سے بہتر محمل وہ ہے جو صاحب فتح القدیر نے پیش کیا ہے۔ یہ بات اوپر گزر چکی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اعفاء لحیہ کا حکم نہیں دیا تھا بلکہ اس کے ساتھ مخالفت مجوس کا حکم بھی دیا تھا یہ بات بھی گزر چکی ہے کہ اس وقت مجوسی داڑھیاں چھوٹی کراتے تھے ان میں منڈوانے کا رواج عام نہ ہوا تھا اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا اور مشکل یہ پیش آتی تھی کہ داڑھی کی وہ کم سے کم مقدار کیا ہو جو مجوسیوں کی داڑھیوں سے مختلف بھی ہو اور اس کو اعفاء لحیہ کے حکم نبویؐ کے موافق بھی قرار دیا جائے۔ اس سوال اور مشکل کو ابن عمر رضی اللہ عنہ کے عمل سے حل کر دیا، انہوں نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ مقدار

مسنون کی آخری حد ایک مشت ہے۔ صحابہ کرامؓ میں سے کسی نے بھی ان کے عمل پر اعتراض نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس مقدار کے مسنون اور مخالف مجوس ہونے پر متفق تھے ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہ اس پر اعتراض نہ کرتے ـــــ اس محمل سے تمام روایتوں میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے اور ذہنی اطمینان بھی پیدا ہوتا ہے۔

(۵) کیا تخصیص کے قائل فقہاء میں سے کوئی فقیہ ایک مشت سے کم مقدار کو بھی مباح قرار دیتا ہے؟

اوپر کے صفحات میں اس سوال کا جواب آگیا ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی امام فقہ نے بھی مباح قرار نہیں دیا ہے لیکن اس سوال کے تحت یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک جلیل القدر فقیہ کی تصریح نقل کر دی جائے ـــــ صاحب فتح القدیر امام ابن الہمام المتوفی ۸۶۱ھ لکھتے ہیں:۔

وَاَمَّا الْاَخْذُ مِنْهَا وَهِيَ دُوْنَ ذَالِكَ كَمَا يَفْعَلُهُ بَعْضُ الْمَغَارِبَةِ وَمُخَنَّثَةُ الرِّجَالِ فَلَمْ يُبِحْهُ اَحَدٌ (فتح القدیر مطبوعہ مصر ج ۲ ص ۷۷)

ترجمہ:۔ لیکن داڑھی ترشوانا جب کہ وہ ایک مٹھی سے کم ہو جیسا کہ بعض مغربی اور مخنث قسم کے مردوں کا فعل ہے تو اس کو کسی نے بھی مباح قرار نہیں دیا ہے۔

"کسی نے بھی اس کو مباح قرار نہیں دیا ہے"۔ کا دعویٰ اپنی جگہ مسلم ہے، اور اس کو ثبوت کے ساتھ رد کرنا آسان نہیں ہے۔ ابن الہمام کے اس دعوے کو ان کے بعد کے ائمہ احناف اپنی کتابوں میں نقل کرتے آئے ہیں اور کسی نے بھی اس کے خلاف کوئی قول پیش نہیں کیا۔ یہاں تک کہ متاخرین میں علامہ ابن عابدین شامی نے بھی اس کی تصدیق کی ہے۔

(۶) مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی نے داڑھی کی مقدار کے مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے اس کو اظہار خیال کی سہولت کے لئے نکات ذیل میں یکجا کر رہا ہوں۔

(۱) داڑھی کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی مقدار مقرر نہیں کی ہے ص ۱۴۰۔ (۲) آپ نے کم سے کم یہ بھی نہیں فرمایا کہ داڑھی

اور مونچھ کی ٹھیک وہی وضع رکھو جو میری ہے جس طرح نماز کے متعلق حضورؐ نے فرمادیا کہ اسی طرح پڑھو جس طرح میں پڑھتا ہوں۔ ص ۲۴۷۔ (۳) مجمل حکم دینے پر اکتفا کرنا اور تعین سے اجتناب کرنا خود اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت اس معاملے میں لوگوں کو آزادی دینا چاہتی ہے کہ وہ اعفاء لحیہ اور رقص شارب کی جو صورت اپنے مذاق اور صورتوں کے تناسب کے لحاظ سے مناسب سمجھیں اختیار کریں ص ۲۴۸۔

(۴) نبی صلی اللہ علیہ وسلم جتنی بڑی داڑھی رکھتے تھے اس کا تعلق "عادت رسول" سے ہے ص ۲۳۶ ایضاً ص ۲۴۲۔ اسی کی توضیح کے لئے ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔ رہا یہ سوال کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے داڑھی رکھنے کا حکم دیا اور اس حکم پر خود ایک خاص طرز کی داڑھی رکھ کر اس کی عملی صورت بتادی لہٰذا حدیث میں حضورؐ کی جتنی داڑھی مذکور ہے اتنی ہی اور ویسی ہی داڑھی رکھنا سنت ہے تو یہ ویسا ہی استدلال ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ حضورؐ نے ستر عورت کا حکم دیا اور ستر چھپانے کے لئے ایک خاص طرز کا لباس استعمال کر کے بتادیا لہٰذا اسی طرز کے لباس سے تن پوشی کرنا سنت ہے۔ ص ۲۴۹۔

(۵)۔ صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ رکھی جائے ص ۱۴۰ (۶)۔ داڑھی کی حد و مقدار بہرحال علماء کی ایک استنباطی چیز ہے ص ۱۴۵۔

یہ تمام حوالے میں نے رسائل و سائل حصہ اول سے لئے ہیں جسے مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند نے شائع کیا ہے اب میں نمبروار ان پر اظہار خیال کرتا ہوں۔

(۱) یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی کی کوئی مقدار متعین نہیں کی ہے۔ مولانا مدظلہ نے اپنی تحریروں میں اس طرح بار بار دہرائی ہے کہ پڑھنے والا یہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ کسی شے کی مقدار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کے بغیر

شرعاً متعین ہو ہی نہیں سکتی، حالانکہ یہ اصول کسی اختلاف کے بغیر مسلم ہے کہ مقدار کی تعین اور اجمال کی تبیین جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول سے ہوتی ہے اسی طرح آپ کے فعل سے بھی ہوتی ہے اور بیسیوں مجمل احکام کے بیان اور متعدد مقادیر کے تعین کے لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف افعال کو دلیل و حجت بنایا گیا ہے اور بعض کے لئے تو آپ کے فعل کے سوا کوئی قول سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ مثال کے طور پر حد خمر کے لئے کوئی نص شرعی موجود نہیں ہے۔ چور کا ہاتھ کس جگہ سے کاٹا جائے؟ اس کے لئے کوئی قول رسول موجود نہیں ہے تراویح میں کتنی رکعتیں ہوں؟ اس کے لئے کوئی نص موجود نہیں تو کیا داڑھی کی مقدار کی طرح ان احکام میں بھی اب مسلمانوں کو یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ اپنی پسند کے مطابق جو کچھ چاہیں اختیار کرلیں؟ اگر ان تمام حدود مقادیر میں حضور کا فعل واجب العمل ہے تو پھر مقدار لحیہ کیوں اس سے خارج ہو جائے گی؟

(۲) نمبر ۲ میں جو بات کہی گئی ہے وہ نمبر ا کی توضیح ہے اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی یہ توضیح پڑھ کر حیران رہ گیا اس لئے کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد صَلُّوْا كَمَا رَاَيْتُمُوْنِيْ اُصَلِّيْ کو صرف نماز تک محدود کر دیا ہے یعنی اس قول سے کوئی ایسا قاعدہ نہیں نکلتا جسے کسی دوسرے حکم میں رہنما بنایا جاسکے. حالانکہ تمام علمائے اصول نے بالاتفاق حضور ؐ کے اس ارشاد سے نیز عبادت حج کے رہنما ارشاد خُذُوْا عَنِّيْ مَنَاسِكَكُمْ سے یہ قاعدہ اخذ کیا ہے کہ حضور ؐ کا فعل تمام مجمل احکام کی تبیین کے لئے برہان کی حیثیت رکھتا ہے اور امت کے لئے وہی کچھ واجب العمل ہے جو آپ ؐ کے فعل سے ثابت ہو۔ اس کے علاوہ سوچنے کی بات یہ بھی ہے کہ عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ (تم پر میری اور خلفاء راشدین کی سنت پر عمل کرنا لازم ہے) کا ارشاد نبوی ؐ بھی کیا سنن ہدی کی کسی خاص سنت کے ساتھ مخصوص و محدود ہے؟

(۳) اس نمبر کی عبارت پڑھ کر بھی اصول فقہ کا طالب علم حیران ہوتا ہے. اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شائد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل. کسی حکم مجمل کا بیان بھی

نہیں ہو سکتا اور اس سے کسی ابہام کی تعیین بھی نہیں ہو سکتی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا مودودی جیسے وسیع المطالعہ اور دیدہ ور عالم دین کے قلم سے ایسی بات کیوں نکلی۔ اس سوال کا جواب نمبر ۴ میں آرہا ہے۔

(۴) یہ ہے وہ اصل اشتباہ جس کی وجہ سے مقدار لحیہ کے مسئلے میں فعل رسول کی شرعی حیثیت مولانا مدظلہ کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ مقدار لحیہ کے مسئلے کو ستر عورت کے مسئلے پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق کی ایک مثال ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ستر عورت کا تعلق لباس سے ہے اور استعمال لباس میں حضورؐ کے فعل کو کسی نے بھی سنت واجب الاطاعت قرار نہیں دیا۔ تمام علماء اسے عادت و جبلت سے متعلق مانتے ہیں نہ کہ اس فعل سے جس کا تعلق سنن ہدیٰ اور قربت و عبادت سے ہے۔ کیا داڑھی اور اس کی مقدار کا معاملہ بھی یہی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ کسی امام فقہ نے بھی مقدار لحیہ کے مسئلے میں حضورؐ کے فعل کو محض عادت و جبلت سے متعلق نہیں مانا، اس لئے اس مسئلہ کو مسئلہ لباس پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے۔ اس کے علاوہ دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ حد و مقدار کے لحاظ سے ستر عورت کا حکم سرے سے مجمل حکم ہے ہی نہیں جس کے لئے بیان کی ضرورت ہو۔ مثال کے طور پر جس عضو کو ڈھانکنا شرعاً واجب ہے وہاں یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ اس کے کتنے حصے کو چھپایا جائے اور کتنے حصے کو کھلا چھوڑا جائے اور وَاَعْفُوا اللُّحیٰ کے حکم کو حد و مقدار کے لحاظ سے مولانا خود مجمل تسلیم کرتے ہیں پھر اس مسئلے کو ستر عورت کے مسئلے پر قیاس کرنا کیونکر صحیح ہو گا۔

ان وجوہ سے اس حقیر کا خیال یہ ہے کہ مقدار لحیہ کو ستر عورت پر قیاس کرنے میں تسامح ہوا ہے اور اس تسامح کی وجہ سے اس مسئلے میں حضورؐ کے عمل کی اصولی حیثیت مولانا کی نگاہ سے اوجھل ہو گئی ہے۔

(۵) اعفاء لحیہ کے حکم کی یہ تعبیر کہ حضور نے صرف یہ ہدایت فرمائی ہے کہ داڑھی رکھی جائے۔ اس حکم کو بہت ہلکا کر دیتی ہے۔ احادیث میں اس کے لئے جو

الفاظ آئے ہیں۔ ان کا کوئی لفظ اس تعبیر کا ساتھ نہیں دیتا بلکہ تمام الفاظ سے حضور کی یہ ہدایت نکلتی ہے کہ داڑھی بڑھائی جائے، لمبی کی جائے اور مجوس کی مخالفت کی جائے۔ اعفاء لحیہ کے جو معنی محدثین نے بیان کئے ہیں اس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ میں یہاں لغت کی چند تصریحات نقل کرتا ہوں۔

ابن درید کی جمہرۃ اللغۃ میں ہے:۔

عَفَا شَعْرُهُ إِذَا كَثُرَ

عَفَى النَّبْتُ وَالشَّعْرُ وَغَيْرُهُ: كَثُرَ وَطَالَ وَفِي الْحَدِيثِ أَنَّهُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَرَ بِإِعْفَاءِ اللُّحَى وَهُوَ أَنْ يُوَفِّرَ شَعْرَهَا وَيُكَثِّرَ وَلَا يَقُصَّ كَالشَّوَارِبِ۔ اَلْعَافِي اَلطَّوِيْلُ الشَّعْرِ۔ وَيُقَالُ لِلشَّعْرِ إِذَا طَالَ وَوَفَى عِفَاء۔

قاموس میں ہے:۔

عَفَى شَعْرُ الْبَعِيْرِ كَثُرَ وَطَالَ فَغَطّٰى دُبُرَهُ۔ أَعْفَى اللِّحْيَةَ: وَفَرَهَا۔

ان تصریحات سے بھی معلوم ہوا کہ عفی اور اعفی کے صیغے جب بالوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں تو ان کا کثیر ہونا وافر اور طویل ہونا ان صیغوں کی لغوی حقیقت میں داخل ہے اس لئے اعفوا اللحی کے ارشاد نبوی ؐ سے یہ سمجھنا کہ اس میں صرف داڑھی رکھ لینے کی ہدایت ہے لغوی معنی کے اعتبار سے بھی صحیح نہیں ہے۔

(٦) ۔ اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اس کو سامنے رکھ کر اگر کوئی شخص مولانا کا یہ ارشاد پڑھے گا کہ مقدار لحیہ محض علماء کی ایک استنباطی چیز ہے تو اس بات پر یقین کرنے میں سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔ جو چیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل، نیز خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام کے عمل سے ثابت ہو آخر کس طرح کوئی شخص اس کو محض علماء کا استنباط سمجھ لے۔ ایک مشت سے اوپر داڑھی کے بال کٹوانے کو علماء جو ناجائز کہتے ہیں تو اس کی وجہ محض استنباط نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ اس کے لئے کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے ___ اس کے علاوہ ائمہ فقہ کے استنباطی احکام کے بارے میں عموم واطلاق کے ساتھ یہ کہنا کہ ان کی حیثیت منصوص احکام کی نہیں ہے۔ صحیح نہیں

ہے ایسے استنباطی احکام کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جن کی حیثیت منصوص احکام سے کم نہیں ہے۔

مغربی پاکستان کے خط میں چونکہ ماہنامہ ترجمان القرآن کی ایک تحریر کا ذکر بھی کیا گیا ہے اس لئے آخر میں اس پر بھی اظہار مناسب معلوم ہوتا ہے۔۔۔۔ترجمان القرآن دسمبر ۱۹۶۲ء میں محترمی ملک غلام علی صاحب کی تحریر کے اس حصے کو پڑھ کر افسوس ہوا جس میں انہوں نے عینی کا حوالہ دیا ہے۔ یہ افسوس تین وجوہ سے ہوا۔ ایک یہ کہ عینی کا حوالہ جس انداز میں انہوں نے دیا ہے اور اس کو پڑھ کو جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ اس تاثر سے مختلف ہے جو عینی کی پوری بحث پڑھ کر پیدا ہوتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے جس قول کو مولانا مودودی کی حمایت میں پیش کیا ہے اس کے بارے میں یہ تحقیق نہیں کی کہ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے تیسری یہ کہ انہوں نے عربی عبارت غَيْرَ اَنَّ مَعْنىٰ ذٰلِكَ عِنْدِىْ مَا لَمْ يَخْرُجْ مِنْ عُرْفِ النَّاسِ۔ کے ٹکڑے کی تحقیق نہیں کی۔ راقم اب ان تین وجوہ کی مختصر تشریح کرتا ہے:۔

(۱) سب سے پہلے اس کی تشریح ضروری ہے کہ برادرم ملک غلام علی صاحب نے قد ثبت الحجۃ سے جو عبارت نقل کی ہے وہ اس طرح نقل کی ہے جیسے وہ بات خود امام طبری کہہ رہے ہیں اور ان کے حوالے سے علامہ عینی نے بھی اس کو قبول کرلیا ہے حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، انہوں نے جو عبارت نقل کی ہے اس سے پہلے کی عبارت یہ ہے:۔

وَقَالَ الطَّبْرِیْ فَمَا وَجْهُ قَوْلِهٖ اَعْفُوا اللُّحٰى وَقَدْ عَلِمْتُ اَنَّ
الْاِعْفَاءَ اِكْثَارُ وَاِنَّ مِنَ النَّاسِ مَنْ اِذَا تَرَكَ شَعْرَ لِحْيَتِهٖ اِتِّبَاعًا مِنْهُ ۔
لِظَاهِرِ قَوْلِهٖ اَعْفُوا اللُّحٰى فَيَتَفَاحَشُ طُوْلًا وَعَرْضًا وَيَسْمَجُ
حَتّٰى يَصِيْرَ لِلنَّاسِ حَدِيْثًا وَمَثَلًا قِيْلَ قَدْ ثَبَتَ الْحُجَّةُ۔

ترجمہ:۔ اور طبری نے کہا آپ کے قول اعفوا اللحی کا محمل کیا ہے؟ تم یہ جان چکے کہ اعفاء کے معنی ہیں کہ داڑھی کے بال بڑھائے جائیں اور کوئی شخص ایسا ہو سکتا ہے کہ جب وہ آپ کے ظاہر قول کی

پیروی کرتے ہوئے اپنے ڈاڑھی کے بال چھوڑ دے پھر وہ طول و عرض میں بہت بڑھ جائے، شکلاً قبیح ہوجائے اور لوگوں کے لئے مضحکہ خیز بن جائے (اس اعتراض کو دور کرنے کے لئے) کہا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ثابت ہے (الی آخرہ)

اب دیکھئے کہ بات کیا ہوگئی۔ بات یہ ہوئی کہ امام طبری نے اعفوا اللحی کے عموم پر ایک سوال وارد کیا اور وہ یہ کہ اگر کوئی شخص ظاہر حدیث پر عمل کر کے اپنی داڑھی کو طول و عرض میں بڑھنے کے لئے چھوڑ دے اور اس سے بالکل تعرض نہ کرے تو وہ اتنی بڑھ سکتی ہے کہ شکلاً قبیح اور لوگوں کے لئے مضحکہ خیز بن جائے۔ اس سوال کا جواب کچھ لوگوں نے وہ دیا ہے جس کا ذکر طبری نے قیل قد ثبت الحجۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الیٰ اخرہ میں کیا ہے۔ یہ دعویٰ کہ "داڑھی کا اعفاء ممنوع اور اس کا کچھ حصہ کٹوانا واجب ہے"۔ نہ امام طبری نے کیا اور نہ علامہ عینی نے بلکہ کچھ دوسرے لوگوں نے اور وہ دوسرے لوگ بھی اس درجے کے ہیں کہ ان کے اس قول کو "قیل" کے صیغے سے ذکر کیا گیا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قول ضعیف ہے۔ طبری کے قام کردہ سوال اور "قیل" کے لفظ کو حذف کر دینا کیا ملک صاحب کے لئے کوئی مناسب بات تھی؟ واقعہ بھی یہی ہے کہ اوپر دعویٰ مذکور ہوا وہ انتہائی کمزور دعویٰ ہے عمرو بن شعیب کی ضعیف حدیث سے داڑھی کے کچھ بال کٹوانے کا جواز ہی ثابت ہوجائے تو غنیمت ہے۔ وجوب کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ فقہاء و محدثین کی ایک جماعت جس میں امام نووی جیسے لوگ شریک ہیں عمرو بن شعیب کی حدیث کو تسلیم نہیں کرتی اور اعفوا اللحی کے عموم کی قائل ہے اور اگر کوئی شخص وجوب کا قول حضرت ابن عمرؓ کے عمل کی دلیل پر اختیار کرتا ہے تو یہ اور طرفہ تماشا ہے۔

(۲) "وقال آخرون" میں طبری نے جس مسلک کا ذکر کیا ہے وہ حضرت حسن بصریؒ کا ہے جیسا کہ فتح الباری کے حوالے سے اوپر گزر چکا ہے اور وہاں دو باتیں اور مذکور ہیں ایک یہ کہ حضرت عطاء کا قول بھی اسی طرح کا ہے جیسا حضرت حسن

بصری کا ہے اور دوسری بات یہ کہ امام طبری نے حضرت عطاء کے قول کو اختیار کیا ہے۔ ان دونوں کے مسلک کا صحیح مفہوم کیا ہے میں اوپر تفصیل سے لکھ آیا ہوں اس لئے یہاں اعادہ بے کار ہے ہاں اس کا ذکر ضروری ہے کہ علامہ عینی نے حضرت عطاء کا جو مسلک نقل کیا ہے اس میں اور "قال آخرون" والے مسلک میں کوئی قابل ذکر فرق نہیں ہے۔ فتح الباری میں حضرت حسن بصری کا قول نقل کرنے کے بعد کہا گیا ہے۔ وقال عطاء نحوہ (اور عطاء نے بھی اسی طرح کی بات کہی ہے جیسی حسن بصریؒ نے) عطاء کا مسلک عینی نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

وَقَالَ عَطَاءٌ لَا بَأْسَ اَنْ يَّاْخُذَ مِنْ لِحْيَتِهِ الشَّيْئَ الْقَلِيْلَ مِنْ طُوْلِهَا وَعَرْضِهَا اِذَا كَبُرَتْ وَعَلَتْ كَرَاهَةَ الشُّهْرَةِ وَفِيْهِ تَعْرِيْضُ نَفْسِهِ لِمَنْ يَّسْخَرُ بِهِ وَاسْتَدَلَّ بِحَدِيْثِ عُمَرَ بْنِ هَارُوْنَ ۔

ترجمہ:۔ اور عطاء نے کہا۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی داڑھی کے طول و عرض سے اس وقت کچھ تھوڑا سا حصہ کٹوا دے جب وہ بہت بڑھ جائے کیونکہ شہرت ایک مکروہ شے ہے اور اس میں اپنے آپ کو مضحکہ بنانا بھی ہے اور انہوں نے عمر بن ہارون کی حدیث سے استدلال کیا ہے۔
اگر کوئی کہے کہ تم یہ کس دلیل کی بنا پر کہتے ہو۔ کہ دونوں قول مختلف نہیں ہیں تو میں اس کے جواب میں کہوں گا کہ اس کی ایک دلیل حافظ ابن حجر کا بیان ہے۔ فتح الباری اور عمدۃ القاری دونوں میں طبری کا حوالہ ہے۔ ہر صاحب علم دونوں کو پڑھ کر دیکھ سکتا ہے کہ فتح کا حوالہ کامل اور عمدہ کا حوالہ ناقص ہے۔ عمدہ میں تو اس جماعت کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ جو اعفاء لحیہ کے حکم میں تخصیص کی قائل نہیں، حالانکہ طبری نے سب سے پہلے اسی جماعت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ عمدہ میں یہ بھی موجود نہیں ہے۔ کہ امام طبری نے خود کس قول کو اختیار کیا ہے اور فتح میں اس کی تصریح موجود ہے راقم الحروف نے اس مقالے کی شق نمبر ۴ میں يَاْخُذُ مِنْ طُوْلِهَا وَعَرْضِهَا مَا لَمْ يَفْحُشْ کے مسلک پر تفصیل سے گفتگو کی ہے وہاں دیکھ لی جائے۔۔۔۔۔۔ اور اگر کوئی شخص اصرار کرے کہ "قال الآخرون" میں جس قول کا ذکر ہے وہ عطاء کے قول سے علیحدہ ہے دونوں ایک نہیں ہیں تو اسے اس بات پر غور کرنا چاہئے کہ وہ اس مبہم اور محتمل قول سے کیا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس قول میں ایک قوی احتمال اس کا بھی موجود ہے کہ ایک قبضے سے اوپر داڑھی کٹوانے کو فحش کی حد میں داخل کیا جائے تو پھر اس محتمل قول کو اس کے جواز کے لئے بطور دلیل پیش کرنا کس طرح صحیح ہوگا۔

(۳) - غَيْرَ أَنَّ مَعْنَىٰ ذَالِكَ عِنْدِي مَالَمْ يَخْرُجْ مِنْ عُرْفِ النَّاسِ کے سلسلے میں عرض ہے کہ برادرم ملک غلام علی نے یہ بات نظر انداز کر دی ہے کہ اس میں ہمارے زمانے کے لوگوں کا عرف نہیں بیان کیا گیا ہے بلکہ اس زمانے کا عرف بیان کیا گیا ہے جب علماء و مشائخ بالخصوص اور مسلمان عوام بالعموم ڈاڑھی کی مقدار میں بھی اسوۂ نبوی کی پیروی کرتے تھے اور جیسا کہ ابن الہمام کے حوالے سے گزر چکا نویں صدی ہجری تک ایک مشت سے اوپر داڑھی کٹوانا صرف عرفِ عام کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کو جائز ہی نہیں سمجھا جاتا تھا اس لئے عمدۃ القاری میں مذکورہ "عرف الناس" اور مولانا مودودی مدظلہ کے بیان کئے ہوئے عرفِ عام میں بونِ بعید ہے۔

آخر میں ملک صاحب کی خدمت میں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ چونکہ ایک جلیل القدر صحابی رسول اور اعفاء لحیہ کی حدیث کے راوی بھی ہیں۔ اس لئے اصولی طور پر فقہا کی ایک جماعت نے ان کے عمل کی وجہ سے ایک قبضے سے زیادہ مقدار لحیہ کو کٹوانا جائز اور اس کو قدر مسنون کی آخری حد قرار دیا ہے۔ اگر صحابی رسول کے علاوہ کوئی دوسرا ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل اور خلفاء راشدین کی سنت کی روشنی میں اس کا عمل رد کر دیا جاتا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کے عمل کو قدر مسنون کی آخری حد ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک قبضے سے کم مقدار کو کسی امام فقہ نے جائز قرار نہیں دیا اور یہ بات اوپر کئی جگہ آچکی ہے کہ فقہاء و محدثین کی ایک جماعت نے حضرت ابن عمرؓ کے عمل کو بھی تسلیم نہیں کیا اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عموم ہی کی قائل رہی ــــــ پھر ہم اور آپ، اب کس اصول کے تحت یہ استنباط کر سکتے ہیں کہ گالوں سے لگی ہوئی یا ایک ذرا سی مختصر داڑھی بھی مسنون داڑھی ہے۔ کیا واضح دلائل کو چھوڑ کر مَالَمْ يَتَشَبَّهْ بِاَهْلِ الشِّرْكِ جیسے مبہم اقوال سے اس طرح کا استنباط کوئی صحیح استنباط ہو گا؟

چونکہ مغربی تہذیب کے استیلا نے مسلمان معاشرے میں بھی حلق لحیہ کی وبا پھیلادی ہے اس لئے حلقِ لحیہ ترک کر کے اک ذرا سی داڑھی بھی رکھ لینا بڑا کام

ہے اور ایسے شخص کا جذبۂ دینی قابل قدر ہے لیکن یہ کہنا کہ اس نے ارشاد نبوی ؐ کا منشاء پورا کر دیا۔ صحیح نہیں اسے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کرنا چاہئے کہ اس کا یہ عمل سنت نبوی کے مطابق ہو جائے۔

(بشکریہ ماہنامہ "زندگی" رام پور۔ بابت ذیقعدہ ۸۲ھ)

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰی

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ۔

ترجمہ: اور جو کوئی مخالفت کرے رسول ؐ سے، جب کھل چکی اس پر راہ کی بات، اور چلے سب مسلمانوں کی راہ سے الگ، سو ہم اس کو حوالے کریں وہی طرف، جو اس نے پکڑی، اور ڈالیں اس کو دوزخ میں، اور بہت بری جگہ پہنچا۔ (ترجمہ شاہ عبدالقادر ؒ)

ضمیمہ نمبر ۴

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ترجمان القرآن (جلد ۲۹ عدد ۴ شوال ۱۳۶۵ھ مطابق ستمبر ۱۹۴۶ء) کا جو حوالہ نقل کیا گیا تھا اس پر مولانا مودودی کی جماعت کی طرف سے دو اعتراض کئے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ عبارت کا جو ٹکڑا مولانا مودودی کی جانب منسوب کیا گیا ہے وہ عبارت ان کی نہیں بلکہ مولانا امین احسن اصلاحی کے تحریر کردہ اشارات کی ہے۔

دوسرا اعتراض یہ کیا گیا ہے کہ اقتباس کو نقل کرتے ہوئے خیانت اور قطع و برید سے کام لیا ہے۔

پہلے اعتراض کے جواب میں یہ گذارش ہے کہ یہ عبارت مولانا مودودی کے ترجمان القرآن کے اداریے سے لی گئی ہے اور مولانا اپنے رسالہ کے اداریے کے مکمل طور پر ذمہ دار ہیں۔ اگر یہ عبارت مولانا امین احسن اصلاحی یا کسی اور کے قلم سے نکلی ہو تب بھی مولانا مودودی اس کے مندرجات سے سو فیصد متفق ہیں، اس لئے اس عبارت کی ذمہ داری کا پورا بار ان پر ہے، اور "مودودی فکر" پر گفتگو کرتے

ہوئے اس کا حوالہ دینا کسی طرح بھی نا درست قرار نہیں پاتا۔

جہاں تک دوسرے اعتراض کا تعلق ہے کہ عبارت میں قطع و برید اور خیانت سے کام لیا گیا ہے یہ قطعی طور پر غلط دعویٰ ہے۔ اقتباس لینے والے (راقم الحروف) کے بارے میں یہ دعویٰ تو صحیح ہے کہ اس نے ایک طویل عبارت کا ایک بہترین خلاصہ ایک جملے میں نقل کر دیا ہے مگر یہ کتنا بڑی زیادتی ہے کہ اس نے نقل میں خیانت اور قطع و برید سے کام لے کر مصنف کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر دی ہے جو اس کی عبارت سے کسی طرح نہیں نکلتی۔ ذیل میں "اشارات" کی متعلقہ عبارت کا طویل اقتباس بلفظہ نقل کیا جاتا ہے جس سے معلوم ہو گا کہ اشارات کے قلم کار نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جلد بازی سے کام لیتے ہوئے قوم کی تربیت کے "فرض" کو چھوڑ دینے کا الزام لگایا ہے اور پھر ان کے واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ جو داعیِ قوم، موسیٰ علیہ السلام کی طرح صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور تربیت کے لئے جو صبر و انتظار مطلوب ہوتا ہے اس کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے .... الخ

لیجئے اشارات کی عبارت کا پورا اقتباس پڑھئے اور پھر انصاف کیجئے کہ راقم الحروف نے اس طویل عبارت کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے کس خیانت سے کام لیا ہے۔

ترجمان القرآن کے "اشارات" کا مکمل اقتباس ذیل ہے۔

"انبیاء علیہم السلام کے طریق دعوت و تربیت پر غور کرنے سے جماعتی تربیت کے لئے جو اصول مستنبط ہوتے ہیں ان میں سے بعض اہم چیزوں کو ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

۱۔ جماعتی تربیت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم اصول یہ ہے کہ داعی کو تعلیم و دعوت کے کام میں جلد بازی سے احتراز کرنا چاہئے۔ اس کو یہ برابر دیکھتے رہنا چاہئے کہ تعلیم کی جو خوراک اس نے دی ہے وہ اچھی طرح ہضم ہو کر لوگوں کے فکر و عمل کا جز بن گئی یا نہیں؟ اس کا پورا پورا اندازہ کئے بغیر، اگر مزید غذا دے دی گئی تو اس کا نتیجہ صرف فسادِ معدہ اور سوءِ ہضم کی شکل میں ظاہر ہو گا۔ جن لوگوں نے داعیانِ حق کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس بات سے ناواقف نہیں ہیں کہ ہر داعیِ حق سے اس طرح کی جلد بازی کے لئے دو طرفہ مطالبہ ہوتا ہے۔ جو لوگ دعوت کو قبول کر چکے ہوتے ہیں وہ حق کی لذت سے ابھی نئے نئے آشنا ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ نئی نئی آشنائی ان میں حق کی ایسی بھوک پیدا کر دیتی ہے کہ تدریج و ترتیب کا پروگرام ان پر

بہت شاق گزرتا ہے۔ وہ شدتِ شوق بلکہ حرصِ حق میں اس طرح مبتلا ہو جاتے ہیں کہ نہ تو اپنی بھوک اور قوتِ ہضم کا صحیح اندازہ کر پاتے نہ جماعت کے دوسرے کمزوروں کی کمزوری کے ساتھ انہیں کچھ ایسی ہمدردی ہوتی۔ وہ اپنے آپ کو بھی اپنی اصل حیثیت سے زیادہ تولتے ہیں اور اپنے کمزور ساتھیوں کو بھی اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں۔ اس کے سبب سے ان کی طرف سے برابر ھَلْ مِنْ مَّزِیْد کا مطالبہ رہتا ہے۔ ان کے ماسوا دوسرے لوگ جو ابھی دعوت کے مخالف ہوتے ہیں' اور دعوت کے کمزور پہلوؤں کی تلاش میں ہوتے ہیں۔ وہ اگر اس کے پیش کردہ پروگرام میں حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں پاتے، تو یہی مطالبہ شروع کر دیتے ہیں کہ اپنا پورا پروگرام پیش کرو۔ ان کا مقصد محض یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی چیز فوراً سامنے نہ آئی تو وہ لوگوں پر یہ ظاہر کر سکیں گے کہ یہ محض ایک بے مقصد اور مجہول دعوت ہے اس کے آگے نہ کوئی متعین منزلِ مقصود ہے نہ اس منزلِ مقصود تک پہنچنے کا کوئی واضح اور مضبوط پروگرام ہے اور اگر کوئی اسکیم پیش کی گئی تو اس میں کوئی نہ کوئی رخنہ ڈھونڈھ کر لوگوں کو دکھا سکیں گے۔ اور اگر کوئی رخنہ تلاش کے باوجود بھی نہ مل سکا تو اس کو پیدا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ایک سچے داعی حق کے اندر تبلیغِ حق کی ایک خواہش خود ہی دبی ہوئی ہوتی ہے جو اتنی قوی ہوتی ہے کہ اللہ کی بخشی ہوئی حکمت اگر اس کی نگرانی نہ کرے تو صبرو انتظار اور تدریج و ترتیب کے حدود و قیود کی وہ کبھی پابند نہ رہ سکے۔ اس خواہش کو یہ دو طرفہ مطالبہ جب مشتعل کر دیتا ہے تو بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ داعی میانہ روی کی اس روش سے ہٹ جاتا ہے جو اس کے مقصد کی حقیقی کامیابی اور جماعت کی صحیح تربیت کے لئے ضروری ہے۔ ہر چند حق کی صحیح قدر شناسی کا تقاضا یہی ہے کہ اس کے لئے آدمی میں ندیدوں کی سی بھوک ہو جو اسے مضطرب بھی رکھے' بے صبر بھی بنا دے اور جلد بازی پر بھی مجبور کر دے لیکن حق کی قدر شناسی اور محبت کے مطالبہ سے جماعت کی تربیت کا مطالبہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ اس وجہ سے ایک داعی کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان صحیح صحیح توازن قائم رکھے۔ اگر پہلی چیز کا تقاضا اس کو جلد بازی کے لئے بے چین کرے تو چاہئے کہ دوسری چیز کا مطالبہ اس کو انتظار پر مجبور کرے۔ اگر اعلانِ حق کا شوق اور حمایتِ حق کا جذبہ اس کو اکسائے کہ وہ نہ اہلِ شوق کے شوق کو تشنہ چھوڑے نہ معاندین پر اتمامِ حجت میں کوئی کسر باقی رہنے دے۔ تو چاہئے کہ تربیت کے اہتمام کے لئے وہ اس پر بھی نظر رکھے کہ کہیں

شراب قدح و خوار کے ظرف سے زیادہ نہ ہونے پائے۔

جب کبھی ایسا ہوا کہ پہلا جذبہ اس قدر غالب آگیا ہے کہ دوسرے پہلو کی پوری رعایت نہیں ہو سکی ہے تو جماعتی تربیت میں ایسا نقص رہ گیا ہے کہ بعد میں اس کی تلافی نہیں ہو سکی ہے۔ اسی رخنہ سے شیطان نے جماعت کے اندر گھس کر انڈے بچے دے دیئے اور پھر اس کے پھیلائے ہوئے فتنوں کی لپیٹ میں پوری جماعت آگئی۔ اس کی سب سے زیادہ عبرت انگیز مثال ہم کو بنی اسرائیل کی تاریخ میں ملتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے نکل کر سینا میں پہنچے تو اللہ تعالیٰ نے ان کو احکامِ شریعت سے آگاہ کرنے کے لئے طور پر بلایا اور اس کے لئے ایک خاص دن معین فرما دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس معین دن سے پہلے ہی طور پر پہنچ گئے۔ ان کے اندر اللہ کے احکام معلوم کرنے اور اس کی رضا طلبی کا جو جوش و جذبہ تھا اولاً تو وہ خود ہی اتنا قوی تھا کہ باریابی کا اشارہ پانے کے بعد وقت اور تاریخ کی پابندیاں اس پر شاق تھیں۔ ثانیاً قوم کی طرف سے ہر قدم پر جو مطالبے پر مطالبے ہو رہے تھے اس سے بھی اس جذبہ کو تحریک ہوئی ہو گی۔ اگرچہ یہ جذبہ نہایت اعلیٰ اور محمود جذبہ تھا اور طُور پر معین وقت سے پہلے پہنچ جانا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ اللہ کے احکام معلوم کرنے کے لئے نہایت بے چین اور مضطرب دل رکھتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ کا ایک دوسرا قابلِ اعتراض پہلو بھی تھا، جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نظر نہیں گئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فوراً بلانے کے بجائے ان کے لئے جو ایک خاص وقت مقرر کیا تو اس سے منشائے الٰہی یہ تھا کہ یہ وقفہ وہ قوم کی تربیت میں صرف کریں اور جن اصولی باتوں کی ان کو تعلیم دی جا چکی ہے اس کو اچھی طرح ان کے اندر پختہ کریں تاکہ آزمائشوں اور فتنوں میں پڑنے کے بعد بھی وہ اپنے ایمان و اسلام کو سلامت رکھ سکے۔ لیکن اللہ کے مزید احکام معلوم کرنے کا شوق ان پر اس قدر غالب آگیا کہ تربیت کی اہمیت کا احساس اس کے مقابل میں دب گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دین کے دشمنوں نے ان کی اس غیر حاضری اور قوم کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا اور قوم کے ایک بڑے حصہ کو گوسالہ پرستی میں مبتلا کر دیا اور اس کی ساری ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عجلت پسندی پر ڈالی۔ جو ہرچند تعلیم و دعوت کی راہ میں تھی لیکن تربیت کی ذمہ داریوں سے غافل کرنے والی ثابت ہوئی۔ چنانچہ قرآن مجید نے ان کی اس عجلت اور اس کے انجام کا

ذکر ان الفاظ میں کیا ہے۔

" اور تم قوم کو چھوڑ کر (اے موسیٰ) وقت مقرر سے پہلے کیوں چلے آئے؟ انہوں نے کہا۔ وہ میرے پیچھے ہیں اور میں تیرے پاس اے پروردگار اس لیے جلدی چلا آیا کہ تیری خوشنودی حاصل کروں۔ فرمایا تو جاؤ ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے چلے آنے کے بعد فتنہ میں ڈالدیا اور سامری نے ان کو گمراہ کر ڈالا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ ایک داعی کا جس طرح یہ فرض ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے احکام وقوانین سے آگاہ کرے اسی طرح اس کا یہ بھی فرض ہے کہ پورے اہتمام کے ساتھ لوگوں کی تربیت بھی کرے تاکہ اس کی تعلیم لوگوں کے فکروعمل کے اندر اس طرح راسخ ہو جائے کہ سخت سے سخت آزمائش میں بھی ان پر اس کی گرفت قائم رہ سکے۔ جو داعی صرف تعلیم کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور اس چیز کا شوق اس پر اس قدر غالب ہو جاتا ہے کہ تربیت کے لیے جو صبروانتظار مطلوب ہے اس کا حق ادا نہیں کرسکتا اس کی مثال اس جلد باز فاتح کی ہے جو اپنے اقتدار کے استحکام کی فکر کیے بغیر مارچ کرتا ہوا بڑھا چلا جارہا ہے۔ اس طرح کی جلد بازی کا نتیجہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ایک طرف وہ فتح کرتا ہوا آگے بڑھے گا دوسری طرف اس کے مفتوحہ علاقہ میں جنگل کی آگ کی طرح بغاوت پھیلے گی۔

سورۃ طٰہٰ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی اس سبق آموز مثال کو پیش کر کے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس عجلت پر گرفت فرمائی ہے جو آپ کے اندر احکامِ الٰہی معلوم کرنے کے لیے تھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنے فطری شوق علم اور قوم کی جلد بازی کی وجہ سے چاہتے تھے کہ وحی الٰہی جلد جلد نازل ہو تاکہ آپ اپنے شوقِ علم کو بھی تسلی دے سکیں اور قوم کے مطالبہ کو بھی پورا کرسکیں۔

(ترجمان القرآن ۱۹۴۶ء)

نظر ثانی کے وقت ہفت روزہ ایشیا کا مطلوبہ شمارہ دستیاب نہ ہو سکا۔ یہی مضمون تفہیم القرآن سورۂ تحریم میں مفصل موجود ہے۔ اس لئے بطور ضمیمہ شامل کردیا

مناسب خیال کیا۔

"اس کے آگے کا قصہ ہم نے چھوڑ دیا ہے جس میں حضرت عمرؓ نے بتایا ہے کہ دوسرے روز صبح حضورؐ کی خدمت میں جا کر انہوں نے کس طرح حضورؐ کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ اس قصے کو ہم نے مسند احمد اور بخاری کی روایات جمع کر کے مرتب کیا ہے۔ اس میں حضرت عمرؓ نے مراجعت کا لفظ جو استعمال کیا ہے اسے لغوی معنی میں نہیں لیا جا سکتا بلکہ سیاق و سباق خود بتا رہا ہے کہ یہ لفظ دو بدو جواب دینے کے معنی میں استعمال ہوا ہے اور حضرت عمر کا اپنی بیٹی سے یہ کہنا کہ لَا تُرَاجِعِی رسولَ اللہ صاف طور پر اس معنی میں ہے کہ حضور سے زبان درازی نہ کیا کر۔ اس ترجمے کو بعض لوگ غلط کہتے ہیں اور ان کا اعتراض یہ ہے کہ مراجعت کا ترجمہ پلٹ کر جواب دینا' دو بدو جواب دینا تو صحیح مگر اس کا ترجمہ زبان درازی صحیح نہیں ہے۔ لیکن یہ معترض حضرات اس بات کو نہیں سمجھتے کہ اگر کم مرتبے کا آدمی اپنے سے بڑے مرتبے کے آدمی کو پلٹ کر جواب دے یا دو بدو جواب دے تو اسی کا نام زبان درازی ہے۔ مثلاً باپ اگر بیٹے کو کسی بات پر ڈانٹے یا اس کے کسی فعل پر ناراضی کا اظہار کرے اور بیٹا اس پر ادب سے خاموش رہنے یا معذرت کرنے کے بجائے پلٹ کر جواب دینے پر اتر آئے تو اس کو زبان درازی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ پھر جب یہ معاملہ باپ اور بیٹے کے درمیان نہیں بلکہ اللہ کے رسول اور امت کے کسی فرد کے درمیان ہو تو صرف ایک غبی آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا نام زبان درازی نہیں ہے۔

بعض دوسرے لوگ ہمارے اس ترجمے کو سوءِ ادب قرار دیتے ہیں' حالانکہ یہ سوءِ ادب اگر ہو سکتا تھا تو اس صورت میں جب کہ ہم اپنی طرف سے اس طرح کے الفاظ حضرت حفصہؓ کے متعلق استعمال کرنے کی جسارت کرتے۔ ہم نے تو حضرت عمرؓ کے الفاظ کا صحیح مفہوم ادا کیا ہے اور یہ الفاظ انہوں نے اپنی بیٹی کو اس کے قصور پر سرزنش کرتے ہوئے استعمال کئے ہیں۔ انسے سوءِ ادب کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یا تو باپ اپنی بیٹی کو ڈانٹتے ہوئے بھی ادب؟ سے بات کرے' یا پھر اس کی ڈانٹ کا ترجمہ کرنے والا اپنی طرف سے اس کو با ادب کلام بنا دے۔

اس مقام پر سوچنے کے قابل بات دراصل یہ ہے کہ اگر معاملہ صرف ایسا ہی ہلکا

اور معمولی سا تھا کہ حضور کبھی اپنی بیویوں کو کچھ کہتے تھے اور وہ پلٹ کر جواب دے دیا کرتی تھیں تو آخر اس کو اتنی اہمیت کیوں دی گئی کہ قرآن مجید میں اللہ تعالی نے براہِ راست خود ان ازواج مطہرات کو شدت کے ساتھ تنبیہ فرمائی ؟ اور حضرت عمرؓ نے اس معاملہ کو اتنا سخت سمجھا کہ پہلے بیٹی کو ڈانٹا اور پھر ازواج مطہرات میں سے ایک ایک کے گھر جا کر ان کو اللہ کے غضب سے ڈرایا ۔ اور سب سے زیادہ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا آپ کے خیال میں ایسے ہی زود رنج تھے کہ ذرا ذرا سی باتوں پر بیویوں سے ناراض ہو جاتے تھے ۔ اور کیا معاذ اللہ آپ کے نزدیک حضورؐ کی تنگ مزاجی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ ایسی ہی باتوں پر ناراض ہو کر آپ ایک دفعہ سب بیویوں سے مقاطعہ کر کے اپنے حجرے میں عزلت گزیں ہو گئے تھے ؟ ان سوالات پر اگر کوئی شخص غور کرے تو اسے لا محالہ ان آیات کی تفسیر میں دو ہی راستوں میں سے ایک کو اختیار کرنا پڑے گا ۔ یا تو اسے ازواج مطہرات کے احترام کی اتنی فکر لاحق ہو کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر حرف آجانے کی پرواہ نہ کرے ۔ یا پھر سیدھی طرح یہ مان لے کہ اس زمانہ میں ان ازواج مطہرات کا رویہ فی الواقع ایسا ہی قابل اعتراض ہو گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر ناراض ہو جانے میں حق بجانب تھے اور حضور سے بڑھ کر خود اللہ تعالی اس بات میں حق بجانب تھا کہ ان ازواج کو اس رویہ پر شدت سے تنبیہ فرماتا ۔ (تفہیم القرآن ج ٦ ص ۲۴-۲۶)



وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ

اختلافِ اُمّت اور صراطِ مستقیم

فروعی مسائل میں مسلکِ اعتدال

حصّہ دوم ○ مع ضمائم

فروعی مسائل میں نوعیتِ اختلاف کی وضاحت اور مسلکِ اعتدال کی نشاندہی
نیز فاتحہ خلف الامام، آمین، رفع یدین، ترجیع اذان، افرادِ اقامت،
تکبیراتِ عیدین، سجدۂ سہو، مسائلِ وتر، نمازِ جنازہ اور جمعہ فی القریٰ وغیرہ چند
مسائل میں حنفیہ کے موقف کی مدلل تشریح



مرتبہ
محمد یوسف لدھیانوی

○

مکتبۂ مدنیہ
۱۷۔ اُردو بازار لاہور
فون: ۷۲۲۸۹۷۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی : اَمَّا بَعْدُ

قریباً ایک سال پہلے میرے ایک محترم بزرگ نے جناب سید زاہد علی صاحب مقیم ابوظہبی کا ایک سوالنامہ، جو چند فقہی مسائل سے متعلق تھا۔ عنایت کرتے ہوئے جواب کا تقاضا فرمایا۔ سوالات پر ایک نظر ڈال کر میں نے جواب سے معذرت کر دی۔ کیونکہ ائمہ مجتہدین کے درمیان مختلف فیہ مسائل پر لکھنے کے لئے اس ناکارہ کی طبیعت چند وجوہ سے آمادہ نہیں ہوتی:

۱۔ یہ تو ظاہر ہے کہ طالب علموں کو اس شکستہ تحریر کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان کے سامنے علم کے دفاتر موجود ہیں۔ جہاں تک عوام کا سوال ہے۔ ان کو دلائل کی نہیں، بلکہ عمل کرنے کے لئے مسائل کی ضرورت ہوتی ہے، انہیں تو صاف اور منقح شکل میں مسئلہ سمجھا دینا چاہئے۔ دلائل کی قیل وقال ان کے لئے اکثر و بیشتر ناقابل فہم اور موجب تشویش ہوتی ہے۔ اور اس سے ان کی عملی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔

۲۔ فقہا کے اختلافی مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے آدمی کا اعتدال پر قائم رہنا بہت مشکل ہے۔ اندیشہ رہتا ہے کہ خدانخواستہ افراط و تفریط نہ ہو جائے اور کوئی بات خدا و رسول کی رضا کے خلاف زبان و قلم سے نہ نکل جائے۔ جو دنیا و آخرت کے خسران کا سبب ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

مَاضَلَّ قَوْمٌ بَعْدَ هُدًى كَانُوا عَلَيْهِ إِلَّا أُوتُوا الْجَدَلَ (ابن ماجہ)

ترجمہ:۔ نہیں گمراہ ہوتی کوئی قوم ہدایت کے بعد مگر ان کو جھگڑے میں ڈال دیا جائے۔

۳۔ پھر یہ مسائل صدر اول سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں۔ اور ان پر دور اول سے آج تک اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ مزید کچھ لکھنا محض اضاعت وقت معلوم ہوتا ہے۔

۴۔ پھر اس سے بھی شرم آتی ہے کہ آدمی ایک ایسے پر فتن دور میں جب کہ اسلام کے قطعی و بنیادی مسائل میں تشکیک کا سلسلہ جاری ہے اور قلوب سے ایمان ہی رخصت ہوتا جا رہا ہے، ان فروعی مسائل کو نزاع و جدال اور بحث و گفتگو کا موضوع بنا کر ان پر خامہ فرسائی کرنے بیٹھ جائے، اور موجودہ دور کے اہم فتنوں سے صرف نظر کر لے۔

۵۔ پھر یہ فروعی مسائل انہی بارہ تیرہ مسئلوں تک محدود نہیں۔ بلکہ اس نوعیت کے ہزاروں

مسائل ہیں۔ اب اگر ان فروعی مسائل پر بحث وتمحیص اور سوال وجواب کا دروازہ کھول دیا جائے تو اس غیر ضروری اور غیر مختتم سلسلہ کے لئے عمر نوح بھی کافی نہ ہوگی۔ دوسرے تمام ضروری مشاغل معطل ہوکر رہ جائیں گے۔

ان تمام معذرتوں کے باوجود میرے محترم بزرگ کا تقاضا جاری رہا۔ اور انہوں نے فرمایا کہ مراسلہ نگار کو بہت اصرار ہے کہ ان کے سوالوں کا جواب ضرور لکھ دیا جائے ____ چنانچہ اسی اصرار وانکار میں مہینے گزر گئے۔ اور سوالات کا مسودہ بھی میرے کاغذات میں گم ہوگیا لیکن ان کا اصرار پھر بھی جاری رہا۔ اور سوالنامہ کی فوٹو اسٹیٹ کاپی مجھے دوبارہ مہیا کی گئی۔ اس لئے حق تعالیٰ شانہ سے استخارہ کرنے کے بعد اسی سے مدد طلب کرتے ہوئے، بعجلت تمام جو کچھ سمجھ میں آیا قلم برداشتہ لکھ دیا۔ اکثر حصوں کی کتابت سے پہلے دوبارہ دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی، حق تعالیٰ شانہ اس کو قبول فرماکر اپنی رضا کا وسیلہ بنائیں۔ اور اس میں میرے نفس کی جو آمیزش ہوگئی ہو اس کو معاف فرمائیں۔

أَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وَأَتُوبُ إِلَيْهِ۔ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ إِلَّا بِاللهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ، وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ۔

محمد یوسف لدھیانوی

علامہ بنوری ٹاؤن ○ کراچی

۱۴۰۲/۶/۱۶ھ

سوالنامہ

۱۔ متفق علیہ کی احادیث اگر دیگر کتب میں موجود کسی حدیث سے متصادم ہوں تو کسے اختیار کرنا چاہئے۔

۲۔ قرآن کریم کی کوئی آیت اگر قوی حدیث نبویؐ سے متصادم ہو تو کسے اختیار کرنا چاہئے۔

(مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے "جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو" اور حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورۃ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ پڑھ لو۔ یہ پڑھنا امام کی آیت پر سکتہ کی حالت میں یا کہ امام کی سورۃ فاتحہ تلاوت کرنے کے بعد یا ساتھ ساتھ یا نہ پڑھے۔ یا حدیث کے مطابق جس کا مفہوم ہے جو "فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی"۔ اگر امام کا ہی فاتحہ تلاوت کرنا کافی ہے پھر دیگر ارکان کے لئے مقتدی کا اعادہ کیوں ضروری ہے جیسے ثناء تسبیحات، تشہد درود وغیرہ

۳۔ متفق علیہ کی حدیث میں اذان کے کلمات جفت اور اقامت طاق پڑھنے کا ذکر موجود ہے یا یہ کہ اگر اذان ترجیع دی جائے تو اقامت جفت کہی جائے تو سوال یہ ہے کہ اذان واقامت دونوں جفت کہی جاتی ہیں کس دلیل سے؟ بحوالہ کتب احادیث وضاحت فرمائیں۔ ساتھ ہی صحت کے اعتبار سے کون سی اذان واقامت بہتر ہے؟

۴۔ تحقیق طلب یہ سوال ہے کہ مرد عورت کی نماز کی ہیئت (ظاہری شکل) مختلف کیوں ہے مثلاً مرد کا کانوں تک تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھانا اور عورت کا کاندھے تک۔ مرد کا زیر ناف دونوں ہاتھوں کا باندھنا اور عورت کا سینے پر، مرد کا سجدہ کی حالت میں دونوں کہنیوں کا زمین سے کچھ اوپر اٹھائے رکھنا اور عورت کا زمین پر بچھا دینا جب کہ صحیح بخاری کی حدیث کے مطابق زمین پر کہنیوں کو بچھانے پر کتے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جلسہ استراحت میں مردوں کو دائیں پاؤں کے انگوٹھے کے بل اور بائیں پاؤں کے کروٹ پر پھیلا کر بیٹھنا اور عورت کو دونوں پاؤں پھیلا کر بیٹھنا۔ یہ تفریق

طریقہ نماز میں کس نے واضح کی۔ کیا حیات طیبہ نبویؐ میں عورت اور مرد کی نماز میں یہ تفریق تھی؟ اگر تھی تو احادیث مبارکہ اور آثار اصحاب سے دلیل دیں

۵۔ نماز کے اندر امام کے پیچھے الفاتحہ پڑھنے سے اور آمین کا امام و مقتدی کو جہری نماز میں جہر سے کہنے سے کس نے منع کیا۔ جب کہ واضح احادیث و آثار اصحاب سے ہے۔ اگر منسوخ ہو چکا ہے تو قول اور صحت والی احادیث اور آثار اصحاب سے دلیل دیں۔

۶۔ رفع الیدین صحاح ستہ سے کثرت سے اصحاب رسولؐ روایت کرتے ہیں جن کی تعداد تقریباً دس سے زائد ہے۔ بعض پچاس سے بھی زائد کہتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ احناف اس سنت کو ترک کر رہے ہیں۔ اور اپنانے سے ہچکچاتے ہی نہیں نماز کو فاسد بھی قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ حکم بھی منسوخ ہے تو مدلل ثبوت کم از کم تین اصحابؓ رسولؐ سے (جو راوی کے اعتبار سے معتبر سمجھے جاتے ہیں) واضح فرمائیں۔

۷۔ سجدہ سہو جو عام رائج ہے۔ داہنی جانب ایک سلام پھیر کر دو سجدے کرنے کا۔ یہ کس دلیل پر بنیاد ہے؟ جب کہ متفق علیہ کی احادیث سے صاف اور واضح ثبوت ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سہو ہونے پر اس وقت سجدہ سہو کیا جب نماز اپنے آخری مرحلہ سے گزر رہی تھی یعنی قریب سلام پھیرنے کے تھے جب آپ نے دو سجدے کئے۔ اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ ایک سلام پھیرنے (تشہد کے بعد) اور پھر دوبارہ تشہد درود پڑھنے کا کیا ثبوت ہے۔

۸۔ وتر کی نماز میں دو رکعات پر تشہد پڑھنے کے لئے بیٹھنا اور آخری یعنی تیسری رکعت میں فاتحہ اور سورۃ کی تلاوت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھانا اور پھر نیت باندھ کر قنوت پڑھنا کس دلیل سے ثابت ہے واضح فرمائیں۔ جب حضرت عائشہ صدیقہؓ سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے تین، پانچ سات رکعات وتر پڑھے تو تشہد کے لئے دو رکعات پر نہ بیٹھتے بلکہ آخری رکعت ہی پر صرف بیٹھتے تھے۔ ان ہی سے ایک رکعت وتر بھی ثابت ہے۔ اسی ضمن میں وضاحت مطلوب ہے کہ قنوت دونوں ہاتھ دعا کی طرح

اٹھا کر پڑھیں یا ہاتھ باندھ کر پڑھیں۔ احادیث نبویؐ سے کوئی ثبوت دے کر آگاہ فرمائیں۔

۹۔ نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ حدیث نبویؐ سے ثابت ہے یا کہ نہیں۔ اگر نہیں تو دلیل تحریر فرمائیں جب کہ حدیث مبارک کا مفہوم کہ سورۃ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔

۱۰۔ عیدین کی نماز میں چھ تکبیر زائد ہیں یا بارہ اگر دونوں ثابت ہیں تو راویوں کی کثرت کس طرف استدلال کرتی ہے اور یہ تکبیریں اول رکعت میں فاتحہ اور سورۃ پڑھنے سے قبل ہیں یا بعد میں۔ اسی طرح دوسری رکعت میں سورۃ پڑھنے کے بعد ہیں یا قبل؟

۱۱۔ نماز کے لئے اقامت ہو چکی ہو تو قریب کوئی نماز نہیں ہوتی پھر کیوں لوگ فجر کی سنت اس وقت پڑھنے لگتے ہیں جب کہ فرض نماز شروع ہو رہی ہے۔ حدیث نبویؐ کی رو سے نماز نہیں ہوئی؟ رہا یہ جب کہ مسجد کے کسی گوشے میں پڑھ لینا۔ تو کیا امام کی قرات کی آواز کانوں سے نہیں ٹکراتی ہے؟

۱۲۔ احناف کے نزدیک نماز کے دوران سورۃ فاتحہ اور دوسری سورۃ کے درمیان اتنا وقفہ ہو جائے کہ تین مرتبہ سبحان اللہ کہا جا سکے تو سجدہ سہو لازم آجاتا ہے۔ اس کی کیا دلیل ہے؟

۱۳۔ مرد کے لئے ستر عورت ناف سے گھٹنے تک بتلایا جاتا ہے اس کے لئے کن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے جب کہ بخاری میں حضرت انسؓ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنگ خیبر میں) اپنی ران کھولی۔ زید بن ثابت نے کہا اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر (قرآن) اتارا اور آپ کی ران میری ران پر تھی۔ وہ اتنی بھاری ہو گئی۔ میں ڈرا کہیں میری ران ٹوٹ جاتی ہے۔ امام بخاریؒ نے استدلال کیا اگر ران عورت ہوتی تو آپؐ زید کی ران پر اپنی ران نہ رکھتے۔ بخاری شریف میں انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر جہاد کیا۔ ہم لوگوں نے صبح کی نماز اندھیرے منہ خیبر کے قریب پہنچ کر پڑھی پھر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے۔ اور میں ابو طلحہ ؓ کے پیچھے ایک ہی سواری پر بیٹھا تھا۔ آنحضرت ؐ نے خیبر کی گلیوں میں اپنا جانور دوڑایا اور (دوڑتے میں) میرا گھٹنہ آنحضرت ؐ کی ران سے چھو جاتا آپ ؐ نے اپنی ران سے تہ بند ہٹادی (ران کھول دی) یہاں تک کہ آپ کی ران کی سفیدی (اور چمک) دیکھنے لگا۔

والسلام

احقر سید زاہد علی۔ حال مقیم ابو ظہبی ۲/۷/۱۸

الجواب

سوالنامے کے ایک ایک نکتہ پر غور کرنے سے پہلے بطور تمہید چند امور عرض کر دینا مناسب ہے

۱۔ اجتہادی و فروعی مسائل میں اختلاف سنت و بدعت کا اختلاف نہیں :۔

سوالنامہ میں جو مسائل ذکر کیے گئے ہیں۔ وہ اعتقادی و نظریاتی نہیں۔ بلکہ فروعی اجتہادی ہیں، فروعی مسائل میں اختلاف مذموم نہیں۔ بلکہ اس نوعیت کا اختلاف حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان بھی رہا ہے ظاہر ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب حق و ہدایت پر تھے اور قرآن کریم نے نہ صرف ان کو، بلکہ ان کی پیروی کرنے والوں کو بھی رضا و مغفرت کا ابدی پروانہ عطا فرمایا ہے، چنانچہ سورۃ توبہ آیت نمبر ۱۰۰ میں ارشاد ہے:

وَالسَّابِقُوْنَ الاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ۔ (سورۃ توبہ آیت نمبر ۱۰۰)

ترجمہ:۔ اور جو لوگ قدیم میں سب سے پہلے ہجرت کرنے والے اور مدد کرنے والے اور جو لوگ ان کے پیرو ہوئے نیکی کے ساتھ، اللہ راضی ہوا ان سے اور وہ راضی ہوئے اس سے اور تیار کر رکھے ہیں واسطے ان کے باغ کہ بہتی ہیں نیچے ان کے نہریں رہا کریں انہی میں ہمیشہ۔ یہی ہے بڑی کامیابی۔ (ترجمہ حضرت شیخ الہندؒ)

پس جو امور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان متفق علیہ تھے وہ بعد کی امت کے حق میں حجت قطعیہ ہیں۔ اور کسی کو ان کے خلاف کرنا جائز نہیں۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا (النساء : ۱۱۵)

ترجمہ:۔ اور جو شخص رسول (مقبول صلی اللہ علیہ وسلم) کی مخالفت کرے گا بعد اس کے اس کو امر حق ظاہر ہو چکا تھا اور مسلمانوں کا (دینی) راستہ چھوڑ کر دوسرے راستہ ہو لیا تو ہم اس کو (دنیا میں) جو کچھ وہ کرتا ہے کرنے دیں گے اور (آخرت میں) اس کو جہنم میں داخل کریں گے اور بری جگہ ہے جانے کی۔

(ترجمہ حضرت تھانویؒ)

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کے ساتھ ساتھ "سبیل

المومنین " سے انحراف پر وعید فرمائی گئی ہے جس سے واضح ہوجاتا ہے کہ اطاعت رسول ؐ اور اتباع "سبیل المومنین " دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی علامت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے راستے کا اختیار کرنا ہے اور صحابہ کرام ؓ کے راستہ سے انحراف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت ہے۔ پس جو شخص صحابہ کرام ؓ کے اجماعی اور متفق علیہ مسائل سے انحراف کرے گا وہ شقاق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتکب اور "نولہ ماتولی ونصلہ جہنم" کی سزا کا مستوجب ہوگا۔

اور جن مسائل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلاف ہوا اس میں علماء کے دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ ہر فریق عند اللہ مصیب ہے۔ دوم یہ کہ ایک فریق مصیب ہے اور دوسرا خطاء پر۔ تاہم اس پر اہل علم کا اتفاق ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے درمیان ہدایت و ضلالت یا سنت و بدعت کا اختلاف نہیں تھا۔ بلکہ ان کا اختلاف حق و ہدایت ہی کے دائرے میں ہے اور ان میں سے ہر فریق اپنے اپنے فہم و اجتہاد کے مطابق حق تعالیٰ شانہ کی رضا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت میں کوشاں تھا۔ جو مسائل ان اکابر کے درمیان مختلف فیہ رہے ان میں بعد کے مجتہدین کو یہ غور کرنے کا تو حق ہے کہ ان میں سے کس کا قول راجح ہے اور کس کا مرجوح، لیکن یہ حق کسی کو نہیں کہ ان میں سے کسی کو بدعت و ضلالت کی طرف منسوب کرے۔ اسی طرح ان کے اقوال سے خروج کا بھی کسی کو حق نہیں کہ ان کے تمام اقوال کو چھوڑ کر کوئی نیا قول ایجاد کر لیا جائے۔

حافظ سیوطی ؒ نے الجامع الصغیر (ص ۲۹ ج ۲) میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے یہ حدیث نقل کی ہے:

سَأَلْتُ رَبِّي فِيمَا تَخْتَلِفُ فِيهِ أَصْحَابِي مِنْ بَعْدِي. فَأَوْحَى إِلَيَّ يَا مُحَمَّدُ! إِنَّ أَصْحَابَكَ عِنْدِي بِمَنْزِلَةِ النُّجُومِ فِي السَّمَاءِ بَعْضُهَا أَضْوَأُ مِنْ بَعْضٍ فَمَنْ أَخَذَ بِشَيْءٍ مِمَّا هُمْ عَلَيْهِ مِنْ اخْتِلَافِهِمْ فَهُوَ عِنْدِي عَلَى هُدًى (السجزی فی الابانۃ، وابن عساکر و رقم لہ السیوطی بالضعف)

ترجمہ:۔ اپنے بعد اپنے اصحاب کے اختلاف کے بارے میں میں نے اپنے رب سے سوال کیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی فرمائی کہ اے محمد! بے شک آپ ؐ کے اصحاب میرے نزدیک بمنزلہ آسمان کے ستاروں کے ہیں، ان میں سے بعض، بعض سے زیادہ روشن ہیں، پس جس شخص نے ان کے اختلاف کی صورت میں ان میں سے کسی کے طریقہ کو اختیار کر لیا۔ وہ میرے نزدیک ہدایت پر ہے۔

یہ حدیث سند کے لحاظ سے کمزور ہے۔ مگر اس کا مضمون متعدد احادیث کے علاوہ قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت سے بھی موید ہے اسی بنا پر تمام اہل حق اس پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت میں کوئی فرد ــــ نعوذ باللہ ــــ گمراہ یا بدعتی نہیں تھا۔ بلکہ مختلف فیہ مسائل میں وہ سب اپنی اپنی جگہ حق پر تھے۔ اور اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق ماجور تھے۔

۲۔ بیشتر اجتہادی و فروعی اختلاف صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے سے چلا آتا ہے

سوال نامہ میں جن مسائل کے بارے میں دریافت کیا گیا ہے وہ (اور اس قسم کے اور بہت سے مسائل) صدر اول سے اسی طرح مختلف فیہ چلے آتے ہیں۔ جیسا کہ ہر مسئلہ کے ذیل میں معلوم ہو گا۔ جو مسئلہ صدر اول سے مختلف فیہ چلا آرہا ہو اس میں اختلاف کا مٹا دینا کسی کے لئے ممکن نہیں، مگر چونکہ ایسے مسائل میں سنت و بدعت یا حق و باطل کا اختلاف نہیں اس لئے جو موقف کسی کے نزدیک راجح ہو اس کو اختیار کر سکتا ہے۔ اور قرآن کریم۔ سنت نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰت والتسلیمات) اور صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل کی روشنی میں اپنے موقف کی ترجیح کے دلائل بھی پیش کر سکتا ہے لیکن کسی ایک فریق کا اپنے موقف کو قطعی حق سمجھنا اور فریق مخالف کے موقف کو قطعی باطل اور بدعت و ضلالت کہنا درست نہیں۔ کیونکہ اس سے ان تمام اکابر امت صحابہؓ و تابعینؒ کی تضلیل لازم آتی ہے۔ جنہوں نے یہ موقف اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ اسے عقلاً و شرعاً درست نہیں کہا جا سکتا۔

فروعی مسائل میں کم از کم اتنی کشادہ ذہنی اور فراخ قلبی تو ہونی چاہئے کہ ہم اپنے موقف کو صواب سمجھتے ہوئے فریق مخالف کے قول کو خطا اجتہادی سمجھ کر اسے معذور و ماجور تصور کریں. مثلاً اگر ایک شخص کا خیال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی: "لاصلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحۃ الکتاب". امام، مقتدی اور منفرد سب کو عام ہے۔ تو اسے اپنے اس موقف کو درست سمجھتے ہوئے اپنی حد تک سختی سے اس پر عمل کرنا چاہئے اور جو اکابر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی:

"مَنْ صَلّٰی خَلْفَ الْإِمَامِ فَقِرَاءَةُ الْإِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ"۔

ترجمہ:۔ جس نے امام کے پیچھے نماز پڑھی تو امام کی قرائت اس کے لئے قرائت ہے۔

کے پیش نظر اول الذکر حدیث کو مقتدی سے متعلق نہیں سمجھتے۔ بلکہ ارشاد ربانی:

"وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَأَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ"۔

ترجمہ:۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ اور خاموش رہو۔ تاکہ تم پر رحم کیا جائے

اور ارشاد نبوی ؐ:

" وَاِذَا قَرَاءَ فَانْصِتُوْا "

ترجمہ:۔ اور جب امام قرائت کرے تو تم خاموش رہو۔

کے مطابق مقتدی کے لئے قراۃ کو ممنوع کہتے ہیں. آپ ان سے اتفاق کرنے کے لئے تیار نہیں تو نہ کیجئے۔ لیکن ان کو حدیث کے مخالف و تارک تو نہ کہئے۔ ورنہ اس سے جنگ و جدال کا منحوس دروازہ کھلے گا۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ حدیث. "لاصلوٰۃ الابفاتحۃ الکتاب" کے مطابق فاتحہ مقتدی کے ذمہ بھی فرض ہے۔ اور اس کے بغیر— اس کی نماز نہیں ہوتی بلاشبہ آپ کو اسی کے مطابق عمل کرنا چاہئے۔ لیکن آپ کا یہ اجتہاد دوسروں پر حجت نہیں ہو سکتا۔ اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہے کہ محض اپنے اجتہاد کی بنا پر صحابہ ؓ و تابعین ؒ اور ائمہ ہدیٰ ؒ کی نمازوں کے باطل ہونے کا فتویٰ صادر فرمائیں۔ کیونکہ صدر اول میں کوئی شخص بھی اس کا قائل نہیں تھا کہ فاتحہ خلف الامام کے بغیر نماز باطل ہے۔ اس کی بحث تو انشاء اللہ سوال دوم کے ذیل میں آئے گی لیکن اس تمہیدی بحث میں امام سنت امام احمد بن حنبل ؒ کا حوالہ ذکر کر دینا مناسب ہو گا۔

موفق ابن قدامہ الحنبلی "المغنی" میں لکھتے ہیں:

قَالَ اَحْمَدُ مَا سَمِعْنَا اَحَدًا مِنْ اَهْلِ الْاِسْلَامِ يَقُوْلُ اَنَّ الْاِمَامَ اِذَا جَهَرَ بِالْقِرَاءَةِ لَا تُجْزِئُ صَلٰوةُ مَنْ خَلْفَهٗ اِذَا لَمْ يَقْرَأْ. وَقَالَ هٰذَا النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهٗ وَالتَّابِعُوْنَ. وَهٰذَا مَالِكٌ فِىْ اَهْلِ الْحِجَازِ وَهٰذَا الثَّوْرِىُّ فِىْ اَهْلِ الْعِرَاقِ وَهٰذَا الْاَوْزَاعِىُّ فِىْ اَهْلِ الشَّامِ وَهٰذَا اللَّيْثُ فِىْ اَهْلِ الشَّامِ وَهٰذَا اللَّيْثُ فِىْ اَهْلِ مِصْرَ مَا قَالُوْا لِرَجُلٍ صَلّٰى وَقَرَاَ اِمَامُهٗ وَلَمْ يَقْرَاْ هُوَ صَلٰوتُكَ بَاطِلَةٌ الخ (ص ۵۶۴ ج ۱)

ترجمہ:۔ امام احمد ؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کا یہ قول نہیں سنا کہ جب امام قرائت کرے تو مقتدی کی نماز صحیح نہیں ہوگی جب تک کہ وہ خود قرائت نہ کرے امام احمد ؒ نے فرمایا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ؐ کے صحابہ ؓ و تابعین ؒ ہیں۔ اور یہ اہل حجاز میں امام مالک ؒ ہیں۔ یہ اہل عراق میں امام ثوری ؒ ہیں. یہ اہل شام میں امام اوزاعی ؒ ہیں۔ یہ اہل مصر میں امام لیث ؒ ہیں۔ ان میں سے کسی نے یہ فتویٰ نہیں دیا کہ جب امام قرائت کرے اور مقتدی قرات نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل ہے۔

امام احمدؒ کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے لیکر امام مالکؒ امام سفیان ثوریؒ، امام اوزاعیؒ اور امام لیث بن سعدؒ تک کوئی شخص بھی یہ فتویٰ نہیں دیتا تھا کہ اگر مقتدی امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھے تو اس کی نماز باطل ہے۔

بلاشبہ سری نمازوں میں یا جہری نمازوں کے سکتات میں بعض سلف قرائت فاتحہ کے جواز بلکہ استحباب کے بھی قائل رہے ہیں۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ ان تمام لوگوں کی نماز ہی سرے سے باطل ہے جو امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھتے کیسا خطرناک دعویٰ ہے۔ جس کی تکذیب امام احمدؒ کو کرنا پڑی۔

جو حضرات، احناف پر چوٹ کرنے کے لئے "لاصلوٰۃ الابفاتحۃ الکتاب" پڑھ پڑھ کر صدر اول کے اکابر کی نمازوں کو باطل کہتے ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ وہ اپنے خیال میں بڑے اخلاص سے عمل بالحدیث فرماتے ہیں۔ میں ان کے اخلاص کی قدر کرتا ہوں لیکن میں بصد منت و لجاجت انہیں اس غلو کے ترک کرنے کا مشورہ دوں گا اور یہ عرض کروں گا کہ اگر آپ کے خیال میں ان اکابر کی نمازیں باطل ہیں تو ان کا زیادہ غم نہ کیجئے۔ کیونکہ ان کی تحقیق کے مطابق ان کی نمازیں صحیح ہیں۔ آپ ان کے بجائے اپنی توجہ ان لوگوں کی طرف مبذول فرمایئے جو سرے سے نماز کے قائل ہی نہیں۔ یا جنہیں سالہا سال سے بھی مسجد کا رخ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ نمازیوں کی نماز کو باطل کہنے کے بجائے بے نمازیوں کو نماز پر لانے کی محنت کیجئے۔ یہ دین کی صحیح خدمت ہوگی۔

۳___ اجتہادی و فروعی مسائل میں غلو اور تشدد روا نہیں:

اسی کے ساتھ یہ امر پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ دور بنیادی طور پر بدعت و ضلالت، الحاد و کجروی اور دین سے بے قیدی و آزادی کا ہے۔ اس زمانے میں ایسے ضروریات دین اور قطعیات اسلام، جن میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئیں، انہیں بھی مشکوک ٹھہرانے کی کوششیں ہو رہی ہیں، صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحینؒ نے قرآن و سنت سے جو کچھ سمجھا اسے بھی زور اجتہاد سے حرف غلط ثابت کرنے کی حماقتیں ہو رہی ہیں۔ اور دور جدید کی تمام بدعتوں اور ضلالتوں کو عین دین و ایمان باور کرایا جا رہا ہے۔ ایسے لادینی ماحول میں دیندار طبقہ کی فروعی و اجتہادی مسائل میں، ہنگامہ آرائی اہل دین کی سبکی و رسوائی اور لادین طبقہ کی حوصلہ افزائی کی موجب ہے۔ علمی انداز میں ان مسائل پر گفتگو پہلے بھی ہوتی آئی ہے اور آج بھی اس کا مضائقہ نہیں، لیکن ان فروعی و اجتہادی مسائل میں جو صدر اول سے مختلف فیہ چلے آتے ہیں۔ اور جن میں دونوں طرف صحابہؓ و تابعینؒ اور سلف صالحین کا ایک جم غفیر ہے۔ اختلاف کو اس قدر بڑھا دینا کہ نوبت جنگ و جدال اور نفاق و

شقاق تک پہنچ جائے کسی طرح بھی زیبا نہیں۔

۴۔ بہت سے مسائل میں محض افضل و غیر افضل کا اختلاف ہے:

سوالنامے میں جن مسائل کے بارے میں استفسار کیا گیا ان میں بیشتر کا تعلق جواز یا عدم جواز سے نہیں۔ بلکہ افضل و غیر افضل سے ہے۔ مثلاً اذان میں ترجیع ہونی چاہئے یا نہیں؟ اقامت دو دو کلمات کے ساتھ کہی جائے یا ایک کلمہ کے ساتھ؟ رکوع کو جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کیا جائے یا نہیں؟ آمین اونچی کہی جائے یا آہستہ؟ سجدہ سہو سلام سے پہلے ہو یا بعد میں؟ عیدین میں تکبیریں بارہ کہی جائیں یا چھ؟ قنوت وتر رکوع سے پہلے ہو یا بعد میں؟ اس کے لئے تکبیر کہی جائے یا نہیں؟ اور رفع یدین بھی کیا جائے یا نہیں؟ قنوت ہاتھ باندھ کر پڑھی جائے یا چھوڑ کر؟ وغیرہ ـــــ جیسا کہ آگے معلوم ہو گا۔ ان مسائل میں باتفاق امت دونوں صورتیں جائز ہیں اختلاف صرف اس میں ہے کہ بہتر اور مستحب کون سی صورت ہے؟ اور مستحب کی تعریف ہی یہ ہے کہ "لایلام تارکہ"۔ (اس کے تارک پر ملامت نہیں ہوتی) لیکن ہماری بدقسمتی کی حد ہے کہ ان مستحبات میں بھی نزاع و اختلاف اس حد تک پہنچا دیا گیا ہے کہ گویا یہ کفر و اسلام کا مسئلہ ہے، چنانچہ راقم الحروف کو حال ہی میں ایک اشتہار موصول ہوا ہے، جس کا عنوان ہے:

رفع الیدین بیس ہزار روپے انعام مناظرے ختم تمام

اس میں رفع الیدین کے مسئلہ پر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث مظاہر حق کے ترجمہ کے ساتھ دے کر لکھا گیا ہے:

> "سوالی کا سوال اطلاع عام ہے، جو عالم رفع الیدین کا کرنا ترک یا منسوخ ثابت کرے اس کو ہائی کورٹ کی شریعت بنچ پر نقد بیس ہزار روپیہ انعام ہے۔ یہ چیلنج پوری دنیا کے عالموں کو ہے۔ انعام دینے والے کا پتہ: ـــــ الاسلامی تحقیقی ادارہ کشمیری بازار راولپنڈی۔ منجانب بہادر بیگ و افتخار ولد زکاء الدین نرنکاری بازار راولپنڈی"۔

اس کے بعد ایک غلط بات (کہ رفع الیدین اس وقت کرنے کا حکم دیا گیا تھا جب کہ لوگ نئے نئے مسلمان ہوئے تھے وہ اپنی بغلوں میں بت لایا کرتے تھے) نقل کر کے اس کی تردید کی گئی ہے اور مولانا عبدالحی لکھنوی" کے حوالے سے ایک موضوع روایت "حتی لقی اللہ" نقل کر کے کہا گیا ہے کہ رفع الیدین منسوخ نہیں۔ بلکہ متواتر ہے۔ اور پھر درمختار کے حوالے سے متواتر کی تعریف کر کے آگے لکھا ہے:

"اب ایک بزرگ حنفی بریلوی کی بات بھی سنئے! فرماتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت آخری شریعت ہے۔ جو شخص شریعت اسلامیہ کے کسی حکم کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد منسوخ ہو جانا مانے وہ قطعاً مرتد اور کافر ہے۔

(حوالہ تحجانب ۱۔ اہل سنہ کتاب صفحہ ۱۲۲)

نوٹ. حنفی بھائیو مولویو بہادر بیگ کی تحقیق نہ مانو لیکن اپنے بڑوں کی تحقیق تو مان جاؤ۔ توبہ کر کے سب کے سب رفع یدین کرو اور کراؤ۔ یا رفع یدین کو منسوخ ثابت کر کے مجھے توبہ کراؤ. نالے بیس ہزار روپیہ اس شکریے میں مجھ سے انعام اٹھاؤ۔

نوٹ. ہم اہل حدیث پہلے وقت کے حنفیوں اور موجودہ وقت کے حنفیوں کی آپس میں رفع الیدین کے بارے میں صلح کرانا چاہتے ہیں اور ان کو ان کے فتویٰ سے بچانا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بلاتا ہے طرف اسلام کے (سورۃ یونس) اسلام پیغمبر کی ہر صحیح حدیث کے فیصلے کا نام ہے"۔

رفع الیدین کا مسئلہ انشاء اللہ سوال ششم کے ذیل میں آپ ملاحظہ فرمائیں گے. اور وہاں باحوالہ عرض کروں گا کہ رفع یدین اور ترک رفع یدین با جماع امت دونوں جائز ہیں۔ اختلاف صرف افضلیت و استحباب میں ہے۔ بعض حضرات کے نزدیک رفع یدین افضل و مستحب ہے۔ اور بعض کے نزدیک ترک رفع یدین۔

یہاں صرف اس غلو کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ ایک ایسا امر. جس کی استحباب و عدم استحباب میں صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدی (رضی اللہ عنہم) کا اختلاف ہے۔ ہمارے بہادر بیگ صاحب اسے کفر و اسلام کا مدار بنا رہے ہیں۔ اس کے لئے اشتہار بازی کی جا رہی ہے بیس بیس ہزار کی انعامی شرطیں بندھ رہی ہیں۔ جانبین میں سے کسی ایک فریق سے توبہ نصوح کرانے کا چیلنج دیا جا رہا ہے۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست ۲۔

بلاشبہ ہمارے بہادر بھائی اپنے خیال میں حدیث نبویؐ کی محبت میں یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ مگر وہ نہیں جانتے کہ ایک مستحب فعل میں (جس کے مستحب ہونے نہ ہونے میں بھی ائمہ

۱۔ نقل مطابق اصل

۲۔ عقل آتش حیرت میں جل گئی کہ یہ کیا بے وقوفی ہے

ہدیٰ کا اختلاف ہو) ایسا تشدد "تحریف فی الدین" ہے۔ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "حجۃ اللہ البالغہ "باب احکام الدین من التحریف" میں تحریف کے اسباب ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَمِنْهَا التَّشَدُّدُ، وَحَقِيقَتُهُ اِخْتِيَارُ عِبَادَاتٍ شَاقَّةٍ لَمْ يَأْمُرْ بِهَا الشَّارِعُ، كَدَوَامِ الصِّيَامِ وَالْقِيَامِ وَالتَّبَتُّلِ وَتَرْكِ التَّزَوُّجِ وَاَنْ يَلْتَزِمَ السُّنَنَ وَالْآدَابَ كَالْتِزَامِ الْوَاجِبَاتِ (ص ۱۲۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ اسباب تحریف میں سے ایک تشدد ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایسی عبادات شاقہ کو اختیار کیا جائے جن کا شارع علیہ السلام نے حکم نہ فرمایا ہو جیسے ہمیشہ روزے رکھنا، قیام کرنا مجرد رہنا اور شادی نہ کرنا۔ اور یہ کہ سنن و مستحبات کا واجبات کی طرح التزام کیا جائے۔

جو حضرات رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع الیدین کے قائل ہیں ان کے نزدیک بھی یہ فرض واجب نہیں صرف مستحب ہے۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید (نور اللہ مرقدہ) ایک زمانے میں رفع یدین کے قائل تھے۔ ۱ ؎ اور "تنویر العینین" کے نام سے اس مسئلہ پر ایک رسالہ بھی رقم فرمایا تھا۔ اس میں فرماتے ہیں:

اَلْحَقُّ اَنَّ رَفْعَ الْيَدَيْنِ عِنْدَ الْاِفْتِتَاحِ وَالرُّكُوْعِ وَالْقِيَامِ مِنْهُ وَالْقِيَامِ اِلَى الثَّالِثَةِ سُنَّةٌ غَيْرُ مُؤَكَّدَةٍ مِنْ سُنَنِ الْهُدَىٰ۔ فَيُثَابُ فَاعِلُهٗ بِقَدْرِ مَا فَعَلَ۔ اِنْ دَائِمًا فَبِحَسْبِهٖ۔ وَاِنْ مَرَّةً فَبِمِثْلِهٖ۔ وَلَا يُلَامُ تَارِكُهٗ وَاِنْ تَرَكَهٗ مُدَّةَ عُمْرِهٖ۔

ترجمہ:۔ حق یہ ہے کہ نماز شروع کرتے وقت رکوع کو جاتے اور اس سے اٹھتے اور تیسری رکعت کے لئے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا سنت غیر مؤکدہ ہے۔ سنن ہدیٰ سے پس اس کے کرنے والے کو بقدر اس کے فعل کے ثواب ہوگا۔ اگر ہمیشہ کرے تو اس کے مطابق اور ایک مرتبہ کرے تو اس کے مطابق۔ اور اس کے تارک پر کوئی ملامت نہیں خواہ مدت العمر نہ کرے۔

(تنویر العینین ص ۹ بحوالہ طائفہ منصورہ. ص ۳۶. از مولانا محمد سرفراز خان صاحب)

---

۱ ؎ لیکن شاہ شہیدؒ نے بعد میں اس رائے سے رجوع فرمالیا تھا۔ چنانچہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد سرفراز صفدر "طائفہ منصورہ" میں لکھتے ہیں:

"حضرت شاہ شہید صاحبؒ نے بلاشک خود رفع یدین بھی کیا۔ اور اسی زمانہ میں انہوں نے تنویر العینین رسالہ بھی

اور ان کے جدامجد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بھی "حجۃ اللہ البالغہ" میں رفع یدین کو "احب الی فرمایا مگر اس کے باوجود وہ لکھتے ہیں:

وَهُوَ مِنَ الْهَيْئَاتِ، فَعَلَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَرَّةً وَتَرَكَهُ مَرَّةً، وَالْكُلُّ سُنَّةٌ وَأَخَذَ بِكُلٍّ وَاحِدٍ جَمَاعَةٌ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِينَ وَمَنْ بَعْدَهُمْ وَهٰذَا أَحَدُ الْمَوَاضِعِ الَّتِي اخْتَلَفَ فِيهَا الْفَرِيقَانِ أَهْلُ الْمَدِينَةِ وَالْكُوفَةِ وَلِكُلٍّ وَاحِدٍ أَصْلٌ أَصِيلٌ" (ص ۱۰ ج ۲)

اس مسئلہ پر لکھا تھا مگر بعد کو انہوں نے رفع یدین ترک کر دیا تھا۔ چنانچہ مولانا سید عبدالخالق صاحبؒ جو (مولانا السید نذیر حسین صاحب دہلویؒ کے استاذ ہیں ۱۲۴۷ھ میں بمقام بالاکوٹ شہید ہوئے۔ دیکھئے حاشیہ اہل سنت والجماعت ص ۷۴ از مولانا محمد علی الصدیقی الکاندھلوی۔ اور خود نتائج التقلید ص ۱۴ میں بھی ان کو سید صاحب کا استاذ بتایا ہے۔ چنانچہ تفسیر و حدیث میں مہارت کی سرخی کے تحت لکھا ہے کہ (مولانا السید نذیر حسین صاحبؒ نے) اور ایک دفعہ مولانا سید عبدالخالق صاحب شاگرد حضرت شاہ عبدالقادر اور شاہ اسحاق صاحب سے یعنی اس مبارک علم میں کماحقہ مہارت پیدا کر لی) لکھتے ہیں کہ:

"مولوی کریم اللہ دہلوی ساکن محلہ لال کنویں نے کہا ہے کہ یہ لوگ اسمٰعیلی ہیں مولوی اسماعیل کی تقلید کرتے ہیں وہ بھی ایسے ہی تھے مگر جچ یوں ہے کہ ان کا گمان فاسد اور محض ظلم اور کذب ہے۔ وہ ہرگز ایسے نہ تھے بلکہ انہوں نے نواح پشاور میں بعد مباحثہ علماء حنفیہ کے رفع یدین چھوڑ دیا تھا اور عالم محقق تھے ایسے لوگوں کو جو پاتے تھے تو گور پرستوں سے زیادہ بد جانتے تھے الخ"۔

آگے لکھتے ہیں: "اور ایک رسالہ تنویر العینین کا جو بعضے آدمیوں نے ان کی شہادت کے بعد ان کا کر کے مشہور کیا اگر وہ ان کا ہو تو بھی بسبب اس کے کہ انہوں نے رفع یدین آخری عمر میں ترک کیا اس بلت میں معتبر نہ رہا، موافق مذہب اہل حدیث کے۔ کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے العبرۃ بالخواتیم وانما الاعمال بالخواتیم الخ (تنبیہ الضالین ص ۸۶ و ۸۷ بر حاشیہ نظام الاسلام طبع خورشید عالم لاہور)

اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے کہ السید مولانا نذیر حسین صاحبؒ کے استاد بزرگوار نے جو مجاہدین کے زمرہ میں شریک ہو کر بالاکوٹ میں شہید ہوئے صاف لفظوں میں یہ تحریر فرمایا کہ حضرت شاہ شہیدؒ نے آخر عمر میں رفع یدین ترک کر دیا تھا۔"

(طائفہ منصورہ ص ۲۴/۲۵ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

ــــــ راقم الحروف نے یہ عبارت "طائفہ منصورہ" کے حوالے سے نقل کی تھی۔ اس میں بین القوسین لفظ طباعت کی غلطی سے رہ گیا ہے۔ میں نے سیاق عبارت کے پیش نظر اس کا اضافہ کر دیا تھا۔ بعد اصل رسالہ کے نوبت آئی تو اس میں یہ لفظ موجود ہے۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

ترجمہ:۔ اور رفع یدین من جملہ ان افعال وہیئات کے ہے جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کیا اور کبھی نہیں کیا اور یہ سب سنت ہیں. اور آپؐ کے ہر ایک فعل کو صحابہؓ وتابعینؒ اور انکے بعد (ائمہ ہدیٰ) کی ایک جماعت نے اختیار کیا۔ اور یہ ان مواضع میں سے ایک ہے جن میں اہل مدینہ اور اہل کوفہ کی دو جماعتوں کا اختلاف ہوا۔ اور ہر ایک کے پاس ایک مضبوط اصل ہے۔

حضرت شہیدؒ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے ارشادات سے معلوم ہوا کہ جن اکابر نے قدیماً و حدیثاً رفع الیدین کو اختیار کیا ہے وہ بھی ترک رفع یدین کو سنت نبویؐ تسلیم کرتے ہیں۔ البتہ اس کے مقابلہ میں رفع یدین کی سنت کو احب واولیٰ سمجھتے ہیں. مگر انہوں نے اس کو کبھی کفرو اسلام کا مدار نہیں بنایا۔ اور نہ تارکین رفع یدین کو لائق ملامت سمجھا۔ چہ جائیکہ انہوں نے ہمارے بہادر بیگ صاحب کی طرح تارکین رفع کو کفروارتداد یا گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دے کر ان سے توبہ کرانا ضروری سمجھا ہو۔

الغرض وہ تمام مسائل جن میں سلف صالحین اور فقہائے امت کا اختلاف ہے۔ خصوصاً جن مسائل میں اختلاف صرف افضلیت و غیر افضلیت تک محدود ہے ان میں ایسا غلو اور تشدد روا نہیں کہ ایک دوسرے کو توبہ کی دعوتیں دی جانے لگیں۔ ایسا غلو اور تشدد. ابتداع فی الدین ہے۔ جس سے شاہ صاحبؒ کے بقول. دین میں تحریف کا دروازہ کھلتا ہے. ایسے لوگوں کا شمار اہل حق میں نہیں۔ اہل بدعت میں ہے۔ میں اپنے بہادر بھائی اور ان کے دیگر ہم مشرب بزرگوں کی خدمت میں نہایت دردمندی سے گزارش کروں گا کہ آپ کے جذبہ عمل بالحدیث کی دل وجان سے قدر کرتا ہوں۔ مگر خدارا! ان فروعی مسائل میں ایسا غلو اور تشدد روا نہ رکھئے جس سے دین کی حدود مٹ جائیں۔ اور فرائض و واجبات اور مستحبات کے درمیان خط امتیاز باقی نہ رہے اور بے دین طبقہ کو اہل دین کا تمسخر اڑانے کا موقع ملے۔ آپ جس سنت کو اولیٰ و افضل سمجھتے ہیں بڑے شوق واخلاص سے اس پر عمل کیجئے انشاء اللہ آپ کو اپنے مخلصانہ عمل کا اجر ملے گا۔ لیکن دوسرے حضرات کے نزدیک اگر دوسری سنت افضل وراجح ہے۔ تو ان پر بھی طعن نہ کیجئے بلکہ اطمینان رکھئے کہ ان کو بھی بشرط اخلاص اس دوسری سنت پر عمل کرنے سے انشاء اللہ آپ سے کم اجر نہیں ملے گا۔

۵ ــــ عمل بالحدیث تمام ائمہ اجتہاد کی مشترک میراث ہے.

قرآن کریم نے بہت سے مقامات پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و فرمانبرداری اور

آپ کے احکامات وارشادات کی تعمیل کو اہل ایمان کا فریضہ ٹھہرایا ہے۔ سورۃ احزاب میں ارشاد ہے

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَمْرًا أَنْ يَكُونَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ ۔ وَمَنْ يَعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا مُبِينًا ۔ (الاحزاب : آیت ۳۶)

ترجمہ :۔ اور کام نہیں کسی ایماندار مرد کا اور نہ ایماندار عورت کا جب کہ مقرر کر دے اللہ اور اس کا رسول کوئی کام کہ ان کو رہے اختیار اپنے کام کا اور جس نے نافرمانی کی اللہ کی اور اس کے رسول کی سو وہ راہ بھولا صریح چوک کر۔ (ترجمہ شیخ الہند)

"وماکان لمؤمن ولا مؤمنۃ" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی اطاعت و فرمانبرداری کا التزام شرط ایمان ہے۔ اس کے بغیر ایمان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جو شخص یہ ایمان رکھتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں۔ آپؐ جو کچھ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے فرماتے ہیں، اس ایمان کے بعد آپؐ کے کسی حکم سے سرتابی کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے؟ اور یہ دو باتیں ایک قلب میں کیسے جمع ہو سکتی ہیں کہ ایک شخص کو آپؐ کی رسالت و نبوت پر ایمان بھی ہو اور پھر آپؐ کے احکام و فرامین کے قبول کرنے سے انحراف و انکار بھی .....

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

كُلُّ أُمَّتِي يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ أَبَى قَالُوا وَمَنْ يَأْبَى ؟ قَالَ، مَنْ أَطَاعَنِي دَخَلَ الْجَنَّةَ ۔ وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ أَبَى (صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۸۱)

ترجمہ :۔ میری امت کے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے مگر جس نے انکار کر دیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا۔ اور انکار کون کرتا ہے؟ فرمایا، جس نے خوشی سے میرا حکم مانا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ اور جس نے میری حکم عدولی کی اس نے انکار کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات مقدسہ اور سنن طیبہ بھی باجماع امت واجب العمل ہیں اور سنت کے حجت شرعیہ ہونے کو "ضروریات دین" میں شمار کیا گیا ہے۔ شیخ ابن الہمامؒ تحریر الاصول میں تحریر فرماتے ہیں:

(حُجِّيَّةُ السُّنَّةِ) سَوَاءٌ كَانَتْ مُفِيدَةً لِلْفَرْضِ أَوِ الْوَاجِبِ أَوْ غَيْرِهِمَا (ضَرُورَةٌ دِينِيَّةٌ) كُلُّ مَنْ لَهُ عَقْلٌ وَتَمْيِيزٌ حَتَّى النِّسَاءَ وَالصِّبْيَانَ يَعْرِفُ أَنَّ مَنْ ثَبَتَتْ نُبُوَّتُهُ صَادِقٌ فِيمَا يُخْبِرُ عَنِ اللّٰهِ تَعَالَى ۔

وَيَجِبُ اِتِّبَاعُهٗ (تیسیر التحریر شرح تحریر، للشیخ محمد امین امیر بادشاہ ص ۲۰ ج ۲)

ترجمہ:۔ سنت خواہ فرض کے لئے مفید ہو، یا واجب کے لئے، یا دونوں کے علاوہ کسی اور حکم کے لئے، اس کا حجت ہونا ضروریات دین میں سے ہے، ہر وہ شخص جو عقل و تمیز رکھتا ہو، حتیٰ کہ عورتیں اور بچے بھی جانتے ہیں کہ جس کی نبوت ثابت ہو وہ ان تمام امور میں سچا ہے جن کی وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خبر دیتا ہے۔ اور اس کی اتباع واجب ہے۔

اور جن "اصول اربعہ" سے احکام شرعیہ کا ثبوت تمام فقہائے امت کے نزدیک متفق علیہ ہے (یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اجماع امت اور قیاس مجتہد) ان میں دوسرا مرتبہ سنت نبوی (علیٰ صاحبہا الف الف صلوٰۃ و سلام) کا ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ کا ارشاد متعدد طرق و الفاظ سے مروی ہے کہ:

مَاجَاءَ نَا عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ بِاَبِیْ وَاُمِّیْ۔ فَعَلَى الرَّأْسِ وَالْعَيْنِ، وَمَاجَاءَ عَنِ الصَّحَابَةِ اِخْتَرْنَا، وَمَا كَانَ مِنْ غَيْرِ ذَالِكَ فَهُمْ رِجَالٌ وَنَحْنُ رِجَالٌ۔ (مناقب ذھبی ص ۲۰)

ترجمہ:۔ جو چیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم تک پہنچے ـــــ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں ـــــ وہ سر آنکھوں پر، اور جو بات صحابہ کرامؓ سے منقول ہو (تو اختلاف کی صورت میں) ہم اس میں سے ایک قول کو اختیار کرتے ہیں۔ اور چیز جو تابعینؒ سے منقول ہو تو وہ بھی ہم جیسے آدمی ہیں۔ (کیونکہ حضرت امامؒ بھی تابعی ہیں)

ایک اور روایت میں ہے:

اٰخُذُ بِكِتَابِ اللّٰهِ فَمَا لَمْ اَجِدْ فَبِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَالْاٰثَارِ الصِّحَاحِ الَّتِىْ فَشَتْ فِىْ اَيْدِى الثِّقَاتِ عَنِ الثِّقَاتِ فَاِنْ لَّمْ اَجِدْ فَبِقَوْلِ اَصْحَابِهٖ اٰخُذُ بِقَوْلِ مَا شِئْتُ وَاَمَّا اِذَا انْتَهَى الْاَمْرُ اِلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَالشَّعْبِىْ وَالْحَسَنِ وَعَطَا فَاَجْتَهِدُ كَمَا اجْتَهَدُوْا (مناقب الامام ابی حنیفہ للذھبی ص ۲۰)

ترجمہ:۔ میں سب سے پہلے اللہ کی کتاب کو لیتا ہوں۔ پس اس میں اگر مسئلہ نہ ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو لیتا ہوں۔ اور ان آثارِ صحیحہ پر عمل کرتا ہوں جو ثقہ راویوں کی روایت سے شائع ذائع ہیں۔ اگر سنت نبویؐ میں بھی مسئلہ نہ ملے تو صحابہ کرامؓ کے اقوال میں سے کسی ایک قول کو لیتا ہوں۔ لیکن جب معاملہ ابراہیم، شعبی، حسن اور عطا (تابعین رحمہم اللہ) تک پہنچے تو میں خود اجتہاد کرتا ہوں، جیسا کہ ان

حضرات تابعین ؒ نے اجتہاد کیا۔

ایک روایت میں ہے :۔

إِنَّا نَعْمَلُ بِكِتَابِ اللّٰهِ ثُمَّ بِسُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ بِأَحَادِيْثِ أَبِي بَكْرٍ وَّعُمَرَ وَعُثْمَانَ وَعَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ۔

(عقود الجواہر المنیفۃ ص ۸)

ترجمہ:۔ ہم کتاب اللہ پر عمل کرتے ہیں. پھر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر. پھر حضرات ابو بکر و عمر و عثمان و علی رضی اللہ عنہم کی احادیث پر۔

تاہم جہاں نصوص میں بظاہر تعارض نظر آئے وہاں اپنے اپنے فہم و اجتہاد کے مطابق تمام ائمہ مجتہدین کو نصوص میں جمع و تطبیق یا ترجیح کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں محدث اور مجتہد کا وظیفہ الگ الگ ہو جاتا ہے۔ ایک محدث کا منصب یہ ہے کہ وہ ان تمام امور کو روایت کرتا جائے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔

اسے اس سے بحث نہیں کہ ان میں سے کون ناسخ ہے کون منسوخ ہے۔ کون قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے اور کس کی حیثیت مستثنیات کی ہے کون سا حکم وجوب پر محمول ہے اور کونسا ندب و استحباب یا اجازت پر کونسا حکم تشریعی ہے اور کونسا ارشادی۔ امت کا تواتر و تعامل کس پر ہے اور کس پر نہیں؟ یہ اور اس قسم کے بہت سے امور پر غور کر کے یہ معلوم کرنا کہ شارع کا ٹھیک ٹھیک منشا کیا ہے؟ یہ محدث کا وظیفہ نہیں بلکہ مجتہد کا منصب ہے۔ ـــــ آپ چاہیں تو اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ ایک ہے حدیث کے الفاظ کی حفاظت و نگہداشت اور ایک ہے حدیث کے معانی و مفاہیم میں دقیقہ رسی، شریعت کے کلیات کو جزئیات پر منطبق کرنا اور جزئیات سے کلیات کی طرف منتقل ہونا. پہلی چیز محدث کا منصب ہے۔ اور دوسری فقیہہ مجتہد کا ـــــ اسی لئے امام ترمذیؒ فرماتے ہیں :۔

وَكَذٰلِكَ قَالَ الْفُقَهَاءُ وَهُمْ أَعْلَمُ بِمَعَانِي الْحَدِيْثِ (ترمذی باب غسل المیت ص ۱۱۸ ج ۱)

ترجمہ:۔ اور فقہا نے اسی طرح کہا ہے اور حدیث کے معنی و مفہوم کو وہی بہتر جانتے ہیں۔

امام اعمش ؒ سے ایک موقعہ پر چند مسائل دریافت کئے گئے۔ امام ابو حنیفہ ؒ بھی وہاں موجود تھے۔ انہوں نے جواب کے لئے حضرت امام ؒ کو فرمایا. حضرت امام ؒ نے مسائل بتا دیئے تو انہوں نے پوچھا یہ مسائل کہاں سے نکالے۔ عرض کیا فلاں فلاں احادیث سے جو آپ ہی سے سنی ہیں یہ کہہ کر وہ تمام احادیث سنا دیں۔ امام اعمش ؒ نے فرمایا۔ بس بس. جو احادیث میں نے سو دن میں

تمہیں سنائی تھیں وہ تم نے ایک جلسہ میں سناڈالیں مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ان احادیث سے بھی مسائل اخذ کرو گے۔

يَا مَعْشَرَ الْفُقَهَاءِ اَنْتُمُ الْاَطِبَّاءُ وَنَحْنُ الصَّيَادِلَةُ (الخيرات الحسان ص ۶۱)

ترجمہ:۔ اے فقہاء کی جماعت! تم طبیب ہو اور ہم دوا فروش ہیں۔

بلاشبہ بہت سے اکابر کو حق تعالیٰ نے دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا۔ وہ بیک وقت بلند پایہ محدث بھی تھے اور دقیقہ رس فقیہ بھی ــــ جیسا کہ حضرات ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ روایت و درایت دونوں کے جامع تھے کیونکہ اجتہاد و تفقہ علم حدیث میں کامل مہارت کے بغیر ممکن نہیں۔

الغرض جب ایک مجتہد کسی مسئلہ پر قرآن و سنت کے نصوص، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے آثار اور امت کے تعامل کی روشنی میں غور کرتا ہے تو اسے متعارض نصوص کے درمیان جمع و تطبیق یا ترجیح کے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اس صورت میں کسی مجتہد نے کسی حدیث کو ترک کیا ہو تو اس سے قوی ترین دلیل کے پیش نظر ہی کیا ہوگا۔ اس لئے اس پر ترک حدیث کا الزام عائد نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ یہ ترک بھی محض خواہش نفس کی بنا پر نہیں بلکہ شارع کے منشا کی تلاش میں ہے۔ شیخ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اپنے رسالہ "رفع الملام عن الائمۃ الاعلام" میں فرماتے ہیں:

وَلْيُعْلَمْ اَنَّهٗ لَيْسَ اَحَدٌ مِّنَ الْاَئِمَّةِ الْمَقْبُوْلِيْنَ عِنْدَ الْاُمَّةِ قَبُوْلًا عَامًّا يَّتَعَمَّدُ مُخَالَفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (فِيْ) شَيْءٍ مِّنْ سُنَّتِهٖ دَقِيْقٍ وَّلَا جَلِيْلٍ۔ فَاِنَّهُمْ مُتَّفِقُوْنَ اِتِّفَاقًا يَّقِيْنًا عَلٰى وُجُوْبِ اِتِّبَاعِ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَعَلٰى اَنَّ كُلَّ اَحَدٍ مِّنَ النَّاسِ يُؤْخَذُ مِنْ قَوْلِهٖ وَيُتْرَكُ اِلَّا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَلٰكِنْ اِذَا وُجِدَ لِوَاحِدٍ مِّنْهُمْ قَوْلٌ قَدْ جَاءَ حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ بِخِلَافِهٖ فَلَا بُدَّ لَهٗ مِنْ عُذْرٍ فِيْ تَرْكِهٖ " (صفحہ ۱۰)

ترجمہ:۔ جان لینا چاہئے کہ ائمہ اجتہاد، جن کو امت کے نزدیک قبول عام حاصل ہے ان میں سے کوئی بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں سے کسی سنت کی قصداً مخالفت نہیں کرتا۔ نہ کسی چھوٹی سنت کی۔ نہ کسی بڑی سنت کی۔

کیونکہ تمام ائمہ اس پر یقینی طور پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع واجب ہے۔ اور یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا ہر شخص کی حیثیت ایسی ہے کہ اس کے قول کو لیا بھی جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی

جاسکتا ہے۔ لیکن جب ائمہ اجتہاد میں سے کسی کا ایسا قول نظر آئے کہ حدیث صحیح اس کے خلاف ہو تو اس کے لئے اس کے ترک میں ضرور کوئی عذر ہو گا۔

پھر مجتہدین کے درجات میں بھی تفاوت ہے۔ اور کیوں نہ ہو. جب کہ یہ تفاوت خود انبیاء کرام علیہم السلام کی ذوات قدسیہ میں موجود ہے. "تلک الرسل فضلنا بعضہم علیٰ بعض" —— اس لئے اجتہاد کے مدارک مختلف ہو سکتے ہیں۔ لیکن اپنی اپنی سعی و کوشش اور اپنے اپنے تفقہ و اجتہاد کے مطابق تمام ائمہ مجتہدین منشائے شارع کی تلاش میں کوشاں ہیں۔ حافظ ابن عبد البرؒ "الانتقا" میں امام عبداللہ بن مبارکؒ سے نقل کرتے ہیں:

"كَانَ اَبُوْحَنِيْفَةَ شَدِيْدَ الْاَخْذِ لِلْعِلْمِ۔ ذَابًّا عَنْ حَرَمِ اللهِ اَنْ يَسْتَحِلَّ يَاْخُذُ بِمَا صَحَّ مِنَ الْاَحَادِيْثِ الَّتِيْ يَحْمِلُهَا الثِّقَاتُ۔ وَبِالْاٰخِرِ مِنْ فِعْلِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَبِمَا اَدْرَكَ عَلَيْهِ عُلَمَاءَ الْكُوْفَةِ۔ ثُمَّ شَنَّعَ عَلَيْهِ قَوْمٌ يَغْفِرُ اللهُ لَنَا وَلَهُمْ"

(ص ۱۴۲)

ترجمہ:۔ امام ابو حنیفہؒ علم کو بہت زیادہ اخذ کرنے والے تھے. بڑی شدت کے ساتھ حدود الہیہ سے مدافعت فرماتے تھے۔ کہ کہیں ان کی بے حرمتی نہ ہونے پائے۔ صحیح احادیث کو لیتے تھے۔ جو ثقہ راویوں کے ذریعہ مروی ہیں۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری سے آخری فعل کو لیتے تھے۔ اور اس فعل کو جس پر آپ نے علمائے کوفہ کو پایا تھا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے آپ کو برا بھلا کہا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی معاف فرمائے۔ اور ان لوگوں کو بھی۔

شیخ ابن حجر مکیؒ نے "الخیرات الحسان" میں امام ابو یوسفؒ کا قول نقل کیا ہے کہ انہوں نے امام ابن مبارکؒ کے سامنے حضرت امامؒ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اِنَّهٗ يَرْكَبُ مِنَ الْعِلْمِ اَحَدَّ مِنْ سِنَانِ الرُّمْحِ۔ كَانَ وَاللهِ شَدِيْدَ الْاَخْذِ لِلْعِلْمِ۔ ذَابًّا عَنِ الْمَحَارِمِ مُتَّبِعًا لِاَهْلِ بَلَدِهٖ۔ لَا يَسْتَحِلُّ اَنْ يَاْخُذَ اِلَّا مَا صَحَّ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ شَدِيْدُ الْمَعْرِفَةِ بِنَاسِخِ الْحَدِيْثِ وَمَنْسُوْخِهٖ وَكَانَ يَطْلُبُ اَحَادِيْثَ الثِّقَاتِ وَالْاٰخِذَ مِنْ فِعْلِ رَسُوْلِ اللهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا ادرك عليه علماء اهل الكوفة فى اتباع الحق نخذ به، وجعله دِيْنَهٗ۔ وَقَدْ شَنَّعَ عَلَيْهِ قَوْمٌ فَسَكَتْنَا عَنْهُمْ بِمَا [illegible]

ترجمہ:۔ وہ علم کی ایسی باریکی پر سوار تھے جو نیزے کی نوک سے زیادہ تیز ہے اللہ کی قسم! وہ بہت زیادہ علم حاصل کرنے والے تھے. حرمات الٰہیہ کی مدافعت کرتے تھے. اپنے اہل شہر کے متبع تھے. وہ اس بات کو حلال نہیں سمجھتے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کے سوا کسی چیز کو اخذ کریں۔ حدیث کے ناسخ و منسوخ کی شدید معرفت رکھتے تھے. ثقہ راویوں کی احادیث اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو اخذ کرنے کی طلب میں رہتے تھے۔ اور حق کی اتباع میں علمائے اہل کوفہ کو جس چیز پر پایا اسے اپنایا۔ اور اس کو اپنا دین بنالیا۔ کچھ لوگوں نے آپ پر ناحق طعن و تشنیع سے کام لیا ہے ہم اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے ہوئے ان لوگوں کے بارے میں خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

الغرض ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ کے بارے میں یہ بدگمانی کہ وہ محض رائے کی وجہ سے احادیث طیبہ کو ترک کردیتے ہیں. نہ صرف یہ کہ صریح ظلم و زیادتی ہے۔ بلکہ اجتہاد کے منصب رفیع سے ناآشنائی کی علامت ہے. امام ربانی مجدد الف ثانی رحمہ اللہ صحیح فرماتے ہیں:

" جماعہ کہ ایں اکابر دین را اصحاب رائے مید انند. اگر ایں اعتقاد دارند کہ ایشاناں بہ رائے خود حکم میکردند و متابعت کتاب و سنت نمی نمودند پس سواد اعظم از اہل اسلام بزعم فاسد ایشاں ضال و مبتدع باشند. بلکہ از جرگہ. اہل اسلام بیروں بوند. این اعتقاد نہ کند مگر جاہلے کہ از جہل خود بے خبراست. یا زندیقے کہ مقصودش ابطال شطر دین است۔ ناقصے چند. احادیث چند را یاد گرفتہ اند و احکام شریعت را منحصر دراں ساختہ اند. و ماورائے معلوم خود را نفی می نمایند. و آنچہ نزد ایشاں ثابت نشدہ منتفی میسازند

چوں آں کرمے کہ در سنگے نہاں است زمین و آسمان او ہماں است "

(مکتوبات دفتر دوم حصہ ہفتم مکتوب نمبر ۵۵ ص ۱۵ مطبوعہ امرتسر)

ترجمہ:۔ جو لوگ ان اکابر دین کو "اصحاب رائے" کہتے ہیں اگر یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ یہ حضرات محض اپنی رائے سے حکم کرتے تھے۔ اور کتاب و سنت کی پیروی نہیں کرتے تھے تو ان کے خیال فاسد کے مطابق مسلمانوں کا سواد اعظم گمراہ اور بدعتی ہوگا۔ بلکہ اہل اسلام کی جماعت ہی سے خارج ہوگا۔ اور یہ خیال نہیں کرے گا. مگر وہ جاہل جو اپنے جہل سے بے خبر ہو۔ یا وہ زندیق جس کا مقصود نصف دین کو باطل ٹھہراتا ہو۔ چند کوتاہ فہم لوگوں نے چند احادیث یاد کرر کھی ہیں۔ اور شریعت کے احکام کو انہی میں منحصر سمجھ لیا ہے. وہ اپنے معلومات کے ماورا کی نفی کر ڈالتے ہیں۔ اور جو چیز ان کے نزدیک ثابت نہ ہو سمجھتے ہیں کہ اس کا وجود ہی سرے سے نہیں۔

جیسے وہ کیڑا جو پتھر میں چھپا ہوا ہو. اس کی زمین و

آسمان بس وہی چھر ہے"۔ (گویا اس کے
سوا نہ آسمان کا وجود ہے نہ زمین کا)

٦۔۔۔ ترک عمل بالحدیث کے اسباب:

شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ ایک مجتہد جن اعذار کی بنا پر کسی حدیث کے عمل کو ترک کرتا ہے ان کی جملاً تین قسمیں ہے:

اَحَدُهَا: عَدَمُ اِعْتِقَادِهٖ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَهٗ۔
وَالثَّانِی: عَدَمُ اِعْتِقَادِهٖ اِرَادَةَ تِلْكَ الْمَسْئَلَةِ بِذَالِكَ الْقَوْلِ۔
وَالثَّالِثُ: اِعْتِقَادُهٗ اَنَّ ذَالِكَ الْحُكْمَ مَنْسُوْخٌ (رفع الملام ص ۱۱)

ترجمہ:۔ ایک یہ کہ وہ اس بات کا قائل ہی نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی ہوگی۔
دوم یہ کہ وہ اس کا قائل نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد سے یہ مسئلہ مراد لیا ہوگا۔
سوم یہ کہ اس کا خیال ہے کہ یہ حکم منسوخ ہوچکا ہے۔
شیخ لکھتے ہیں کہ یہ تین قسمیں متعدد اسباب کی طرف متفرع ہیں. اس سلسلہ میں انہوں نے دس اسباب کی نشاندہی فرمائی ہے۔ مناسب ہے کہ ان کا خلاصہ یہاں درج کر دیا جائے۔

پہلا سبب. حدیث کی اطلاع نہ ہونا.

ان دس اسباب میں سے پہلا اور اکثری سبب شیخ ابن تیمیہؒ کے نزدیک انہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"اَنْ لَّا یَكُوْنَ الْحَدِیْثُ قَدْ بَلَغَهٗ، وَمَنْ لَّمْ یَبْلُغْهُ الْحَدِیْثُ لَمْ یُكَلَّفْ اَنْ یَّكُوْنَ عَالِمًا بِمُوْجَبِهٖ۔ وَاِذَا لَمْ یَكُنْ قَدْ بَلَغَهٗ، وَقَدْ قَالَ فِیْ تِلْكَ الْقَضِیَّةِ بِمُوْجَبِ ظَاهِرِ اٰیَةٍ، اَوْ حَدِیْثٍ اٰخَرَ اَوْ بِمُوْجَبِ قِیَاسٍ۔ اَوْ مُوْجَبِ اِسْتِصْحَابٍ، فَقَدْ یُوَافِقُ ذَالِكَ الْحَدِیْثَ مَرَّةً، وَیُخَالِفُهٗ اُخْرٰی وَهٰذَا السَّبَبُ هُوَ الْغَالِبُ عَلٰی اَكْثَرِ مَا یُوْجَدُ مِنْ اَقْوَالِ السَّلَفِ مُخَالِفًا لِبَعْضِ الْاَحَادِیْثِ" ص ۱۲)

ترجمہ:۔ کہ اس کو حدیث نہ پہنچی ہو اور جب اس کو حدیث پہنچی ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اس بات کا مکلف ہی نہیں کہ اس کے حکم کا عالم ہو۔ اور جب اسے حدیث نہ پہنچی ہو اور اس نے اس مسئلہ میں کسی آیت کے ظاہر۔ یا

کسی اور حدیث کے موافق، یا قیاس و استصحاب کی رو سے کوئی رائے قائم کی ہو تو وہ کبھی اس حدیث کے موافق ہوگی۔ اور کبھی مخالف۔ اور سلف کے جو اقوال بعض احادیث کے خلاف پائے جاتے ہیں ان کا غالب اور اکثری سبب یہی ہے۔

قریب قریب یہی بات مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی قدس سرہ نے "حجۃ اللہ البالغہ" اور "الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف" میں لکھی ہے۔ بعض حضرات کو اس سے شدید غلط فہمی ہوئی ہے۔ اور انہوں نے ترک حدیث کے باقی اسباب کو نظرانداز کر کے گویا اسی کو ایک مستقل اصول بنالیا ہے کہ جہاں کسی مجتہد کا قول کسی حدیث کے خلاف نظر آئے یہ حضرات اپنے حسن ظن کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اس مجتہد کو یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی۔ مگر یہ رائے نہایت مخدوش ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے اس شہادت میں سلف کے جو واقعات نقل کئے ہیں وہ معدودے چند ہیں۔ اس لئے اس کو ترک حدیث کا "اکثری سبب" قرار دینا محل نظر ہے۔

علاوہ ازیں یہ عذر ان مسائل میں تو صحیح ہے جو کبھی شاذ و نادر پیش آتے ہیں (اور اس ضمن میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں وہ اسی نوعیت کے ہیں) لیکن وہ مسائل جن سے روزمرہ سابقہ پیش آتا ہے، ان میں یہ عذر صحیح نہیں۔ مثلاً امام کے پیچھے فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں؟ آمین اونچی کہی جائے یا آہستہ؟ رکوع کو جاتے اور اس سے اٹھتے وقت رفع الیدین کیا جائے یا نہیں؟ اذان و اقامت کے کلمات کتنے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ ـــــ ظاہر ہے کہ یہ ایسے شاذ و نادر مسائل نہیں جن کی ضرورت برس عمر میں کبھی ایک آدھ بار پیش آتی ہو۔ اور یہ فرض کر لیا جائے کہ بعض سلف کو حدیث نہیں پہنچی ہوگی۔ یہ اعمال تو ایسے ہیں کہ روزانہ بار بار علی روس الاشہاد ادا کئے جاتے ہیں، اور تعداد رکعات کی طرح یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متواتر چلے آتے ہیں۔ اور عقلاً ناممکن ہے کہ اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کو اس بارے میں سنت نبوی کا علم نہ ہو۔

اسی طرح جن مسائل میں صحابہؓ و تابعینؒ کے زمانے میں بحث و مناظرہ کی نوبت آئی ان میں بھی یہ احتمال بعید ہے کہ ایک فریق کو حدیث نہیں پہونچی ہوگی۔ اس قسم کے مواقع میں صحیح عذر وہی ہے جس طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں کہ یہ مدارک اجتہاد کا اختلاف ہے۔ اس کی مثال وہ واقعہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بنو قریظہ کی بستی میں پہنچنے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا۔

"لَا يُصَلِّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْعَصْرَ اِلَّا فِيْ بَنِيْ قُرَيْظَةَ"

ترجمہ:۔ تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ پہنچ کر۔

اتفاق سے وہاں پہنچنے میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو تاخیر ہوگئی۔ اور نماز عصر کا وقت نکلنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مشورہ کیا کہ کیا ہونا چاہئے؟ مشورہ میں دو فریق بن گئے۔ ایک کی رائے یہ تھی کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمایا ہے کہ بنو قریظہ پہنچے سے پہلے عصر کی نماز نہ پڑھی جائے تو اب راستہ میں نماز پڑھنے کا کیا جواز ہے؟ اس لئے خواہ نماز قضا ہو جائے مگر ارشاد نبوی ؐ کی تعمیل ضروری ہے۔ جب کہ دوسرے فریق کی رائے یہ تھی کہ اس حکم سے منشاء مبارک یہ تھا کہ ہمیں عصر کا وقت ختم ہونے سے پہلے پہلے بنو قریظہ پہنچ جانا چاہئے اور عصر کی نماز وہاں پہنچ کر پڑھنی چاہئے۔ اب جب کہ ہم غروب سے پہلے وہاں نہیں پہنچ سکتے تو نماز عصر قضا کرنے کے کوئی معنی نہیں۔ اگر ہم سے وہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ہمیں نماز عصر قضا کر کے اپنی کوتاہی میں مزید اضافہ کر لینا چاہئے۔ الغرض پہلے فریق نے ارشاد نبوی ؐ کی تعمیل میں نماز عصر قضا کرنا گوارا کی مگر ارشاد نبوی ؐ کے ظاہر سے ہٹنا گوارا نہیں کیا اور دوسرے فریق نے منشاء نبوی ؐ کی تعمیل ضروری سمجھی اور راستے میں اتر کر نماز عصر پڑھی. اور پھر بنو قریظہ پہنچے۔ جب بارگاہ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ واقعہ پیش ہوا. تو آپ نے کسی فریق کو عتاب نہیں فرمایا بلکہ دونوں کی تصویب فرمائی۔ کیونکہ دونوں منشاء نبوی ؐ کی تعمیل میں کوشاں تھے۔

اس واقعہ میں ایک فریق نے اگرچہ ظاہر حدیث کے خلاف کیا۔ مگر وہ دیگر نصوص شرعیہ اور قواعد کلیہ کے پیش نظر ایسا کرنے پر مجبور تھا اس لئے ان کا عذر یہ نہیں تھا کہ انہیں حدیث نہیں پہنچی تھی کیونکہ حدیث تو انہوں نے خود اپنے کانوں سے سنی تھی۔ البتہ ان کے مدارک اجتہاد کی وسعت و گہرائی انہیں ظاہر حدیث پر عمل کرنے سے مانع تھی ـــــ اسی سے ائمہ مجتہدین کے مدارک اجتہاد کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ناواقف ان پر طعن کریں گے کہ انہوں نے حدیث کی کیوں مخالفت کی مگر جن لوگوں کو حق تعالیٰ شانہ نے فہم و بصیرت عطا فرمائی ہے وہ جانتے ہیں کہ نے حدیث کے ظاہری الفاظ پر اگرچہ عمل نہیں کیا۔ مگر منشاء نبوی ؐ کی تعمیل انہوں ۔ سے بڑھ کر فرمائی ہے۔

دوسرا سبب: کسی علت کی وجہ سے حدیث کا ثابت نہ ہونا.

شیخ ابن تیمیہ ؒ لکھتے ہیں:

"دوسرا سبب یہ ہے کہ حدیث تو اس کو پہنچی. لیکن یہ حدیث اس کے نزدیک ثابت نہیں تھی کیونکہ اسناد کے راویوں میں سے کوئی راوی اس کے نزدیک مجہول یا

متہم۔ یا سیئی الحفظ تھا"۔ (ص۲۶)
اس کی مزید تفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وَهٰذَا اَيْضًا كَثِيْرٌ جِدًّا وَهُوَ مِنَ التَّابِعِيْنَ اِلَى الْاَئِمَّةِ الْمَشْهُوْرِيْنَ (و) مِنْ بَعْدِهِمْ اَكْثَرُ مِنَ الْعَصْرِ الْاَوَّلِ اَوْ كَثِيْرٌ مِنَ الْقِسْمِ الْاَوَّلِ (ص۲۶)

ترجمہ:۔ اور یہ سبب بھی بہت ہی زیادہ ہے۔ اور یہ تابعین سے لے کر ائمہ مشہورین تک اور ان کے بعد کے حضرات تک بہ نسبت زمانہ اول کے زیادہ ہے۔ یا قسم اول کی نسبت زیادہ ہے۔——

تیسری اور چوتھی صدی کے محدثین ؒ نے احادیث کے نقد و تنقیح اور راویوں کی جرح و تعدیل کے لئے جو اصول مقرر فرمائے ہیں ان کی روشنی میں بہت سی وہ احادیث و روایات محدثین متاخرین کے نزدیک غیر ثابت اور ساقط الاعتبار قرار پائیں۔ جو ان کے مقرر کردہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھیں حالانکہ ائمہ متقدمین کے نزدیک وہ صحیح تھیں اور وہ حضرات ان احادیث پر عمل پیرا تھے. جن راویوں کو بعد کے حضرات نے مجہول، سئی الحفظ یا متہم قرار دے کر ان کی احادیث کو ترک کیا ائمہ متقدمین ان راویوں سے خود ملے تھے اور بعد کے حضرات کی بہ نسبت ان کے حالات سے زیادہ واقف تھے متاخرین کے پاس سو سال قبل کے رلویوں کی جانچ پرکھ کے لئے ان کے وضع کردہ اصطلاحی پیمانے تھے۔ لیکن متقدمین، راویوں کو ان اصطلاحی پیمانوں سے ناپنے تولنے کے محتاج نہیں تھے۔ ان کی رائے براہ راست مشاہدہ پر مبنی تھی، اسی طرح متاخرین نے جن احادیث میں ارسال و انقطاع —— کی ذرا سی چھائیں بھی دیکھی اسے مسترد کر دیا۔ حالانکہ متقدمین ان مرسل و منقطع احادیث کو حجت سمجھتے تھے، جیسا کہ امام مالک اور امام محمد بن حسن شیبانی رحمہما اللہ تعالیٰ کی تصریحات موجود ہیں، کیونکہ ائمہ متقدمین ہر گرے پڑے شخص سے علم نہیں لیتے تھے۔ بلکہ جس کے علم و فہم اور صدق و دیانت پر انہیں اعتماد تھا اسی سے لیتے تھے۔ اس لئے انہیں اپنے مشائخ کے مرسل روایات پر اعتماد تھا۔ مگر متاخرین کا اعتماد "عصائے عنعنہ" کا محتاج تھا —— چنانچہ شیخ ابن تیمیہ ؒ کے بقول جوں جوں وقت گزرتا گیا بہت سی وہ احادیث جن سے متقدمین تمسک کرتے تھے، متاخرین کی نظر میں مشکوک ہوتی چلی گئیں۔ اگر اس نکتہ کو پیش نظر رکھا جائے تو متقدمین کے بجائے متاخرین زیادہ احادیث کے تارک نظر آئیں گے۔ مگر چونکہ ان کا یہ ترک بھی ایک اجتہادی رائے اور اپنے خیال میں احتیاط فی الدین پر مبنی ہے اس لئے وہ بھی ان احادیث کے ترک میں معذور ہیں۔

تیسرا سبب. حدیث کے صحت و ضعف میں اختلاف.

شیخ ابن تیمیہ ؒ لکھتے ہیں:

"تیسرا سبب یہ ہے کہ ایک مجتہد نے اپنے اجتہاد سے ایک حدیث کو ضعیف سمجھا ہو جب کہ دوسرے طریق سے قطع نظر، دوسرے حضرات بر خلاف اس کے اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہوں خواہ حدیث کو ضعیف سمجھنے والے کا قول درست ہو۔ یا اس کے مخالف کا یا دونوں کا قول درست ہو. ان حضرات کے نظریہ کے مطابق جو کہتے ہیں کہ "ہر مجتہد صواب پر ہے"۔ (۲۷)

شیخ ؒ نے اس کے بعد حدیث کی تصحیح و تضعیف میں اختلاف کے متعدد اسباب ذکر کئے ہیں۔

چوتھا سبب. بعض احادیث کا مقررہ شرائط پر پورا نہ اترنا.

"ایک مجتہد. عادل وحافظ راوی کی خبر واحد میں ایسے شرائط کا لحاظ کرنا ضروری سمجھتا ہو.

جن کا لحاظ دوسروں کے نزدیک ضروری نہ ہو. مثلاً حدیث کو کتاب و سنت پر پیش کرنا۔ یا مثلاً حدیث جب دیگر اصول شرعیہ کے خلاف ہو تو راوی فقیہ ہونا چاہئے۔ یا مثلاً حدیث جب ایسے مسئلہ سے متعلق ہو جس کی ضرورت روزمرہ پیش آتی ہے تو اس کا مشہور ہونا"۔ (ص ۳۱)

پانچواں سبب: حدیث کا بھول جانا.

"مجتہد کو حدیث تو پہنچی تھی. اور اس کے نزدیک ثابت بھی تھی۔ مگر اسے یاد نہیں رہی"۔

اس کی دو تین مثالیں ذکر کر کے آگے لکھتے ہیں: "وہذا کثیر فی السلف والخلف ــــ یہ صورت بھی سلف و خلف میں بہت پیش آتی ہے"۔ (ص ۳۵)

شیخ ؒ نے یہاں صرف تین واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جنبی کے لئے تیمم کا مسئلہ. جس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حدیث نبوی ؐ یاد نہیں رہی تھی۔ اور حضرت عمار رضی اللہ عنہ نے انہیں یاد بھی دلایا۔ مگر پھر بھی انہیں وہ واقعہ یاد نہیں آیا۔ دوسرا واقعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور خطبہ کا جس میں انہوں زیادہ مہر رکھنے سے منع فرمایا. اور اس پر ایک عورت نے آپ کو ٹوکا. اور آیت. "وآتیتم احداھن قنطارا" انہیں یاد دلائی ــــ یہ واقعہ تو صحیح روایت سے ثابت

ہے۔ مگر اس کو زیر بحث مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اس خاتون کا اس آیت کا حوالہ دینا بھی بے محل تھا۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تادباً مع القرآن خاموش رہے۔ تیسرا واقعہ جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو ایک حدیث یاد دلانے کا ہے جس کو سن کر حضرت زبیر رضی اللہ عنہ قتال سے پلٹ گئے تھے۔

بلاشبہ بھول چوک خاصہ انسانیت اور لازمہ بشریت ہے۔ کسی خاص موقعہ پر کسی بات کا حافظہ سے اتر جانا کوئی مستبعد بات نہیں۔ بلکہ یہ بھی ظاہر ہے کہ صحیح ثبوت کے بغیر دعویٰ کر دینا غلط ہے کہ وہ فلاں بات بھول گئے ہوں گے۔ اور پھر بھول چوک بھی نادر قسم کے امور میں ہو سکتی ہے۔ جیسا کہ ابن تیمیہ ؒ کے محولہ بالا واقعات سے واضح ہے۔ روزمرہ کے معمولات کے بارے میں یہ دعویٰ اس سے بھی زیادہ غلط ہے ..... بعض حضرات نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ دعویٰ فرمایا کہ وہ رکوع کو جاتے اور اس سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا بھول گئے ہوں گے یہ ایک ایسی بات ہے کہ کوئی صاحب فہم اس کو زبان پر لانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ جس صحابی کو ابتدائے بعثت سے آخری دور نبوت تک سفرو حضر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر رہی ہو جو صحابہ کرام ؓ میں "صاحب النعل والوسادہ" کے لقب سے معروف ہو۔ اور جس کے بارے میں ارشاد نبوی ؐ ہو۔ "تمسکو العہد ابن ام عبد" اس کے بارے میں نماز کی ایک ایسی سنت کے بارے میں ..... جو دن میں بیسیوں مرتبہ دہرائی جاتی ہو ..... یہ دعویٰ کرنا کہ وہ بھول گئے ہوں گے۔ سوچنا چاہئے کہ کس قدر عجیب و غریب بات ہے۔

چھٹا سبب۔ دلالت حدیث سے واقف نہ ہونا۔

> "مجتہد کو دلالت حدیث کی معرفت نہ ہو۔ کبھی اس لئے کہ حدیث میں جو لفظ آیا وہ اس کے لئے اجنبی تھا ..... کبھی اس لئے کہ اس کی لغت و عرف میں اس لفظ کے جو معنی تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لغت کے خلاف تھے۔ اس نے حدیث کو اپنی لغت کے مفہوم پر محمول کیا ..... کبھی اس لئے کہ لفظ مشترک یا مجمل تھا۔ یا حقیقت و مجاز دونوں کو محتمل تھا۔ پس مجتہد نے اس کو ایسے معنی پر محمول کیا جو اس کے نزدیک اقرب تھا۔ حالانکہ مراد دوسری تھی" (ص ۳۶ تا ص ۴۲ ملخصاً)

حدیث کے کسی لفظ کی تفسیر میں اہل علم کا اختلاف تو ایک عام بات ہے۔ اور شیخ ابن تیمیہ ؒ نے مثالیں بھی اسی کی دی ہیں۔ لیکن یہ بات ناقابل فہم ہے کہ مجتہد کو دلالت حدیث کی معرفت ہی نہ ہو۔ کیونکہ لغت اور طرق دلالات کی معرفت تو اجتہاد کی شرط اول ہے۔ پس ایسا شخص مجتہد کیونکر ہو گا۔

ساتواں سبب. حدیث کا اس مسئلہ پر دلالت نہ کرنا.

"مجتہد کا اعتقاد یہ ہو کہ حدیث میں اس مسئلہ کی دلالت نہیں۔ اس سبب کے درمیان اور اس سے پہلے سبب کے درمیان فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں وہ یہی نہیں جانتا تھا کہ یہ لفظ اس مفہوم پر دلالت کرتا ہے یا نہیں؟ لیکن اس ساتویں صورت میں وہ دلالت کی وجہ کو تو وہ جانتا ہے. لیکن اس کے نزدیک اصول کی روشنی میں یہ دلالت صحیح نہیں. خواہ واقع میں بھی اس کا خیال صحیح ہو یا نہ ہو"۔ (ص ۴۴)

آٹھواں سبب. دلالت کا معارض دلیل کا ہونا.

"اس کا یہ اعتقاد ہو کہ اس دلالت کے معارض دلیل موجود ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ دلالت مراد نہیں۔ مثلاً عام کے مقابلہ میں خاص کا ہونا. مطلق کے مقابلہ میں مقید کا ہونا. یا امر مطلق کے مقابلے میں ایسی چیز کا ہونا جو وجوب کی نفی کرتی ہو. یا حقیقت کے مقابلہ ایسے قرینے کا موجود ہونا جو مجاز پر دلالت کرے۔

وَهُوَ بَابٌ وَاسِعٌ اَيْضًا. فَاِنَّ تَعَارُضَ دَلَالَاتِ الْاَقْوَالِ وَتَرْجِيْحِ بَعْضِهَا عَلٰى بَعْضٍ، بَحْرٌ خِضَمٌّ (ص ۴۵)

ترجمہ:۔ اور یہ باب بھی بہت ہی وسیع ہے کیونکہ الفاظ کی دلالتوں کا متعارض ہونا اور بعض کو بعض پر ترجیح دینا ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔

نواں سبب. حدیث کے ضعف یا نسخ یا تاویل پر معارض کا موجود ہونا.

"اس کا یہ اعتقاد کہ حدیث کے معارض ایسی چیز موجود ہے جو اس کے ضعف. یا نسخ یا تاویل پر (اگر وہ لائق تاویل ہو) دلالت کرتی ہے. بشرطیکہ وہ چیز بالاتفاق معارض ہونے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ جیسے کوئی آیت۔ یا حدیث۔ یا اجماع"۔ (۴۵)

دسواں سبب. مختلف فیہ معارض کا پایا جانا.

"حدیث کے معارض ایسی چیز موجود ہو جو اس کے ضعف. یا نسخ یا تاویل پر دلالت کرتی ہو۔ وہ چیز یا اس کی جنس دوسروں کے نزدیک معارض نہیں یا فی الحقیقت معارض راجح نہ ہو" (ص ۴۹)

ان دس اسباب کو ذکر کرنے کے بعد شیخ ابن تیمیہ" لکھتے ہیں:

فَهٰذِهِ الْاَسْبَابُ الْعَشْرَةُ ظَاهِرَةٌ وَفِي كَثِيْرٍ مِنَ الْاَحَادِيْثِ يَجُوْزُ اَنْ يَكُوْنَ لِلْعَالِمِ حُجَّةٌ فِي تَرْكِ الْعَمَلِ بِالْحَدِيْثِ لَمْ نَطَّلِعْ نَحْنُ عَلَيْهَا۔ فَاِنَّ مَدَارِكَ الْعِلْمِ وَاسِعَةٌ وَلَمْ نَطَّلِعْ نَحْنُ عَلٰى جَمِيْعِ مَا فِي بَوَاطِنِ الْعُلَمَاءِ (۵۲)

ترجمہ:۔ یہ دس اسباب تو بالکل ظاہر ہیں اور بہت سی احادیث میں عالم کے لئے ترک عمل بالحدیث پر کوئی ایسی حجت بھی ہو سکتی ہے جس پر ہم مطلع نہ ہوئے ہوں۔ کیونکہ علم کے مدارک بڑے وسیع ہیں اور اہل علم کے باطن میں جو کچھ ہے سب پر ہم مطلع نہیں۔

ان دو گانہ اسباب پر غور کیا جائے تو سوائے پہلے اور پانچویں سبب کے، باقی تمام امور ایسے ہیں جن کا منشاء اجتہاد کا اختلاف ہے۔ فریقین میں سے کسی کے بارے میں یہ کہنا ممکن نہیں کہ وہ قطعی غلطی پر ہے۔ اور پھر اس پر غور فرمایا جائے کہ شیخ ابن تیمیہؒ ایسا "دریائے علم" کس صفائی سے اعتراف کرتا ہے کہ تمام مدارک اجتہاد پر اطلاع پانا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ اس سے مقام اجتہاد کی گیرائی و گہرائی اور بلندی و برتری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۔

۷۔۔۔ کسی روایت پر صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم بھی اجتہادی امر ہے:

شیخ ابن تیمیہؒ کے جو اقتباسات اوپر تیسرے اور چوتھے سبب کے ذیل میں نقل کئے گئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ کسی روایت کی تصحیح و تضعیف میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے کہ ایک مجتہد کے نزدیک ایک حدیث صحیح ہو اور دوسرے کے نزدیک صحیح نہ ہو۔ گویا احادیث کی تصحیح و تضعیف ایک اجتہادی امر ہے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ بہت سی احادیث تو معنی متواتر یا مستفیض ہیں ان کے صحیح ہونے میں تو کسی اختلاف و اجتہاد کی گنجائش ہی نہیں بہت سی احادیث اگرچہ خبر واحد ہیں مگر انہیں تلقی بالقبول کی حیثیت حاصل ہے اس لئے ان کی صحت بھی نزاع و اختلاف سے بالاتر ہے۔ اور بعض احادیث وہ ہیں جن میں کسی علت خفیہ کا احتمال ہے یا جن کے راویوں میں جرح و تعدیل کی گنجائش ہے، ایسی احادیث کی تصحیح میں اختلاف رونما ہوتا ہے، بعض حضرات ایک روایت کو صحیح کہتے ہیں اور بعض اسے ضعیف تصور کرتے ہیں، چونکہ ان میں سے ہر فریق کا فیصلہ اپنے علم و اجتہاد پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ دوسرے فریق کے حق میں حجت نہیں۔ شیخ ابن ہمامؒ "فتح القدیر باب" النوافل میں لکھتے ہیں:

وَقَدْ اَخْرَجَ مُسْلِمٌ عَنْ كَثِيْرٍ فِيْ كِتَابِهٖ مِمَّنْ لَمْ يُسْلِمْ مِنْ غَوَائِلِ الْجَرْحِ ۔ وَكَذَا فِي الْبُخَارِيْ جَمَاعَةٌ تُكُلِّمَ فِيْهِمْ ۔ فَدَارَ الْاَمْرُ فِي الرُّوَاةِ عَلٰى اِجْتِهَادِ الْعُلَمَاءِ فِيْهِمْ ۔ وَكَذَا فِي الشُّرُوْطِ، حَتّٰى اَنَّ مَنِ اعْتَبَرَ شَرْطًا وَاَلْغَاهُ آخَرُ يَكُوْنُ مَا رَوَاهُ الْاٰخَرُ مِمَّا لَيْسَ فِيْهِ ذٰلِكَ الشَّرْطُ عِنْدَهٗ مُكَافِئًا لِمُعَارَضَةِ الْمُشْتَمِلِ عَلٰى ذٰلِكَ الشَّرْطِ وَكَذَا فِيْمَنْ ضَعَّفَ رَاوِيًا وَوَثَّقَهُ الْاٰخَرُ. نَعَمْ تَسْكُنُ نَفْسُ غَيْرِ الْمُجْتَهِدِ وَمَنْ لَّمْ يُخْبِرْ اَمْرَ الرَّاوِيْ بِنَفْسِهٖ اِلٰى مَا اجْتَمَعَ عَلَيْهِ الْاَكْثَرُ اَمَّا الْمُجْتَهِدُ فِيْ اِعْتِبَارِ الشَّرْطِ وَعِلْمِهٖ وَالَّذِيْ خَبَرَ الرَّاوِيْ فَلَا يَرْجِعُ اِلَّا اِلٰى رَأْيِ نَفْسِهٖ ۔ فَاِنَّ وَصْفَ الْحَسَنِ وَالصَّحِيْحِ وَالضَّعِيْفِ اِنَّمَا هُوَ بِاعْتِبَارِ السَّنَدِ ظَنًّا ۔ اَمَّا فِي الْوَاقِعِ فَيَجُوْزُ غَلَطُ الصَّحِيْحِ، وَصِحَّةُ الضَّعِيْفِ الخ (فتح القدیر ص ۳۱۸ ج ۱)

ترجمہ:۔ امام مسلمؒ نے اپنی کتاب میں ایسے بہت سے راویوں سے روایت لی ہے جو جرح سے محفوظ نہیں۔ اسی طرح صحیح بخاری میں راویوں کی ایک جماعت ہے جن پر کلام کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ کسی راوی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کا مدار علماء کے اجتہاد پر ہے۔ اسی طرح صحت حدیث کے شرائط میں بھی۔ چنانچہ اگر ایک مجتہد ایک شرط کو ضروری سمجھتا ہو اور دوسرا اسے غیر ضروری سمجھتا ہو تو وہ روایت جس کو یہ دوسرا مجتہد روایت کرتا ہے اور جس میں وہ شرط نہیں پائی جاتی وہ اس مجتہد کے نزدیک اس روایت کی ٹکر کی ہوگی جس میں وہ شرط پائی جاتی ہے۔۔۔ یہی صورت اس وقت ہوگی جب کہ ایک شخص ایک راوی کو ضعیف سمجھے اور دوسرا اس کو ثقہ کہے۔ ہاں! جو شخص خود مجتہد نہیں۔ اور جو راوی سے ذاتی واقفیت نہیں رکھتا اس کا دل اس قول سے مطمئن ہوگا جس کے اکثر لوگ قائل ہوں۔ لیکن جو شخص کسی شرط کے معتبر ہونے یا نہ ہونے میں خود مجتہد ہے اور جو راوی کے حال سے خود واقف ہے وہ کسی دوسرے کی رائے کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔۔۔ کیونکہ کسی حدیث کو حسن صحیح اور ضعیف کہنا سند کے پیش نظر غلبہ ظن کی وجہ سے ہوتا ہے۔ لیکن واقع کے اعتبار سے ممکن ہے کہ جسے صحیح کہا گیا ہے وہ غلط ہو۔ اور جسے ضعیف کہا گیا ہے وہ صحیح ہو۔

شیخ ابن ھمامؒ کی اس عبارت سے معلوم ہوا کہ صحیح بخاری یا صحیح مسلم کے بعض راویوں پر اگر بعض محدثین نے جرح کی ہے تو یہ امام بخاریؒ و مسلمؒ پر حجت نہیں۔۔۔ کیونکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دیگر حضرات کے نزدیک یہ راوی متکلم فیہ ہیں تو ہوا کریں مگر امام بخاریؒ و مسلمؒ کے نزدیک وہ

لائق اعتماد ہیں. اس لئے شیخین کے نزدیک ان کی روایت صحیح ہے۔ اسی حدیث سے انہوں نے یہ روایت لی ہیں۔

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر کوئی مجتہد کسی مسئلہ میں کسی روایت سے تمسک کرتا ہے تو اس روایت سے اس کا تمسک کرنا ہی اس روایت کی تصحیح یا تحسین ہے۔ دوسرے لوگوں کے نزدیک اگر وہ روایت صحیح یا مقبول نہیں تو دوسروں کا قول اس پر حجت نہیں. جیسا کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی احادیث پر کلام کرنے والوں کا قول امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ پر حجت نہیں۔ ان دونوں بزرگوں نے جن احادیث کو اپنی کتابوں میں لیا ہے وہ ان کے نزدیک صحیح ہیں۔ دوسروں کے نزدیک اگرچہ متکلم فیہ ہوں ـــــ ٹھیک اسی اصول پر امام ابو حنیفہؒ. امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ نے جن احادیث کو لیا ہے اور ان سے تمسک فرمایا ہے وہ ان کے نزدیک صحیح اور لائق احتجاج ہیں۔ اگر دیگر محدثینؒ کو ان پر کلام ہے تو ان کے کلام کی حیثیت اختلافی نوٹ کی سی ہوگی جو مجتہد کے فیصلے پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

اور یہاں ایک ضروری نکتہ یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ صحاح ستہ کے مؤلفین. امام ابو حنیفہؒ کے مقلد نہیں. بلکہ یا تو خود مجتہد ہیں یا دیگر ائمہ اجتہاد کے مقلد ہیں. اس لئے یہ قدرتی امر ہے کہ ان کی کتابوں میں اپنے فقہی مسلک کا رنگ غالب ہوگا۔ چنانچہ امام بخاریؒ تو جس مسلک کو اختیار کر لیتے ہیں اسی کی دلیل ذکر کرتے ہیں. اور مخالف مسلک کی حدیث خواہ ان کی شرط پر بھی ہوا سے ذکر نہیں کرتے۔ بلکہ بسا اوقات اس حدیث کو خود اپنی کتاب میں روایت کرتے ہیں مگر متعلقہ باب میں اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کرتے۔ اور دیگر ائمہ اگرچہ اکثر و بیشتر دونوں طرف کی احادیث ذکر کرتے ہیں. تاہم ان کی کتابوں میں غالب پہلو وہی نظر آتا ہے جو ان کے فقہی مسلک کے مطابق ہو۔ اس لئے صحاح ستہ کی احادیث کو حرف آخر سمجھ کر ان کے پیش نظر ائمہ احنافؒ کے خلاف یکطرفہ فیصلہ کر دینا صحیح نہیں ہوگا۔

۸ـــــ تعامل سلف کی اہمیت

تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے زمانے میں حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اور اکابر تابعینؒ کا تعامل کسی مسئلہ میں حجت قاطعہ شمار ہوتا تھا. اور احادیث کی صحت و سقم کے لئے معیار کی حیثیت رکھتا تھا جو احادیث کہ اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل کے خلاف ہوتیں انہیں شاذ منسوخ یا مؤول سمجھا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالکؒ موطا میں جگہ جگہ تعامل اہل مدینہ کا حوالہ دیتے ہیں۔ اور جو

احادیث اہل مدینہ کے تعامل کے خلاف ہوں انہیں غیر معمول بہا قرار دیتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دوسری صدی میں احادیث کے جتنے مجموعے مرتب کئے گئے ان میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے ساتھ حضرات صحابہؓ و تابعینؒ کا تعامل بھی ذکر کیا جاتا تھا ...... لیکن خیر القرون کے بعد چونکہ معیاری تعامل آنکھوں کے سامنے نہیں رہا تھا اس لئے احادیث کی صحت و سقم اور ان کے معمول بہا ہونے یا نہ ہونے کا مدار صرف سند کی صحت و ضعف اور راویوں کی جرح و تعدیل پر رہ گیا اور روایات کے مقابلہ میں تعامل سلف کی اہمیت نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو خیال ہونے لگا کہ ایک ایسی روایت جس کے راوی ثقہ ہوں ...... اس کے مقابلہ میں حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کا تعامل بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کسی روایت کے راویوں کی ثقاہت و عدالت اور فہم و دیانت کو حضرات خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے تعامل پر ترجیح دے ڈالنا نہ صرف یہ کہ صحت مندانہ طرز فکر نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اگر اسے رفض کا خفی شعبہ کہا جائے تو شائد بے جا نہ ہوگا۔ کیونکہ رفض کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ بعد کے راویوں کی روایات کے بھروسے حضرات صحابہ کرام اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کو نص نبویؐ کی مخالفت سے مطعون کیا جائے۔

اول تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے حالات سے واضح ہے کہ انہوں نے (اپنی اپنی استعداد کے مطابق) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال اور احوال کو اپنے اندر ایسا جذب کر لیا تھا کہ ان کی سیرت جمال نبویؐ کا آئینہ بن گئی تھی۔ اور پھر وہ سنت کے ایسے عاشق تھے کہ ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک سنت دنیا و مافیہا سے زیادہ قیمتی تھی، ادھر قرآن کریم میں ان کے راستہ کو "سبیل المومنین" کہہ کر ان کی اقتدا کا حکم فرمایا گیا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ خصوصاً حضرات خلفائے راشدینؓ کی اقتدا کے بارے میں جو وصیتیں اور تاکیدیں فرمائی ہیں وہ سب کو معلوم ہیں۔ ان وجوہ کے پیش نظر سنت ثابتہ وہی ہے جس پر اکابر صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کا تعامل رہا۔ اور جو روایت ان کے تعامل کے خلاف ہو وہ یا تو منسوخ کہلائے گی۔ یا اس میں تاویل کی ضرورت ہوگی۔ ایسی روایات جو تعامل سلف کے خلاف ہوں صدر اول میں "شاذ" شمار کی جاتی تھیں۔ اور جس طرح متاخرین محدثین کی اصطلاحی "شاذ" روایت حجت نہیں۔ اسی طرح متقدمین کے نزدیک ایسی شاذ روایات حجت نہیں تھیں۔

اگر بنظر تعمق دیکھا جائے تو تعامل ہی کی برکت سے ہمارے دین کا نصف حصہ عملاً متواتر ہے۔ اور تعامل ہی تعلیم و تعلم کا قوی ترین ذریعہ ہے۔ اگر تعامل کو درمیان سے ہٹا دیا جائے

تو محض روایات کو سامنے رکھ کر کوئی شخص نماز کا مکمل نقشہ بھی مرتب نہیں کر سکتا۔ جو دن میں پانچ بار پڑھی جاتی ہے. چہ جائیکہ پورے دین کا نظام مرتب کر دیا جائے. اس لئے صحیح طرز فکر یہ ہے کہ اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل اور روایات کو بیک وقت پیش نظر رکھ کر دونوں کے درمیان تطبیق دی جائے اور یہی وہ کارنامہ ہے جو ائمہ احناف رحمہم اللہ نے انجام دیا. انہوں نے کسی مسئلہ میں بھی صحابہؓ و تابعینؒ کے تعامل سے صرف نظر نہیں کیا۔ لیکن بعد کے فقہاو محدثین کو اس معیار کا قائم رکھنا مشکل تھا۔ اس لئے انہوں نے روایات کی صحت و ضعف کو اصل معیار قرار دیا۔

۹ اجتہاد و تقلید

فروعی و اجتہادی مسائل میں اجتہاد یا تقلید کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے اجتہاد و تقلید کے بارے میں بھی چند حروف لکھ دینا مناسب ہے.

صرف علم شریعت ہی نہیں بلکہ کسی بھی علم و فن میں اہل علم کی دو قسمیں ہوا کرتی ہیں. کچھ حضرات استنباط و اجتہاد کے اہل ہوتے ہیں۔ اور دوسرے حضرات ان کی روش کی تقلید اور ان کی آراپر اعتماد کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص کسی علم و فن میں خود مرتبہ اجتہاد پر فائز نہ ہو وہ اگر اس فن سے استفادہ کرنا چاہتا ہے لامحالہ اسے اہل اجتہاد کے اصول و نظریات پر اعتماد کرنا ہوگا۔

ٹھیک یہی دو صورتیں عمل بالشریعت کی ہیں۔ جو شخص شریعت میں مجتہدانہ فہم و بصیرت رکھتا ہو۔ ایک ایک باب میں شارع کے مقصد و منشا پر اس کی نظر ہو شریعت کے کلیات سے جزئیات کے استنباط کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اور استنباط کے اصول و قواعد اس کے لئے محض " دانستن " کا درجہ نہ رکھتے ہوں بلکہ یہ اس کا فطری ملکہ بن گئے ہوں اور وہ شارع کے مقاصد اور صالحین کے تعامل کی روشنی میں متعارض نصوص کی جمع و تطبیق میں مہارت رکھتا ہو۔ اسے خود اجتہاد کرنا لازم ہے۔ اور کسی مجتہد کی تقلید اس پر حرام ہے۔ لیکن جس شخص کو فہم و بصیرت کا یہ درجہ اور استنباط و اجتہاد کا یہ ملکہ حاصل نہیں. یا اجتہاد کے آلات و شرائط اور ضروریات اسے میسر نہیں۔ وہ اگر شریعت سے استفادہ کرنا چاہتا ہے تو اسے اہل اجتہاد کے فہم و بصیرت پر اعتماد لازم ہے۔ اجتہادی صلاحیتوں اور اس کے آلات و شرائط کے بغیر اگر یہ اجتہاد کرے گا تو یہ خود رائی ہوگی۔ جس کا نتیجہ زیغ و ضلال کے سوا کچھ نہیں۔

ارشاد نبویؐ ہے:

مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَأْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔ وَفِي رِوَايَةٍ مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ (مشکوٰۃ صفحہ ۳۵۔ بروایت ترمذی)

ترجمہ:۔ جس شخص نے اپنی رائے سے قرآن میں کلام کیا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنائے۔ اور ایک روایت میں ہے کہ جس نے بغیر علم کے قرآن میں کلام کیا وہ اپنا ٹھکانا دوزخ بنائے۔

ملت اسلامیہ میں جتنے لوگ کج روی کج نظری کا شکار ہوئے اگر غور و تأمل سے دیکھا جائے تو ان کی گمراہی کا یہی ایک سبب تھا کہ انہوں نے اجتہادی صلاحیتوں سے محرومی کے باوصف ائمہ اجتہاد اور سلف صالحین پر اعتماد کرنے کے بجائے خود رائی و خودروی اختیار کی۔ اور قرآن و سنت میں بر خود غلط اجتہاد کرنے بیٹھ گئے ـــــ اس سے واضح ہے کہ جس طرح جاہل کے لئے کسی عالم سے رجوع کرنا کوئی عار اور ذلت کی بات نہیں۔ بلکہ یہی اس کے مرض جہل کا علاج ہے چنانچہ حدیث نبویؐ میں ہے۔ "فانماشفاء العی السوال" (درماندہ کا علاج پوچھنا ہے) ٹھیک اسی طرح جو عالم کہ خود مرتبہ اجتہاد پر فائز نہ ہو اس کا اجتہاد پر اعتماد کرنا بھی کوئی عار اور ذلت نہیں. بلکہ ایسی حالت میں خود رائی اور ترک تقلید ننگ و عار کا موجب ہے۔

جہاں تک مرتبہ اجتہاد کے شرائط اور اس کے آلات و ضروریات کا تعلق ہے۔ ان کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ تاہم یہ پیش نظر رہنا چاہئے کہ تیسری صدی کے بعد امت میں کوئی مجتہد مطلق پیدا نہیں ہوا. امام دار قطنیؒ. امام حاکمؒ اور امام حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (جنہیں دنیا نے حافظ الدنیا کا لقب دیا ہے) وہ بھی اجتہاد مطلق کے منصب سے محروم ہیں۔ حافظ ابن تیمیہؒ اور حافظ ابن القیمؒ معقولات و منقولات کے امام اور علم کے سمندر ہیں. اس کے باوجود امام احمد بن حنبلؒ کے مقلد ہیں۔ اور جن مسائل میں ان بزرگوں نے اپنے اجتہاد سے کوئی رائے قائم فرمائی ہے اسے بھی امت میں شرف قبول حاصل نہیں ہو سکا۔ بلکہ انہیں "شاذ اقوال" کی فہرست میں جگہ ملی ہے.

ہندوستان کی زرخیز سرزمین میں امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور ان کے جلیل القدر صاحبزادوں سے بڑھ کر علوم اسلامیہ کا امام اور اسرار الٰہیہ کا رمز شناس کون ہوا ہو گا. لیکن اجتہاد مطلق کا درجہ ان کو بھی حاصل نہ ہو سکا۔ خود حضرت شاہ صاحبؒ "فیوض الحرمین" میں لکھتے ہیں کہ تین باتیں میرے عندیہ اور میلان طبع کے قطعاً خلاف تھیں. مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے میلان طبع کے علی الرغم مجھے ان کی تاکید و وصیت فرمائی:

وَثَانِيهَا الْوُصَاةُ بِالتَّقْلِيدِ بِهٰذَا الْمَذَاهِبِ الْأَرْبَعَةِ. لَا أَخْرُجُ مِنْهَا
وَالتَّوْفِيقِ مَا اسْتَطَعْتُ وَجِبِلَّتِي تَأْبَى التَّقْلِيدَ وَتَأْنَفُ مِنْهُ رَأْسًا.
وَلٰكِنْ شَيْءٌ طَلَبَ مِنِّي التَّعَبُّدَ بِهِ بِخِلَافِ نَفْسِي (فیوض الحرمین مترجم

ص ۶۴/۶۵ مطبع احمدی دہلی)

ترجمہ:۔ ان تین امور میں سے دوسری بات ان مذاہب اربعہ کی تقلید کی وصیت تھی کہ میں ان سے خروج نہ کروں۔ اور جہاں تک ممکن ہو تطبیق کی کوشش کروں۔ میری سرشت تقلید سے قطعاً انکار اور عار کرتی تھی۔ لیکن یہ ایک ایسی چیز تھی جس کا مجھے اپنے مزاج کے علی الرغم پابند کیا گیا۔

اور یہ بھی شاہ صاحبؒ نے فیوض الحرمین ہی میں تحریر فرمایا ہے:

عَرَّفَنِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّ فِي الْمَذْهَبِ الْحَنَفِي طَرِيقَةً اَنِيقَةً هِيَ اَوْفَقُ الطُّرُقِ بِالسُّنَّةِ الَّتِي جُمِعَتْ وَنُقِّحَتْ فِي زَمَانِ الْبُخَارِي وَاَصْحَابِهٖ (صفحہ ۴۸)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پہچان کرائی کہ مذہب حنفی میں ایک بہت ہی عمدہ طریقہ ہے جو اس سنت سے قریب تر ہے جو امام بخاریؒ اور ان کے رفقاء کے زمانہ میں جمع اور منقح کی گئی ہے۔

الغرض امام الہند شاہ ولی اللہ ایسی نابغہ شخصیت کو بھی اجتہاد مطلق کا مقام میسر نہیں آتا۔ بلکہ ان پر ان کے مزاج کے قطعی خلاف مذاہب اربعہ کی تقلید کی پابندی عائد کی جاتی ہے۔ اور جن چند مسائل میں حضرت شاہ صاحبؒ نے تفرد اختیار فرمایا انہیں امت میں تو کیا قبول عام نصیب ہوتا۔ خود ان کے جلیل القدر صاحبزادوں اور ان کے خاندان میں بھی ان آرا کو رواج اور فروغ میسر نہیں آیا۔

اور یہ تو خیر گذشتہ صدیوں کے اکابر تھے۔ خود ہمارے زمانہ میں حضرت امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ کی زیارت سے مشرف ہونے والے حضرات تو اب بھی موجود ہیں۔ حضرت شاہ صاحبؒ کو حق تعالیٰ نے جو علمی تبحر عطا فرمایا تھا اس کی نظیر ان کے ہمعصر علماء میں تو کیا. قرون سابقہ میں بھی خال خال ہی نظر آتی ہے. ہمارے شیخ حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ حضرت شاہ صاحبؒ سے کسی فن کا کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ساری عمر بس اسی ایک مسئلہ کی تحقیق میں گزری ہے۔ پورا کتب خانہ گویا ان کے ذہن میں ہے[۱]۔ اس بے نظیر وسعت مطالعہ. استحضار اور دقت نظر کے باوجود وہ خود ہی فرماتے ہیں:

"میرے نزدیک فقہ سے مشکل کوئی فن نہیں۔ چنانچہ میں تمام فنون میں اپنی مستقل رائے اور تجربہ رکھتا ہوں. جو چاہتا ہوں فیصلہ کرتا ہوں۔ اہل فن کے اقوال میں سے جس کو چاہتا منتخب کرلیتا ہوں۔ اور خود بھی رائے قائم کرلیتا ہوں۔ لیکن فقہ میں مقلد محض ہوں۔ اس میں نقل و روایت کے سوا میری کوئی رائے نہیں"۔ (فیض الباری ص ۱۹۷ ج ۴)

---

[۱] حاشیہ بر صفحہ ۲۹۷

اور " نفحتہ العنبر " میں حضرت ؒ کا ارشاد اس طرح نقل کیا ہے :

" میں فقہ کے سوا دیگر عقلی و نقلی فنون میں کسی امام کا مقلد نہیں ہوں ۔ ہاں ! فقہ میں امام ابو حنیفہ ؒ کا مقلد ہوں ، پس ہر علم و فن میں میری ایک مستقل رائے ہے سوائے فقہ کے ـــ اور بسا اوقات جب میں ائمہ مجتہدین کے اقوال کی تخریج میں غور کرتا ہوں تو میری فکری پرواز مدارک اجتہاد کے ادراک سے قاصر رہتی ہے اور میں ائمہ اجتہاد کے مدارک کی وسعت و گہرائی پر ششدر رہ جاتا ہوں " ۔ (ص ۸۸ طبع جدید)

پس جب یہ تمام اکابر اپنے تبحر علمی کے باوصف مجتہدین کی تقلید سے بے نیاز نہیں ۔ تو دوسرا کون ہو سکتا ہے ۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں اکابر کے اعتماد و تقلید پر ہی عمل بالسنتہ کا مدار ہے ۔ اور تقلید کے سوا کوئی چارہ کار نہیں اب خواہ کوئی امام اعظم ابو حنیفہ ، امام مالک ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کی تقلید کر لے ۔ یا بعد کے ایسے لوگوں کی جو علم و دانش ، فہم و بصیرت ، زہد و تقویٰ ، طہارت قلب اور صفائے باطن میں ان اکابر کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے [illegible]

۱۰ ـــ ائمہ فقہاء کا احترام

از خدا جوئیم توفیق ادب

بے ادب محروم گشت از فضل رب

حضرات صحابہ ؓ و اکابر تابعین ؒ کے بعد حضرات ائمہ مجتہدین ـــ امام اعظم ابو حنیفہ ، امام دار الہجرت مالک بن انس ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے فضائل و مناقب اور امت پر ان کے احسانات سب سے بڑھ کر ہیں ۔ عنایت ازلی نے ان کو دین قیم کی تبویب و تدوین کے لئے منتخب فرمایا ۔ اور انہیں بعد کے تمام اولیائے امت کا سرخیل و سرگروہ بنا دیا ۔

---

۱ ۔ نفحتہ العنبر ص ۶۷ (طبع جدید) اور مقدمہ انوار الباری حصہ دوم ص ۲۴۱ (مطبوعہ مکتبہ حقیقیہ گوجرانوالہ) سے اس سلسلہ کی ایک مثال نقل کرتا ہوں ۔ حضرت شاہ صاحب ؒ نے شیخ ابن ہمام ؒ کی فتح القدیر (۸ جلدوں) کا مطالعہ قریباً بیس دن میں فرمایا تھا کتاب الحج تک اس کی تلخیص بھی فرمائی تھی ۔ اور اس میں صاحب ہدایہ پر شیخ ؒ کے انتقادات کا جواب بھی لکھا تھا اس کے بعد دوبارہ کبھی فتح القدیر کے مطالعہ کی ضرورت نہیں ہوئی ایک بار تحدث نعمت کے طور پر فرمایا :

چھبیس سال ہوئے پھر مراجعت کی ضرورت نہیں پڑی ۔ اور جو مضمون اس کا بیان کروں گا اگر مراجعت کرو گے تفاوت کم پاؤ گے " ۔

حق تعالیٰ شانہ کے کسی مقبول بندے سے عداوت و دشمنی اور اس کی شان میں گستاخی و بے ادبی بہت ہی سنگین جرم ہے. حدیث صحیح کے مطابق ایسے شخص کے خلاف حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے اعلان جنگ ہے جو کسی مقبول بارگاہ الٰہی کی بے ادبی کا مرتکب ہو۔ حق تعالیٰ شانہ بہت ہی غیور ہیں۔ اور جو شخص ان مقبولان الٰہی کی پوستین دری کرے۔ غیرت الٰہی اسے ہلاک کر دیتی ہے۔ حق تعالیٰ شانہ اپنے بعض مقبول بندوں کی محبت و عداوت کو سنت و بدعت اور ہدایت و ضلالت کی علامت بنا دیتے ہیں. انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد نوع انسانی میں کامل ترین فرد علی الترتیب۔ حضرت ابو بکر صدیق و عمر فاروق رضی اللہ عنہما ہیں۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ کی حکمت ہے کہ ایک گروہ ان کی اور ان کی رفقاء کی عداوت اور توہین و تنقیص کو اپنا دین و ایمان سمجھتا ہے۔ اور ائمہ میں سب سے اقدم و اکمل امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ ہیں۔ جنہیں اکابر امت نے "امام الائمہ" اور "امام اعظم" کا لقب دیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ محرومان توفیق کا ایک طبقہ ان کی تخفیف شان اور اہانت و گستاخی کو سرمایہ سعادت سمجھتا ہے۔ نہ پہلے گروہ کی عداوت شیخینؓ سے ان دونوں بزرگوں کا کچھ بگڑا اور نہ اس دوسرے گروہ کی عداوت و گستاخیوں سے امام ابو حنیفہؒ کے فضل و کمال ہی میں کوئی کمی آئی. بلکہ یقین ہے کہ ان اکابر کے درجات اس سے بلند ہوئے ہوں گے۔ البتہ اس کا صدمہ ہے کہ ان اکابر کی عداوت کتنے ہی لوگوں کو کھا گئی۔۔۔۔۔۔

حضرت امام اعظمؒ کی جلالت قدر کا اندازہ ان امتیازی خصوصیات سے ہوتا ہے جو ائمہ اربعہ میں ان کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہوئیں۔ مثلاً

۱۔۔۔۔ وہ باتفاق اہل نقل تابعی ہیں. اور انہوں نے بعض صحابہؓ کی زیارت سے مشرف ہو کر انوار صحابیت کو اپنی آنکھوں میں جذب کیا ہے۔ اور یہ سعادت ان کے سوا دیگر ائمہ کو نصیب نہیں ہوئی جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"طُوبٰی لِمَنْ رَاٰنِی وَلِمَنْ رَاٰی مَنْ رَاٰنِی" (فیض القدیر صفحہ ۲۸۰ ج ۴)

۲۔۔۔۔ حضرت امامؒ پہلے شخص ہیں جنہوں نے شریعت کو کتب و ابواب کی شکل میں مدون فرمایا ہے. اور ان کی اقتداء میں امام مالکؒ نے موطا لکھی۔

۳۔۔۔۔ ان کے فیضان صحبت سے ایسے ائمہ کبار تیار ہوئے جن کی نظیر سے دوسرے اکابر کے تلامذہ میں نہیں ملتی۔ چنانچہ آپ کے سیرت نگاروں نے آپ کے تلامذہ کی ایک طویل فہرست نقل کی ہے۔ جن میں اکثر ائمہ کبار ہیں۔ مثلاً مغیرہ بن مقسم الضبیؒ اور امام مالکؒ ایسے اکابر بھی آپ سے روایت کرتے ہیں۔ اور زکریا بن ابی زائدہ۔ مسعر بن کدام۔ سفیان

ثوری۔ مالک بن مغول۔ یونس ابن ابی اسحاق۔ حفص بن غیاث۔ جریر بن عبدالحمید۔ عبداللہ بن المبارک۔ وکیع بن الجراح۔ یزید بن ہارون۔ مکی ابن ابراہیم۔ ابو عاصم النبیل۔ عبدالرزاق بن ہمام۔ ابو یوسف القاضی۔ داؤد بن نصیر الطائی اور فضیل بن عیاض رحمہم اللہ ایسے اکابر کو حضرت امامؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے...... غور فرمایا جائے کہ بعد کی امت کا کون شخص ہے جو حضرت امامؒ کے ان فیض یافتوں کا خوشہ چین نہیں۔

۴۔۔۔۔ اور حضرت امامؒ کا ایک اہم ترین امتیاز یہ ہے کہ ان کے فقہی مسائل محض ان کی ذاتی و انفرادی رائے نہیں. بلکہ فقہاء و محدثین اور عباداللہ الصالحین کی ایک بڑی جماعت نے غور و فکر اور بحث و تمحیص کے بعد ان کی منظوری دی ہے۔

شیخ ابن حجر المکیؒ "الخیرات الحسان" فصل دوم میں لکھتے ہیں:

"ایک شخص نے امام وکیع بن جراحؒ کی موجودگی میں یہ کہہ دیا کہ ابو حنیفہ نے غلطی کی ہے۔ امام وکیعؒ نے اسے ڈانٹ پلائی اور فرمایا جو شخص ایسی بات کہے وہ چوپاؤں کی مانند ہے. بلکہ ان سے بڑھ کر گم کردہ راہ...... وہ کیسے غلطی کر سکتے تھے. حالانکہ ان کے پاس امام ابو یوسفؒ اور امام محمد ایسے ائمہؒ فقہ موجود تھے. فلاں فلاں ائمہ حدیث موجود تھے۔ فلاں فلاں ائمہ لغت و عربیت موجود تھے۔ اور فضیل بن عیاضؒ اور داؤد الطائی ایسے ائمہ زہد و ورع موجود تھے۔

وَمَنْ كَانَ اَصْحَابُهٗ هٰؤُلَاءِ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَ - لِاَنَّهٗ اِنْ اَخْطَأَ رَدُّوْهُ لِلْحَقِّ (صفحہ ۲۸)

ترجمہ:۔ اور جس کے رفقاء یہ لوگ ہوں وہ غلطی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اگر وہ غلطی کرتا تو یہ حضرات اسے ضرور حق کی طرف لوٹا دیتے۔

حضرت امامؒ کے علوم کتاب و سنت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ جس کی واضح دلیل ہے کہ جرح و تعدیل کے امام یحییٰ بن سعید القطان...... ان کے شاگرد یحییٰ بن معینؒ. الامام الثقة الثبت لیث بن سعدؒ امام شافعیؒ کے استاذ امام وکیع بن جراح اور امام بخاریؒ کے استاذ کبیر امام مکی بن ابراہیم (رحمہم اللہ) ایسے جہابذہ محدثین حضرت امامؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ اور امام عبداللہ بن المبارکؒ کو. جنہیں دربار علم سے امیر المؤمنین فی الحدیث کا خطاب ملا ہے۔ حضرت امامؒ سے تلمذ پر فخر تھا۔

مناسب ہے کہ حضرت امامؒ کے معاصرین اور بعد کے چند اکابر کے کچھ جملے حضرت امامؒ کے حق میں نقل کر دیئے جائیں۔

۱۔۔۔ امام محمد بن سیرینؒ (م ۱۱۰): حضرت امامؒ کے اس خواب کا ذکر قریباً سبھی نے کیا ہے کہ گویا آپ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر مبارک کھول رہے ہیں۔ امام محمد بن سیرینؒ سے اس کا ذکر کیا گیا تو فرمایا "یہ شخص علوم نبوت کو پھیلائے گا"۔ (مناقب ذہبی ص ۲۲)

۲۔۔ امام مغیرہ بن مقسم الضبیؒ (م ۱۳۶ھ): جریر بن عبدالحمیدؒ کہتے ہیں کہ موصوف نے مجھے تاکید فرمائی: "امام ابو حنیفہؒ کی خدمت میں حاضری دیا کرو۔ فقیہ بن جاؤ گے۔ اور اگر ابراہیم نخعیؒ حیات ہوتے تو وہ بھی ان کی ہم نشینی اختیار کرتے"۔ (مناقب ذہبی ص ۱۹)

۳۔۔۔ امام اعمش (سلیمان بن مہران م ۱۴۷ھ): حضرت امامؒ سے مسائل دریافت فرماتے تھے۔ اور آپ کی تحسین فرماتے تھے۔ ایک بار ان سے ایک مسئلہ دریافت کیا گیا تو فرمایا "اس کا صحیح جواب ابو حنیفہؒ ہی دے سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کے علم میں برکت دی گئی ہے"۔ جریر کہتے ہیں کہ امام اعمشؒ سے دقیق مسائل پوچھے جاتے تو حضرت امامؒ کے پاس بھیج دیتے

(مناقب ذہبی ص ۱۸)

۴۔۔۔ امام ابن جریج (عبدالملک بن عبدالعزیزؒ م ۱۵۰ھ): حضرت امامؒ کی وفات کی خبر سن کر فرمایا: "آہ! کیسا علم جاتا رہا (تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۳۸ اور ایک روایت میں ہے"۔ اللہ تعالیٰ ان پر رحمت فرمائے۔ ان کے ساتھ بہت سا علم جاتا رہا"۔ (مناقب ذہبی ص ۱۸)

۵۔۔۔ امام علی بن صالحؒ (م ۱۵۱ھ) نے حضرت امامؒ کی وفات پر فرمایا: "عراق کا مفتی اور فقیہ چل بسا"۔ (مناقب ذہبی ص ۱۸)

۶۔۔۔ امام مسعر بن کدامؒ (م ۱۵۳ھ) "مجھے کوفہ کے دو شخصوں کے سوا کسی پر رشک نہیں آتا۔ ابو حنیفہؒ پر ان کی فقہ میں۔ اور حسن بن صالحؒ پر ان کے زہد میں"۔

(تاریخ بغداد ص ۳۳۸ ج ۱۴)

نیز فرماتے تھے: "اللہ تعالیٰ ابو حنیفہؒ پر رحمت فرمائے وہ بڑے فقیہ عالم تھے"۔

(مناقب ذہبی ص ۱۸)

نیز فرماتے تھے: "ہم نے ابو حنیفہؒ کے ساتھ علم حدیث حاصل کرنا شروع کیا تو وہ ہم پر غالب

آ گئے۔ ہم زہد میں مشغول ہوئے تو ہم سے آگے نکل گئے۔ ہم نے ان کے ساتھ علم فقہ حاصل کرنا شروع کیا تو اس میں انہوں نے جو کارنامہ سرانجام دیا وہ تم دیکھ ہی رہے ہو"۔
(مناقب ذہبی ۲۷)

۷۔۔۔ امام اوزاعیؒ (عبدالرحمٰن بن عمرو م ۱۵۷ھ): "وہ پیچیدہ اور مشکل مسائل کو سب لوگوں سے زیادہ جانتے ہیں"۔ (مناقب کردری ص ۹۰ ج اتبییض الصحیفہ ص ۲۸)

۸۔۔۔ امام عبدالعزیز بن ابی رواد (م ۱۵۹ھ): "جو شخص امام ابو حنیفہؒ سے محبت رکھتے وہ سنی ہے۔ اور جو ان سے بغض رکھے وہ بدعتی ہے"۔ اور ایک روایت میں ہے: "ہمارے پاس لوگوں کے جانچنے کے لئے ابو حنیفہؒ معیار ہیں۔ جو ان سے محبت اور دوستی رکھے وہ اہل سنت میں سے ہے۔ اور جو ان سے بغض رکھے. ہمیں معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بدعتی ہے۔"
(الخیرات الحسان ص ۳۲)

۹۔۔۔ امام شعبہ بن الحجاجؒ (م ۱۶۰ھ): "اللہ کی قسم! امام ابو حنیفہؒ بہت عمدہ فہم اور جید حافظہ کے مالک تھے۔ لوگوں نے آپ پر ایسی باتوں میں طعن و تشنیع کی جن کو وہ ان لوگوں سے زیادہ جانتے تھے۔ اللہ کی قسم! یہ لوگ اپنی اس بدگوئی کی سزا خدا تعالیٰ کے یہاں پائیں گے"۔ امام شعبہؒ حضرت امامؒ کے حق میں بکثرت دعائے رحمت کیا کرتے تھے۔
(مناقب ذہبی ص ۱۸، الخیرات ص ۳۲)

۱۰۔۔۔ امام داؤد بن نصیر الطائیؒ (م ۱۶۰ھ): "آپ ایک روشن ستارہ تھے جس سے راہ رو رات کی تاریکیوں میں راستہ پاتا ہے۔ آپ کے پاس وہ علم تھا جس کو اہل ایمان کے قلوب قبول کرتے ہیں"۔ (الخیرات ص ۳۲)

۱۱۔۔۔ امام سفیان بن سعید الثوریؒ (م: ۱۶۱ھ): ایک شخص حضرت امامؒ کے پاس آیا تھا۔ امام ثوریؒ نے اس سے فرمایا: "تم روئے زمین کے سب سے بڑے فقیہ کے پاس سے آئے ہو"۔۔۔ نیز فرمایا: "جو شخص حضرت امامؒ کی مخالفت کرتا ہے اسے اس کی ضرورت ہے کہ علو مرتبت اور وفور علم میں آپ سے بڑھ کر ہو۔ لیکن بعید ہے کہ کوئی ایسا بن کر دکھائے"۔
(الخیرات ص ۳۹)

۱۲۔۔۔ امام دار الہجرت مالکؒ بن انس (م: ۱۷۹ھ) نے حضرت امامؒ کے بارے میں فرمایا: "سبحان اللہ میں نے ان جیسا آدمی نہیں دیکھا۔" نیز فرمایا: "اگر وہ اس ستون کے بارے میں دعویٰ کریں کہ سونے کا ہے تو اسے دلیل سے ثابت کر دیں گے۔"

(الخیرات ص ۳۶)

۱۳ــــــ امام عبداللہ بن المبارکؒ (م: ۱۸۱ھ) حضرت امامؒ کے مایہ ناز شاگرد ہیں۔ اور آپ کی مدح و توصیف میں ان کے بہت اقوال ہیں فرماتے تھے: "لوگ جب حضرت امامؒ کا ذکر برائی سے کرتے ہیں تو مجھے بہت ہی صدمہ ہوتا ہے۔ اور مجھے اندیشہ ہوتا ہے۔ کہ ان پر اللہ کا غضب ٹوٹ پڑے گا"۔ (مناقب ذہبی ۲۲) نیز فرماتے تھے: "اگر اللہ تعالیٰ، امام ابو حنیفہؒ اور سفیانؒ کے ذریعہ میری دستگیری نہ کرتا تو میں بدعتی ہوتا۔"

(مناقب ذہبی ص ۱۸)

۱۴ــــــ امام حفص بن غیاثؒ (م ۱۹۵ھ): "حضرت امام ابو حنیفہؒ کا کلام بال سے زیادہ باریک ہے، اور اس میں عیب چینی صرف جاہل ہی کر سکتا ہے۔" (مناقب ذہبی ص ۲۰)

۱۵ــــــ امام وکیع بن الجراحؒ (م: ۱۹۶ھ): "میں نے حضرت امامؒ سے زیادہ فقیہ اور ان سے اچھی نماز پڑھنے والا کسی کو نہیں دیکھا"۔ (الخیرات الحسان ص ۳۱) یحیٰ بن معینؒ فرماتے ہیں: "میں نے کسی کو نہیں دیکھا جسے وکیع بن جراح پر ترجیح دوں۔ اور وہ امام ابو حنیفہؒ کے قول پر فتویٰ دیتے تھے۔ اور ان کی احادیث کے حافظ تھے۔ انہوں نے حضرت امامؒ سے بہت زیادہ احادیث سنی تھیں"۔ (جامع بیان العلم: ابن عبدالبر ص ۱۴۹ ج ۲)

۱۶ــــــ امام سفیان بن عینیہ (م: ۱۹۸ھ) "میری آنکھوں نے ابو حنیفہؒ جیسا شخص نہیں دیکھا۔" (مناقب ذہبی ص ۱۹)۔ "دو چیزوں کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ کوفہ کے پل سے پار بھی نہیں جائیں گی۔ مگر وہ تو زمین کے آخری کناروں تک پہنچ گئیں۔ ایک حمزہ کی قرات اور دوسری ابو حنیفہؒ کی فقہ"ــــــ

(تاریخ بغداد ص ۳۴۷ ج ۱۳، مناقب ذہبی ص ۲۰)

۱۷ــــــ امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ (م ۱۰۹ھ): "میں ناقل حدیث ہوں ــــــ سفیان ثوریؒ علماء کے امیر المومنین ہیں۔ سفیان بن عینیہ امیر العلماء ہیں۔ شعبہ حدیث کی کسوٹی ہیں۔ عبداللہ بن مبارکؒ حدیث کے صراف ہیں۔ یحیٰ بن سعید القطان قاضی العلماء ہیں۔ اور ابو حنیفہؒ علماء کے قاضی القضاۃ ہیں۔ جو شخص تم سے اس کے علاوہ کچھ اور کہے اسے بنو سلیم کے کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دو"۔ (مناقب موفق ص ۲۵ ج ۲)

۱۸ــــــ امام یحیٰ بن سعید القطان (م ۱۹۸ھ): "ہم اللہ کے سامنے جھوٹ نہیں بولتے "یعنی خدا گواہ ہے کہ" ہم نے امام ابو حنیفہؒ سے اچھی رائے کسی کی نہیں سنی۔ اور ہم نے ان کے اکثر اقوال کو لیا ہے۔" (تاریخ بغداد ص ۳۴۵ ج ۱۳، مناقب ذہبی ص ۱۹)

۱۹۔۔۔۔ علی بن عاصم الوسطیؒ (م ۲۰۱ھ): "اگر امام ابو حنیفہؒ کی عقل کا نصف اہل زمین کی عقل سے موازنہ کیا جائے تب بھی حضرت امامؒ کا پلہ بھاری رہے گا"۔
(مناقب ذہبی ص ۲۳)

نیز فرماتے تھے: "اگر امام ابو حنیفہؒ کا علم ان کے اہل زمانہ کے علم سے تولا جائے تو امام کے علم کا پلہ بھاری ہو گا۔" (مناقب ذہبی ص ۲۰)

۲۰۔۔۔۔ امام شافعی (محمد بن ادریسؒ م ۲۰۴ھ): "لوگ فقہ میں امام ابو حنیفہؒ کے عیال ہیں"۔ (مناقب ذہبی ص ۱۹) "جو شخص فقہ میں تبحر حاصل کرنا چاہتا ہے وہ امام ابو حنیفہؒ کا محتاج ہے"۔ امام ابو حنیفہؒ فقہ کے لئے موفق تھے۔" "جو شخص فقہ میں معرفت حاصل کرنا چاہتا ہو وہ امام ابو حنیفہؒ کے اصحاب کو لازم پکڑے"۔ (تاریخ بغداد ص ۳۴۶ ج ۱۳) "لوگ علم کلام میں امام ابو حنیفہؒ کے خوشہ چین ہیں"۔ (تاریخ بغداد ص ۱۶۱ ج ۱۳) "امام شافعیؒ نے ایک بار حضرت امامؒ کی قبر کے پاس صبح کی نماز پڑھی تو اس میں قنوت نہیں پڑھی۔ وجہ دریافت کی گئی تو فرمایا: اس صاحب قبر کا ادب مانع ہوا" (الخیرات ص ۶۳)

۲۱۔۔۔۔ امام نضر بن شمیلؒ (م ۲۰۴ھ): لوگ علم فقہ سے خواب میں تھے۔ امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کی شرح و تفصیل کر کے انہیں بیدار کر دیا۔" (الخیرات ص ۳۱)

۲۲۔۔۔۔ امام یزید بن ہارونؒ (م ۲۰۶ھ): "میں نے جن لوگوں کو دیکھا ہے ان میں ابو حنیفہؒ سے بڑا فقیہ کسی کو نہیں دیکھا۔" (مناقب ذہبی ص ۲۹) میں نے ابو حنیفہؒ سے بڑھ کر کوئی عاقل۔ افضل اور صاحب ورع نہیں دیکھا۔" (مناقب ذہبی ۲۹) "میں نے ان سے زیادہ حلیم نہیں دیکھا۔ ان کے پاس فضیلت تھی دین تھا۔ پرہیز گاری تھی۔ زبان کی حفاظت تھی۔ اور مفید کاموں کی طرف توجہ تھی" (الخیرات ص ۵۳)

۲۳۔۔۔۔ امام عبداللہ بن داؤد الخریبی: (م ۲۱۳ھ): "اہل اسلام پر واجب ہے کہ اپنی نمازوں میں حضرت امام ابو حنیفہؒ کے لئے دعا کیا کریں۔" تاریخ بغداد (ص ۳۴۴ ج ۱۳، مناقب ذہبی ص ۱۹)

۲۴۔۔۔۔ امام مکی بن ابراہیمؒ (م ۲۱۵ھ): "حضرت امامؒ اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم تھے"۔ (تاریخ بغداد ص ۳۴۵ ج ۱۳، مناقب ذہبی ص ۱۹)

۲۵۔۔۔۔ محدث عبیداللہ بن عائشہؒ: (۲۲۸ھ) ایک دفعہ انہوں نے امامؒ کی سند سے ایک حدیث بیان فرمائی تو حاضرین میں سے کسی نے کہا نہیں ہمیں ان کی حدیث نہیں چاہیئے۔ انہوں نے

فرمایا: "میاں! تم نے ان کو دیکھا نہیں۔ دیکھ لیا ہوتا تو تمہیں ان کی چاہت ہوتی۔ تمہاری اور ان کی حالت اس شعر کے مطابق ہے۔

اَقِلُّوْا عَلَيْهِ وَيْحَكُمْ لَا اَبَا لَكُمْ   مِنَ اللَّوْمِ اَوْ سُدُّوْا الْمَكَانَ الَّذِیْ سَدَّا

(تاریخ بغداد صہ ۳۶۰ ج ۱۳)

(تمہارا ناس ہو جائے اس پر ملامت کم کرو.   یا وہ کام کر کے دکھاؤ جو اس نے کیا)

۲۶____ امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین" : (م ۲۳۳ھ). حافظ ذہبی اپنے رسالہ "الرواۃ الثقات المتکلم فیہم بمالا یوجب ردھم" ص ۷ میں لکھتے ہیں کہ "ابن معین حنفیہ میں سے غالی قسم کے حنفی ہیں۔ اگرچہ محدث ہیں۔" (ما تمس الیہ الحاجۃ لمن یطالع سنن ابن ماجہ۔ ص ۲۷) فرمایا کرتے تھے. "میرے نزدیک قرات بس ہے تو حمزہ کی۔ اور فقہ امام ابو حنیفہ" کی"۔ (تاریخ بغداد ص ۳۴۷ ج ۱۳)

۲۷____ امام اہل سنت احمد بن محمد بن حنبل شیبانی" : (م ۲۴۱ھ) : ابو بکر مروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد بن حنبل" کو یہ فرماتے ہوئے خود سنا ہے کہ "ہمارے نزدیک امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی طرف خلق قرآن کے قول کی نسبت صحیح نہیں۔" میں نے عرض کیا: "الحمد للہ..... اے ابو عبداللہ! وہ علم کے بلند مرتبہ پر فائز تھے۔" امام احمد" نے فرمایا. "سبحان اللہ! وہ علم۔ ورع۔ زہد اور ایثار آخرت میں ایسے مقام پر فائز تھے جس پر کوئی نہیں پہنچ سکتا، انہیں اس بات پر کوڑے لگائے گئے کہ ابو جعفر منصور کے دور حکومت میں قضا کے منصب کو قبول کر لیں، مگر انہوں نے کسی طرح قبول نہیں فرمایا۔" (مناقب ذہبی ص ۲۷. الخیرات ص ۳۰)

۲۸____ امام ابو داؤد" (سلیمان بن الاشعث السجستانی (م ۲۷۵ھ) : "اللہ تعالیٰ امام مالک پر رحمت فرمائے وہ امام تھے۔ اللہ تعالیٰ امام ابو حنیفہ" پر رحمت فرمائے وہ امام تھے۔"

(مناقب ذہبی ص ۲۱)

۲۹____ مؤرخ ابن الندیم" (محمد بن اسحاق ___ م ۲۸۵ھ) : "بر و بحر مشرق و مغرب اور دور و نزدیک میں جو علم ہے وہ آپ ہی کا مدون کردہ ہے۔ رضی اللہ عنہ"۔

(فہرست ابن ندیم ص ۲۹۹)

۳۰____ حافظ مغرب ابو عمر ابن عبد البر المالکی" ۴۶۳ھ) :

"جن حضرات نے حضرت امام" سے روایت لی ہے اور آپ کی توثیق کی ہے۔ اور آپ کی مدح و توصیف فرمائی ہے وہ زیادہ ہیں بہ نسبت ان لوگوں کے جنہوں نے آپ پر نکتہ چینی کی ہے۔ اور جن

محدثین نے آپ پر نکتہ چینی کی ہے، ان کا بیشتر اعتراض یہ ہے کہ آپ رائے اور قیاس سے بہت کام لیتے ہیں۔ اور آپ ارجا کے قائل ہیں (یعنی اعمال کی نفی سے ایمان کی نفی نہیں ہوتی) ـــــ داناؤں کا قول ہے کہ گزشتہ بزرگوں میں کسی شخصیت کے عبقری ہونے کی علامت یہ ہے کہ اس کے بارے میں دو متضاد انتہاپسندانہ رائیں ہوں۔ جیسے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بارے میں دو گروہ ہلاک ہوئے۔ ایک حد سے بڑھ کر دوستی کرنے والا۔ اور دوسرا حد سے بڑھ کر دشمنی کرنے والا اور حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا کہ "تیرے بارے میں دو گروہ ہلاک ہوں گے۔ ایک محب مفرط۔ دوسرا مبغض مفتری" ۔ اور وہ عبقری شخصیتیں جو دین و فضل میں آخری حد تک پہنچ گئی ہوں ان میں لوگوں کی اسی طرح متضاد اور انتہا پسندانہ رائیں ہوا کرتی ہیں۔ " (جامع البیان العلم ص ۱۴۹)

۳۱ ـــــ امام حجتہ الاسلام ابو حامد محمد الغزالی الشافعیؒ (۵۰۵ھ) : "اللہ کی قسم! جو طالب غالب، مدرک، مہلک۔ ضار۔ اور نافع ہے اور جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ امت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں سے معانی فقہ کے حقائق میں سب سے زیادہ غوطہ زن ہیں۔ "

(امام غزالیؒ کا خط مندرجہ "فضائل الانام من رسائل حجتہ الاسلام" مطبوعہ ایران ۱۳۲۳ھ

منقول از تعلیقات مقدمہ کتاب التعلیم ص ۶۱. از مولانا محمد عبدالرشید نعمانی مدفیضہ

حضرت امامؒ کے حق میں اکابر امت کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں توصیفی کلمات میں سے یہ چند جملے نقل کئے ہیں۔ ان سے ہر منصف کو اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت امامؒ زہد وورع، خوف و خشیت، علم و فضل، دیانت و تقویٰ، عقل و دانش اور دیگر اوصاف خیر میں اپنے دور میں بھی (جو خیر القرون کا دور تھا) فائق الاقران تھے، بعد کی امت فقہ انہی کی خوشہ چین ہے۔ یہی راز ہے کہ حق تعالیٰ شانہ نے نصف سے زائد امت کو ان کی اقتداء پر جمع کر دیا ـــــ اس کے باوجود جو لوگ ایسے مقبول بارگاہ الٰہی سے سوئے ظن رکھتے ہیں، ان کی حالت پر حسرت و افسوس کے سوا کیا عرض کیا جا سکتا ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ کے الفاظ میں:

"وائے ہزار وائے از تعصبہائے بارد ایشاں، واز نظرہائے فاسد ایشاں۔ بانی فقہ ابو حنیفہؒ است، و سہ حصہ از فقہ اور اسلم داشتہ اند۔ و در ربع باقی ہم شرکت دارند باوے، در فقہ صاحب خانہ اوست۔ و دیگراں، ہمہ عیال دے اند ـــــ باوجود التزام ایں مذہب مرا با امام شافعیؒ گویا محبت ذاتی است، و بزرگ میدانم، لہذا در بعضے اعمال نافلہ تقلید مذہب اومی نمایم۔ اما چہ کنم کہ دیگراں را باوجود وفود علم و کمال تقویٰ در جنب امام ابی حنیفہؒ در رنگ طفلاں می یابم۔ والا مرالی

اللہ سبحانہ۔" (مکتوبات امام ربانی، دفتر دوم مکتوب نمبر ۵۵)
ترجمہ:۔ "افسوس! ہزار افسوس! ان کے تعصب بارد اور ان کی نظر فاسد پر، فقہ کے بانی ابو حنیفہ" ہیں۔ اور علمائے فقہ کے تین حصے آپ کے لئے مسلم رکھے ہیں۔ اور باقی چوتھائی میں دوسرے حضرات آپ کے ساتھ شریک ہیں۔ فقہ میں صاحب خانہ وہ ہیں۔ اور دوسرے ان کے عیال ہیں ـــــ مذہب حنفی کے التزام کے باوجود امام شافعی" کے ساتھ مجھے گویا ذاتی محبت ہے اور ان کی عظمت و بزرگی کا قائل ہوں۔ اس لئے بعض نفلی اعمال میں ان کے مذہب کی تقلید کرتا ہوں۔ لیکن کیا کروں، دوسرے حضرات کو وفود علم اور کمال تقویٰ کے باوجود، امام ابو حنیفہ" کے مقابلے میں بچوں کے رنگ میں پاتا ہوں"۔

اس بحث کے آخر میں مناسب ہے کہ حضرت مولانا میر محمد ابراہیم سیالکوٹی" (م ۱۳۷۵ھ) کی کتاب "تاریخ اہل حدیث" سے دو اقتباس نقل کر دیئے جائیں:

ایک زمانے میں موصوف کو حضرت امام" کے خلاف لکھنے کا کچھ خیال ہوا۔ لیکن حق تعالیٰ شانہ نے ان کے دین و تقویٰ اور صفائے باطن کی برکت سے انہیں اس بلا سے محفوظ رکھا۔ مولانا مرحوم خود لکھتے ہیں:

> "اس مقام پر اس کی صورت یوں ہے کہ جب میں نے اس مسئلہ کے لئے کتب متعلقہ الماری سے نکالیں اور حضرت امام صاحب" کے متعلق تحقیقات شروع کی تو مختلف کتب کی ورق گردانی سے میرے دل پر کچھ غبار آگیا جس کا اثر بیرونی طور پر یہ ہوا کہ دن دوپہر کے وقت جب سورج پوری طرح روشن تھا۔ یکایک میرے سامنے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ گویا "ظلمت بعضہا فوق بعض" کا نظارہ ہو گیا۔ معاً خدا تعالیٰ نے میرے دل میں ڈالا کہ یہ حضرت امام صاحب" سے بد ظنی کا نتیجہ ہے، اس سے استغفار کرو۔ میں نے کلمات استغفار دھرانے شروع کیے، وہ اندھیرے فوراً کافور ہو گئے۔ اور ان کے بجائے ایسا نور چمکا کہ اس نے دوپہر کی روشنی کو مات کر دیا اس وقت سے میری امام صاحب" سے حسن عقیدت اور بڑھ گئی، اور میں ان مخصوں سے، جن کو حضرت امام صاحب" سے حسن عقیدت نہیں ہے، کہا کرتا ہوں کہ میری اور تمہاری مثال اس آیت کی مثال ہے کہ حق تعالیٰ شانہ منکرین معارج قدسیہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے: "افتمارونہ علیٰ مایریٰ۔" میں نے جو کچھ عالم بیداری و ہوشیاری میں دیکھ لیا اس میں مجھ سے جھگڑا کرنا بے سود ہے۔" (تاریخ اہل حدیث ص ۷۲)

دوسری جگہ مشہور اہل حدیث عالم حضرت مولانا حافظ محمد عبدالمنان وزیر آبادی" کے حالات میں لکھتے ہیں:

"آپ ائمہ دین کا بہت ادب کرتے تھے۔ چنانچہ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص ائمہ دین اور خصوصاً امام ابو حنیفہ" کی بے ادبی کرتا ہے اس کا خاتمہ اچھا نہیں ہوتا۔" (تاریخ اہل حدیث ص ۴۲۰)

منقول از "مقام ابی حنیفہ" از مولانا محمد سرفراز خان صفدر مد ظلہ ص ۱۴۸، ۱۴۹)

حق تعالیٰ شانہ اس آفت سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ اور اور سب کا خاتمہ بالخیر فرمائے۔

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات   با دردکشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

ترجمہ:۔ بس تجربہ کرلیا ہم نے اس مکافات کی دنیا میں۔ کہ جو (شراب محبت) کی تلچھٹ پینے والوں کے ساتھ الجھا وہ تباہ ہوگیا۔

ان تمہیدی نکات کے بعد اب الات کے جوابات عرض کرتا ہوں۔

سوال اول: کیا صحیحین کی روایت مقدم ہے؟

س ۱:۔ متفق علیہ کی احادیث اگر دیگر کتب میں موجود کسی حدیث سے متصادم ہوں تو کسے اختیار کرنا چاہئے۔

ج ۱:۔ بعض شافعیہ نے یہ اصول ذکر کیا ہے۔ کہ صحیحین کی روایت زیادہ صحیح ہے۔ پھر بخاری کی، پھر مسلم کی، پھر جو دونوں کی شرط پر مشتمل ہو۔ پھر جو ان میں سے ایک کی شرط پر مشتمل ہو۔ پھر جس میں صحت کی عام شرائط پائی جائیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ اصول محل نظر ہے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ غیر صحیحین کی روایت صحیحین کی روایت سے اصح ہو۔ یا اس کے مساوی ہو۔ شیخ ابن ہمام فتح القدیر (ص ۳۱۷ ج ۱ باب النوافل) میں لکھتے ہیں۔

وَكَوْنُ مُعَارِضِهِ فِي الْبُخَارِيِّ لَا يَسْتَلْزِمُ تَقْدِيمَهُ بَعْدَ اِشْتِرَاكِهِمَا فِي الصِّحَّةِ۔ بَلْ يُطْلَبُ التَّرْجِيحُ، مِنْ خَارِجٍ۔ وَقَوْلُ مَنْ قَالَ: "اَصَحُّ الْاَحَادِيْثِ مَا فِي ... ثُمَّ مَا انْفَرَدَ بِهِ الْبُخَارِيُّ ثُمَّ مَا انْفَرَدَ بِهِ مُسْلِمٌ۔ ثُمَّ مَا اشْتَمَلَ عَلٰى شَرْطِهِمَا مِنْ غَيْرِهِمَا ثُمَّ مَا اشْتَمَلَ عَلٰى شَرْطِ اَحَدِهِمَا" تَحَكُّمٌ لَا يَجُوْزُ التَّقْلِيْدُ

فِيهِ۔ إِذِ الْأَصَحِّيَّةُ لَيْسَ إِلَّا لِاشْتِمَالِ رُوَاتِهِمَا عَلَى الشُّرُوطِ الَّتِي اعْتَبَرَاهَا فَإِذَا فُرِضَ وُجُوْدُ تِلْكَ الشُّرُوطِ فِي رُوَاةِ حَدِيْثٍ فِي غَيْرِ الْكِتَابَيْنِ أَفَلَا يَكُوْنُ الْحُكْمُ بِأَصَحِّيَّةِ مَا فِي الْكِتَابَيْنِ عَيْنَ التَّحَكُّمِ ثُمَّ حُكْمُهُمَا أَوْ حُكْمُ أَحَدِهِمَا بِأَنَّ الرَّاوِيَ الْمُعَيَّنَ مُجْتَمِعٌ تِلْكَ الشُّرُوطَ لَيْسَ مِمَّا يُقْطَعُ فِيْهِ بِمُطَابَقَةِ الْوَاقِعِ فَيَجُوْزُ كَوْنُ الْوَاقِعِ خِلَافَهُ۔

ترجمہ:۔ اور اس حدیث کی معارض حدیث کے بخاری میں ہونے سے لازم نہیں آتا کہ بخاری کی روایت مقدم ہو۔ جب کہ دونوں صحت میں مشترک ہیں۔ بلکہ ترجیح خارج سے تلاش کی جائے گی۔ اور جس شخص نے یہ کہا کہ صحیحین کی روایت زیادہ صحیح ہے پھر بخاری کی، پھر مسلم کی، پھر جو دونوں کی شرائط پر مشتمل ہو۔ پھر جو ان میں سے ایک کی شرائط پر مشتمل ہو۔" اس کا قول محض تحکم اور سینہ زوری ہے۔ جس کی تقلید جائز نہیں۔ کیونکہ زیادہ صحیح ہونے کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ وہ حدیث ان شرائط پر مشتمل ہے۔ جو بخاریؒ و مسلمؒ نے اپنے راویوں میں ملحوظ رکھی ہیں۔ پس جب ان ہی شرائط کا وجود کسی ایسی حدیث میں فرض کیا جائے جو ان دونوں کتابوں کے علاوہ کسی اور کتاب میں ہو اس صورت میں ان دونوں کتابوں کی روایت کو اصح کہنا محض سینہ زوری نہیں تو اور کیا ہے۔

پھر بخاری و مسلم کا یا ان میں سے کسی ایک کا کسی خاص راوی کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا کہ اس میں یہ سب شرائط پائی جاتی ہیں ایسی چیز نہیں جو قطعی طور پر واقع کے مطابق بھی ہو۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ واقعہ اس کے خلاف ہو۔

یہاں یہ امر بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ ائمہ مجتہدین (امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ) کا زمانہ مؤلفین صحاح ستہ سے مقدم ہے۔ اس لئے صحیحین کی روایت کے راجح ہونے یا نہ ہونے کا سوال بعد کے لوگوں کے بارے میں تو پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ائمہ مجتہدین کے حق میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ائمہ مجتہدین کے سامنے مرفوع، موقوف، مرسل احادیث اور صحابہ و تابعین کے فتاویٰ اور خیر القرون کے تعامل کا پورا ذخیرہ موجود تھا۔ انہوں نے ان تمام امور کی روشنی میں فقہی مسائل کو مدون کیا اور مختلف فیہ مسائل میں اپنے اپنے مدارک اجتہاد اور فہم و بصیرت کے مطابق بہتر سے بہتر پہلو کو اختیار کیا۔

محدثین کا منصب احادیث و روایات کو اسانید سے نقل کر دینا ہے۔ لیکن ان میں کون ناسخ ہے کون منسوخ۔ کون راجح ہے کون مرجوح، کس میں شرعی اصول اور قاعدہ ذکر کیا گیا ہے۔ اور کس

میں استثنائی صورت مذکور ہے؟ وغیرہ وغیرہ، یہ وہ امور ہیں جن کی تنقیح فقہائے امت اور ائمہ اجتہاد کا منصب ہے۔ جس طرح ہم احادیث کی تصحیح و تحسین اور راویوں کی جرح و تعدیل میں محدثین کے محتاج ہیں۔ اسی طرح کتاب و سنت کے فہم و استنباط۔ متعارض نصوص کے درمیان توفیق و تطبیق اور ترجیح میں حضرات فقہائے امت کے محتاج ہیں۔

الغرض کسی حدیث کے اصح ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ معمول بہ بھی ہو۔ یا عمل کے اعتبار سے راجح بھی ہو۔ خود صحیح بخاری میں اس کی متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ کہ حدیث صحیح بخاری میں موجود ہے۔ لیکن امام بخاریؒ کا فتویٰ اس کے مطابق نہیں۔ اور کوئی عقلمند اس چیز کو دیکھ کر امام بخاریؒ کی جانب سے سوئے ظن میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ ٹھیک اسی طرح اگر ائمہ اجتہاد کسی صحیح حدیث کو نہیں لیتے تو یقیناً اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی یہاں بھی سوئے ظن نہیں ہونا چاہئے۔

اور یہ امر بھی واضح ہے کہ امام بخاریؒ کا کسی حدیث کو اپنی کتاب میں درج کردینا ہی امام بخاریؒ کی طرف سے اس کی تصحیح ہے۔ اسی طرح ائمہ مجتہدین جب کسی حدیث سے استدلال فرماتے ہیں تو یہ ان کی طرف سے حدیث کی تصحیح ہے۔ گو بعد کے لوگوں کو وہ حدیث بسند ضعیف پہنچی ہو۔

سوال دوم . فاتحہ خلف الامام

س ۲. قرآن کریم کی کوئی آیت اگر قوی حدیث نبویؐ سے متصادم ہو تو کسے اختیار کرنا چاہئے۔ (مثلاً قرآن مجید کی ایک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ "جب قرآن پڑھا جائے تو خاموشی سے سنو) اور حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورۂ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ پڑھ لو۔ ـــــ یہ پڑھنا امام کی آیت پر سکتہ کی حالت میں یا کہ امام کے سورۃ فاتحہ تلاوت کرنے کے بعد، یا ساتھ ساتھ، یا نہ پڑھے۔۔ یا حدیث کے مطابق جس کا مفہوم ہے جو " فاتحہ نہ پڑھے اس کی نماز نہیں ہوتی۔" اگر امام کا ہی فاتحہ تلاوت کرنا کافی ہے پھر دیگر ارکان کے لئے مقتدی کا وہ کیوں ضروری ہے۔ جیسے ثناء، تسبیحات، تشہد درود وغیرہ ـــ)

ج ۲. آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات طیبہ قرآن کریم کی شرح و تفسیر ہیں۔ اس لئے واقعہ نفس الامری کے اعتبار سے قرآن کریم اور حدیث صحیح کے درمیان تعارض یا تصادم ممکن ہی نہیں اگر بظاہر تعارض نظر آئے۔ (اور ان میں سے کسی ایک کا حکم منسوخ بھی نہ ہو) تو یہ دونوں میں سے کسی ایک کے مفہوم اور منشا کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوگا۔ اور دونوں کے درمیان توفیق و

تطبیق کی ضرورت ہوگی۔ اور یہ بہت دقیق علم ہے۔ جس کے لئے غیر معمولی فہم و بصیرت اور قوت اجتہاد کی ضرورت ہے۔

زیر بحث مسئلہ قرآن کریم اور احادیث طیبہ میں کوئی تعارض نہیں۔ کیونکہ قرآن کریم کی یہ آیت۔

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الاعراف: ۲۰۴)

ترجمہ:۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس پر کان دھرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ جیسا کہ امام ابن کثیرؒ نے اس آیت کے ذیل میں صحابہ کرامؓ میں سے حضرت ابن مسعود۔ ابو ہریرہ۔ ابن عباس اور عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہم کے اور تابعین میں سے سعید بن جبیر۔ عطا بن ابی رباح۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم۔ ابراہیم نخعی۔ شعبی۔ حسن بصری۔ ابن شہاب زہری۔ مجاہد۔ قتادہ۔ اور عبید بن عمیر رحمہم اللہ کے ارشادات نقل کیے ہیں۔ (دیکھئے تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۲۸۰/۲۸۱)

حافظ ابن تیمیہؒ اپنے فتاویٰ میں فرماتے ہیں۔

وَقَدِ اسْتَفَاضَ عَنِ السَّلَفِ أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي الْقِرَاءَةِ فِي الصَّلٰوةِ وَقَالَ بَعْضُهُمْ فِي الْخُطْبَةِ وَذَكَرَ أَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ الْإِجْمَاعَ عَلَىٰ أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي ذٰلِكَ۔ (طبع قدیم ص ۱۴۳ ج ۲ طبع جدید ص ۲۶۹ ج ۲)

ترجمہ:۔ اور سلف سے استفاضہ و شہرت کے ساتھ منقول ہے کہ یہ آیت قرآت فی الصلوٰۃ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور بعض کا قول ہے کہ خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور امام احمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ اس پر اجماع ہے کہ یہ نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ (طبع قدیم ص ۱۴۳ ج ۲ طبع جدید ص ۲۶۹ ج ۲۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

أَحَدُهَا مَا ذَكَرَهُ الْإِمَامُ أَحْمَدُ مِنْ إِجْمَاعِ النَّاسِ عَلَىٰ أَنَّهَا نَزَلَتْ فِي الصَّلٰوةِ وَفِي الْخُطْبَةِ وَكَذٰلِكَ قَوْلُهُ "وَإِذَا قَرَأَ فَأَنْصِتُوا"

(ص ۳۱۲ ج ۲، ۳۱۳ ج ۲۳)

ترجمہ:۔ ایک وہ جو امام احمدؒ نے ذکر کیا ہے کہ لوگوں کا اجماع ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

اسی طرح ارشاد نبویؐ "واذا قرا فانصتوا" بھی ۔۔۔۔۔ (ص ۳۱۲ ج ۲ ۔۔۔ ص ۳۱۳ ج ۲۳)

اور موفق ابن قدامہ "المغنی" میں لکھتے ہیں۔

قَالَ اَحْمَدُ فِی رِوَایَۃِ اَبِی دَاوٗدَ : اَجْمَعَ النَّاسُ عَلٰی اَنَّ هٰذِهِ الْاٰیَۃَ
نَزَلَتْ فِی الصَّلٰوۃِ (صہ ۵۶۴ جلد اوّل)

ترجمہ:۔ ابو داؤد کی روایت ہے کہ امام احمدؒ نے فرمایا، لوگوں کا اسپرا جماع ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی۔

پس یہ آیت کریمہ نماز با جماعت میں امام اور مقتدی دونوں کا الگ الگ وظیفہ مقرر کرتی ہے کہ امام کا وظیفہ قرات ہے۔ اور مقتدی کا وظیفہ امام کی قرات کی طرف متوجہ ہونا اور خاموش رہنا ___ اس آیت کی روشنی میں مقتدی کا وظیفہ خود قرات کرنا نہیں بلکہ اس کے ذمہ یہ فرض عائد کیا گیا ہے کہ وہ خاموش رہ کر امام کی قرات کی طرف متوجہ رہے۔ اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ مقتدی کے ذمہ قرات فرض نہیں ورنہ اسے خاموشی کا حکم نہ دیا جاتا۔ بلکہ قرات کا فرض ادا کرنے کا حکم دیا جاتا شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

وَذُکِرَ الْاِجْمَاعُ عَلٰی اَنَّهٗ لَا تَجِبُ الْقِرَاءَۃُ عَلَی الْمَاْمُوْمِ حَالَۃَ الْجَهْرِ
(حوالہ بالا)

ترجمہ:۔ اور امام احمدؒ نے اس پر بھی اجماع نقل کیا ہے کہ امام جب جہری قراۃ کرے تو مقتدی کے ذمہ قرات واجب نہیں۔

موفق ابن قدامہؒ نے اس کی تفصیل امام احمدؒ کے حوالے سے یوں نقل کی ہے:

قَالَ اَحْمَدُ مَا سَمِعْنَا اَحَدًا مِّنْ اَهْلِ الْاِسْلَامِ یَقُوْلُ اِنَّ الْاِمَامَ اِذَا جَهَرَ بِالْقِرَاءَۃِ لَا تُجْزِیُٔ صَلٰوۃُ مَنْ خَلْفَهٗ اِذَا لَمْ یَقْرَاْ۔ وَقَالَ هٰذَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَصْحَابُهٗ وَالتَّابِعُوْنَ وَهٰذَا مَالِکٌ فِیْ اَهْلِ الْحِجَازِ وَهٰذَا الثَّوْرِیُّ فِیْ اَهْلِ الْعِرَاقِ وَهٰذَا الْاَوْزَاعِیُّ فِیْ اَهْلِ الشَّامِ وَهٰذَا اللَّیْثُ فِیْ اَهْلِ مِصْرَ مَا قَالُوْا الرَّجُلُ صَلّٰی وَقَرَاَ اِمَامُهٗ وَلَمْ یَقْرَاْ هُوَ صَلٰوتُهٗ بَاطِلَۃٌ (المغنی صہ ۵۶۴ ج ۱)

ترجمہ:۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے اہل اسلام میں سے کسی کا یہ قول نہیں سنا کہ جب امام جہری قرات کرے تو مقتدی کی نماز صحیح نہیں ہوگی جب کہ وہ خود قرات نہ کرے۔ امام احمدؒ نے فرمایا۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ و تابعینؒ ہیں۔ یہ اہل حجاز میں امام مالکؒ ہیں۔ یہ اہل عراق میں امام ثوریؒ ہیں۔ یہ اہل شام میں امام اوزاعیؒ ہیں۔ یہ اہل مصر میں امام لیثؒ ہیں ان میں سے کسی نے یہ فتویٰ

نہیں دیا کہ جب امام قرات کرے اور مقتدی قرات نہ کرے تو مقتدی کی نماز باطل ہو جاتی ہے۔

الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ و تابعین اور ائمہ ہدیٰ نے اس آیت سے یہی سمجھا ہے کہ جب مقتدی کو خود قرات کرنے کے بجائے امام کی قرات کی طرف متوجہ ہونے اور خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے آپ سے آپ یہ لازم آتا ہے کہ مقتدی کے ذمہ قرات فرض نہیں بلکہ اس کا فریضہ امام کی قرات کی طرف متوجہ ہونا اور خاموش رہنا ہے۔ اور اسی سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ امام کی قرات صرف اس کی اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ پوری قوم کی طرف سے ہے، ورنہ مقتدیوں کی امام کی قرات کے استماع و انصات کا حکم نہ دیا جاتا۔ بلاشبہ قرات نماز میں فرض ہے، مگر مقتدی اس فرض کو خود اپنی زبان سے ادا نہیں کرے گا۔ بلکہ اس کا یہ فرض امام کی زبان سے ادا ہو گا۔ اور امام کی قرات مقتدی ہی کی قرات سمجھی جائے گی۔

الغرض یہ تین مضامین ہیں جو اس آیت کریمہ میں ارشاد ہوئے ہیں:

اول :۔ مقتدی کا کام قرات کرنا نہیں۔ بلکہ امام کی قرات کو سننا اور خاموش رہنا ہے۔

دوم :۔ قرات مقتدی کے ذمہ فرض نہیں۔ بلکہ یہ فرض اس کی جانب سے امام ادا کرے گا۔

سوم :۔ امام کی قرات تنہا اس کی اپنی ذات کیلئے نہیں بلکہ پوری قوم کی طرف سے ہے اس لئے امام کی قرات مقتدی ہی کی قرات ہے۔

ان تین نکات کو خوب اچھی طرح ذہن میں رکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشادات لیہ پر غور فرمایئے تو وہاں بھی امام اور مقتدی کے تعلق میں انہی تین چیزوں کی تفصیل و تاکید نظر آئے گی۔ چنانچہ:

ا۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَطَبَنَا فَبَیَّنَ لَنَا سُنَّتَنَا وَعَلَّمَنَا صَلٰوتَنَا۔ فَقَالَ: اِذَا صَلَّیْتُمْ فَاَقِیْمُوْا صُفُوْفَکُمْ۔ ثُمَّ لِیَؤُمَّکُمْ اَحَدُکُمْ فَاِذَا کَبَّرَ فَکَبِّرُوْا۔ (وَفِیْ حَدِیْثِ جَرِیْرٍ عَنْ سُلَیْمَانَ عَنْ قَتَادَۃَ مِنَ الزِّیَادَۃِ) "وَاِذَا قَرَاَ فَاَنْصِتُوْا" وَاِذَا قَالَ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا آمِیْنَ یُجِبْکُمُ اللّٰہُ۔ فَاِذَا رَکَعَ فَارْکَعُوْا الْحَدِیْثَ (صحیح مسلم ص۱۷۴ ج ۱ باب التشہد نسائی ص۱۴۶ ج ۱) (ابوداؤد ص۱۴۰ ج ۱، ابن ماجہ ص۶۱، مسند احمد ص۴۱۰ ج ۴)

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا۔ پس ہمارے لئے ہمارا طریقہ کار واضح فرمایا۔ اور ہمیں ہماری نماز سکھائی۔ چنانچہ آپؐ نے فرمایا۔ جب تم نماز شروع کرو تو صفیں خوب اچھی طرح سیدھی کر لیا کرو۔ پھر تم میں کا ایک شخص امام بنے پس جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو (اور بروایت جریر عن سلیمان عن قتادہ اس حدیث میں یہ اضافہ ہے کہ) "اور جب وہ قرات شروع کرے تو تم خاموش ہو جاؤ" اور جب وہ "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہے تو تم آمین کہو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری د کو قبول کریں گے۔ پھر جب وہ رکوع کرے تو تم رکوع کرو۔ الخ

۲۔۔۔ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ فَاِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا۔ وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا وَاِذَا قَالَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِيْن الخ

(نسائی صہ ۱۴۶ ج ۱، ابوداؤد صہ ۸۹ ج ۱، ابن ماجہ صہ ۶۱)

ترجمہ:۔ امام اسی لئے تو مقرر کیا جاتا ہے کہ اسکی اقتدا کی جائے۔ پس جب وہ تکبیر کہے تو تم تکبیر کہو۔ اور جب وہ قرات کرے تو تم خاموش ہو جاؤ۔ اور جب وہ "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہے تو تم آمین کہو۔ الخ

یہ دونوں حدیثیں قرآن کریم کے ارشاد:

"اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسپر کان دھرو۔ اور خاموش رہو۔" کی تشریح کرتی ہیں۔ اور ان میں چند امور لائق توجہ ہیں۔

اول:۔ یہ کہ ان احادیث میں اول سے آخر تک امام اور مقتدی کے فرائض و وظائف کا ذکر کیا گیا ہے، مگر جس طرح یہ فرمایا کہ جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو۔ جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو۔ الخ اسی طرح یہ نہیں فرمایا گیا کہ جب وہ سورۃ فاتحہ پڑھے تو تم بھی پڑھو۔ بلکہ اس کے برعکس یہ فرمایا گیا ہے کہ جب وہ قراۃ شروع کرے تو تم خاموش رہو۔ پس اگر مقتدی کے ذمہ قرات ہوتی تو ممکن نہیں تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ذکر نہ کرتے۔ اور یوں نہ فرماتے "واذا قرء فاقرءوا" ـــــ کہ جب امام قرات شروع کرے تو تم بھی قرات کرو۔ پس امام کے وظیفہ قرات کو ذکر کرنا۔ اور مقتدی کے حق میں اس کو ذکر نہ کرنا اس امر کی دلیل ہے کہ قرات امام کا وظیفہ ہے مقتدی کا نہیں۔

دوم:۔ پھر اسی پر اکتفا نہیں فرمایا جاتا۔ بلکہ صاف صاف یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جب امام قرات

کرے توتم خاموش رہو۔ پس ایک طرف امام کے حق میں قرات کاذکر کرنااور دوسری طرف امام کی قرات کے وقت مقتدی کو خاموشی کا حکم دینااس امر کی تصریح ہے کہ امام کی قرات میں امام اور مقتدی دونوں شریک ہیں۔ اور یہ شرکت امام کی قرات اور مقتدی کی خاموشی کے دوطرفہ عمل کی وجہ سے ہے۔ پس اگر مقتدی خاموشی اختیار نہ کرے بلکہ اپنی قرات میں مشغول ہو جائے توایک تو وہ اپنے اس وظیفہ سے روگردانی کرنے والا ہو گا۔ جو قرآن کریم اور حدیث نبویؐ نے اس کیلئے متعین فرمایا ہے۔ یعنی استماع وانصات ــــ دوسرے ایسی حالت میں امام کی قرات میں اس کی شرکت مقصود نہیں ہو سکتی جب کہ شارع کا مقصد اور مطمع نظر مقتدی کوامام کی قرات میں شریک کرنا ہے۔

سوم:۔ یہ کہ مقتدی کو حکم دیا گیا ہے کہ جب امام غیرالمغضوب علیہم ولاالضالین" کہے تو مقتدی آمین کہے جس سے ایک تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ امام کی قرات شروع ہونے کے بعد مقتدی کو پہلی بار سورۂ فاتحہ کے ختم پر بولنے کی اجازت دی گئی ہے۔ اس سے قبل اس کے لئے سوائے خاموشی کے کوئی وظیفہ مقرر نہیں کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ مقتدی، امام کی فاتحہ پر آمین کہنے کے لئے اسی لئے مامور کیا گیا کہ سورۂ فاتحہ میں جو درخواست امام پیش کر رہا ہے وہ صرف اپنی طرف سے پیش نہیں کر رہابلکہ پوری قوم کے نمائندہ کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے اس لئے ختم فاتحہ پر تمام مقتدی آمین کہہ کراس کی درخواست کی تائید کرتے ہیں۔ اگر یہ حکم ہوتاکہ امام اپنی فاتحہ پڑھے اور مقتدی اپنی اپنی پڑھیں تواس طرح اجتماعی آمین کہنے کا حکم نہ دیا جاتابلکہ ہرایک کواپنی اپنی فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم ہوتا۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امام اور مقتدی سب کوامام کی فاتحہ پر آمین کہنے کا حکم فرمایاتواس کامطلب اس کے سوااور کیا ہے کہ نماز با جماعت میں سورۂ فاتحہ پڑھ کر جو درخواست کی جاتی ہے وہ ہرایک کی انفرادی درخواست نہیں بلکہ ایک وفد کی شکل میں اجتماعی درخواست ہے۔ امام اس وفد کاامیر ہے۔ اور وہی پوری قوم کی جانب سے متکلم ہے۔ اس لئے اس اجتماعی درخواست پر آمین بھی اجتماعی مقرر فرمائی گئی۔ ورنہ اگر ایک شخص کو معتمد علیہ نمائندہ بناکر اجتماعی درخواست پیش کرنا منظور نہ ہوتاتونماز با جماعت کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ ہر شخص اپنی انفرادی نماز میں انفرادی درخواست کر لیا کرتا۔ وہ جماعت جماعت نہیں کہلاتی اور نہ وہ وفد وفد کہلاتا ہے جسکا ایک امیر اور ایک متکلم نہ ہو۔ بلکہ ہر شخص انفرادی طور پر اپنی اپنی درخواست پیش کیا کرے۔

چہارم:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مقتدی کے فرائض کی تشریح کرتے ہوئے

تمہیداً یہ ارشاد فرمایا ہے۔

اِنَّمَا جُعِلَ الْإِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهٖ :

ترجمہ:۔ امام اسی لئے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتداء کی جائے۔

اس میں تعلیم دی گئی ہے کہ مقتدی کا کام امام کی اقتداء متابعت کرنا ہے نہ کہ اس کی مخالفت ـــــ اور متابعت اور مخالفت ہر رکن میں اپنی اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہوگی۔ جب وہ تکبیر کہے تو تکبیر کہنا متابعت ہے۔ اس سے پہلے تکبیر کہہ لینا۔ یا اس کی تکبیر پر تکبیر نہ کہنا مخالفت ہے۔ اسی طرح جب وہ رکوع کرے تب رکوع کرنا متابعت ہے۔ اس سے پہلے رکوع کر لینا، یا اسکے رکوع میں جانے کے باوجود مقتدی کا رکوع نہ کرنا اس کی مخالفت ہے۔ اور رکوع سے اٹھ کر جب وہ "سمع اللہ لمن حمدہ" کہے تو جواب میں "ربنالک الحمد" کہنا متابعت ہے۔ اور وہی فقرہ جو امام نے کہا ہے اس کا دہرا دینا متابعت کے خلاف ہے۔ اسی طرح جب امام قرات شروع کرے تو مقتدی کا اپنے ذکر اذکار بند کر کے امام کی قرات کی طرف متوجہ ہو جانا متابعت ہے۔ اور امام کے مقابلہ میں اپنی قرات شروع کر دینا مخالفت ہے۔ جس کو احادیث میں منازعت سے تعبیر فرمایا ہے۔

خلاصہ یہ کہ شریعت نے مقتدی کو امام کی اقتدا اور متابعت کا حکم دیا ہے۔ اور اسی متابعت اور اجتماعیت کی غرض سے نماز با جماعت مشروع کی گئی ہے۔ اور قرات کے موقعہ پر امام کی متابعت یہی ہے کہ مقتدی امام کی قرات کی طرف متوجہ رہے۔ اور خاموش رہے امام کے مقابلہ میں خود اپنی قرات شروع کر دینا متابعت نہیں۔ بلکہ مخالفت اور منازعت ہے۔ اس لئے حکم دیا گیا۔

وَاِذَا قَرَأَ فَاَنْصِتُوْا۔

ترجمہ:۔ اور امام جب قرات شروع کرے تو خاموش ہو جاؤ۔

دوم:۔ اور جب یہ معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مقتدی کو امام کی متابعت کا حکم فرمایا ہے اور اس متابعت کے ضمن میں اس کی قرات کو سننے اور خاموش رہنے کا حکم دیا ہے تو اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ امام ہی کی قرات مقتدی کے لئے بھی کافی ہے۔ اس نکتہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے صراحۃً بھی ارشاد فرمایا ہے۔

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَاِنَّ قِرَاءَةَ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ۔ (ابن ماجہ ص۱۶، مسند احمد ص۳۳۹ ج ۳، موطا امام محمد ص ۹۷، کتاب الآثار ص ۱۲ ج ۱)

ترجمہ:۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا امام ہو پس امام کی قرات اسی کی قرات ہے۔

یہ حدیث متعدد طرق سے مروی ہے۔ بعض نے اس کو حضرت عبداللہ بن شدادؓ سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اور بعض نے سند متصل کے ساتھ۔ ـــــ شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں۔

وَثَبَتَ اَنَّهٗ فِیْ هٰذِهِ الْحَالِ قِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ. كَمَا قَالَ ذَالِكَ جَمَاهِيْرُ السَّلَفِ وَالْخَلَفِ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ لَهُمْ بِاِحْسَانٍ وَفِیْ ذَالِكَ الْحَدِيْثُ الْمَعْرُوْفُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَالَ: "مَنْ كَانَ لَهٗ اِمَامٌ فَقِرَاءَةُ الْاِمَامِ لَهٗ قِرَاءَةٌ" وَهٰذَا الْحَدِيْثُ رُوِیَ مُرْسَلًا وَّمُسْنَدًا - لٰكِنَّ اَكْثَرَ الْاَئِمَّةِ الثِّقَاتِ رَوَوْهُ مُرْسَلًا عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَدَّادٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - وَاَسْنَدَهٗ بَعْضُهُمْ وَرَوَاهُ ابْنُ مَاجَةَ مُسْنَدًا - وَهٰذَا الْمُرْسَلُ قَدْ عَضَدَهٗ ظَاهِرُ الْقُرْاٰنِ وَالسُّنَّةِ وَقَالَ بِهٖ جَمَاهِيْرُ اَهْلِ الْعِلْمِ مِنَ الصَّحَابَةِ وَالتَّابِعِيْنَ وَمُرْسِلُهٗ مِنْ اَكَابِرِ التَّابِعِيْنَ وَمِثْلُ هٰذَا الْمُرْسَلِ - يُحْتَجُّ بِهٖ بِاِتِّفَاقِ الْاَئِمَّةِ الْاَرْبَعَةِ وَغَيْرِهِمْ وَقَدْ نَصَّ الشَّافِعِیُّ عَلٰى جَوَازِ الْاِحْتِجَاجِ بِمِثْلِ هٰذَا الْمُرْسَلِ

(فتاویٰ ابن تیمیہ صفحہ ۲۷۱ ج ۲۳)

ترجمہ:۔ اور یہ ثابت ہوا کہ اس حالت میں امام کی قراۃ مقتدی کی قرات ہے جیسا کہ جماہیر سلف و خلف صحابہؓ و تابعینؒ اس کے قائل ہیں۔ اور اس باب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی معروف حدیث وارد ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جس کے لئے امام ہو تو امام کی قرات اسی کی قرات ہے"۔

اور یہ حدیث مرسل اور مسند دونوں طرح روایت کی گئی ہے۔ لیکن اکثر ائمہ ثقات نے اس کو عبداللہ بن شداد سے اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مرسلاً روایت کیا ہے۔ اور بعض نے اس کو سند متصل سے روایت کیا ہے۔ ابن ماجہ نے اس کو مسند ذکر کیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن و سنت اس مرسل کے مؤید ہیں۔ اور جماہیر اہل علم صحابہؓ و تابعینؒ اسی کے قائل ہیں اور اس کو مرسل نقل کرنے والے اکابرین تابعین میں سے ہیں۔ اس قسم کی مرسل

روایت سے ائمہ اربعہ اور دیگر اہل علم کے نزدیک بالاتفاق استدلال صحیح ہے۔ اور امام شافعیؒ نے اس قسم کی مرسل حدیث سے استدلال صحیح ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس حدیث کی تصحیح کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس کی وضاحت چند نکات میں کرتا ہوں۔

اول: اس کے ارسال و اتصال میں اختلاف ہے۔ اور جب طرق صحیحہ سے اس کا مسند و متصل ہونا ثابت ہے تو اتصال کو ترجیح ہوگی۔ چنانچہ مسند احمد۔ مسند احمد بن منیع۔ مسند عبد بن حمید، موطا امام محمد۔ اور شرح معانی الاثار طحاوی میں اس کے مسند و متصل طرق بروایت ثقات موجود ہیں۔

دوم:۔ اگر اکثر حفاظ کی روایت کے مطابق اس کو مرسل بھی فرض کیا جائے تب بھی ظاہر قرآن و سنت اسی کا موید ہے۔ اس کی تفصیل اوپر کی سطور میں گزر چکی ہے۔

سوم:۔ جماہیر صحابہؓ و تابعینؒ کا فتویٰ اسی حدیث کے مطابق ہے چنانچہ:

۱۔ صحیح مسلم ص ۲۱۰ میں عطا بن یسار سے مروی ہے کہ انہوں نے زید بن ثابتؓ سے قرات مع الامام کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا۔

لَا قِرَاءَةَ مَعَ الْإِمَامِ فِي شَيْءٍ

ترجمہ:۔ امام کے ساتھ کسی نماز میں قرات نہیں۔

۲ سنن نسائی ص ۹۲ ج ۱ میں حضرت ابو الدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے:

سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَفِي كُلِّ صَلٰوةٍ قِرَاءَةٌ؟ قَالَ نَعَمْ. قَالَ رَجُلٌ مِّنَ الْأَنْصَارِ وَجَبَتْ هٰذِهٖ. فَالْتَفَتَ إِلَيَّ وَكُنْتُ أَقْرَبَ الْقَوْمِ مِنْهُ فَقَالَ. مَا أَرَى الْإِمَامَ إِذَا أَمَّ الْقَوْمَ إِلَّا قَدْ كَفَاهُمْ.

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ ہر نماز میں قرات ہوتی ہے؟ فرمایا، ہاں۔ انصار میں سے ایک آدمی نے کہا۔ یہ تو واجب ہوگئی۔ پس آپؐ میری طرف التفات فرمایا اور میں آپؐ کے قریب تر بیٹھا تھا۔ پس فرمایا کہ امام جب کسی قوم کی امامت کرے تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ سب کی طرف سے کافی ہے۔

امام نسائیؒ نے اس حدیث کو نقل کر کے فرمایا ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بلکہ ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ لیکن مجمع الزوائد ص ۱۱۰ ج ۲ میں بروایت طبرانی یہ

حدیث مرفوعاً ہے۔ اور امام ہیثمی فرماتے ہیں کہ اس کی اسناد حسن ہے۔

۳۔ ترمذی ج ۲ ص ۷۲ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

مَنْ صَلّٰی رَکْعَۃً لَمْ یَقْرَأْ فِیْھَا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ فَلَمْ یُصَلِّ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ وَرَاءَ الْاِمَامِ۔

ترجمہ:۔ جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی اس نے گویا نماز ہی نہیں پڑی الایہ کہ امام کے پیچھے ہو۔

امام ترمذیؒ نے اس کو حسن صحیح کہا ہے۔ اور امام طحاوی نے شرح معانی الاثار میں اس کو مرفوعاً نقل کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے امانی الاحبار ص ۱۴۶ ج ۳)

۴:۔ امام ابن کثیرؒ نے ابن جریر کی سند سے نقل کیا ہے۔

صَلّٰی ابْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُ فَسَمِعَ نَاسًا یَّقْرَؤُنَ مَعَ الْاِمَامِ. قَالَ اَمَا اَنْ لَّکُمْ اَنْ تَفْھَمُوْا، اَمَا اَنْ لَّکُمْ اَنْ تَعْقِلُوْا "وَاِذَا قُرِیَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا کَمَا اَمَرَکُمُ اللہُ (تفسیر ابن کثیر ص ۲۸۰ ج ۲)

ترجمہ:۔ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھی۔ تو کچھ لوگوں کو سنا کہ وہ امام کے ساتھ قرات کرتے ہیں۔ فرمایا۔ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم فہم حاصل کرو؟ کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم سمجھو۔ "اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس کی طرف کان دھرو اور خاموش رہو" جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے قرات خلف الامام کی ممانعت مختلف طرق اور مختلف الفاظ میں وارد ہے۔

۵:۔ موطا امام مالک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

کَانَ اِذَا سُئِلَ ھَلْ یَقْرَأُ اَحَدٌ خَلْفَ الْاِمَامِ قَالَ اِذَا صَلّٰی اَحَدُکُمْ خَلْفَ الْاِمَامِ فَحَسْبُہٗ قِرَاءَۃُ الْاِمَامِ وَاِذَا صَلّٰی وَحْدَہٗ فَلْیَقْرَأْ قَالَ وَکَانَ عَبْدُ اللہِ بْنُ عُمَرَ لَا یَقْرَأُ خَلْفَ الْاِمَامِ (ص ۲۹)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے جب دریافت کیا جاتا کہ کیا امام کی اقتداء میں قرات کی جائے تو فرماتے کہ جب تم میں سے کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے تو اس کو امام کی قرات کافی ہے۔ اور جب تنہا پڑھے تو قرات کرے۔ نافعؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے قرات نہیں کیا

کرتے تھے۔

ان کے علاوہ متعدد صحابہ ؓ و تابعین ؒ کے فتاویٰ موطا امام محمد ؒ۔ کتاب الآثار۔ شرح معانی الآثار طحاوی۔ مصنف عبدالرزاق اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں موجود ہیں۔

سوم:۔ تیسرا نکتہ شیخ ابن تیمیہ ؒ نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس مرسل روایت کا سلسلہ سند صحابی کے بجائے طبقہ علیا کے تابعی پر ختم ہوتا ہے۔ جو اکثر و بیشتر صحابہ کرام ؓ سے روایت کرتے ہیں۔ چنانچہ یہاں مرسل روایت حضرت عبداللہ بن شداد ؓ سے مروی ہے۔ جن کی ولادت آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں ہوئی۔ اس لئے ان کا شمار صغیرالسن صحابہ ؓ میں ہوتا ہے۔ اور علمی طبقہ کے لحاظ سے ان کو کبار تابعین میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس لئے ان کی مرسل حدیث کی حیثیت ایک اعتبار سے مراسیل صحابہ ؓ کی ہے۔ جو بالاتفاق حجت ہیں۔ اور چونکہ ان کی بیشتر احادیث حضرات صحابہ کرام ؓ سے ہیں اس لئے یہ حدیث بھی انہوں نے کسی صحابی سے سنی ہوگی۔ خصوصاً جب کہ بعض طرق صحیحہ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واسطہ بھی مذکور ہے۔

الغرض ان متعدد دلائل و شواہد کی روشنی میں حدیث:

”من کان لہٗ امام فقرأۃ الامام لہ، قرأۃ“

بلاشک و شبہ صحیح اور حجت ہے۔ قرآن کریم، احادیث نبویہ ؐ اور فتاویٰ ؓ سے موید ہے امام احمد ؒ ایسے ائمہ اعلام نے اس سے استدلال کیا ہے۔ اس لئے حنفیہ اور جمہور ائمہ۔ امام ہی کی قرات کو مقتدی کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اور بحکم قرآن و حدیث امام کی قرات کے وقت مقتدی کے خاموش رہنے کو واجب جانتے ہیں۔

فاتحہ خلف الامام کے دلائل:۔

اور سوال میں جو ذکر کیا گیا ہے۔ ”اور حدیث مبارک کا مفہوم یہ ہے کہ جب سورہ فاتحہ امام پڑھے تو تم بھی آہستہ پڑھو۔“

ذخیرہ احادیث میں کوئی حدیث ایسی نہیں جس میں مقتدی پر فاتحہ کی قراۃ واجب ٹھہرائی گئی ہو۔ اور یوں بھی یہ بات عقلاً مستبعد ہے کہ ایک طرف قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں مقتدی کو خاموش رہنے اور امام کی قرات سننے کا حکم دیا گیا ہو اور دوسری طرف عین امام کی قرات کے وقت اسے سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم بھی دیا جائے۔ ایک طرف امام کی قرات کو بعینہ مقتدی کی قرات فرمایا گیا ہو اور پھر مقتدی کے ذمہ بھی قرات کو واجب ٹھہرایا گیا ہو ــــــ البتہ اس مضمون کی

احادیث ضرور مروی ہیں کہ بعض حضرات نے از خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے قرات شروع کر دی جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے نکیر فرمائی۔ اور پھر بعض روایات کے مطابق سورہ فاتحہ پڑھنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ ذیل میں ان احادیث پر غور کر کے شارع کے مقصد و مدعا کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

حدیث. لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ :۔

جو حضرات فاتحہ خلف الامام کا حکم کرتے ہیں صحت کے اعتبار سے ان کی سب سے قوی دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ۔ مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ ۔ وَفِي رِوَايَةٍ لِمُسْلِمٍ ۔ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِأُمِّ الْقُرْآنِ فَصَاعِدًا (مشکوٰۃ صہ ۷۸)

ترجمہ۔ نماز نہیں اس شخص کی جس نے نہیں پڑھی فاتحۃ الکتاب ۔۔۔ یہ بخاری و مسلم کی روایت میں ہے "جس نے نہیں پڑھی ام القرآن مع زائد"۔

یہ حدیث بلاشبہ صحیح اور متفق علیہ ہے، ائمہ ستہ نے اس کی تخریج کی ہے مگر جو حضرات فاتحہ خلف الامام کے قائل نہیں ان کے نزدیک یہ حدیث مقتدی کے حق میں نہیں بلکہ امام اور منفرد کے حق میں ہے جیسا کہ امام ترمذیؒ نے امام احمدؒ سے نقل کیا ہے۔

وَاَمَّا اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ فَقَالَ مَعْنٰى قَوْلِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "لَاصَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ" اِذَا كَانَ وَحْدَهٗ وَاحْتَجَّ بِحَدِيْثِ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَيْثُ قَالَ : مَنْ صَلّٰى رَكْعَةً لَمْ يَقْرَأْ فِيْهَا بِاُمِّ الْقُرْآنِ فَلَمْ يُصَلِّ ۔ اِلَّا اَنْ يَكُوْنَ وَرَاءَ الْاِمَامِ ۔ قَالَ اَحْمَدُ فَهٰذَا رَجُلٌ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَاَوَّلَ قَوْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ اَنَّ هٰذَا اِذَا كَانَ وَحْدَهٗ

(سنن ترمذی صہ ۴۲ ج ۱)

ترجمہ۔ امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد "نہیں نماز اس شخص کی جس نے نہیں پڑھی فاتحۃ الکتاب" اس صورت پر محمول ہے جب اکیلا پڑھے۔ اور انہوں نے حضرت جابر

عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے استدلال کیا ہے کہ "جس نے کوئی رکعت پڑھی جس میں ام القرآن نہیں پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔ الا یہ کہ وہ امام کے پیچھے ہو"۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ ایک صحابیؓ ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد "لاصلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحہ الکتاب" کا مطلب یہی سمجھے ہیں کہ یہ تنہا نماز پڑھنے والے کے حق میں ہے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ یہاں دو مقام الگ الگ ہیں۔ ایک یہ کہ نماز میں کس قدر قرات واجب اور ضروری ہے جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ دوم یہ کہ جب کوئی شخص امام کی اقتدا میں نماز پڑھے تو اسے فریضہ قرات خود ادا کرنا ہو گا۔ یا امام اس کی طرف سے نمائندگی کرے گا۔ پہلے مسئلہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے ارشاد گرامی "لاصلوٰۃ لمن لم یقرا بفاتحہ الکتاب فصا عداً" میں ارشاد فرمایا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ سورہ فاتحہ کا وجوب تو متعین ہے۔ اور چونکہ سورہ فاتحہ میں ہدایت کی درخواست کی گئی ہے۔ اور الم سے والناس تک پورا قرآن کریم اسی درخواست کا جواب ہے اس لئے نماز میں سورہ فاتحہ کے بعد اس کے جواب کا کچھ حصہ بھی واجب ہے۔ چنانچہ متعدد احادیث میں اس کے ساتھ "فصاعداً" اور "ومازاد" بھی مروی ہے۔ یعنی سورۃ فاتحہ کے بعد قرآن کریم کا کچھ مزید حصہ بھی تلاوت کرنا ضروری ہے۔

بہرحال اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں قرات کی مقدار واجب کو متعین فرمایا ہے۔ اور وہ ہے سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ قرآن کریم کا کچھ مزید حصہ۔

اور دوسرے مسئلہ کو آپؐ نے اپنے ارشاد۔

مَنْ كَانَ لَهُ إِمَامٌ فَإِنَّ قِرَاءَةَ الْإِمَامِ لَهُ قِرَاءَةٌ۔

ترجمہ:۔ جس کے لئے امام ہو تو امام کی قرات اس کی قرات ہے۔

میں بیان فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مقتدی کو چونکہ استماع و انصات کا حکم ہے اس لئے وہ بذات خود قرات نہیں کرے گا۔ بلکہ امام اس کی جانب سے قرات کا تحمل کرے گا۔ اور امام کی قرات مقتدی کی قرات شمار ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام کو "القاری" کے لقب سے ملقب فرما کر مقتدی کو اس کی قرات پر آمین کہنے کا حکم دیا۔ مشکوٰۃ شریف ص ۷۹ میں صحیح بخاری کے حوالے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

اِذَا اَمَّنَ الْقَارِئُ فَاَمِّنُوْا فَاِنَّ الْمَلٰٓئِكَةَ تُؤَمِّنُ فَمَنْ وَافَقَ تَاْمِيْنُهٗ تَاْمِيْنَ الْمَلٰٓئِكَةِ غُفِرَلَهٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهٖ (صحیح بخاری ص ۹۴۷ ج ۲)

ترجمہ:۔ جب "قرات کرنیوالا" آمین کہے تو تم بھی آمین کہو۔ کیونکہ فرشتے بھی آمین کہتے ہیں۔ پس جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوئی۔ اس کے گزشتہ گناہ معاف ہوجائیں گے۔

ظاہر ہے کہ فرشتے خود سورہ فاتحہ کی تلاوت نہیں کرتے بلکہ صرف امام کی آمین پر آمین کہتے ہیں۔ اور ہمیں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے آمین میں فرشتوں کی موافقت کا حکم فرمایا ہے۔ اور اسی پر مغفرت ذنوب کا وعدہ فرمایا ہے۔ اور اس وعدہ کو صرف آمین کہنے پر معلق فرمایا ہے۔ نہ کہ خود اپنی قرات کرنے پر۔ بلکہ امام کو "القاری" کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ قرات کرنا امام کا منصب ہے۔ نہ کہ مقتدی کا۔ مقتدی کا منصب امام کی قرات کو سننا اور خاموش رہنا ہے۔ واللہ اعلم۔

الغرض جب دو الگ الگ مسئلوں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے الگ الگ حکم صادر فرمائے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک مسئلہ سے متعلق آپ کا جو ارشاد ہے اسے اٹھا کر دوسری جگہ چسپاں کر دیا جائے۔ اور اس دوسری جگہ کے لئے جو حکم فرمایا ہے اسے مہمل چھوڑ دیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ مقتدی بھی سورہ فاتحہ کی قرات کرتا ہے، مگر بطور خود نہیں بلکہ بحکم "من کان لہ فقراۃ الامام لہ قراۃ" امام کے توسط سے قرات کرتا ہے۔ اور شارع نے امام کی قرات کو حکماً مقتدی کی قرات قرار دیا ہے۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ چونکہ مقتدی خود قرات نہیں کرتا اس لئے اس کی نماز نہیں ہوتی۔

محمد بن اسحاق کی روایت:۔

ان حضرات کی ایک دلیل حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے جو محمد بن اسحاق کی روایت سے مروی ہے۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ كُنَّا خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي صَلٰوةِ الْفَجْرِ فَقَرَأَ۔ فَثَقُلَتْ عَلَيْهِ الْقِرَاءَةُ۔ فَلَمَّا فَرَغَ قَالَ لَعَلَّكُمْ تَقْرَؤُنَ خَلْفَ إِمَامِكُمْ قُلْنَا نَعَمْ يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ لَا تَفْعَلُوْا إِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ۔ فَإِنَّهُ لَا صَلٰوةَ لِمَنْ لَمْ يَقْرَأْ بِهَا رَوَاهُ أَبُوْ دَاوُدَ وَالتِّرْمِذِيُّ وَالنَّسَائِيُّ مَعْنَاهُ۔ وَفِي رِوَايَةٍ لِأَبِي دَاوُدَ۔ قَالَ وَأَنَا أَقُوْلُ مَالِي يُنَازِعُنِي الْقُرْآنُ۔ فَلَا تَقْرَؤُا بِشَيْءٍ مِنَ الْقُرْآنِ إِذَا جَهَرْتُ إِلَّا بِأُمِّ الْقُرْآنِ (مشکوٰۃ ص ۸۱ ج ۱)

ترجمہ:۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اقتداء میں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، آپ نے قرات کی تو آپ پر قرات دشوار ہو گئی۔ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا، شائد تم اپنے امام کے پیچھے قرات کرتے ہو۔ ہم نے کہا، جی ہاں! یارسول اللہ! فرمایا، ایسا نہ کیا کرو۔ سوائے فاتحہ الکتاب کے کیونکہ نماز نہیں اس شخص کی جو اس کو نہ پڑھے۔

اس کو ابو داؤد۔ ترمذی اور نسائی نے روایت کیا ہے اور ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا "میں بھی کہہ رہا تھا کہ کیا بات ہے کہ قرآن مجھ سے کشاکشی کرتا ہے۔ (یعنی پڑھنے میں الجھن ہو رہی ہے) پس جب میں بلند آواز سے قرات کروں تو کچھ نہ پڑھا کرو سوائے ام القرآن کے

اگرچہ امام بیہقی، امام دار قطنی اور دیگر بعض شافعیہ نے اپنے مسلک کے مطابق اس حدیث کی تصحیح کی ہے۔ چنانچہ امام خطابیؒ (معالم السنن (ص ۲۰۵ ج ۱) میں فرماتے ہیں۔

هٰذَا الْحَدِيْثُ نَصٌّ بِاَنَّ قِرَاءَةَ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَاجِبَةٌ عَلٰى مَنْ صَلّٰى خَلْفَ الْاِمَامِ۔ سَوَاءٌ جَهَرَ الْاِمَامُ بِالْقِرَاءَةِ اَوْخَافَتَ بِهَا وَاِسْنَادُهٗ جَيِّدٌ لَاطَعْنَ فِيْهِ۔

یہ حدیث نص ہے اس بات پر کہ فاتحہ الکتاب کا پڑھنا واجب ہے اس شخص پر جو امام کے پیچھے نماز پڑھے۔ خواہ امام جہری قرات کرے۔ یا سری۔ اور اس کی سند جید ہے۔ اس میں کوئی طعن نہیں۔

لیکن یہ حدیث سند اور متن دونوں کے اعتبار سے مضطرب ہے۔ اور امام احمدؒ اور دیگر اکابر محدثین نے اس کی تضعیف کی ہے۔ شیخ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

وَهٰذَا الْحَدِيْثُ مُعَلَّلٌ عِنْدَ اَئِمَّةِ الْحَدِيْثِ بِاُمُوْرٍ كَثِيْرَةٍ۔ ضَعَّفَهٗ اَحْمَدُ وَغَيْرُهٗ مِنَ الْاَئِمَّةِ۔ وَقَدْ بُسِطَ الْكَلَامُ عَلٰى ضُعْفِهٖ فِيْ غَيْرِ هٰذَا الْمَوْضِعِ۔ وَبُيِّنَ اَنَّ الْحَدِيْثَ الصَّحِيْحَ قَوْلُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لَاصَلٰوةَ اِلَّا بِاُمِّ الْقُرْاٰنِ، فَهٰذَا الَّذِيْ اَخْرَجَاهُ فِي الصَّحِيْحَيْنِ وَرَوَاهُ الزُّهْرِيُّ عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ عَنْ عُبَادَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔ وَاَمَّا هٰذَا الْحَدِيْثُ فَغَلَطٌ فِيْهِ بَعْضُ الشَّامِيِّيْنَ وَاَصْلُهٗ اَنَّ عُبَادَةَ رض كَانَ يَؤُمُّ بَيْتَ الْمُقَدَّسِ فَقَالَ هٰذَا۔ فَاشْتَبَهَ عَلَيْهِمُ الْمَرْفُوْعُ بِالْمَوْقُوْفِ عَلٰى عُبَادَةَ رض۔

(فتاویٰ ابن تیمیہ ص ۲۸۷ ج ۲۳ جدید)

ترجمہ :۔ یہ حدیث بہت سی وجوہ سے ائمہ حدیث کے نزدیک معلول ہے۔ امام احمدؒ اور دیگر ائمہ حدیث نے اس کی تضعیف کی ہے۔ اس حدیث کے ضعف پر دوسری جگہ تفصیل سے لکھا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ صحیح حدیث آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہے کہ "ام القرآن کے بغیر نماز نہیں۔" پس حضرت عبادہؓ کی یہ حدیث ہے جو صحیحین میں مروی ہے۔ اور اسے زہری نے بواسطہ محمود بن ربیع حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

لیکن یہ حدیث (جس میں اختلاط کا قصہ ہے) اس میں بعض شامیوں نے غلطی کی ہے۔ اور اصل اس کی یہ ہے کہ حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ بیت المقدس کے امام تھے۔ اور یہ بات (فاتحہ خلف الامام کی) انہوں نے کہی تھی۔ لیکن راویوں کو اشتباہ ہو گیا اور انہوں نے حضرت عبادہ کے قول کو حدیث مرفوع کی حیثیت سے نقل کر دیا۔

شیخ ابن تیمیہؒ نے جو لکھا ہے اس کی طرف امام ترمذیؒ نے بھی اشارہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

وَقَرَأَ عُبَادَةُ بْنُ الصَّامِتِ بَعْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَلْفَ الْإِمَامِ. وَتَأَوَّلَ قَوْلَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا صَلٰوةَ إِلَّا بِقِرَاءَةِ فَاتِحَةِ الْكِتَابِ (ترمذی ص۴۲ ج ۱)

ترجمہ :۔ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد امام کے پیچھے قرات کی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے فرمان "لاصلوٰۃ الابقراۃ فاتحہ الکتاب" سے استدلال کیا۔

امام ترمذیؒ کے اس ارشاد سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ "لاصلوٰۃ الابفاتحہ الکتاب" کے عموم سے استدلال کرتے ہوئے حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ قراۃ فاتحہ خلف الامام کے جواز کے قائل تھے۔ یہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امام کی اقتداء میں فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ مگر جیسا کہ شیخ ابن تیمیہؒ نے کہا ہے۔ راوی کو وہم ہوا ہے۔ اور اس نے اس کو مرفوع حدیث کی حیثیت سے نقل کر دیا۔

بہر حال حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی یہ مرفوع حدیث جو سنن کے حوالے سے نقل ہو چکی ہے، ضعیف اور مضطرب ہے۔ لیکن اگر اس کے ضعف و اضطراب سے قطع نظر کر کے اس کو صحیح فرض کر لیا جائے تب بھی یہاں چند امور قابل غور ہیں۔

اول : آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ فرمانا کہ "شائد تم اپنے امام کے پیچھے قرات کیا کرتے ہو" ــــ اس امر کی دلیل ہے کہ اس واقعہ سے قبل آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب

سے قرات خلف الامام شروع نہیں کی گئی تھی۔ اور جو حضرات امام کے پیچھے قرات کرتے تھے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے علم و اجازت کے بغیر کرتے تھے۔

دوم۔ بجائے اس کے کہ آپؑ یہ فرماتے کہ "شائد تم میرے پیچھے قرات کیا کرتے ہو" آپ کا یہ فرمانا کہ "شائد تم اپنے امام کے پیچھے قرات کیا کرتے ہو"۔ اس امر کی دلیل ہے کہ امام کے پیچھے قرات کرنا منصب امامت کے خلاف ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس پر نکیر فرما رہے ہیں۔ اس لئے امام کے پیچھے قرات کرنا شرعاً نادرست اور لائق نکیر ہے۔

سوم۔ آپؑ کے سوال کے جواب میں ایک شخص یا چند اشخاص کا یہ کہنا کہ ہم ایسا کرتے ہیں۔ اس امر کی دلیل ہے کہ قرات خلف الامام صحابہ کرامؓ کا عام معمول نہیں تھا۔ غالباً بعض حضرات جن کو مسئلہ معلوم نہیں تھا۔ ایسا کرتے تھے۔ ابو داؤد ص ۱۱۹ میں حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کا جو قصہ لکھا ہے کہ ایک دفعہ ان کو صبح کی نماز میں تاخیر ہو گئی۔ ابو نعیم موذن نے نماز شروع کر دی۔ اور حضرت عبادہؓ ان کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے لگے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو نافع بن محمود نے حضرت عبادہؓ سے عرض کیا کہ امام قرات کر رہا تھا اور آپ سورۃ فاتحہ پڑھ رہے تھے. دار قطنی ص ۱۲۱ کی روایت میں ہے۔

قُلْتُ لِعُبَادَةَ قَدْ صَنَعْتَ شَيْئًا ، فَلَا أَدْرِي أَسُنَّةٌ هِيَ أَمْ سَهْوٌ كَانَتْ مِنْكَ

نافع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبادہؓ سے عرض کیا کہ آپ نے آج ایک ایسا کام کیا ہے جس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں کہ آیا وہ سنت ہے۔ یا آپ نے بھول کر کیا ہے

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے بعد بھی قرات خلف الامام صحابہؓ و تابعینؒ کا معمول نہیں تھا۔ چنانچہ حضرت عبادہؓ کے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے پر نافع بن محمود کو یہ گمان ہوا کہ آپ بھول کر پڑھ رہے ہیں۔ اور حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ نے "لاصلوٰۃ الابفاتحۃ الکتاب" سے استدلال کرتے ہوئے اپنے فاتحہ پڑھنے کی وجہ بیان کی۔ مگر نافع کو یہ نہیں فرمایا کہ چونکہ تم نے امام کے پیچھے فاتحہ نہیں پڑھی اس لئے تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اور حضرت عبادہؓ حالانکہ امام تھے۔ انہوں نے اپنے مقتدیوں کو بھی فاتحہ خلف الامام کا حکم نہیں فرمایا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ خود حضرت عبادہؓ بھی اس کے قائل نہیں کہ اگر امام کے پیچھے فاتحہ نہ پڑھی جائے تو مقتدی کی نماز نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس کو جائز یا مستحسن سمجھتے تھے۔

۱۔ بلکہ امام ترمذیؒ کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جو آگے امر سوم کے تحت آرہا ہے سعید احمد پالن پوری)۔

بہر حال حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے معلوم ہو جاتا ہے کہ فاتحہ خلف الامام صحابہ کرام ؓ کا معمول نہیں تھا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانہ میں اور نہ آپ کے بعد۔

چہارم: مقتدی کا امام کے پیچھے قرات کرنا چونکہ امام کی قرات میں گڑبڑ کا موجب ہوتا ہے۔ جیسا کہ اس واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو کچھ لوگوں کے پڑھنے کی وجہ سے قرات میں دشواری پیش آئی۔ اس لئے آپ ؐ نے امام کے پیچھے قرات کرنے سے منع فرمادیا۔ اور سورۃ فاتحہ کو اس ممانعت سے مستثنیٰ فرمادیا۔ اس کو مستثنیٰ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ سورہ فاتحہ نماز میں بار بار پڑھی جاتی ہے، اس لئے اس میں امام کو التباس پیش آنے کا احتمال کم ہوتا ہے۔ اس مضمون کو آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے " فانہ لاصلوٰۃ الابفاتحہ الکتاب " میں ارشاد فرمایا جس سے مقتدی پر سورۃ فاتحہ کی قرات کو واجب کرنا مقصود نہیں تھا۔ بلکہ سورہ فاتحہ کو ممانعت سے مستثنیٰ کرنے کی وجہ بیان فرمانا مقصود تھا۔ کہ چونکہ کوئی نماز سورۃ فاتحہ سے خالی نہیں ہوتی۔ بلکہ سورۃ فاتحہ ہر نماز میں پڑھی جاتی ہے اس لئے اس میں گڑبڑ ہونے اور امام کے قرات میں بھول جانے کا امکان کم ہے۔

پنجم: جس علت کی بنا پر قرات خلف الامام سے ممانعت فرمائی گئی یعنی اس کی وجہ سے امام کی قرات میں گڑبڑ ہونا چونکہ وہ علت سورہ فاتحہ میں نہیں پائی جاتی تھی اس لئے سورہ فاتحہ پڑھنے کی اجازت دے دی گئی۔ کیونکہ نہی سے استثنا اباحت کے لئے ہوتا ہے۔ وجوب کے لئے نہیں۔ پس حدیث عبادہ ؓ سے معلوم ہوا کہ قرات فاتحہ کو مقتدی کے لئے مباح فرمایا گیا۔ مگر یہ اباحت بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے نزدیک اباحت مرجوحہ تھی۔ چنانچہ ابن ابی شیبہ ص ۳۷۴ ج ۱ میں حضرت ابو قلابہ رضی اللہ عنہ کی مرسل روایت کے الفاظ یہ ہیں۔

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ لِاَصْحَابِہٖ، ہَلْ تَقْرَؤُنَ خَلْفَ اِمَامِکُمْ۔ قَالَ بَعْضٌ: نَعَمْ، وَقَالَ بَعْضٌ لَا، فَقَالَ، اِنْ کُنْتُمْ لَابُدَّ فَاعِلِیْنَ فَلْیَقْرَأْ اَحَدُکُمْ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ فِیْ نَفْسِہٖ۔

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے اصحاب ؓ سے فرمایا، کیا تم اپنے امام کے پیچھے قرات کیا کرتے ہو؟ بعض نے اثبات میں جواب دیا اور بعض نے نفی میں۔ پس آپ نے فرمایا، اگر تم کو ضرور کچھ پڑھنا ہی ہے تو تم میں کا ایک فاتحہ اپنے دل میں پڑھ لیا کرے۔

اس روایت میں "اگر تم کو پڑھنا ہی ہے۔" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ؐ کے مقتدی

کے لئے فاتحہ کا پڑھنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ سورۃ فاتحہ پڑھنے کی اجازت دی جا رہی ہے۔ مگر ایسے الفاظ میں جن سے ناگواری مترشح ہوتی ہے۔ اور یہ مطلب بھی اس صورت میں ہے کہ "دل میں پڑھنے" سے مراد زبان سے آہستہ پڑھنا ہو، اور اگر اس سے تدبر و تفکر مراد لیا جائے تو زبان سے پڑھنے کی اجازت بھی ثابت نہیں ہوتی۔

ششم:۔ لیکن عام قرات کی ممانعت اور سورۃ فاتحہ کی اجازت کے باوجود بھی کبھی الجھن کی صورت پیش آجاتی تھی اس لئے مطلقاً ممانعت فرمادی گئی جیسا کہ موطا امام مالک" اور سنن کی روایت میں ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، انْصَرَفَ مِنْ صَلٰوةٍ جَهَرَ فِیْهَا الْقِرَاءَةَ فَقَالَ هَلْ قَرَأَ مَعِیَ اَحَدٌ مِّنْکُمْ اٰنِفًا؟ فَقَالَ رَجُلٌ نَعَمْ، یَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ اِنِّیْ اَقُوْلُ مَالِیْ اُنَازِعُ الْقُرْاٰنَ۔ قَالَ فَانْتَهَى النَّاسُ عَنِ الْقِرَاءَةِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فِیْمَا جَهَرَ فِیْهِ بِالْقِرَاءَةِ مِنَ الصَّلٰوةِ حِیْنَ سَمِعُوْا ذٰلِكَ مِنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ۔ (رواہ مالک، واحمد، وابوداؤد، والترمذی والنسائی وروی ابن ماجہ نحوہٗ (مشکوٰۃ شریف ص۸۱)

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ایک ایسی نماز سے، جس میں جہری قرات فرمائی تھی۔ فارغ ہوئے تو فرمایا، کیا ابھی میرے ساتھ تم میں سے کسی نے کچھ پڑھا تھا۔ ایک شخص نے کہا جی ہاں! میں نے پڑھا تھا۔ فرمایا، میں بھی سوچتا تھا کہ کیا بات ہے، مجھے قرآن پڑھنے میں تشویش کیوں ہو رہی ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ساتھ جہری نمازوں میں قرات کرنے سے رک گئے۔

ہفتم:۔ مگر مقتدی کی قرات خلف الامام سے امام کی قرات میں گڑبڑ ہونے کا قصہ صرف جہری نمازوں سے مخصوص نہیں بلکہ سری نمازوں میں بھی اس سے گڑبڑ پیدا ہو سکتی ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم (ص ۱۷۲ ج ۱) میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَ صَلّٰی بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةَ الظُّهْرِ اَوِ الْعَصْرِ فَقَالَ اَیُّکُمْ قَرَأَ خَلْفِیْ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی؟ فَقَالَ رَجُلٌ اَنَا وَلَمْ اُرِدْ بِهَا اِلَّا الْخَیْرَ۔ قَالَ قَدْ عَلِمْتُ اَنَّ بَعْضَکُمْ خَالَجَنِیْهَا۔

فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ہم کو ظہر یا عصر کی نماز پڑھائی تو فرمایا۔ تم میں سے کس نے میرے پیچھے " سبح اسم ربک الاعلیٰ " پڑھی تھی۔ ایک شخص نے کہا کہ میں نے پڑھی تھی۔ اور میں نے اس سے خیر کے سوا کسی چیز کا ارادہ نہیں کیا۔ فرمایا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ تم میں سے بعض نے اس میں مجھ سے منازعت کی ہے۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قَالَ كَانُوْا يَقْرَءُوْنَ خَلْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ فَقَالَ خَلَطْتُمْ عَلَيَّ الْقُرْآنَ۔ (رواہ احمد وابویعلی والبزار۔ ورجال احمد رجال الصحیح (مجمع الزوائد صفحہ ۱۱۰ ج ۲)

ترجمہ:۔ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے پیچھے قرات کیا کرتے تھے تو آپؐ نے فرمایا کہ تم نے مجھ پر قرات گڑبڑ کر دی۔

پس چونکہ مقتدی کے ذمہ قرات واجب نہیں کی گئی۔ بلکہ امام کی قرات کو اس کے لئے کافی قرار دیا گیا ہے اور چونکہ مقتدی کو امام پیچھے خاموش رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور چونکہ اس کی قرات کی وجہ سے امام کی قرات میں گڑبڑ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور چونکہ یہ اندیشہ سری اور جہری نمازوں میں یکساں ہے۔ اس لئے حضرت امام ابو حنیفہؒ قرات خلف الامام کے مطلقاً قائل نہیں اور جیسا کہ اوپر معلوم ہوا صحابہؓ و تابعینؒ کا عام معمول یہی تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی۔ اور بعد میں بھی۔

سکتات امام کی بحث۔ اور جو حضرات قرات خلف الامام کے قائل ہیں وہ بھی عین امام کی قرات کے وقت مقتدی کے قرات کرنے کو معیوب اور قرآن کریم کے ارشاد۔ " فاستمعوا لہ وانصتوا " اور ارشاد نبویؐ: " واذا قرا فانصتوا " کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ سکتات امام میں پڑھنے کا حکم فرماتے ہیں۔ لیکن کسی حدیث میں امام کو مقتدی کی قرات کے لئے سکتے کرنے کا حکم نہیں دیا گیا اور نہ امام کو مقتدیوں کے تابع کرنا صحیح ہو سکتا ہے۔ اگر سکتات امام میں مقتدی پر قرات فاتحہ لازم ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ امام کو اس کے لئے پابند نہ کیا جاتا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تین سکتات فرماتے تھے۔ ایک قراۃ سے پہلے۔ اور یہ حمد و ثنا کے لئے ہوتا تھا۔ اس وقت اگر مقتدی فاتحہ پڑھے تو اس سے مقتدی کا فاتحہ میں تقدم لازم آتا ہے۔ اور جب عام ارکان میں مقتدی کو امام سے آگے بڑھنے کی اجازت نہیں تو اس کو یہ اجازت

یسے ہو سکتی ہے کہ امام کے قرات شروع کرنے سے پہلے ہی قرات کو نمٹالے۔
اور ایک سکتہ سورۃ فاتحہ کے بعد اور ایک رکوع سے قبل ہوتا تھا۔ مگر یہ سکتات علم معمول کے مطابق ہوتے تھے. اور ان میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی تھی کی مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ سکیں۔۔۔۔۔
بہرحال سکتات میں مقتدی کا فاتحہ پڑھنا بھی بعض حضرات کا اجتہاد تھا۔ لیکن جب مقتدی کے ذمہ قرات واجب ہی نہیں تو اس کو اس تکلف کی ضرورت ہی کیوں ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ:

اور سوال میں جو یہ شبہ کیا گیا ہے کہ۔
"اگر امام ہی کا فاتحہ تلاوت کرنا کافی ہے پھر دیگر ارکان کے لئے مقتدی کا اعادہ کیوں ضروری ہے۔ جیسے ثنا۔ تسبیحات۔ تشہد درود شریف وغیرہ۔"
اس کا جواب حدیث "واذا اقرا فانصتوا" کی شرح میں اوپر گزر چکا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مقتدی کو دوسرے ارکان تو امام کے ساتھ ادا کرنے کا حکم فرمایا۔ لیکن امام کی قرات کے وقت اس کو قرات کرنے کا نہیں بلکہ خاموش رہنے کا حکم فرمایا۔
اس کی وجہ سے اسکے سوا کچھ نہیں کہ امام مقتدی کی طرف سے قرات کا تحمل کرتا ہے۔ دوسرے ارکان کا تحمل نہیں کرتا۔

سوال سوم: ازان واقامت کے کلمات

س. ۳۔ متفق علیہ کی حدیث میں ازان کے کلمات جفت اور اقامت طاق پڑھنے کا ذکر موجود ہے یا یہ کہ اگر ازان ترجیح سے دی جائے تو اقامت جفت کہی جائے تو سوال یہ ہے کہ ازان واقامت دونوں جفت کہی جاتی ہیں کس دلیل سے؟ بحوالہ کتب احادیث وضاحت فرمائیں۔ ساتھ ہی صحت کے اعتبار سے کون سی ازان واقامت بہتر ہے۔
ج. اس مبحث میں چند امور لائق ذکر ہیں۔
۱. سوال میں جس متفق علیہ حدیث کا ذکر ہے۔ وہ حضرت انس رضی اللہ کی روایت ہے۔
عَنْ اَنَسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ ذَکَرُوا النَّارَ وَالنَّاقُوْسَ۔ فَذَکَرُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی۔ فَاُمِرَ بِلَالٌ اَنْ یَّشْفَعَ الْاَذَانَ وَاَنْ یُّوْتِرَ الْاِقَامَۃَ قَالَ اِسْمَاعِیْلُ وَذَکَرْتُہٗ لِاَیُّوْبَ فَقَالَ اِلَّا الْاِقَامَۃَ۔ (متفق علیہ مشکوۃ صہ ۶۳)
فَقَامَ عَلَی الْمَسْجِدِ فَاَذَّنَ ثُمَّ قَعَدَ قَعْدَۃً ثُمَّ قَامَ فَقَالَ مِثْلَھَا

اِلَّا اَنَّہٗ یَقُوْلُ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃُ۔ (ابوداؤد صہ ۲۷، ج ۱)

ترجمہ:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صحابہ نے (نماز کی اطلاع کے لئے) آگ جلانے اور گھنٹی بجادینے کا تذکرہ کیا۔ تو یہود و نصاریٰ کا ذکر آیا۔ پس حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا گیا کہ اذان جفت کہا کریں۔ اور اقامت طاق کہا کریں اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے یہ حدیث ایوب سے ذکر کی تو انہوں نے فرمایا۔ مگر اقامت۔

۲:۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی اس روایت سے ابتدائے تشریع اذان کے واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس واقعہ کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو مشورہ ہوا کہ نماز کی اطلاع کے لئے کوئی طریقہ کار وضع کیا جائے۔ بعض حضرات نے مشورہ دیا کہ نصاریٰ کی طرح گھنٹی بجادی جایا کرے بعض نے یہودیوں کی طرح بوق بجانے کا اور بعض نے کسی بلند مقام پر آگ روشن کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ان میں سے کسی تجویز کو پسند نہیں فرمایا۔ کیونکہ یہ چیزیں علی الترتیب نصاریٰ یہود اور مجوس کا شعار تھیں۔ بالآخر یہ طے پایا کہ سردست کوئی صاحب گلی کوچوں میں "الصلوٰۃ جامعہ" کا اعلان کر دیا کریں۔ بعد ازاں حضرت عبداللہ بن زید بن عبدربہ رضی اللہ عنہ کو خواب میں ایک فرشتے نے اذان واقامت کی تعلیم دی۔ انہوں نے اس کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا یہ سچا خواب ہے۔ تم یہ کلمات بلال کو تلقین کرو۔ وہ اذان کہیں۔ کیونکہ ان کی آواز بلند ہے۔ یہ پورا واقعہ احادیث میں مروی ہے۔ اسی کی طرف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

۳:۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ فرشتہ کی تعلیم کردہ اذان واقامت ــــــ جس کے مطابق اذان واقامت کہنے کا حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم ہوا تھا ــــــ کیا تھی؟ اس پر تو تمام روایات متفق ہیں کہ فرشتہ کی تلقین کردہ اذان کے کلمات پندرہ تھے۔ البتہ اقامت میں بظاہر روایت میں اختلاف نظر آتا ہے۔ چنانچہ ابو داؤد "باب کیف ؟الاذان" میں دونوں قسم کی روایات جمع کر دی گئی ہیں۔

الف:۔ محمد بن اسحاق کی روایت میں خود حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ صاحب الرؤیا سے اذان کے کلمات پندرہ اور اقامت کے کلمات گیارہ نقل کئے ہیں (ص ۷۱/ ۷۲) امام ترمذیؒ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ کی اس حدیث کو مختصراً نقل کر کے فرماتے ہیں۔

"یہ حدیث ابراہیم بن سعد نے محمد بن اسحاق کی روایت سے پوری اور اس سے

طویل نقل کی ہے۔ اور اس میں اذان کے کلمات دو دو مرتبہ اور اقامت کے ایک مرتبہ مذکور ہیں" (ص ۲۷)

ب:۔ لیکن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کی روایت میں ہے۔

فَقَامَ عَلَى الْمَسْجِدِ فَأَذَّنَ ثُمَّ قَعَدَ قَعْدَةً ثُمَّ قَامَ فَقَالَ مِثْلَهَا إِلَّا أَنَّهُ يَقُولُ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ۔ (ابوداؤد ص ۴۷، ج ۱)

ترجمہ:۔ وہ (فرشتہ) مسجد پر کھڑا ہوا پس اس نے اذان کہی، پھر وہ ذرا سا بیٹھا پھر کھڑا ہوا۔ تو اسی کی مثل الفاظ کہے۔ مگر اس میں "قد قامت الصلوٰۃ" کا اضافہ کیا۔

ایک روایت میں اذان کے کلمات الگ الگ ذکر کر کے یہ کہا ہے۔

ثُمَّ أَمْهَلَ هُنَيَّةً ثُمَّ قَامَ فَقَالَ مِثْلَهَا إِلَّا أَنَّهُ قَالَ زَادَ بَعْدَ حَيَّ عَلَى الْفَلَاحِ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوةُ (ص ۷۵)

ترجمہ:۔ پھر وہ ذرا سا ٹھہرا۔ پھر اٹھا۔ پس اسی کے مثل الفاظ کہے۔ مگر "حی علی الفلاح" کے بعد "قد قامت الصلوٰۃ" دو مرتبہ کا اضافہ کیا۔

ایک روایت میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ صاحب واقعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قَالَ كَانَ أَذَانُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ شَفْعًا شَفْعًا فِي الْأَذَانِ وَالْإِقَامَةِ (ترمذی صفحہ ۲۷ ج ۱)

ترجمہ:۔ وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اذان و اقامت دونوں میں دو دو مرتبہ الفاظ تھے۔

ابن ابی شیبہ روایت میں ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ فرماتے ہیں۔

حَدَّثَنَا أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ زَيْدِ الْأَنْصَارِيَّ جَاءَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ إِرَأَيْتُ فِي الْمَنَامِ كَأَنَّ رَجُلًا قَامَ وَعَلَيْهِ بُرْدَانِ أَخْضَرَانِ فَقَامَ عَلَى حَائِطٍ فَأَذَّنَ مَثْنٰى مَثْنٰى وَأَقَامَ مَثْنٰى مَثْنٰى (ص ۲۰۳ ج ۱)

ترجمہ:۔ ہم سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نے بیان کیا کہ عبداللہ بن زید انصاری آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پس عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گویا ایک آدمی، جس نے دو سبز چادریں پہن رکھی تھیں۔ کھڑا ہوا پس اس نے دو دو مرتبہ اذان کے اور دو دو مرتبہ اقامت کے کلمات کہے۔

نصب الرایہ (۱۔۲۶۷) میں اس روایت کو نقل کر کے حافظ ابن دقیق العید سے نقل کیا ہے۔

وَهٰذَا رِجَالُ الصَّحِيْحِ۔ وَمُتَّصِلٌ عَلٰى مَذْهَبِ الْجَمَاعَةِ فِيْ عَدَالَةِ الصَّحَابَةِ وَاَنَّ جِهَالَةَ اَسْمَاءِ هِمْ لَا تَضُرُّ۔

ترجمہ:۔ اس سند کے تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔ اور یہ محدثین کے مطابق سند متصل ہے۔ کیونکہ تمام صحابہ عادل ہیں اور ان کا نام معلوم نہ ہونا مضر نہیں۔

اور نصب الرایہ کے حاشیہ میں محلی ابن حزم (۳۔۱۵۸) سے نقل کیا ہے۔

وَهٰذَا اِسْنَادٌ فِيْ غَايَةِ الصِّحَّةِ مِنْ اِسْنَادِ الْكُوْفِيِّيْنَ۔

ترجمہ:۔ اور یہ سند اہل کوفہ کی اسناد میں سے نہایت صحیح سند ہے۔

۴:۔ ان روایات میں پہلی روایت میں عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ "حدثنا اصحابنا" کہتے ہیں۔ دوسری میں "عن معاذ ابن جبل" فرماتے ہیں۔ تیسری میں "عن عبداللہ زید الانصاری" کہتے ہیں اور چوتھی میں "حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم" فرماتے ہیں۔

دوسری اور تیسری روایت پر محدثین نے یہ اعتراض کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ کو حضرت معاذ بن جبل اور حضرت عبداللہ بن زید الانصاری سے سماع حاصل نہیں اس لئے یہ دونوں روائتیں منقطع ہیں، مگر اصل قصہ یہ ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے تواتر کے ساتھ سنا تھا۔ اس لئے وہ کسی ایک صحابی کے نام سے اس کی روایت نہیں کرتے۔ بلکہ کبھی "حدثنا اصحابنا" کہتے ہیں۔ اور کبھی "حدثنا اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم" فرماتے ہیں. پھر چونکہ یہ واقعہ حضرت عبداللہ بن زید الانصاری کا ہے اس لئے وہ کبھی ارسالاً ان کی طرف نسبت کر دیتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا قصہ بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے ارسالاً ان کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ پس اگر انہوں نے حضرت عبداللہ بن زید انصاری اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہما سے براہ راست اخذ نہ بھی کیا ہو۔ تب بھی چونکہ وہ کسی تابعی سے نہیں بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ

ہیثم ہی کے واسطہ سے نقل کرتے ہیں اس لئے ان کا ارسال مضر نہیں۔

۵:۔ ان روایات میں اقامت کے بارے میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے۔ مگر واقعہ کے اعتبار سے ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ بلکہ اقامت کے کلمات ٹھیک وہی تھے جو اذان کے کلمات تھے۔ مگر اس میں "قد قامت الصلوٰۃ کا اضافہ تھا۔ جیسا کہ متعدد روایات میں وارد ہے۔ اس لئے جس روایت میں اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے اقامت کے کلمات مفرد ذکر کئے گئے ہیں وہ اختصار پر محمول ہیں۔

۶:۔ چونکہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان واقامت فرشتہ کی تعلیم کردہ اذان واقامت کے مطابق تھی۔ اس لئے ان کی اذان بغیر ترجیع کے پندرہ کلمات پر مشتمل تھی اور اقامت ــــ قد قامت الصلوٰۃ ــــ قد قامت الصلوٰۃ کے اضافہ کے ساتھ سترہ کلمات پر مشتمل تھی جیسا کہ اوپر حضرت عبداللہ بن زید انصاری رضی اللہ عنہ کی حدیث گزر چکی ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق (ص ۴۶۲ ج ۱) میں حضرت اسود بن یزید تابعی" سے روایت ہے۔

اِنَّ بِلَالاً كَانَ يُثَنِّيْ الْاَذَانَ وَيُثَنِّيْ الْاِقَامَةَ (نصب الرایہ ص ۲۶۹ ج ۱)

ترجمہ:۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اذان اور اقامت کے کلمات دو دو مرتبہ کہا کرتے تھے۔

اور سنن دارقطنی میں حضرت ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

اِنَّ بِلَالاً كَانَ يُؤَذِّنُ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَثْنٰى مَثْنٰى وَيُقِيْمُ مَثْنٰى مَثْنٰى (حوالہ مذکور)

ترجمہ:۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اذان واقامت کے کلمات دو دو مرتبہ کہا کرتے تھے۔

اس روایت کے ایک راوی زیاد بن عبداللہ بکائی میں بعض حضرات نے کلام کیا ہے۔ مگر ہمارے لئے اتنا بس ہے کہ یہ صحیحین کا راوی ہے۔ حافظ نورالدین ہیثمی اس حدیث کو طبرانی کی معجم اوسط اور کبیر کے حوالے سے نقل کر کے لکھتے ہیں: ورجالہ ثقات۔ اس کے تمام راوی ثقہ ہیں (مجمع الزوائد ص ۳۳۰ ج ۱)

۷ــــ اور حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہ کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سترہ کلمات کی اقامت کی تلقین فرمائی تھی وہ فرماتے ہیں۔

عَلَّمَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الْأَذَانَ تِسْعَ عَشَرَۃَ کَلِمَۃً وَالْإِقَامَۃَ سَبْعَ عَشَرَۃَ کَلِمَۃً۔ (ابوداؤد ص ۷۳، ج ۱، نسائی ص ۱۰۳ ج ۱، ترمذی ص ۲۷ ج ۱، ابن ماجہ ص ۵۲)

ترجمہ:۔ مجھے رسول اللہ صلی علیہ و آلہ وسلم نے اذان کے انیس کلمات اور اقامت کے سترہ کلمات خود سکھائے تھے۔

اور حضرت ابو محذورہ کی اذان میں ترجیع کا ہونا صرف ان کی خصوصیت ہے۔ ورنہ فتح مکہ کے بعد بھی حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی اذان بغیر ترجیع کے ہوتی تھی۔

۸۔۔۔۔۔ چونکہ اقامت کے سترہ کلمات ہی اصل میں مشروع ہوئے تھے۔ اور مدینہ میں حضرت بلال اور مکہ میں حضرت ابو محذورہ رضی اللہ عنہما سترہ کلمات اقامت ہی کہتے تھے۔ اس لئے اسی کو اصل سنت قرار دیا جائے گا۔ اور افراد اقامت کو بیان جواز محمول کیا جائے گا۔ یا جن روایات میں اذان کا شفع اور اقامت کا ایتار ذکر کیا گیا ہے۔ ان کا یہ مطلب لیا جائے کہ اذان کے کلمات الگ الگ کہے جائیں۔ اور اقامت میں دو دو کلمات کو ملا کر کہا جائے۔ اور سوال میں جو خیال ظاہر کیا ہے کہ "اگر اذان ترجیع سے دی جائے تو اقامت جفت کہی جائے۔" یہ نظریہ شافعیہ میں سے امام ابن خزیمہؒ نے پیش کیا تھا۔ مگر اس کو خود شافعیہ نے بھی قبول نہیں کیا، چہ جائیکہ دوسرے حضرات اس کو قبول کرتے۔ اس لئے احادیث و آثار کے اعتبار سے یہی راجح ہے کہ اذان کے کلمات بغیر ترجیع کے پندرہ ہوں۔ اور اقامت کے کلمات قد قامت الصلوٰۃ کے اضافہ کے ساتھ سترہ ہوں۔ چنانچہ امام طحاویؒ نے شرح معانی الآثار میں نقل کیا ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے خادم ثوبان رضی اللہ عنہما اذان و اقامت مثنیٰ مثنیٰ کہا کرتے تھے۔ اور حضرت مجاہدؒ تابعی سے نقل کیا ہے کہ اقامت کے کلمات ایک ایک مرتبہ کہنا ایسی چیز ہے جس کو امرا نے ایجاد کیا ہے۔ (مصنف عبد الرزاق ص ۴۶۳، ج ۱ امانی الاحبار شرح معانی الآثار ص ۲۲۵ ج ۲)

امانی الاحبار شرح معانی الآثار (ص ۲۲۵ ج ۲) میں مصنف ابن ابی شیبہ کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

إِنَّ عَلِیًّا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَانَ یَقُوْلُ الْأَذَانُ مَثْنٰی وَالْإِقَامَۃُ وَأَتٰی عَلٰی مُؤَذِّنٍ یُّقِیْمُ مَرَّۃً مَرَّۃً فَقَالَ أَلَا جَعَلْتَہَا مَثْنٰی۔ لَا أُمَّ لَکَ۔

ترجمہ:۔ حضرت علی رضی اللہ فرماتے تھے کہ اذان کے کلمات دو دو مرتبہ ہوتے ہیں اور اقامت کے بھی۔ اور آپ ایک موذن کے پاس آئے جو ایک ایک مرتبہ اقامت کے کلمات کہتا تھا۔ تو آپ نے فرمایا تو نے اس کو دو دو مرتبہ کیوں نہ کہا تیری ماں نہ رہے۔

اور بیہقی کی خلافیات کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابراہیم نخعی ؒ فرماتے تھے کہ جس نے اقامت کو سب سے پہلے کم کیا وہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تھے۔

۹:۔ اذان اور اقامت کے کلمات میں جو اختلاف ہے وہ راجح اور مرجوح کا اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ ؒ۔ امام سفیان ثوری ؒ۔ اہل کوفہ۔ اور امام احمد بن حنبل ؒ نے احادیث و آثار کی بنا پر اذان کے پندرہ اور اقامت کے سترہ کلمات کو ترجیح دی ہے، ان حضرات کے نزدیک اذان میں ترجیع اور اقامت میں افراد بھی جائز ہے۔

سوال چہارم: مردوں اور عورتوں کی نماز میں تفریق:۔

س: ۴ تحقیق طلب یہ سوال ہے کہ مرد عورت کی نماز کی ہیئت (ظاہری شکل) مختلف کیوں ہے۔ مثلاً مرد کا کانوں تک تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھانا اور عورت کا کاندھے تک۔ مرد کا زیر ناف دونوں ہاتھ باندھنا اور عورت کا سینے پر۔

ج: ۴۔ مرد و عورت کی نماز میں یہ تفریق خود آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ثابت ہے۔ چنانچہ مراسیل ابی داؤد (ص ۸ مطبوعہ کارخانہ کتب کراچی) میں یزید ابن ابی حبیب ؒ سے مرسلاً روایت ہے۔

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَرَّ عَلٰی امْرَاَتَیْنِ تُصَلِّیَانِ فَقَالَ اِذَا سَجَدْتُمَا فَضُمَّا بَعْضَ اللَّحْمِ اِلَی الْاَرْضِ. فَاِنَّ الْمَرْاَۃَ لَیْسَتْ فِیْ ذٰالِکَ کَالرَّجُلِ۔

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی علیہ وسلم دو عورتوں کے پاس سے گزرے، جو نماز پڑھ رہی تھیں آپ ؐ نے ان سے فرمایا، جب تم سجدہ کرو تو اپنے جسم کا کچھ زمین سے ملالیا کرو کیوں کہ عورت کا حکم اس بارے میں مرد جیسا نہیں۔

کنز العمال (جلد ۴ ص ۱۱۷۔ مطبوعہ حیدر آباد دکن ۱۳۱۲ھ) میں بیہقی اور ابن عدی کے حوالے سے بروایت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے۔

وَاِذَا سَجَدَتْ اَلْصَقَتْ بَطْنَھَا بِفَخِذَیْھَا کَاَسْتَرِ مَا یَکُوْنُ لَھَا

ترجمہ:۔ ورت جب سجدہ کرے تو اپنا پیٹ رانوں سے چپکالے ایسے طور پر کہ اس کے لئے زیادہ سے زیادہ پردہ کا موجب ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے جہاں عورت کے سجدہ کا مسنون طریقہ معلوم ہوا کہ اسے بالکل سمٹ کر اور زمین سے چپک کر سجدہ کرنا چاہئے۔ وہاں دو اہم ترین اصول بھی معلوم ہوئے۔ ایک یہ کہ نماز کے تمام احکام اول سے آخر تک مردوں اور عورتوں کے لئے یکساں نہیں بلکہ بعض احکام مردوں کے لئے الگ ہیں اور عورتوں کے لئے ان سے مختلف۔ ہر صنف کو ان احکام کی پابندی لازم ہے جو اس سے متعلق ہوں۔

مردوں کو عورتوں کی اور عورتوں کو مردوں کی مشابہت کی اجازت نہیں۔

دوسرا اہم اصول یہ معلوم ہوا کہ عورتوں کے لئے نماز کی وہ ہیئت مسنون ہے جس میں زیادہ سے زیادہ ستر ہو۔ چونکہ مرد و عورت کی نماز میں یہ تفریق آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے خود فرما کر اس کے لئے ایک اصولی قاعدہ ارشاد فرمایا اس لئے امت کا تعامل و توارث اسی کے مطابق چلا آتا ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے۔

اِذَا سَجَدَتِ الْمَرْأَةُ فَلْتَضُمَّ فَخِذَيْهَا (کنز العمال صہ ۲۲۲ ج ۴)

ترجمہ:۔ جب عورت سجدہ کرے تو اسے چاہئے کہ اپنی رانوں کو ملالیا کرے۔

حضرات فقہاء جب عورتوں کے ان مسائل کو جن کی طرف سوال میں اشارہ کیا گیا ہے ذکر کرتے ہیں تو اسی اصول کو پیش نظر رکھتے ہیں جو اوپر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں عورت کے سجدہ کی کیفیت کو ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

وَالْمَرْأَةُ تَنْخَفِضُ فِي سُجُوْدِهَا وَتُلْزِقُ بَطْنَهَا بِفَخِذَيْهَا لِاَنَّ ذٰلِكَ اَسْتَرُ لَهَا۔

ترجمہ:۔ اور عورت اپنے سجدہ میں سمٹ جائے۔ اور اپنا پیٹ اپنی رانوں سے ملائے کیونکہ یہ اس کے لئے زیادہ پردہ کی چیز ہے۔

یہ قریب قریب وہی الفاظ ہیں جو اوپر حدیث میں منقول ہوئے ہیں۔ اور قعدہ کی ہیئت کو ذکر کرتے ہوئے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

فَاِنْ كَانَتْ امْرَأَةً جَلَسَتْ عَلٰى اَلْيَتِهَا الْيُسْرٰى وَاَخْرَجَتْ رِجْلَيْهَا اِلَى الْجَانِبِ الْاَيْمَنِ لِاَنَّهٗ اَسْتَرُ لَهَا۔

ترجمہ:۔ اگر عورت ہو تو اپنے سرین پر بیٹھ جائے اور پاؤں دائیں جانب نکال لے کیونکہ یہ اس کے لئے زیادہ پردہ کی چیز ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اس ارشاد فرمودہ اصول کی رعایت صرف فقہائے احناف ہی نے نہیں کی بلکہ قریب قریب تمام ائمہ اور فقہاء امت نے اس اصول کو ملحوظ رکھا ہے۔ جیسا کہ ان کی کتب فقہیہ سے واضح ہے۔ واللہ الموفق۔

سوال پنجم: فاتحہ خلف الامام اور مسئلہ آمین:۔

س ۵: نماز کے اندر امام کے پیچھے الفاتحہ پڑھنے سے اور آمین کا امام اور مقتدی کا جہری نماز میں جہر سے کہنے سے کس نے منع کیا ہے۔ جب کہ واضح احادیث و آثار اصحاب سے ہے۔ اگر منسوخ ہو چکا ہے تو قول اور صحت والی احادیث اور آثار اصحاب سے دلیل دیں۔

ج ۵:۔ فاتحہ خلف الامام کی بحث سوال دوم کے ذیل میں گزر چکی ہے۔ اور میں وہاں بتا چکا ہوں کہ
۱۴۴ قرآن کریم نے بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے بھی امام کی اقتداء میں مقتدی کو خاموش رہنے کا حکم دیا ہے۔ مگر چونکہ سوال میں دوبارہ دریافت کیا گیا ہے کہ اس سے کس نے منع کیا ہے؟ اس لئے مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں دو نکتے مزید عرض کر دیئے جائیں۔ واللہ الموفق

اول:۔ یہ کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم کی یہ آیت:

وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ

ترجمہ:۔ اور جب قرآن پڑھا جائے تو اس پر کان دھرو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس آیت کریمہ میں حق تعالیٰ شانہ نے اپنی رحمت کو مقتدی کی خاموش پر معلق فرمایا ہے۔ گویا جو مقتدی امام کے پیچھے خاموشی اختیار نہ کرے بلکہ امام کی قرات کے وقت اپنی قرات خود شروع کر دے وہ "لعلکم ترحمون" کے زمرے سے خارج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خطبہ کی حالت میں ذکر و تسبیح کی بھی ممانعت ہے اور امر بالمعروف، جو عام حالات میں واجب ہے، اس کی بھی ممانعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایسے شخص کو بھی لغو کا مرتکب قرار دیا ہے جس سے جمعہ کا ثواب باطل ہو جاتا ہے۔

ارشاد نبوی ہے۔

إِذَا قُلْتَ لِصَاحِبِكَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ أَنْصِتْ وَالْإِمَامُ يَخْطُبُ فَقَدْ لَغَوْتَ (متفق علیہ، مشکوٰۃ صہ ۱۲۲)

ترجمہ:۔ جب تم نے جمعہ کے دن اپنے رفیق سے کہا کہ خاموش رہو جب کہ امام خطبہ دے رہا تھا تو تم نے لغو کا ارتکاب کیا۔

ایک اور حدیث میں ہے کہ اس سے جمعہ کا ثواب باطل ہو جاتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَنْ تَکَلَّمَ یَوْمَ الْجُمُعَۃِ وَالْإِمَامُ یَخْطُبُ فَھُوَ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا۔ وَالَّذِیْ یَقُوْلُ لَہٗ اَنْصِتْ لَیْسَ لَہٗ جُمُعَۃٌ۔

(رواہ احمد۔ مشکوٰۃ صفحہ ۱۲۳)

ترجمہ:۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے جمعہ کے دن کوئی بات کی جب کہ امام خطبہ دے رہا تھا۔ تو اس کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو بوجھ اٹھائے پھرتا ہے اور جو شخص بات کرنے والے کو خاموش رہنے کا حکم دے اس کا بھی جمعہ نہیں۔

جب خطبہ کی حالت میں کلام کرنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس قدر تشدید فرمائی تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ نماز جو خطبہ سے بدرجہا فائق ہے، اس میں امام کی قرات کے وقت مقتدی کا اپنی قراءت میں مشغول ہونا آپ کی نظر میں کس قدر سنگین ہو گا۔

دوم:۔ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے امام کی اقتدا میں قرات کی صاف صاف ممانعت بھی وارد ہے اس سلسلہ میں مصنفہ عبدالرزاق سے چند روایات نقل کرتا ہوں۔

۱۔ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ اَبِیْہِ قَالَ نَھٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ الْقِرَاءَۃِ خَلْفَ الْإِمَامِ قَالَ وَاَخْبَرَنِیْ اَشْیَاخُنَا اَنَّ عَلِیًّا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: مَنْ قَرَأَ خَلْفَ الْإِمَامِ فَلَا صَلٰوۃَ لَہٗ۔ قَالَ وَاَخْبَرَنِیْ مُوْسَی بْنُ عُقْبَۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَاَبُوْبَکْرٍؓ وَعُمَرُؓ وَعُثْمَانُؓ کَانُوْا یَنْھَوْنَ عَنِ الْقِرَاءَۃِ خَلْفَ الْإِمَامِ (ص۱۳۹ ج۲)

۲۔ عَنْ زَیْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ کَانَ یَنْھٰی الْقِرَاءَۃَ خَلْفَ الْإِمَامِ (ص۱۴۰ ج۲)

۳۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَجْلَانَ قَالَ قَالَ عَلِیٌّ: مَنْ قَرَأَ مَعَ الْإِمَامِ

فَلَيْسَ عَلَى الْفِطْرَةِ۔

قَالَ وَقَالَ ابْنُ مَسْعُوْدٍ مُلِئَ فُوْهُ تُرَابًا۔ قَالَ وَقَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ وَدِدْتُ اَنَّ الَّذِيْ يَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ فِيْ فِيْهِ حَجَرٌ (صفحہ ۱۳۸ ج ۲)

۴۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ لَيْلٰى قَالَ سَمِعْتُ عَلِيًّا يَقُوْلُ مَنْ قَرَأَ خَلْفَ الْإِمَامِ فَقَدْ اَخْطَأَ الْفِطْرَةَ (صفحہ ۱۳۷ ج ۲)

۵۔ عَنْ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ قَالَ مَنْ قَرَأَ مَعَ الْإِمَامِ فَلَا صَلٰوةَ لَهٗ (ایضاً)

۶۔ عَنِ الْاَسْوَدِ قَالَ وَدِدْتُ اَنَّ الَّذِيْ يَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ مُلِئَ فُوْهُ تُرَابًا (صفحہ ۱۳۸ ج ۲)

۷۔ اَنَّ عَلْقَمَةَ بْنَ قَيْسٍ قَالَ اِنَّ الَّذِيْ يَقْرَأُ خَلْفَ الْإِمَامِ مُلِئَ فُوْهُ قَالَ اَحْسِبُهٗ قَالَ تُرَابًا اَوْ رَضْفًا۔

ترجمہ:۔ عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم اپنے والد زید بن اسلم سے نقل کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امام کے پیچھے قرات کرنے سے منع فرمایا۔

عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارے مشائخ نے بتایا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا جو شخص امام کے پیچھے قرات کرے اس کی نماز نہیں۔

اور موسیٰ بن عقبہ نے مجھے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم امام کے پیچھے قرات کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔

زید بن اسلم سے روایت ہے کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ امام کے پیچھے قرات کرنے سے منع کیا کرتے تھے۔

محمد بن عجلان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ جو شخص امام کے ساتھ قرات کرے وہ فطرت پر نہیں۔ اور ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کا منہ مٹی سے بھرا جائے۔

اور حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے قرات کرتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ اس کے منہ میں پتھر ہو۔

عبداللہ بن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو فرماتے سنا ہے کہ جو شخص امام کے پیچھے قرات کرے اس نے فطرت کے خلاف کیا۔

زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کو جو شخص امام کے ساتھ قرات کرے اس کی نماز نہیں۔

اسود رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرات کرے اس کا منہ مٹی سے بھرا

جائے۔ علقمہ بن قیسؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص امام کے پیچھے قرات کرے خدا کرے اس کا منہ مٹی سے یا پتھر سے بھرا جائے۔

مئوخر الذکر دونوں حضرات (اسود و علقمہ) کبار تابعین میں ہیں جو حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے زمانہ فتویٰ دیا کرتے تھے۔

ان تمام احادیث و آثار سے واضح ہے کہ قرات خلف الامام سے آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم، خلفائے راشدین اکابر صحابہ اور اکابر تابعین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) منع فرماتے تھے۔ اور یہ قرآن کریم کی آیت کریمہ "فاستمعوا لہ وانصتوا" کی تعمیل تھی۔ واللہ الموافق۔

جہاں تک مسئلہ آمین کا تعلق ہے اس سلسلہ میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔

اول:۔ بعض امور میں جائز و ناجائز کا اختلاف ہوتا ہے۔ مگر آمین کے مسئلہ میں جواز و عدم جواز کا اختلاف نہیں بلکہ اختلاف اگر ہے تو اس میں ہے کہ آمین جہراً کہنا زیادہ بہتر ہے یا آہستہ کہنا؟ حافظ ابن قیمؒ زاد المعاد (بحث قنوت) میں لکھتے ہیں۔

وَهٰذَا مِنَ الْاِخْتِلَافِ الْمُبَاحِ الَّذِیْ لَا یُعَنَّفُ فِیْهِ مَنْ فَعَلَهٗ وَلَا مَنْ تَرَكَهٗ وَهٰذَا كَرَفْعِ الْیَدَیْنِ فِی الصَّلٰوةِ وَتَرْكِهٖ (ص۷۰ ج ۱ مطبوعہ مصر ۱۳۶۹ھ)

ترجمہ:۔ اور یہ مباح اختلاف میں سے ہے جس میں نہ کرنے والے پر کوئی ملامت ہے اور نہ ترک کرنے والے پر۔ اس کی مثال ہے نماز میں رفع یدین کرنا یا نہ کرنا۔

حافظ ابن قیمؒ کی اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں ایک یہ کہ آمین کے آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کے جواز پر سب کا اتفاق ہے۔ البتہ ایک فریق کے نزدیک آہستہ کہنا زیادہ بہتر ہے۔ اور دوسرے کے نزدیک جہراً کہنا۔ اس لئے سوال میں جو دریافت کیا گیا ہے کہ "جہر سے کس نے منع کیا" سوال کا یہ انداز صحیح نہیں۔ صحیح انداز یہ تھا کہ آپ کے نزدیک آہستہ کہنا کیوں بہتر ہے؟

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اگر ایک فریق کے نزدیک دلائل کی بنا پر ایک پہلو راجح ہو۔ اور دوسرے فریق کو دوسرا پہلو بہتر معلوم ہو تو کسی فریق کو دوسری پر ملامت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اس لئے کہ ملامت سنن موکدہ کے ترک پر ہوتی ہے۔ مستحبات کے اخذ و ترک پر ملامت نہیں ہوا کرتی۔

دوم: آمین ایک دعا ہے جیسا کہ صحیح بخاری ص ۱۰۷ ج ۱ میں حضرت عطاؒ کا قول نقل کیا ہے۔ مجمع البحار (ص ۱۰۵ ج ۱ طبع جدید حیدر آباد دکن) میں ہے۔

وَمَعْنَاهُ اِسْتَجِبْ لِیْ اَوْکَذَالِکَ فَلْیَکُنْ

ترجمہ:۔ اس کے معنی ہیں یااللہ! میری دعاقبول فرما۔ یا یہ کہ ایسا ہی ہو۔

جب معلوم ہوا کہ "آمین" ایک دعا ہے تو سب سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا ہو گا کہ دعا میں جہر افضل ہے یا اخفا؟ بلاشبہ جہری دعا بھی جائز اور آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے ثابت ہے۔ مگر دعا میں اصل اخفاء ہے چنانچہ قرآن کریم میں ہے۔

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (الاعراف ۵۵)

ترجمہ:۔ پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور پوشیدہ۔

اور حضرت زکریا علیہ السلام کے تذکرہ میں فرمایا۔

اِذْ نَادٰی رَبَّہٗ نِدَاءً خَفِیًّا (مریم: ۳)

ترجمہ:۔ جب پکارا اپنے رب کو پکارنا پوشیدہ۔

چونکہ دعا میں اعلیٰ اور اولیٰ صورت اخفاء کی ہے۔ اس لئے آمین میں بھی اخفا ہی اولیٰ و بہتر ہو گا۔

سوم:۔ جو حضرات جہری نمازوں میں امام اور مقتدی کے جہراً آمین کہنے کو مستحب فرماتے ہیں ان کا مدعا اس وقت ثابت ہو سکتا ہے کہ جب وہ یہ ثابت کر دیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دائمی یا اکثری معمول آمین بالجہر کا تھا۔ یا یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جہراً آمین کہنے کا حکم فرمایا تھا مگر کسی صحیح و صریح حدیث میں یہ دونوں باتیں کم از کم میری نظر سے نہیں گزری، امام بخاریؒ نے "جہرالامام بالتأمین" اور "جہرالماموم بالتأمین" کے دو الگ الگ باب قائم کئے ہیں۔ اور دونوں کے ذیل میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک ہی حدیث باختلاف الفاظ نقل کی ہے۔ پہلے باب کے ذیل میں یہ الفاظ ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا اَمَّنَ الْاِمَامُ فَاَمِّنُوْا فَاِنَّہٗ
مَنْ وَّافَقَ تَامِیْنُہٗ تَامِیْنَ الْمَلَائِکَۃِ غُفِرَلَہٗ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ
قَالَ ابْنُ شِہَابٍ وَکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ
آمِیْنَ

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب امام آمین کہے تو تم بھی آمین کہو کیونکہ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہو جائے گی اس کے گذشتہ گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ ابن شہاب کہتے ہیں کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم بھی آمین کہا کرتے تھے۔
اور دوسرے باب کے ذیل میں یہ الفاظ ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ اِذَا قَالَ الْاِمَامُ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ فَقُوْلُوْا اٰمِیْنَ فَاِنَّہٗ مَنْ وَّافَقَ قَوْلُہٗ قَوْلَ الْمَلَائِکَۃِ غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ (صحیح بخاری صـ ۱۰۸، ج ۱)

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہا کرو کیونکہ جس کا کہنا ملائکہ کے کہنے کے موافق ہو گا اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جائیں گے۔

جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں اس حدیث میں امام اور مقتدی کو آمین کہنے کا حکم ہے۔ اور اس کی فضیلت ارشاد فرمائی گئی ہے لیکن یہ کہ آمین آہستہ آہستہ کہنی ہو گی۔ یا جہراً، اسی کی تصریح اس حدیث سے ثابت نہیں ہوتی۔ حافظ ابن قیمؒ "قنوت فجر کی بحث میں لکھتے ہیں۔

وَمِنَ الْمَعْلُوْمِ بِالضَّرُوْرَۃِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَوْ کَانَ یَقْنُتُ کُلَّ غَدَاۃٍ یَدْعُوْا بِھٰذَا الدُّعَاءِ وَیُؤَمِّنُ الصَّحَابَۃُ لَکَانَ نَقْلُ الْاُمَّۃِ لِذَالِکَ کُلِّھِمْ کَنَقْلِھِمْ بِجَھْرِہٖ بِالْقِرَاءَۃِ فِیْھَا وَعَدَدِھَا وَوَقْتِھَا۔ وَاِنْ جَازَ عَلَیْھِمْ تَضْیِیْعُ اَمْرِ الْقُنُوْتِ مِنْھَا جَازَ عَلَیْھِمْ تَضْیِیْعُ ذَالِکَ۔ وَلَا فَرْقَ وَبِھٰذَا الطَّرِیْقِ عَلِمْنَا اَنَّہٗ لَمْ یَکُنْ ھَدْیُہُ الْجَھْرَ بِالتَّسْمِیَۃِ کُلَّ یَوْمٍ وَّلَیْلَۃٍ سِتَّ مَرَّاتٍ دَائِمًا مُّسْتَمِرًّا ثُمَّ یُضَیِّعُ اَکْثَرُ الْاُمَّۃِ ذَالِکَ وَیَخْفٰی عَلَیْھَا وَھٰذَا مِنْ اَمْحَلِ الْمُحَالِ بَلْ لَوْ کَانَ وَاقِعًا لَکَانَ نَقْلُہٗ کَعَدَدِ الصَّلٰوۃِ وَعَدَدِ الرَّکْعَاتِ وَالْجَھْرِ وَالْاِخْفَاءِ وَعَدَدِ السَّجَدَاتِ وَمَوَاضِعِ الْاَرْکَانِ وَتَرْتِیْبِھَا۔ وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ۔

وَالْاِنْصَافُ الَّذِیْ یَرْتَضِیْہِ الْعَالِمُ الْمُنْصِفُ اَنَّہٗ جَھَرَ وَاَسَرَّ وَقَنَتَ وَتَرَکَ وَکَانَ اِسْرَارُہٗ اَکْثَرَ مِنْ فِعْلِہٖ (صفحہ ۶۹)

ترجمہ:۔ اور یہ بات بداہتہً معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اگر ہر صبح کو قنوت پڑھا کرتے اور یہ دعا (اللھم اہدنی فیمن ہدیت) پڑھا کرتے اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین۔ اس پر آمین

کیا کرتے تو پوری کی پوری امت اس کو نقل کرتی جیسا کہ امت نے نماز میں جہری قرات کو نمازوں کی تعداد کو اور ان کے اوقات کو نقل کیا ہے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ امت نے قنوت کی نقل کو ضائع کر دیا ہے تو ان مذکورہ بالا امور کا ضائع کرنا بھی بلا کسی فرق کے صحیح ہو گا۔ اور اسی طریقہ سے ہم نے معلوم کر لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک جہراً بسم اللہ پڑھنے کا نہیں تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ شب و روز میں چھ مرتبہ دوام و استمرار کے ساتھ جہراً بسم اللہ پڑھتے ہوں۔ اس کے بعد اکثر امت اس کو ضائع کر دے۔ اور یہ بات اس پر مخفی رہ جائے۔۔۔۔ یہ سب سے بڑھ کر محال ہے۔ بلکہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو اس کو بھی اسی طرح نقل کیا جاتا جیسے نماز کی تعداد کو، رکعات کی تعداد کو، قرات کے جہر و اخفا کو، سجدوں کی تعداد کو، ارکان کے مواضع اور ان کی ترتیب کو۔ نقل کیا گیا واللہ الموافق۔

اور انصاف کی بات جسے عالم منصف قبول اور پسند کرے گا یہ ہے کہ آپؐ نے جہر بھی کیا اور آہستہ بھی۔ قنوت پڑھی بھی اور چھوڑی بھی۔ اور آپ کا آہستہ کہنا جہر سے زیادہ تھا۔ اور قنوت کا ترک کرنا اس کے پڑھنے سے زیادہ تھا۔

حافظ ابن قیمؒ نے جو منصفانہ بات قنوت فجر اور جہر بالتسمیہ کے بارے میں کہی ہے وہ لفظ بلفظ آمین بالجہر میں جاری ہوتی ہے اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دائمی معمول آمین بالجہر کا ہوتا تو ناممکن تھا کہ اسے عدد رکعات کی طرح نقل نہ کیا جاتا۔ اس مسئلہ میں صحابہ و تابعین اور ائمہ اجتہاد کا اختلاف نہ ہوتا اور امام بخاریؒ کو ایک ایسی حدیث سے استدلال کی ضرورت پیش نہ آتی جس میں جہر کا کوئی شائبہ نظر نہیں آتا۔

چہارم: امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث سے، باوجود جہر کی تصریح نہ ہونے کے، قرائن و قیاسات کی مدد سے جہر پر استدلال فرمایا ہے، جو حضرات اخفاء آمین کے قائل ہیں وہ اسی حدیث کے اشارات سے اخفا پر استدلال کرتے ہیں۔ مثلاً

ا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے امام کے "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کہنے پر مقتدیوں کو آمین کہنے کا حکم فرمایا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ امام بلند آواز سے آمین نہیں کہتا ورنہ اس کے غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہنے پر آمین کہنے کا حکم نہ دیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری روایت میں "جب امام آمین کہے" کے جو الفاظ ہیں ان کو خود شافعیہ نے بھی مجاز پر محمول کیا ہے، یعنی جب امام آمین کہنے کا ارادہ کرے یا جب اس کے آمین کہنے کا وقت ہو جائے تو تم بھی آمین کہو۔

۲. اسی حدیث کی ایک روایت میں بسند صحیح یہ اضافہ ہے۔

وَانَّ الاِمَامَ یَقُوْلُ آمِیْن (سنن نسائی ص ۱۴۷ ج ۱)

اور امام بھی آمین کہتا ہے۔

اگر امام کو جہراً آمین کہنے کا حکم ہوتا تو اس ارشاد کی ضرورت نہ تھی کہ امام بھی آمین کہا کرتا ہے صحابہ کرامؓ آپؐ کے عمل سے ہی معلوم کر سکتے تھے۔

۳۔ حدیث میں ملائکہ کی آمین کے موافق ہونے پر مغفرت کا وعدہ فرمایا گیا ہے نمازی کی آمین میں فرشتوں کے ساتھ موافقت وقت میں بھی ہو سکتی ہے۔ خشوع و اخلاص میں بھی اور کیفیت میں بھی اسی موافقت کا دائرہ ذرا وسیع کر دیا جائے تو جہر و اخفا میں بھی موافقت ہو سکتی ہے۔ فرشتوں کی آمین چونکہ اخفاء کے ساتھ ہوتی ہے تو ہمیں بھی ان کی موافقت کرنی چاہئے۔

پنجم: آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم سے آمین بالجہر کے جو واقعات منقول ہیں اول تو ان کی اسانید میں اہل علم کو کلام ہے۔ پھر احیاناً جہر تعلیم پر بھی محمول ہو سکتا ہے۔

حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

فَاِذَا جَهَرَ بِهِ الْاِمَامُ اَحْيَانًا لِيَعْلَمَ الْمَأْمُوْمِيْنَ فَلَا بَأْسَ بِذَالِكَ فَقَدْ جَهَرَ عُمَرُ بِالْاِفْتِتَاحِ لِيُعَلِّمَ الْمَأْمُوْمِيْنَ وَجَهَرَ ابْنُ عَبَّاسٍ بِقِرَاءَةِ الْفَاتِحَةِ فِيْ صَلٰوةِ الْجَنَازَةِ لِيُعَلِّمَهُمْ اَنَّهَا سُنَّةٌ وَمِنْ هٰذَا اَيْضًا جَهْرُ الْاِمَامِ بِالتَّأْمِيْنِ (زاد المعاد ص ۷۰ ج ۱)

پس جب امام اس (قنوت) کو کبھی جہر کے ساتھ پڑھے تاکہ مقتدی جان لیں تو کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ مقتدیوں کی تعلیم کے لئے حضرت عمرؓ نے "سبحانک اللھم" بلند آواز سے پڑھی تھی اور حضرت ابن عباسؓ نے نماز جنازہ میں فاتحہ بلند آواز سے پڑھی تھی تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ سنت ہے اور امام کا بلند آواز سے آمین کہنا اسی قبیل سے ہے۔

چنانچہ حضرت وائل بن حجرؓ کی حدیث، جو جہر کی روایات میں سب سے قوی ہے اس میں اس مضمون کی تصریح موجود ہے۔

وَقَرَأَ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ فَقَالَ آمِيْنَ يَمُدُّ بِهَا صَوْتَهُ مَا اَرَاهُ اِلَّا يُعَلِّمُنَا اَخْرَجَهُ اَبُوْ بِشْرِ الدُّوْلَابِيُّ فِي الْاَسْمَاءِ وَالْكُنٰى

(اعلاء السنن ص ۱۸۶ ج ۲)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کی قرات سے فارغ ہوئے تو آپ ؐ نے آمین کہی۔ آپ ؐ اس کے ساتھ اپنی آواز کو کھینچ رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ آپ ؐ ہمیں تعلیم دینا چاہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ اپنے زمانہ خلافت میں مکہ مکرمہ میں بلند آواز سے آمین کہتے تھے اور ان کے مقتدی بھی، وہ بھی تعلیم ہی پر محمول ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس موقعہ پر آمین کہنا سنت ہے ورنہ آمین چونکہ خفیہ کہی جاتی ہے اس سے بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہو سکتا تھا کہ آمین کہنا ہی بدعت ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں امام مالک ؒ امام کی آمین کہنے کے قائل نہیں۔

ششم۔ علامہ ابن الترکمانی نے الجوہر النقی میں دعویٰ کیا ہے کہ اکثر صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اخفاء آمین پر عامل تھے، اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اصل سنت یہی تھی، اور احیاناً اگر جہر فرمایا تھا، تو نو واردوں کی تعلیم کے لئے تھا۔ یہاں چند آثار کا حوالہ دیدینا کافی ہو گا۔

۱۔ (کنز العمال (جلد ۴ ص ۲۴۹ کتاب الصلوٰۃ من قسم الافعال ادب الماسوم ماتیعلق بہ) میں ابن جریر کے حوالے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے۔

اَرْبَعٌ يُّخْفِيْهِنَّ الْاِمَامُ اَلتَّعَوُّذُ وَبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَآمِيْن وَاَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ۔

۲۔ عَنْ اَبِيْ وَائِلٍ قَالَ كَانَ عَلِيٌّ وَّعَبْدُ اللّٰهِ لَا يَجْهَرَانِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَلَا بِالتَّعَوُّذِ وَلَا بِالتَّامِيْنِ (مجمع الزوائد ص ۱۸ ج ۲)

قَالَ الْهَيْثَمِيُّ رَوَاهُ الطَّبْرَانِيُّ فِي الْكَبِيْرِ۔ وَفِيْهِ اَبُوْ سَعْدِ الْبَقَّالُ وَهُوَ ثِقَةٌ مُّدَلِّسٌ۔

۳۔ عَنْ اَبِيْ وَائِلٍ قَالَ لَمْ يَكُنْ عُمَرُ وَعَلِيٌّ يَجْهَرَانِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَلَا بِاٰمِيْن (رواہ ابن جریر الطبری فی تہذیب الآثار الجواہر النقی صفحہ ۱۳۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ ۱۔ چاروں چیز کو امام خفیہ ادا کرے گا۔ اعوذ باللہ۔ بسم اللہ۔ آمین اور اللہم ربنا ولک الحمد۔

۲۔ ابو وائل کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کو بلند آواز سے نہیں کہتے تھے۔ نہ اعوذ باللہ کو نہ آمین کو۔

ترجمہ:۔ ۳۔ ابو وائل کہتے ہیں کہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم بلند آواز سے کہتے اور نہ آمین کو۔

۴۔ مصنف عبدالرزاق (۸۷ج۲) میں حضرت ابراہیم نخعی ؒ کا ارشاد نقل کیا ہے۔

اَرْبَعٌ یَخْفَضُھُنَّ الْاِمَامُ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ وَالْاِسْتِعَاذَۃُ وَآمِیْنَ وَاِذَا قَالَ سَمِعَ اللّٰہُ لِمَنْ حَمِدَہٗ قَالَ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔

ترجمہ:۔ چار چیزیں ایسی ہیں کہ امام ان کا اخفا کرے گا۔ بسم اللہ الرحمٰن۔ اعوذ باللہ۔ آمین، اور سمع لمن حمدہ کے بعد ربنا لک الحمد۔

دوسری روایت میں ہے:۔

خَمْسٌ یُخْفَیْنَ سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَالتَّعَوُّذُ وَبِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَاٰمِیْنَ وَاَللّٰھُمَّ رَبَّنَا لَکَ الْحَمْدُ۔

ترجمہ:۔ پانچ چیزیں خفیہ کہی جاتی ہیں سبحانک اللہم وبحمدک۔ اعوذ باللہ۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم آمین اور اللہم ربنا لک الحمد۔

سوال ششم. رفع یدین کا مسئلہ:۔

س۶: رفع الیدین صحاح ستہ سے کثرت سے اصحاب رسولؐ روایت کرتے ہیں جن کی تعداد تقریباً دس سے زائد ہے۔ بعض پچاس سے بھی زائد کہتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ احناف اس سنت کو ترک کر رہے ہیں۔ اور اپنانے سے ہچکچاتے ہی نہیں نماز کو فاسد بھی قرار دیتے ہیں۔ اگر یہ حکم منسوخ ہے تو مدلل ثبوت کم از کم تین اصحاب رسولؐ سے (جو راوی کے اعتبار سے معتبر سمجھے جاتے ہوں) واضح فرمائیں۔

ج ۶:۔ رفع یدین کے مسئلہ میں بھی حنفیہ کا موقف ٹھیک سنت نبویؐ کے مطابق ہے اس کو سمجھنے کے لئے چند امور کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اول: تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین با جماع امت مستحب ہے ا۔ اور باقی مقامات میں اختلاف

ہے۔ (نووی: شرح مسلم ص ۱۶۸ ج ۱) اور اس اختلاف کا منشایہ ہے کہ اس سلسلہ میں روایات بھی مختلف وارد ہوئی ہیں اور سلف صالحین کا عمل بھی مختلف رہا ہے۔ چنانچہ:

۱ــــ بعض روایات میں صرف تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔ (اس سلسلہ کی احادیث آگے ذکر کی جائیں گی۔)

۲ــــ بعض روایات میں رکوع میں جاتے اور رکوع سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین کا ذکر ہے یہ چونکہ خود سوال میں مذکور ہے اس لئے اس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں۔

۳ــــ بعض روایات میں سجدہ کو جاتے ہوئے بھی رفع یدین کا ذکر ہے

۴ــــ بعض روایات میں دونوں سجدوں کے درمیان بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔
(مثلاً حدیث ابن عباسؓ ــــ ابو داؤد ص ۱۰۸ انسائی ص ۱۷۲)

۵ــــ بعض روایات میں دوسری رکعت کے شروع میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔
(مثلاً حدیث وائل بن حجرؓ

وَإِذَا رَفَعَ رَأْسَهُ مِنَ السُّجُودِ ؕ (ابو داؤد ص ۱۰۵)

۶ــــ بعض روایات میں تیسری رکعت کے شروع میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔
(مثلاً حدیث ابن عمرؓ صحیح بخاری ص ۱۰۲ ج ۱ وَإِذَا قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ رَفَعَ يَدَيْهِ ؕ
حدیث ابی حمید الساعدی: ابو داؤد ص ۱۰۶ ج ۱ ترمذی ص ۴۰ ثُمَّ إِذَا قَامَ مِنَ الرَّكْعَتَيْنِ كَبَّرَ وَرَفَعَ۔
حدیث ابی ہریرہ: ابو داؤد ص ۱۰۸، حدیث ابن عمر. ابو داؤد ص ۱۰۹. حدیث علی: ابو داؤد ۱۰۹، وص ۱۱۱

۷ــــ بعض روایات میں ہر اونچ نیچ (عند کل خفض ورفع) رفع یدین کا ذکر ہے۔
(مثلاً حدیث عمیر بن حبیب: ابن ماجہ ص ۶۲ یرفع یدیہ مع کل تکبیر)

رفع یدین کی یہ تمام صورتیں احادیث کی کتابوں میں مروی ہیں۔ اور سلف صالحین کے یہاں معمول بہا رہی ہیں، لیکن امام شافعیؒ، واحمدؒ صرف تین موقعوں پر رفع یدین کو مستحب سمجھتے ہیں باقی جگہ نہیں اور امام ابو حنیفہؒ (مشہور اور معتمد علیہ روایت کے مطابق) ؟امام مالکؒ صرف تحریمہ کے وقت مستحب سمجھتے ہیں باقی جگہ نہیں۔ جس طرح امام شافعیؒ اور امام احمدؒ باقی مقامات کے رفع یدین کو ترک کرنے کی وجہ سے تارک سنت نہیں کہلاتے اور نہ ان کے بارے میں کوئی شخص یہ کہے

۱۔ بعض حضرات اس موقعہ پر رفع یدین کے وجوب کے قائل ہیں۔

گاوہ سنت کو اختیار کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اسی طرح اگر امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ کے نزدیک دلائل و ترجیحات کی بنا پر یہ محقق ہوا تحریمہ کے وقت رفع یدین سنت ہے۔ اور باقی مواقع میں ترک رفع یدین سنت ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ان کو تارک سنت کا خطاب دیا جائے۔ یا سنت کو اختیار کرنے میں ہچکچاہٹ کا الزام دیا جائے۔

دوم: تین مقامات (تحریمہ۔ رکوع اور قومہ) میں رفع یدین کی احادیث مروی ہیں ان میں خاصا انتشار و اضطراب ہے اور مختلف طرق سے مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہیں۔ مثال کے طور پر یہاں ان دو حدیثوں کا ذکر مناسب ہو گا جو رفع یدین کی احادیث میں سب سے اصح اور سب سے قوی سمجھی جاتی ہیں اور امام بخاریؒ و امام مسلمؒ نے صحیحین میں رفع یدین کے استدلال میں صرف انہی دو حدیثوں پر اکتفا کیا ہے۔ ایک حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت جو اس باب کی سب سے صحیح ترین حدیث سمجھی جاتی ہے۔ اور دوسری حضرت مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ جو اس سے دوسرے در[illegible] پر ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث کے طرق ملاحظہ ہوں۔

ص ا[illegible] ج ا میں ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں صرف تحریمہ کے وقت رفع یدین کا ذکر ہے۔ اور اسی روایت کی بنا پر امام مالکؒ نے ترک رفع یدین کو اختیار کیا ہے۔

۲___ امام بخاری کے استاد امام حمیدی کی مسند (ص ۲۷۷ ج ۲ میں اور صحیح ابو عوانہ ص ۹۰ ج ۲) میں تحریمہ کے سوا باقی مقامات میں رفع یدین کی نفی ہے (یہ حدیث آگے ترک رفع یدین کے دلائل میں نمبر ا پر ذکر کروں گا)

۳___ موطا امام مالکؒ کی روایت میں صرف دو جگہ رفع یدین کا ذکر ہے تحریمہ کے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت اور سجدوں میں رفع یدین کی نفی ہے۔

۴___ صحیح بخاری ص ۱۰۲ ج ا اور صحیح مسلم ص ۱۶۸ ج ا کی روایت میں تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔ اور سجدوں کے درمیان رفع یدین کی نفی ہے۔

۵___ صحیح بخاری ص ۱۰۲ ج ا کی ایک روایت میں ان تینوں جگہوں کے علاوہ تیسری رکعت میں بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

۱___ امام بخاری کے رسالہ جزء القراۃ (ص ۱۱۰ اور مجمع الزوائد ص ۱۰۲ ج ۲ وغیرہ) کی روایت میں ان چار جگہوں کے علاوہ سجدہ کے لئے رفع یدین کا بھی ذکر ہے۔

۷۔۔۔۔ امام طحاویؒ کی مشکل الآثار کی روایت میں ہراونچ نیچ (کل خفض ورفع) رکوع و سجود، قیام وقعود اور سجدوں کے درمیان رفع یدین کا ذکر ہے۔

(فتح الباری ص ۱۸۵ ج ۲ بحوالہ معارف السنن ص ۴۷۴ ج ۲)

حدیث مالک بن حویرثؓ کے طرق۔

۱۔۔۔۔ صحیح بخاری ص ۱۰۲ ج ۱ و صحیح مسلم ۱۶۸ ج ا کی روایت میں صرف تین جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔ تکبیر تحریمہ۔ رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت۔

۲۔۔۔۔ سنن نسائی (ص ۱۶۵ ج ۱) کی ایک روایت میں ان تین جگہوں کے علاوہ چوتھی جگہ سجدہ سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین کا ذکر ہے۔

۳۔۔۔۔ اور سنن نسائی ہی کی ایک روایت میں پانچ جگہ رفع یدین کا ذکر ہے۔ تین مندرجہ بالا مقامات۔ سجدہ کو جاتے ہوئے اور سجدہ سے اٹھتے ہوئے۔ (ص ۱۶۵ ج ۱)

۴۔۔۔۔ اور مسند ابو عوانہ ص ۹۵ ج ۲ کی روایت میں ہے۔

"كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حِيَالَ أُذُنَيْهِ فِي الرُّكُوْعِ وَالسُّجُوْدِ"

یعنی رکوع اور سجدہ میں رفع یدین کرتے تھے۔

یہ ان دو حدیثوں میں اختلاف روایت کا نقشہ ہے جو محدثین کے نزدیک رفع یدین کے باب میں سب سے قوی اور سب سے صحیح ہیں۔ اور جن پر امام بخاری و مسلم نے اکتفا کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اختلاف کی موجودگی میں کسی ایک روایت کو لے کر باقی روایات کو ترک کرنا ہوگا۔ اس لئے اگر امام شافعیؒ و احمدؒ یا ان دونوں کے متبعین نے ایک روایت کو ترجیح دے کر باقی صحیح روایات کو ترک کر دیا تو ان پر ترک سنت کا الزام نہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے گا کہ سنت کی جو مختلف صورتیں مروی ہیں ان میں سے ایک سنت کو انہوں نے اختیار کر لیا۔ اسی طرح امام ابو حنیفہؒ و مالکؒ اور ان کے متبعین نے بھی ان صورتوں میں سے سنت ہی کی ایک صورت کو اختیار کیا ہے۔ اس لئے ان کو بھی ترک سنت کا الزام دینا صحیح نہیں۔ امام بخاری اور امام شافعیؒ کو کوئی شخص یہ الزام نہیں دے سکتا چونکہ انہوں نے مالک بن حویرث رضی اللہ عنہ کی حدیث رفع یدین فی السجود کو اختیار نہیں کیا اس لئے وہ سنت کو اپنانے سے ہچکچاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہا جائے گا کہ ان کے نزدیک اس سنت کے مقابلہ میں ترک رفع یدین کی سنت راجح ہے۔ اور یہ روایات مرجوح ہیں۔ اس لئے وہ اس سنت پر عامل ہیں۔ یہی نیک گمان امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور ان کے مقتداؤں اور مقتدیوں کے بارے

میں بھی رکھنا چاہئے۔ اور اگر کوئی شخص ائمہ ہدیٰ اور سلف صالحین کے حق میں اس قدر حسن ظن سے بھی محروم ہے تو اس کے حق میں دعائے خیر ہی کی جا سکتی ہے۔

سوم: فریق مخالف میں سے بعض حضرات، جنہوں نے رفع یدین کے مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے۔ ان کے طرز نگارش سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رکوع کو جاتے وقت اور رکوع سے اٹھتے وقت رفع یدین کرنا ہی سنت نبویؐ ہے۔ اور ترک رفع یدین گویا ایک بدعت ہے جو حنفیوں نے گھڑ لی ہے۔ حاشا و کلا کہ امام ابو حنیفہؒ اور امام مالکؒ ایسے اکابر ائمہ نے کوئی بدعت ایجاد کر لی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان مواقع پر (بلکہ ان کے علاوہ دوسرے مواقع پر بھی) جس طرح رفع یدین احادیث سے ثابت ہے گو بعض صورتیں معمول بہا نہیں اسی طرح تکبیر تحریمہ کے سوا باقی مواضع میں ترک رفع یدین بھی سنت متواترہ اور سلف صالحین کے توارث و تعامل سے ثابت ہے۔

ذرا غور فرمائیے کہ امام مالکؒ جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ایک یا دو واسطوں سے شاگرد ہیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا عمل گویا ان کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ جن کو محدثین، "امام دار الہجرت، راس المتقین و کبیر المثبتین" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ اور جن کی روایت کو (عن نافع عن ابن عمرؓ) امام بخاریؒ وغیرہ اصح الاسانید اور سلسلۃ الذہب شمار کرتے ہیں، رفع یدین کی پوری احادیث ان کے سامنے ہیں اس کے باوجود مدونہ کبریٰ (ص ۷۱ ج ۱) میں ان کا ارشاد نقل کیا ہے۔

قَالَ مَالِكٌ لَا أَعْرِفُ رَفْعَ الْيَدَيْنِ فِي شَيْءٍ مِّنْ تَكْبِيرِ الصَّلٰوةِ لَا فِي خَفْضٍ وَّلَا فِي رَفْعٍ اِلَّا فِي افْتِتَاحِ الصَّلٰوةِ، قَالَ ابْنُ الْقَاسِمِ وَ كَانَ رَفْعُ الْيَدَيْنِ عِنْدَ مَالِكٍ ضَعِيفًا

ترجمہ: ۔ امام مالکؒ نے فرمایا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے سوا نماز کی کسی تکبیر ہیں، میں رفع یدین کو نہیں جانتا نہ کسی جھکنے کے موقعہ پر نہ کسی اٹھنے کے موقعہ پر، ابن قاسمؒ کہتے ہیں کہ امام مالکؒ کے نزدیک رفع یدین ضعیف تھا"۔

مدینہ طیبہ مہبط وحی، مہاجرین و انصار کا مسکن، اجلہ صحابہؓ کا مستقر اور تین خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کا دار الخلافہ ہے۔ اسی مدینہ طیبہ میں بیٹھ کر امام مالکؒ ـــــ جو اہل مدینہ کے علوم کے وارث ہیں ـــــ یہ فرماتے ہیں کہ میں تکبیر تحریمہ کے سوا کسی تکبیر میں رفع یدین سے واقف نہیں ہوں۔ انصاف کیجئے اگر ترک رفع یدین توار سے ثابت نہ ہوتا اور خلفائے راشدین سے لیکر اکابر تابعین تک اہل مدینہ ترک رفع یدین کی سنت رائج نہ ہوتی۔ تو کیا امام دار الہجرت،

راس المتقین و سلطان المحدثین یہ فرما سکتے تھے کہ میں تحریمہ کے سوا نماز کی کسی تکبیر میں رفع یدین سے واقف نہیں ہوں۔ اور کیا ان کے شاگرد عبدالرحمٰن بن قاسمؒ یہ نقل کر سکتے تھے کہ رفع یدین امام مالکؒ کے نزدیک ضعیف مسلک تھا؟

اور اس پر بھی غور کیجئے کہ کوفہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عساکر اسلامی کی چھاؤنی تھا جس میں ڈیڑھ ہزار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فروکش ہوئے۔ جن میں ـــــ تین سو اصحاب بیعت رضوان اور ستر بدری صحابہؓ شامل تھے۔ (مقدمہ نصب الرایہ) کوفہ کے معلم، اواخر عہد عثمانی تک حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ اور حضرت علیؓ کے دور خلافت سے کوفہ اسلام کا دارالخلافہ بن گیا تھا۔ اسی کوفہ کے بارے میں امام عراقی نے شرح تقریب میں امام محمد بن نصر المروزی سے نقل کیا ہے۔

لَا نَعْلَمُ مِصْرًا مِّنَ الْأَمْصَارِ تَرَكُوْا بِإِجْمَاعِهِمْ رَفْعَ الْيَدَيْنِ عِنْدَ الْخَفْضِ وَالرَّفْعِ فِي الصَّلٰوةِ إِلَّا أَهْلَ الْكُوْفَةِ۔ فَكُلُّهُمْ لَا يَرْفَعُ إِلَّا فِي الْإِحْرَامِ (اتحاف شرح احیاء العلوم صہ ۵۴ ج ۳)

ترجمہ:۔ ہمیں شہروں میں سے کوئی شہر معلوم نہیں کہ وہاں کے لوگوں نے نماز کے جھکنے اور اٹھنے کے وقت رفع الیدین بالا جماع ترک کیا ہو۔ سوائے اہل کوفہ کے کہ وہ سب کے سب تحریمہ کے سوا کسی جگہ رفع یدین نہیں کرتے۔

مطلب یہ ہے کہ تمام بلاد اسلامیہ میں جہاں ترک رفع یدین کے عامل ہیں۔ وہاں رفع یدین کے عامل بھی رہے ہیں۔ ایک کوفہ ایسا شہر ہے جس کے تمام علماء فقہاً قدیماً و حدیثاً ہمیشہ ترک رفع یدین پر عمل پیرا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اہل کوفہ میں وہ صحابہ کرامؓ بھی شامل ہیں جو دور فاروقی سے دور مرتضوی تک کوفہ میں رونق افروز ہوئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور دیگر اکابر صحابہؓ سے استفادہ کے علاوہ کوفہ کے اکابر تابعین حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم کے دور خلافت میں خلفائے راشدین اور دیگر اکابر صحابہ سے استفادہ کرنے کے لئے مدینہ طیبہ حاضری دیتے رہے۔ اگر ترک رفع یدین پر خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل نہ ہوتا تو کیا کوفہ کے تمام صحابہ و تابعین ترک رفع یدین پر متفق ہو سکتے تھے۔ الغرض صدر اول میں مدینہ طیبہ اور کوفہ کے حضرات کا ترک رفع یدین پر متفق ہونا اس امر کی علامت ہے۔ کہ ترک رفع یدین

صدر اول میں متواتر و متوارث چلا آتا تھا۔ اور یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سنت متواترہ ہے جس پر صحابہؓ و تابعینؒ عامل رہے۔

اور پھر اس پر بھی غور کیجیے کہ حضرات محدثین جہاں رفع یدین کا باب قائم کرتے ہیں، وہاں ترک رفع یدین کا باب بھی رکھتے ہیں۔ چنانچہ امام نسائی نے "رفع الیدین للرکوع" کے بعد "الرخصتہ فی ترک ذالک" کا "رفع الیدین عندالرفع من الرکوع" کے بعد "الرخصتہ فی ترک ذالک" کا (ص ۱۶۱)

"باب رفع الیدین للسجود" کے بعد "ترک رفع الیدین عندالسجود" (کا ص ۱۶۵) اور "باب رفع الیدین عند الرفع من السجدۃ الاولیٰ" کے بعد "ترک ذالک بین السجدتین" کا (ص ۱۷۲ ج ۱) عنوان قائم کیا ہے۔

امام ابو داؤد نے "باب رفع الیدین" اور "باب افتتاح الصلوٰۃ" کے بعد "باب من لم یذکر الرفع عندالرکوع" رکھا ہے۔ (ص ۱۰۹ ج ۱)

ترمذی شریف کے ہندوستانی نسخوں میں "ترک رفع یدین" کا باب سہو کتابت کی وجہ سے رہ گیا ہے۔ ورنہ صحیح نسخوں میں باب کا لفظ موجود ہے۔ اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ امام ترمذیؒ نے باب رفع الیدین عندالرکوع" کے تحت حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث نقل کی ہے۔ اور اس کے ذیل میں "وفی الباب" کہہ کر ان صحابہ کرام کی فہرست دی ہے جن سے رفع یدین کی احادیث مروی ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث ترک رفع یدین پر نقل کی ہے۔ اور اس کے ذیل میں فرماتے ہیں۔

وَفِي الْبَابِ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ قَالَ اَبُوْعِيْسٰى حَدِيْثٌ حَسَنٌ
وَبِهٖ يَقُوْلُ غَيْرُ وَاحِدٍ مِّنْ اَصْحَابِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَالتَّابِعِيْنَ وَهُوَ قَوْلُ سُفْيَانَ وَاَهْلُ الْكُوْفَةِ (ص ۳۵ ج ۱)

ترجمہ:۔ اس باب میں براء بن عازبؓ سے بھی حدیث مروی ہے۔ امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث حسن ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت سے صحابہؓ اور تابعین اسی کے قائل ہیں۔ یہی امام سفیان ثوری کا اور اہل کوفہ کا قول ہے۔

"فی الباب" کا لفظ بتاتا ہے کہ انہوں نے حدیث ابن مسعودؓ سے پہلے ترک رفع یدین پر مستقل باب باندھا ہے۔ چنانچہ مولانا قطب الدینؒ "مظاہر حق" میں لکھتے ہیں: "ترمذی نے دو باب لکھے ہیں اول رفع یدین میں۔ دوسرا باب عدم رفع یدین میں"۔ ——— اس سے معلوم ہوتا

ہے کہ ان کے نسخہ میں دوسرا باب بھی ہوگا۔

نصب الرایہ کے حاشیہ ص ۳۹۴ ج اپر ہے کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے شیخ عبداللہ بن سالم بصریؒ کے نسخہ میں (جو پیر جھنڈا کے کتب خانہ میں موجود تھا) عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث سے پہلے "باب من لم یرفع یدیہ الافی اول مرۃ" کا باب موجود ہے۔ اسی طرح شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے نسخہ میں بھی ____ جیساکہ "شرح سفرالسعادۃ" میں ہے۔ علامہ احمد محمد شاکر مصری "شرح ترمذی ص ۴۰ ج ۲ میں لکھتے ہیں۔ شیخ محمد عابد سندھیؒ کے نسخہ ترمذی میں بھی یہاں باب کا عنوان موجود ہے، اور اس نسخہ کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں: "وہذہ النسختہ ہی اصح النسخ التی وتعت لی من کتاب الترمذی" (مقدمہ شرح ترمذی ص ۱۴) "یہ سب سے صحیح تر نسخہ ہے، جو کتاب ترمذی کا مجھے میسر آیا"۔

خود شیخ احمد محمد شاکر نے شرح ترمذی میں جو متن لیا ہے، اس کے بارے میں فرماتے ہیں۔

وَلَمْ اَكْتُبْ حَرْفًا وَاحِدًا اِلَّا عَنْ ثَبْتٍ وَيَقِيْنٍ وَبَعْدَ بَحْثٍ وَاطْمِيْنَانٍ (شرح ترمذی ص ۶۲)

ترجمہ:۔ میں نے اس کا ایک ایک حرف ثبت ویقین کے ساتھ اور بحث واطمینان کے بعد لکھا ہے۔

اس متن میں انہوں نے حدیث عبداللہ بن مسعودؓ سے پہلے باب کا عنوان اس طرح تحریر فرمایا ہے۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ باب ماجاء ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لم یرفع الامرۃ"۔ (شرح ترمذی ص ۴۰ ج ۲)

الغرض اکابر محدثین جہاں رفع الیدین کا باب قائم کرتے ہیں وہاں ترک رفع الیدین کا باب بھی قائم کرتے ہیں۔ اور امام ترمذیؒ اس کو بہت سے صحابہؓ و تابعینؒ کا مسلک بتاتے ہیں اگر "ترک رفع الیدین" بدعت ہوتا۔ جیساکہ بعض حضرات یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا یہ اکابر محدثین بدعات کے اثبات کے لئے عنوانات قائم کرتے تھے۔ اور پھر اگر ترک رفع یدین کی سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہوتی تو بہت سے صحابہ و تابعین (علیہم الرضوان) اس کو کیسے اختیار فرماسکتے تھے۔

اس تمام تر بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ترک رفع یدین سنت نبویؐ ہے۔ اور یہ سنت صحابہؓ و تابعینؒ کے دور سے لے کر آج تک امت میں متواتر و متوارث چلی آتی ہے۔ اس لئے اس کو بدعت سمجھ کر سرے سے اس کی نفی کر دینا انصاف سے بعید ہے۔ ہاں ترجیح میں گفتگو ہوسکتی ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ دلائل ذکر کئے جائیں جن کی بناپر حنفیہ و مالکیہ ترک رفع یدین کی

سنت کے قائل ہیں۔ اور پھر ان امور کو ذکر کیا جائے جن کی وجہ سے ترک رفع یدین کو رفع یدین پر ترجیح دیتے ہیں۔ واللہ الموفق۔

ترک رفع یدین کے دلائل

حدیث ابن عمرؓ

ا۔ صحیح ابو عوانہ ص ۹۰ ج ۲ میں بروایت سفیان بن عینیہ عن الزہری عن سالم عن ابیہ یہ حدیث ذکر کی ہے۔

قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَتّٰى يُحَاذِيْ بِهِمَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ۔ وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَّرْكَعَ وَبَعْدَ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهٗ مِنَ الرُّكُوْعِ لَا يَرْفَعُهُمَا وَقَالَ بَعْضُهُمْ وَلَا يَرْفَعُ بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ وَالْمَعْنٰى وَاحِدٌ۔

ترجمہ:۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تب تو اپنے دونوں ہاتھ کندھوں کے برابر تک اٹھاتے ___ اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور رکوع سے اٹھتے تو ہاتھ نہیں اٹھاتے تھے۔ اور سجدوں کے درمیان بھی نہیں اٹھاتے تھے۔

۲۔ امام ابو عوانہؒ نے سفیان تک اس کی چار سندیں ذکر کی ہیں چوتھی سند امام بخاریؒ کے استاذ حمیدیؒ کی ہے۔

"حَدَّثَنَا الصَّائِغُ بِمَكَّةَ قَالَ حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ أَخْبَرَنِيْ سَالِمٌ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِثْلَهٗ"

چنانچہ مسند حمیدی (ص ۲۷۷ ج ۲ حدیث نمبر ۶۱۴) میں یہ حدیث اسی سند سے اور انہی الفاظ میں مذکور ہے۔

حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ (قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ) قَالَ حَدَّثَنَا الزُّهْرِيُّ قَالَ أَخْبَرَنِيْ سَالِمُ بْنُ عَبْدِ اللهِ عَنْ أَبِيْهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ رَفَعَ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ، وَإِذَا أَرَادَ أَنْ يَّرْكَعَ وَبَعْدَ مَا يَرْفَعُ رَأْسَهٗ فَلَا يَرْفَعُ۔ وَلَا بَيْنَ السَّجْدَتَيْنِ۔

ا۔ بین القوسین کی عبارت طباعت کی غلطی سے رہ گئی ہے جیسا کہ اس مقام کے حاشیہ سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

ترجمہ:۔ حمیدی سفیان سے۔ وہ زہری سے۔ وہ سالم بن عبداللہ سے، وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو دونوں ہاتھ کندھوں تک اٹھاتے۔ اور جب رکوع کا ارادہ کرتے اور رکوع سے سر اٹھاتے تو رفع یدین نہیں کرتے تھے۔ اور نہ دونوں سجدوں کے درمیان۔

صحیح ابو عوانہ کی احادیث کا صحیح ہونا سب کو مسلم ہے۔ اور مسند حمیدی کی یہ حدیث نہ صرف صحیح ہے۔ بلکہ صحیح ترین سند سے مروی ہے۔ امام حمیدیؒ (عبداللہ بن الزبیر بن عیسیٰ القرشی الحمیدی المکی المتوفی ۲۱۹ھ) امام بخاری کے استاذ ہیں، صحیح ابو عوانہ اور مسند حمیدی کی مذکورہ بالا حدیث نہ صرف صحیح ہے بلکہ صحیح ترین سند سے مروی ہے۔

۳ــــ مدونہ کبریٰ ص ۷۱ ج ۱ میں ہے۔

اِبْنُ وَهْبٍ وَّابْنُ الْقَاسِمِ عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمٍ عَنْ أَبِيْهِ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ حَذْوَ مَنْكِبَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ۔

ابن وہب اور ابن القاسم امام مالکؒ سے وہ ابن شہاب زہری سے، وہ سالم سے، وہ اپنے والد حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کندھوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔ جب نماز شروع فرماتے تھے۔

یہ سند بھی اصح الاسانید ہے۔ اس میں صرف افتتاح صلوٰۃ کے وقت رفع یدین ذکر کیا گیا ہے۔ اور اسی حدیث کی پر امام مالکؒ نے ترک رفع یدین قبل الرکوع وبعد الرکوع کا مسلک اختیار کیا ہے جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رکوع سے قبل وبعد رفع یدین کا ذکر امام مالکؒ کے نزدیک صحیح نہیں۔ صحیح ابو عوانہ اور مسند حمیدی کی روایت میں اس کی صراحت گزر چکی ہے۔

۴ــــ نصب الرایہ ص ۴۰۴ میں خلافیات بیہقی کے حوالے سے یہ حدیث اس طرح نقل کی گئی ہے۔

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَوْنِ الْخَرَّازِ[1] عَنْ مَالِكٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ إِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ ثُمَّ لَا يَعُوْدُ۔

---

[1] خاء معجمۃ بعد ہا راء مہملۃ آخرہ زاء معجمہ (نصب الرایہ وتقریب)

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عون الخراز مالک سے وہ زہری سے، وہ سالم سے، وہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کیا کرتے تھے جب نماز شروع فرماتے۔ پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔

اس حدیث کو نقل کر کے امام بیہقیؒ امام حاکمؒ کے حوالے سے فرماتے ہیں۔

هٰذَا بَاطِلٌ مَوْضُوْعٌ، وَلَا يَجُوْزُ اَنْ يُذْكَرَ اِلَّا عَلٰى سَبِيْلِ الْقَدْحِ.
فَقَدْ رَوَيْنَا بِالْاَسَانِيْدِ الصَّحِيْحَةِ عَنْ مَالِكٍ بِخِلَافِ هٰذَا۔

ترجمہ:۔ یہ حدیث باطل موضوع ہے۔ اور جائز نہیں کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ مگر بطور اعتراض۔ کیونکہ ہم نے صحیح اسانید کے ساتھ امام مالک سے اس کے خلاف روایت کیا ہے۔

مگر امام حاکم کا یہ فیصلہ یکطرفہ ہے۔ اگر اس کی سند میں کسی راوی پر کلام ہے تو اس کو ذکر کرنا چاہئے تھا۔ لیکن اگر راوی سب کے سب ثقہ اور قابل اعتماد ہیں تو ان کی روایت کو باطل اور موضوع کہنا تحکم ہے۔ اور ان کی یہ دلیل بھی ناکافی ہے کہ ہم نے امام مالک سے صحیح اسانید کے ساتھ اس کے خلاف روایت کیا ہے۔ اس لئے کہ اسانید صحیحہ کے ساتھ امام مالک سے ترک رفع یدین کی حدیث بھی منقول ہے۔ اور خود امام مالکؒ کا مسلک بھی ترک رفع یدین ہے۔ تو کیا امام حاکم، مالکیہ کو یہ اجازت دیں گے کہ چونکہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رفع یدین امام مالکؒ سے صحیح اسانید کے ساتھ منقول ہے اور چونکہ ترک ہی کی روایت امام مالکؒ کے نزدیک صحیح اور معتمد علیہ ہے اور چونکہ اسی روایت پر امام مالکؒ نے ترک رفع یدین کو اختیار کیا ہے اسلئے ابن عمرؓ کی روایت میں رفع الدین کا ذکر باطل اور موضوع ہے ظاہر ہے کہ محض ایسے قرائن اور قیاسات سے ثقہ راویوں کی حدیث کو موضوع کہنا صحیح نہیں۔

اس لئے امام العصر مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے نیل الفرقدین ص ۱۲۷ میں صحیح لکھا ہے۔

هذا حكم من الحاكم لا يكفي ولا يشفي۔

۵۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ تُرْفَعُ الْاَيْدِيْ فِيْ سَبْعَةِ مَوَاطِنَ اِفْتِتَاحِ الصَّلٰوةِ وَاسْتِقْبَالِ الْبَيْتِ وَالصَّفَا وَالْمَرْوَةِ۔ وَالْمَوْقِفَيْنِ وَعِنْدَ الْحَجَرِ

(نصب الرایہ ص ۳۹۰ بحوالہ مسند بزار)

ترجمہ:۔ حاکم کا یہ حکم ناکافی اور غیر تسلی بخش ہے۔ ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رفع یدین سات جگہ کیا جاتا ہے نماز کے شروع میں، استقبال بیت اللہ کے وقت، صفا و مروہ پر، وقوف عرفات میں، وقوف مزدلفہ میں، اور حجر اسود کے پاس۔

اس حدیث کے بارے میں محدثین کی رائے ہے کہ یہ موقوف ہے۔ تاہم یہ موقوف بھی مرفوع کے حکم میں ہے۔ خصوصا جب کہ اس مرفوعا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور دیگر احادیث بھی اس کو کی موید ہیں۔

حدیث ابن مسعودؓ

۱۔ عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ قَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَلَا اُصَلِّيْ بِكُمْ صَلٰوةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى فَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ اِلَّا فِيْ اَوَّلِ مَرَّةٍ۔ (ترمذی صہ ۳۵ ج ۱۔ نسائی صہ ۱۶۱ ج ۱۔ ابوداؤد صہ ۱۰۹ ج ۱)

ترجمہ:۔ حضرت علقمہ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز پڑھاؤں؟ پھر آپ نے نماز پڑھائی۔ پس پہلی مرتبہ کے سوا رفع یدین نہیں کیا۔

(ترمذی ص ۳۵ ج ۱۔ نسائی ص ۱۶۱ ج ۱۔ ابوداؤد ص ۱۰۹ ج ۱)

ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اور حافظ ابن حزمؒ نے محلّی (ص ۸۸ ج ۴) میں اسے صحیح کہا ہے۔

علامہ احمد محمد شاکر شرح ترمذی میں فرماتے ہیں کہ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ اور بعض نسخوں میں "حسن صحیح" ہے۔ مگر چونکہ بہت سے حضرات نے ترمذی سے اس کی تحسین ہی نقل کی ہے اس لئے علامہ موصوف نے "حسن صحیح" کے نسخہ کو مرجوح قرار دیا ہے۔ اس حدیث پر بعض محدثین نے جو کلام کیا ہے اس کو مسترد کرتے ہوئے علامہ موصوف فرماتے ہیں۔

وَهٰذَا الْحَدِيْثُ صَحِيْحٌ صَحَّحَهُ ابْنُ حَزْمٍ وَغَيْرُهُ مِنَ الْحُفَّاظِ وَمَا قَالُوْا فِيْ تَعْلِيْلِهِ لَيْسَ بِعِلَّةٍ۔ (صہ ۴۱ ج ۲)

۲۔ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَلَا اُخْبِرُكُمْ بِصَلٰوةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ فَقَامَ رَفَعَ يَدَيْهِ اَوَّلَ مَرَّةٍ ثُمَّ لَمْ يُعِدْ (نسائی صہ ۱۵۸ ج ۱)

ترجمہ:۔ یہ حدیث صحیح ہے۔ ابن حزمؒ اور دیگر حفاظ حدیث نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اور لوگوں نے اس کی تعلیل میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ علت نہیں۔

حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کیا تمہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی خبر نہ دوں ؟ پس کھڑے ہوئے۔ پس پہلی مرتبہ رفع یدین کیا، پھر دوبارہ نہیں کیا۔
اس حدیث کی سند صحیح ہے۔ (اعلاء السنن ص ۶۱ ج ۳)

۳۔ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ أَوَّلِ تَكْبِيْرَةٍ ثُمَّ لَا يَعُوْدُ. (طحاوی : شرح معانی الآثار صفحہ ۱۱۰ جلد ۱)

ترجمہ:۔ حضرت علقمہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے۔ پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے۔
اس کی سند بھی قوی ہے۔

۴۔ أَبُوْ حَنِيْفَةَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ إِبْرَاهِيْمَ عَنِ الْأَسْوَدِ أَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ أَوَّلِ التَّكْبِيْرِ ثُمَّ لَا يَعُوْدُ إِلٰى شَيْءٍ مِّنْ ذَالِكَ وَيَأْثُرُ ذَالِكَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (مسند امام اعظم صفحہ ۳۵۵ ج ۱)

ترجمہ:۔ امام ابو حنیفہؒ اپنے شیخ حماد سے وہ ابراہیم نخعی سے وہ اسود سے نقل کرتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پہلی تکبیر میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد نماز کے کسی حصہ میں نہیں کرتے تھے اور وہ اس عمل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی روایت کے طرق کو مولانا ابو الوفا افغانیؒ نے حاشیہ کتاب الآثار میں جمع کر دیا ہے۔ امام ابو حنیفہؒ نے اس حدیث کی بنا پر ترک رفع یدین کو اختیار کیا ہے۔ اس لئے یہ ان کی جانب سے حدیث کی تصحیح ہے۔

۵۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ جَابِرٍ عَنْ حَمَّادِ بْنِ أَبِيْ سُلَيْمَانَ عَنْ إِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِيْ بَكْرٍ وَعُمَرَ فَلَمْ يَرْفَعُوْا أَيْدِيَهُمْ إِلَّا عِنْدَ اسْتِفْتَاحِ الصَّلٰوةِ۔

ترجمہ:۔ محمد بن جابر حماد بن ابی سلیمان سے۔ وہ ابراہیم نخعی سے۔ وہ علقمہ سے۔ وہ عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضرات ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ نماز پڑھی ہے۔ وہ تکبیر تحریمہ کے سوا رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

یہ حدیث محمد بن جابر یمامی کی روایت سے ہے، جو صدوق تھے۔ مگر نابینا ہو گئے تھے اس لئے ان کی احادیث میں اختلاط ہو گیا تھا۔ بعض محدثین نے محمد بن جابر کی وجہ سے اس سے روایت کو کمزور کہا ہے۔ اور ابن جوزیؒ ایسے متشددین نے (جو بعض اوقات صحیح بخاری کی احادیث کو بھی موضوع کہہ جاتے ہیں) اس کو موضوع تک قرار دیا ہے۔ لیکن محمد بن جابر سے امام شعبہ ایسے اکابر محدثین نے روایت کی ہے۔ (جیسا کہ نصب الرایہ ص ۳۹۷ ج ۱ میں نقل کیا ہے) اور دار قطنی ص ۱۱۱ میں ہے کہ اسحاق بن ابی اسرائیل اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وَبِهٖ نَاْخُذُ فِی الصَّلٰوۃِ کُلِّہَا۔

ترجمہ:۔ پوری نماز میں ہمارا عمل اسی حدیث پر ہے۔

اس تصریح سے واضح ہوتا ہے کہ یہ روایت محمد بن جابر کے اختلاط سے پہلے زمانہ کی ہے۔ اس لئے اس کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

علاوہ ازیں اس حدیث کو مضمون متواتر روایات سے ثابت ہے۔ کیونکہ اس حدیث میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ ابن مسعودؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما کے پیچھے نمازیں پڑھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی عاقل اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ یہ حضرات تکبیر تحریمہ کے علاوہ رفع یدین نہیں کرتے تھے، اور جیسا کہ پہلے لکھ چکا ہوں کہ یہ مضمون بھی متواتر ہے۔

چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایات میں مختلف طرق اور صحیح اسانید سے یہ مضمون مروی ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کا نقشہ دکھایا۔ اور اس میں رفع یدین نہیں فرمایا، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے اصحاب سے ایک روایت بھی اس کے خلاف مروی نہیں۔ اور یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرات شیخینؓ کی سنت تو رفع یدین ہو۔ اور حضرت ابن مسعودؓ۔ حضرت علیؓ اور ان کے اصحاب انکی سنت کو ترک کر دیں۔ پس جب محمد بن جابر کی روایت کے دونوں مضمون تواتر سے ثابت ہیں تو اس حدیث کے ثبوت میں کیا شبہ ہے؟

حدیث جابر بن سمرہؓ

عَنْ تَمِيمِ بْنِ طَرَفَةَ عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ مَالِيْ اَرَاكُمْ رَافِعِي اَيْدِيكُمْ كَاَنَّهَا اَذْنَابُ خَيْلٍ شُمُسٍ اُسْكُنُوا فِي الصَّلٰوةِ (صحیح مسلم صفحہ ۱۸۱ جلد ۱، سنن نسائی صفحہ ۱۷۶ جلد ۱، ابوداؤد صفحہ ۱۴۳ جلد ۱)

ترجمہ:۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس گھر سے باہر تشریف لائے تو فرمایا کیا بات ہے تمہیں رفع یدین کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں۔ گویا وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی دمیں ہیں۔ نماز میں سکون اختیار کرو۔

اس حدیث کی صحت میں کسی کو کلام نہیں۔ البتہ بعض حضرات نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ اس حدیث میں سلام کے وقت اشارہ کرنے کی ممانعت فرمائی ہے جیسا کہ صحیح مسلم ہی میں حضرت جابر بن سمرہؓ کی دوسری حدیث ہے۔

كُنَّا اِذَا صَلَّيْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُلْنَا اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَةُ اللهِ ـ وَاَشَارَ بِيَدِهٖ اِلَى الْجَانِبَيْنِ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَامَ تُوْمُوْنَ بِاَيْدِيْكُمْ كَاَنَّهَا اَذْنَابُ خَيْلٍ شُمُسٍ ـ اِنَّمَا يَكْفِيْكُمْ اَنْ يَّضَعَ يَدَهٗ عَلٰى فَخِذِهٖ ثُمَّ يُسَلِّمُ عَلٰى اَخِيْهِ مَنْ عَلٰى يَمِيْنِهٖ وَشِمَالِهٖ (صحیح مسلم صفحہ ۱۸۱ ج ۱)

ترجمہ:۔ ہم جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھتے تھے تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے وقت دونوں جانب ہاتھ سے اشارہ کیا کرتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، تم ہاتھوں سے اشارہ کس لئے کرتے ہو، جیسے وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی دمیں ہوں، تمہارے لئے یہی کافی ہے کہ ہاتھ رانوں پر رکھے ہوئے دائیں بائیں اپنے بھائی کو سلام کیا کرو۔

ان دونوں حدیثوں میں چونکہ "کانہا اذناب خیل شمس" کا فقرہ آگیا ہے غالباً اس سے ان حضرات کا ذہن اس طرف منتقل ہو گیا ہے کہ یہ دونوں حدیثیں ایک ہی واقعہ سے متعلق ہیں، لیکن جو شخص ان دو حدیثوں کے سیاق پر غور کرے گا اسے یہ سمجھنے میں قطعاً دشواری نہیں ہوگی کہ یہ دونوں الگ الگ واقعہ سے متعلق ہیں اور ان دونوں کا مضمون ایک دوسری سے یکسر مختلف ہے۔ چنانچہ۔

۱۔ پہلی حدیث میں ہے کہ ہم اپنی نماز میں مشغول تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور دوسری حدیث میں میں نماز با جماعت کا ذکر ہے۔
۲۔ پہلی حدیث میں ہے کہ آپ ؐ نے صحابہؓ کو نماز میں رفع یدین کرتے دیکھا اور اس پر نکیر فرمائی اور دوسری حدیث میں ہے کہ سلام کے وقت دائیں بائیں اشارہ کرنے پر نکیر فرمائی
۳۔ پہلی حدیث میں ہے کہ آپ ؐ نے نماز کو سکون اختیار کرنے کا حکم فرمایا۔ اور دوسری میں ہے کہ آپ نے سلام پھیرنے کا طریقہ بتایا۔
۴۔ اور پھر یہ دونوں حدیثیں الگ الگ سندوں سے مذکور ہیں۔ پہلی حدیث کے راوی دوسرے واقعہ کی طرف کوئی اشارہ نہیں کرتے۔ اور دوسری حدیث کے راوی پہلے واقعہ سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔

اس لئے دونوں حدیثوں کو جن کا الگ الگ مخرج ہے۔ الگ الگ قصہ ہے۔ الگ الگ حکم ہے، ایک ہی واقعہ سے متعلق کہہ کر دل کو تسلی دے لینا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

اور اگر بطور تنزل تسلیم بھی کر لیا جائے کہ دونوں حدیثوں کی شان ورود ایک ہے۔ تب بھی یہ مسلمہ اصول ہے کہ خاص واقعہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ بلکہ الفاظ کے عموم کا اعتبار ہوتا ہے۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین پر نکیر فرمائی ہے۔ اور اس کے بجائے نماز میں سکون اختیار کرنے کا حکم فرمایا ہے تو اس سے ہر صاحب فہم یہ سمجھے گا کہ رفع یدین سکون کے منافی ہے۔ اور آپ ؐ نے اسے ترک کرنے کا حکم فرمایا ہے۔ مزید یہ کہ جب بوقت سلام رفع یدین کو سکون کے منافی سمجھا گیا حالانکہ وہ نماز سے خروج کی حالت ہے تو نماز کے عین وسط میں سکون کی ضرورت اس سے بدرجہا بڑھ کر ہوگی۔

حدیث ابن عباسؓ :۔

۱۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُرْفَعُ الْاَيْدِيْ اِلَّا فِيْ سَبْعَةِ مَوَاطِنَ حِيْنَ يَفْتَتِحُ الصَّلٰوةَ وَحِيْنَ يَدْخُلُ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ فَيَنْظُرُ اِلَى الْبَيْتِ، وَحِيْنَ يَقُوْمُ عَلَى الصَّفَا، وَحِيْنَ يَقُوْمُ عَلَى الْمَرْوَةِ، وَحِيْنَ يَقِفُ مَعَ النَّاسِ عَشِيَّةَ عَرَفَةَ، وَبِجَمْعٍ (رواہ الطبرانی، نصب الرایہ صفحہ ۲۹۰ ج ۱)

۲۔ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ السُّجُوْدُ عَلٰى سَبْعَةِ اَعْضَاءٍ اَلْيَدَيْنِ، وَالْقَدَمَيْنِ، وَالرُّكْبَتَيْنِ، وَالْجَبْهَةِ۔ وَرَفْعُ الْاَيْدِيْ اِذَا رَأَيْتَ الْبَيْتَ، وَعَلَى الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَبِعَرَفَةَ، وَعِنْدَ رَمْيِ الْجِمَارِ وَاِذَا قُمْتَ لِلصَّلٰوةِ (ایضاً)

ترجمہ:۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رفع یدین نہیں کیا جاتا مگر سات جگہوں میں، جب نماز شروع کرے، جس مسجد حرام میں داخل ہو کر بیت اللہ کو دیکھے جب صفا پر کھڑا ہو، جب مروہ پر کھڑا ہو جب عرفہ کی شام کو لوگوں کے ساتھ عرفات میں وقوف کرے۔ اور مزدلفہ میں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا سجدہ سات اعضاء پر ہوتا ہے۔ دونوں ہاتھ۔ دونوں قدم۔ دو گھٹنوں اور پیشانی۔ اور رفع یدین کیا جاتا ہے جب تم بیت اللہ کو دیکھو صفا و مروہ پر، عرفات میں، رمی جمار کے وقت، اور جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو۔

امام ہیثمی "مجمع الزوائد ص ۲۳۸ ج ۳ میں ان احادیث کو ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

وَفِي الْاِسْنَادِ الْاَوَّلِ مُحَمَّدُ بْنُ اَبِيْ لَيْلٰى وَهُوَ سَيِّئُ الْحِفْظِ وَحَدِيْثُهٗ حَسَنٌ اِنْشَاءَ اللّٰهُ۔ وَفِي الثَّانِيْ عَطَاءُ بْنُ السَّائِبِ وَقَدِ اخْتَلَطَ۔

ترجمہ:۔ پہلی سند میں محمد بن ابی لیلیٰ ہیں، جو سیئ الحفظ ہیں۔ اور ان کی حدیث انشاء اللہ حسن ہے۔ اور دوسری میں عطاء بن السائب ہیں ان کا حافظہ آخری زمانے میں گڑبڑ ہو گیا تھا۔

نواب صدیق حسن خان صاحب نزل الابرار ص ۴۴ میں فرماتے ہیں:

مِنْ حَدِيْثِ ابْنِ عَبَّاسٍ بِسَنَدٍ جَيِّدٍ (بحوالہ نور الصباح صفحہ ۶۹)

ترجمہ:۔ ابن عباسؓ کی حدیث سے سند جید کے ساتھ۔

دوسری روایت حافظ سیوطیؒ نے جامع صغیر میں بھی ذکر کی ہے۔ اس کی شرح السراج المنیر ص ۴۵۸ میں علامہ عزیزی نے اس کو حدیث صحیح کہا ہے۔ (نیل الفرقدین ص ۱۱۸)

۳۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ لَا تُرْفَعُ الْاَيْدِيْ اِلَّا فِيْ سَبْعِ مَوَاطِنَ اِذَا قَامَ اِلَى الصَّلٰوةِ وَاِذَا رَأَى الْبَيْتَ وَعَلَى الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَفِيْ عَرَفَاتٍ وَفِيْ جَمْعٍ وَعِنْدَ الْجِمَارِ۔ (مصنف ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۳۷)

ترجمہ:۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا رفع یدین صرف سات جگہوں میں کیا جاتا ہے۔ جب نماز کے لئے کھڑا ہوا۔ جب بیت اللہ کو دیکھے۔ صفا و مروہ پر۔ عرفات میں۔ مزدلفہ میں۔ اور رمی جمار کے وقت

محدثین کو اس حدیث کا موقوف ہونا مسلم ہے۔ تاہم اگر موقوف بھی ہو تو حکماً مرفوع ہے۔ خصوصاً جب کہ مرفوعاً بھی ثابت ہے۔

حدیث البراء بن عازب رضی اللہ عنہ

۱۔ عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ رَفَعَ يَدَيْهِ اِلٰى قَرِيْبٍ مِّنْ اُذُنَيْهِ ثُمَّ لَا يَعُوْدُ۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ مَرَّةً وَاحِدَةً۔ وَفِيْ رِوَايَةٍ ثُمَّ لَمْ يَرْفَعْهُمَا حَتّٰى انْصَرَفَ وَفِيْ رِوَايَةٍ ثُمَّ لَا يَرْفَعُهُمَا حَتّٰى يَفْرُغَ (ابوداؤد صفحہ ۱۰۹ جلد ۱ مصنف عبدالرزاق صفحہ ۷۰ ج ۲ طحاوی صفحہ ۱۱۰ ج ۱ مصنف ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۳۶ ج ۱)

۲۔ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ يَزِيْدَ بْنِ اَبِيْ زِيَادٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ اَبِيْ لَيْلٰى يَقُوْلُ سَمِعْتُ الْبَرَاءَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فِيْ هٰذَا الْمَجْلِسِ يُحَدِّثُ قَوْمًا مِنْهُمْ كَعْبُ ابْنُ عُجْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حِيْنَ افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ اَوَّلِ تَكْبِيْرَةٍ۔

(دار قطنی صفحہ ۱۱۰)

ترجمہ:۔ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تو کانوں کے قریب تک ہاتھ اٹھاتے اس کے بعد نہیں اٹھاتے تھے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ پھر نماز سے فارغ ہونے تک رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

امام شعبہ یزید بن ابی زیاد سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن ابی لیلیٰ سے سنا وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو اس مجلس میں ایک جماعت کے سامنے جن میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یہ حدیث بیان کرتے ہوئے سنا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز شروع کرتے تو صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے۔

یہ حدیث ترک رفع یدین پر نص صریح ہے، بعض حضرات نے "ثم لایعود" کی زیادتی کو یزید بن ابی زیاد کے اختلاط و تلقین کا نتیجہ قرار دیا ہے مگر یہ رائے بوجوہ غلط ہے۔

اول :۔ ایک یہ کہ دار قطنی کی روایت میں "ثم لایعود" کے بجائے "فی اول تکبیرة" کا لفظ ہے۔ اور جن روایتوں میں "ثم لایعود" کا لفظ نہیں ان کا مفہوم بھی اس کے سوا کیا ہے کہ صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کیا۔

دوم :۔ یہ کہ اس میں وہ واقعہ بھی ذکر کیا گیا ہے جس موقع پر حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث بیان کی تھی۔ اور یہ ان کے کمال ضبط کی علامت ہے۔

سوم :۔ یزید سے اس روایت کو یزید کے اکابر اصحاب نقل کر رہے ہیں۔

مثلاً امام سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، اسماعیل بن زکریا، شعبہ، اسرائیل بن ابی اسحاق، نضر بن شمیل، حمزہ زیارت، ہشیم، شریک، محمد بن ابی لیلیٰ ــــ کوئی وجہ نہیں کہ ان اکابر کی ایک پوری جماعت کی روایت کے بعد بھی اس لفظ کو غیر محفوظ کہا جائے، حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی حدیث چونکہ متعدد طرق سے مروی ہے اس لئے وہ محدثین کے اصول پر صحیح ہے۔

چہارم :۔ عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، جو حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے اس حدیث کی روایت کرتے ہیں، ترک رفع یدین پر عامل تھے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۳۷ ج ۱) اس سے واضح ہے کہ ترک رفع یدین ہی ان کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت تھی جو انہوں نے صحابہ کرامؓ سے سیکھی تھی۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ یزید کی روایت بالکل صحیح ہے۔

پنجم :۔ دار قطنی کی روایت میں واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت براء بن عازبؓ نے صحابہ و تابعین کے مجمع میں یہ حدیث بیان کی تھی، اس سے ترک رفع یدین کی سنت اور موکد ہو جاتی ہے۔

مرسل عباد بن عبداللہ بن الزبیر

۱۔ عَنْ عَبَّادِ بْنِ الزُّبَيْرِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ رَفَعَ يَدَيْهِ فِيْ اَوَّلِ الصَّلٰوةِ ثُمَّ لَمْ يَرْفَعْهُمَا فِيْ شَيْءٍ حَتّٰى يَفْرُغَ (نصب الرایہ صفحہ ۴۰۴ ج ۱ بحوالہ خلافیات بیہقی)

ترجمہ :۔ عباد بن زبیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز شروع کرتے تھے تو صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے پھر نماز سے فارغ ہونے تک کسی جگہ رفع یدین نہیں کرتے تھے

۲ــــ بسط الیدین ص ۵۳ میں المواہب اللطیفہ کے حوالہ سے یہ دریافت مفصل نقل کی ہے

۲۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اَبِیْ یَحْیٰی قَالَ صَلَّیْتُ اِلٰی جَنْبِ عَبَّادِ بْنِ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ الزُّبَیْرِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ۔ قَالَ فَجَعَلْتُ اَرْفَعُ اَیْدِیْ فِیْ کُلِّ رَفْعٍ وَّخَفْضٍ قَالَ یَا ابْنَ اَخِیْ رَأَیْتُکَ تَرْفَعُ فِیْ کُلِّ رَفْعٍ وَّخَفْضٍ وَاَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ اِذَا افْتَتَحَ الصَّلٰوۃَ رَفَعَ یَدَیْہِ فِیْ اَوَّلِ صَلٰوۃٍ ثُمَّ لَمْ یَرْفَعْھُمَا فِیْ شَیْءٍ حَتّٰی یَفْرُغَ۔

محمد بن ابی یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے عباد بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے پہلو میں نماز پڑھی میں ہراونچ نیچ میں رفع یدین کرنے لگا انہوں نے فرمایا بھتیجے! میں نے تجھے دیکھا ہے کہ تم ہراونچ نیچ میں رفع یدین کر رہے تھے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم جب نماز شروع کرتے تھے تو صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے۔ پھر آپؐ نے نماز سے فارغ ہونے تک رفع یدین نہیں کیا۔

عباد بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما تابعی ہیں۔ اس لئے یہ روایت مرسل ہے۔ اور مرسل روایت۔ جب کہ اس کی سند صحیح ہو، امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمدؒ اور اکثر فقہائے کے نزدیک حجت ہے۔ اور اگر اس کی تائید دوسری روایات سے ہو تو بالاتفاق حجت ہے۔

زیر نظر حدیث کی سند بھی صحیح اور ثقہ ہے اور اس کی تائید میں بہت سی احادیث بھی موجود ہیں۔ اس لئے اس کے حجت ہونے میں کسی کو شبہ نہیں۔ اور حضرت عبادؒ کا محمد بن ابی یحییٰ کے رفع یدین پر نکیر فرمایا اور صرف اول تکبیر میں رفع یدین کو سنت قرار دینا اس امر کی دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ترک رفع یدین ہے۔

مزید احادیث

یہ تو وہ احادیث تھیں جن میں تکبیر تحریمہ کے سوا ترک رفع یدین کی تصریح موجود ہے۔ ان کے علاوہ وہ احادیث بھی ترک رفع یدین کی دلیل میں ہیں جن میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی کیفیت بیان فرمائی اور اس کا پورا نقشہ کھینچ کر دکھایا۔ مگر رفع یدین کا ذکر نہیں فرمایا، ان احادیث کا متن پیش کرنا طوالت کا موجب ہوگا۔ اس لئے صرف کتابوں کے حوالے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

۱۔ حدیث ابی ہریرہ رضی اللہ عنہ

موطا امام مالک ص ۲۶، موطا امام محمد ص ۸۸، کتاب الام للشافعی ص ۹۵ ج ۱

عبدالرزاق ص ۶۲ ج ۲،   ابن ابي شيبه ص ۲۴۱ ج ۱   مسند احمد ص ۲۳۶ ج ۲، ۲۷۰، ۳۱۹، ۴۱۷، ۴۳۴، ۴۵۲، ۴۵۴، ۵۰۰، ۵۰۲، ۵۲۷۔   سنن دارمی ص ۱۴۷   صحیح بخاری ص ۱۰۸ ج ۱ ص ۱۰۹   صحیح مسلم ص ۱۶۹ ج ۱   سنن ابی داؤد ص ۱۲۱ ج ۱   سنن نسائی صفحات ۱۵۸ ج ۱، ۱۴۱۱۷۳،   منتقی ابن الجارود ص ۷۴،   حدیث نمبر ۱۹۱   صحیح ابن خزیمه صفحات ۲۹۰ ج ۱، ۲۹۱، حدیث نمبر بالترتیب ۵۷۸، ۵۷۹،   صحیح ابی عوانه صفحات ۹۵، ۹۶ ج ۲   شرح معانی الاثار للطحاوی ص ۱۰۸ ج ۱   سنن بیہقی صفحات ۶۷، ۱۱۸، ۳۷۴ ج ۲   مسند ابی داؤد طیالسی ص ۳۰۵ ج ۹،   حدیث نمبر ۲۳۲۰ اور ص ۳۱۳ ج ۱۰   حدیث نمبر ۲۳۷۴۔

۲۔ حدیث انس بن مالک رضی اللہ عنہ

سند ابی داؤد الطیالسی ص ۲۷۶ ج ۸ حدیث نمبر ۲۰۷۶۔   مصنف عبدالرزاق ص ۶۴ ج ۲   مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۴۰ ج ۱   مسند احمد صفحات ۱۲۵، ۱۲۲، ۲۵۱، ۲۵۷، ۲۶۲ ج ۳   سنن نسائی ص ۱۷۶ ج ۱،   طحاوی ص ۱۰۸، ج ۱   بیہقی ص ۶۷، ج ۲۔

۳۔ حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہ

مسند احمد ص ۲ ج ۲، ص ۱۵۲،   سنن نسائی ص ۱۹۴ ج ۱، ۱۹۵   صحیح ابن خزیمۃ ص ۲۸۹ ج ۱ حدیث نمبر ۵۷۶

۴۔ حدیث ابی مالک الاشعری

عبدالرزاق ص ۶۲ ج ۲، مصنف ابن ابی شیبہ صفحات ۲۴۰ ج ۱، ۲۴۱، مسند احمد ۳۴۱ ج ۵، ۳۴۲، ۳۴۳۔

۵۔ حدیث ابی موسیٰ رضی اللہ عنہ

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۴۱ ج ۱، مسند احمد ص ۳۹۲ ج ۴، ۴۰۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۵۔ طحاوی ص ۱۰۸ ج ۱، البزاز ص ۱۳۱ ج ۲،

۶۔ حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ

مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۴۱ ج ۱، مسند احمد ص ۲۱۸ ج ۱، ۲۵۰، ۲۹۲، ۳۲۷، ۳۳۵، ۳۳۹، ۳۵۱، صحیح بخاری ص ۱۰۸ ج ۱،   صحیح ابن خزیمہ ۲۹۰ ج ۱، ۲۹۳   طحاوی ص ۱۰۸ ج ۱، بیہقی ص ۶۸ ج ۲،

۷۔ حدیث جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ

مسند ابی داوٗد الطیالسی ص ۲۳۶ ج ۷. حدیث نمبر ۱۶۹۹ مسند بزار ص ۱۳۱ ج ۲

۸۔ حدیث ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ

مسند احمد ص ۱۸. ج ۲ صحیح بخاری ص ۱۱۴. ج ۱ صحیح ابن خزیمہ ص ۲۹۱ حدیث نمبر ۵۸۰. مستدرک حاکم ص ۲۲۳ ج ۱ بیہقی ص ۱۸ ج ۲.

۹۔ حدیث ابی مسعود البدری رضی اللہ عنہ

طحاوی ص ۱۰۸ ج ۱

۱۰۔ حدیث رفاعۃ البدری رضی اللہ عنہ

سند ابی داوٗد الطیالسی ص ۱۹۶ ج ۶ حدیث نمبر ۱۳۷۲. کتاب الام للشافعی ص ۸۸ ج ۱. مصنف عبدالرزاق ص ۳۷۰ ج ۲ حدیث نمبر ۳۷۳۹. مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۸۷ ج ۱. مسند احمد ص ۳۴۰ ج ۴. مسند دارمی ص ۱۵۸ سنن ابی داوٗد ص ۱۲۵. ج ۱ ترمذی ص ۴۰ ج ۱. سنن نسائی ص ۱۶۱. ۱۷۰. ۱۹۳. ج ۱ منتقی ابن الجارود ص ۷۶. صحیح ابن خزیمہ ص ۲۷۴ ج ۱. حدیث نمبر ۵۴۵. طحاوی ص ۱۱۴. ج ۱. مستدرک حاکم ص ۲۴۲ ج ۱. بیہقی ص ۷۲. ۳۷۳. ج ۲ البغوی ص ۷. ۹. ۱۰.

آثار صحابہ و تابعینؒ

۱۔ حضرت صدیق اکبر اور عمر فاروق رضی اللہ عنہما رفع یدین نہیں کرتے تھے (دیکھئے حدیث عبداللہ مسعود رضی اللہ عنہ ۵)

۲۔ عَنِ الْاَسْوَدِ قَالَ صَلَّيْتُ مَعَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ فَلَمْ يَرْفَعْ يَدَيْهِ فِيْ شَيْءٍ مِّنْ صَلٰوتِهٖ اِلَّا حِيْنَ افْتَتَحَ الصَّلٰوةَ - قَالَ عَبْدُ الْمَلِكِ وَرَأَيْتُ الشَّعْبِيَّ وَاِبْرَاهِيْمَ وَاَبَا اِسْحَاقَ لَا يَرْفَعُوْنَ اَيْدِيَهُمْ اِلَّا حِيْنَ يَفْتَتِحُوْنَ الصَّلٰوةَ (طحاوی صفحہ ۱۱۱ ج ۱ مصنف ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۳۷ ج ۱، صفحہ ۴۰۵ ج ۱)

۳۔ عَنْ عَاصِمِ بْنِ كُلَيْبٍ عَنْ اَبِيْهِ - وَكَانَ مِنْ اَصْحَابِ عَلِيٍّ اَنَّ عَلِيَّ بْنَ اَبِيْ طَالِبٍ كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي التَّكْبِيْرَةِ الْاُوْلٰى الَّتِيْ يَفْتَتِحُ بِهِ الصَّلٰوةَ ثُمَّ لَا يَرْفَعُهُمَا فِيْ شَيْءٍ مِّنَ الصَّلٰوةِ -

ترجمہ:۔ حضرت اسود فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ نماز کے شروع کے علاوہ کسی جگہ بھی رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

عبدالملک (راوی حدیث) کہتے ہیں کہ میں نے شعبی، ابراہیم نخعی اور ابو اسحاق کو دیکھا ہے کہ وہ ابتدائے نماز کے سوا رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

عاصم بن کلیب اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اصحاب میں سے تھے، کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نماز کی صرف پہلی تکبیر میں رفع یدین کرتے تھے۔ اس کے بعد نماز کے کسی حصہ میں رفع یدین نہیں کرتے تھے۔

(موطا امام محمد ص ۹۴، طحاوی ص ۱۱۰ ج ۱ مصنف ابن ابی شیبہ ۲۳۶ ج ۱)

نصب الرایہ ص ۴۰۶ ج ۱ میں فرماتے ہیں: "وھو اثر صحیح"۔ حافظ ابن حجرؒ الدرایہ ص ۸۵ (طبع دہلی) میں فرماتے ہیں: "رجالہ ثقات وھو موقوف"

۴ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ اَوَّلِ مَا يَسْتَفْتِحُ ثُمَّ لَا يَرْفَعُهُمَا (مصنف ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۳۶) (طحاوی صفحہ ۱۳۳ جلد ۱)

ترجمہ:۔ حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نماز کے شروع میں رفع یدین کیا کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے۔

اس کی سند صحیح ہے (نصب الرایہ) اور امام طحاوی نے شرح معانی الاثار ص ۱۳۳ ج ۱ میں، امام ترمذیؒ نے کتاب العلل ص ۲۳۹ ج ۲ اور ابن سعد نے طبقات ص ۱۶۰ ج ۶ میں امام اعمشؒ سے نقل کیا ہے کہ میں نے حضرت ابراہیمؒ سے عرض کیا کہ آپ جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث بیان کیا کریں تو اس کی سند ذکر کیا کیجئے (کہ فلاں صاحب سے آپ نے یہ حدیث سنی ہے) وہ فرمانے لگے کہ جب میں یہ کہوں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے یوں فرمایا تو یہ بات میں نے آپ کے شاگردوں کی ایک پوری جماعت سے سنی ہوتی ہے۔ اور جب کسی خاص شخص کے حوالے سے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کروں تو یہ حدیث میں نے صرف انہی صاحب سے سنی ہوتی ہے ____ امام بیہقی نے سنن ص ۱۴۸ ج ۱ میں یحییٰ بن معینؒ سے نقل کیا ہے کہ ابراہیم نخعی کی مرسل روائتیں صحیح ہیں سوائے دو حدیثوں کے حدیث تاجر البحرین اور ضحک فی الصلوٰۃ (حاشیہ نصب الرایہ ص ۴۰۶ ج ۱)

۵۔ عَنْ مُجَاهِدٍ قَالَ مَا رَاَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ اِلَّا فِيْ اَوَّلِ مَا يَفْتَتِحُ۔ طحاوی صفحہ ۱۱۰ ج ۱، مصنف ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۳۷ ج ۱)

ترجمہ:۔ امام مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ابتدائے نماز کے سوا رفع یدین کرتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

امام ابن ابی شیبہ نے یہ روایت ابو بکر بن عیاش سے انہوں نے حصین سے اور انہوں نے مجاہد سے نقل کی ہے، یہ سند بخاری و مسلم کی شرط پر ہے، چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر ص ۷۲۵ ج ۲ میں ابو بکر بن عیاش عن حصین کی سند موجود ہے۔ اس لئے اس روایت کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں، حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث کے تحت عرض کر چکا ہوں کہ ان سے مختلف احادیث مروی ہیں۔ رفع یدین کی بھی اور ترک رفع یدین کی بھی ___ ان کا یہ عمل، جو امام مجاہد نے نقل کیا ہے، ترک رفع یدین کی روایت کے مطابق ہے۔

۶___ امام محمد موطا ص ۹۰ میں اور کتاب الحجۃ ص ۹۵ ج ۱ میں امام مالک ؒ سے روایت کرتے ہیں۔ یہ اثر بھی نہایت صحیح ہے

۶۔ اَخْبَرَنِیْ نُعَیْمُ الْمُجْمِرُ وَاَبُوْجَعْفَرِ الْقَارِیُٔ اَنَّ اَبَا هُرَیْرَةَ کَانَ یُصَلِّیْ بِهِمْ فَیُکَبِّرُ کُلَّمَا خَفَضَ وَرَفَعَ ۔ وَکَانَ یَرْفَعُ یَدَیْهِ حِیْنَ یُکَبِّرُ وَیَفْتَتِحُ الصَّلٰوةَ ۔

ترجمہ:۔ امام مالک ؒ فرماتے ہیں کہ مجھے نعیم بن عبداللہ المجمر اور ابو جعفر القاری نے بتایا کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ان کو نماز پڑھاتے تھے تو ہر اونچ نیچ میں تکبیر کہتے تھے اور رفع یدین نماز کے شروع میں تکبیر تحریمہ کے وقت کرتے تھے۔

۷___ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۲۳۶ ج ۱ میں ہے۔

۷۔ حَدَّثَنَا وَکِیْعٌ وَاَبُوْاُسَامَةَ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ قَالَ کَانَ اَصْحَابُ عَبْدِ اللّٰهِ وَاَصْحَابُ عَلِیٍّ لَا یَرْفَعُوْنَ اَیْدِیَهُمْ اِلَّا فِیْ افْتِتَاحِ الصَّلٰوةِ ۔ قَالَ وَکِیْعٌ ثُمَّ لَا یَعُوْدُوْنَ ؛

ترجمہ:۔ ہم سے وکیع اور ابو اسامہ نے بیان کیا، شعبہ سے، انہوں نے ابو اسحاق سے، کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کے اصحاب اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اصحاب صرف نماز کے شروع میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔

یہ سند بھی نہایت صحیح ہے، اور اس امر کی دلیل ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اصحاب کا ترک رفع یدین پر اجماع تھا۔

۸۔ حَدَّثَنَا یَحْیَی بْنُ سَعِیْدٍ عَنْ اِسْمَاعِیْلَ قَالَ کَانَ قَیْسٌ یَرْفَعُ یَدَیْهِ اَوَّلَ مَا یَدْخُلُ فِی الصَّلٰوةِ ثُمَّ لَا یَرْفَعُهُمَا (حوالہ مذکور)

ترجمہ ۔۸۔ اسماعیل کہتے ہیں کہ حضرت قیس بن ابی حازم" صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے۔

قیس بن ابی حازم البجلی الکوفی" اکابر تابعین" میں سے ہیں. حافظ" تقریب میں لکھتے ہیں کہ انہوں نے زمانہ نبوت پایا۔ اور کہا جاتا ہے کہ ان کو شرف رؤیت بھی حاصل ہے. انہی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کو عشرہ مبشرہ سے روایت کا اتفاق ہوا ہے۔ ۹۰ھ کے بعد یا اس سے پہلے انتقال ہوا۔ سن مبارک سو سے متجاوز تھا۔ اور قویٰ میں تغیر پیدا ہو گیا تھا"۔

یہ جلیل القدر تابعی جن کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ عشرہ مبشرہ سے روایت کرتے ہیں۔ ترک رفع یدین پر عامل تھے۔ اگر ترک رفع یدین اکابر صحابہ کے زمانہ میں متواتر نہ ہوتا تو یہ اس پر عامل نہ ہوتے۔

۹۔ عَنِ الْاَسْوَدِ وَعَلْقَمَةَ اَنَّهُمَا كَانَ يَرْفَعَانِ اَيْدِيَهِمَا اِذَا افْتَتَحَا ثُمَّ لَا يَعُوْدَانِ (ایضاً صفحہ ۲۳۷ ج ۱)

ترجمہ۔ ۹۔ حضرت اسود" علقمہ" صرف نماز شروع کرتے وقت رفع یدین کرتے تھے پھر دوبارہ نہیں کرتے تھے

۱۰۔ حَدَّثَنَا مُعَاوِيَةُ بْنُ هُشَيْمٍ عَنْ سُفْيَانَ بْنِ مُسْلِمِ الْجُهَنِيِّ قَالَ كَانَ ابْنُ اَبِيْ لَيْلٰى يَرْفَعُ يَدَيْهِ اَوَّلَ شَيْئٍ اِذَا كَبَّرَ۔

۱۰۔ سفیان بن مسلم جہنی کہتے ہیں کہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کیا کرتے تھے۔

۱۱۔ عَنْ خَيْثَمَةَ وَاِبْرَاهِيْمَ كَانَا لَا يَرْفَعَانِ اَيْدِيَهِمَا اِلَّا فِيْ بَدْءِ الصَّلٰوةِ

(صفحہ ۲۳۶ ج ۱)

۱۱۔ حضرت خثیمہ" اور حضرت ابراہیم نخعی" دونوں رفع یدین نہیں کرتے تھے مگر نماز کی ابتدا میں۔

۱۲۔ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ لَا تَرْفَعْ يَدَيْكَ فِيْ شَيْئٍ مِّنَ الصَّلٰوةِ اِلَّا فِي الْاِفْتِتَاحَةِ الْاُوْلٰى (صفحہ ۲۳۶ ج ۱)

۱۲۔ حضرت ابراہیم نخعی" فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ کے سوا نماز کے کسی حصہ میں رفع یدین مت کرو۔

۱۳۔ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ اَنَّهُ كَانَ يَقُوْلُ اِذَا كَبَّرْتَ فِيْ فَاتِحَةِ الصَّلٰوةِ فَارْفَعْ يَدَيْكَ ثُمَّ لَا تَرْفَعْهُمَا فِيْمَا بَقِيَ (ایضاً)

۱۳۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ فرمایا کرتے تھے کہ جب تکبیر تحریمہ کہو تو رفع یدین کرو۔ باقی نماز میں مت کرو۔
حضرات اسودؒ و علقمہؒ، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے جلیل القدر شاگرد اور اکابر تابعین میں سے ہیں. حضرت اسود حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں بھی دو سال رہے ہیں اور ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے بھی خصوصی تلمذ تھا۔ حضرت ابراہیم نخعیؒ بھی جلیل القدر تابعی ہیں۔ صحابہ کرامؓ کے زمانے میں فتویٰ دیا کرتے تھے۔

۱۴۔ حَدَّثَنَا ابْنُ مُبَارَكٍ عَنْ اَشْعَثَ عَنِ الشَّعْبِيِّ اَنَّهُ كَانَ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ اَوَّلِ التَّكْبِيْرِ ثُمَّ لَا يَرْفَعُهُمَا (ایضًا)

ترجمہ ۱۴: اشعث کہتے ہیں کہ امام شعبیؒ صرف پہلی تکبیر کے وقت رفع یدین کرتے تھے پھر نہیں کرتے تھے
شرح معانی الاثار طحاوی ص ۱۱۲ ج ۱ میں ابو بکر بن عیاش کا قول صحیح سند سے نقل کیا ہے۔

۱۵۔ مَا رَاَيْتُ فَقِيْهًا قَطُّ يَفْعَلُهُ، يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِيْ غَيْرِ التَّكْبِيْرَةِ الْاُوْلٰى۔

ترجمہ ۱۵: میں نے کسی فقیہ کو کبھی ایسا کرتے نہیں دیکھا کہ وہ تکبیر تحریمہ کے سوا رفع یدین کرتا ہو۔

ترک رفع یدین کے وجوہ ترجیح

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ و تابعینؒ سے ترک رفع یدین کا عمل متواتر ہے. اب یہ معلوم کر لینا بھی مناسب ہے کہ اہل کوفہ و اہل مدینہ اور مالکیہ نے ترک رفع یدین کو کن وجوہ سے راجح قرار دیا۔

۱۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ جو عمل اوفق بالقرآن ہو وہ راجح ہے۔ قرآن کریم میں ان مومنین کی مدح فرمائی ہے جو نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔

"اَلَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ" (المومنون : ۲)

"(جو لوگ کہ اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں) اور خشوع کے معنی سکون ہیں۔
گویا نماز میں جس قدر ظاہری و باطنی قلباً و قالباً سکون ہو گا اسی قدر خشوع ہو گا۔ اور اوپر سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین سے منع کرتے ہوئے نماز میں سکون اختیار کرنے کا حکم فرمایا. اس سے واضح ہوتا ہے کہ ترک رفع یدین اوفق بالقرآن ہے۔

۲۔ اوپر روایات سے معلوم ہو چکا ہے کہ رفع یدین مواضع ثلاثہ کے علاوہ بھی متعدد

مواضع میں ہوتا تھا۔ مگر صحیح روایات کے مطابق باقی مواضع میں رفع یدین سب کے نزدیک متروک ہے۔ اور تحریمہ کے وقت رفع یدین سب کے نزدیک سنت ہے۔ دو جگہوں میں اختلاف ہے۔ پس حنفیہ و مالکیہ نے متفق علیہ کو اختیار کر لیا. اور جس چیز میں اختلاف اور تردد تھا اسے ترک کر دیا۔

۳۔۔۔ نماز میں حرکت سے سکون کی طرف تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں جیسا کہ ابو داؤد میں "تحویلات ثلاثہ" کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے. اس کے برعکس یہ نہیں ہوا کہ پہلے نماز میں سکون ہوتا ہو پھر حرکات شروع ہو گئی ہوں۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رفع یدین کی روایات بھی مروی ہیں اور ترک رفع یدین کی بھی۔ مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری عمل ترک رفع یدین تھا۔

۴۔۔۔ امام حازمیؒ نے متعارض روایات میں ترجیح کے جو اصول بیان فرمائے ہیں ان میں سے دوسرا اصول یہ بیان کیا ہے۔ کہ ایک روایت کا راوی اگر حفظ و اتقان میں دوسرے سے بڑھ کر ہو تو اس کی روایت مقدم ہوگی ۔۔۔ "الوجہ الثانی ان یکون احد الروایین احفظ واتقن"۔ (ص ۱۱)

۵۔۔۔ دسواں اصول یہ لکھا ہے کہ ایک راوی کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زیادہ قرب حاصل ہو تو اس کی روایت مقدم ہوگی۔

"العاشر. ان یکون احد الروایین اقرب مکانا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فحدیثہ. اولیٰ بالتقدیم۔" (ص ۱۴)

۶۔ گیارہواں اصول یہ لکھا ہے کہ اگر ایک راوی کا اپنے شیخ سے زیادہ تعلق رہا ہو اور اسے شیخ سے طویل صحبت رہی ہو تو اس کی روایت مقدم ہوگی۔ "الحادی عشر. ان یکون احد الروایین اکثر ملازمتہ لشیخہ۔ قال وطول الصحبتہ لہ زیادہ تاثیر فیرجح بہ۔" (کتاب الاعتبار ص ۱۴)

۷۔ تیئسواں اصول یہ لکھا ہے. جب دو روایتوں کے راوی حفظ و اتقان میں یکساں ہوں مگر ان میں سے ایک روایت کے راوی فقیہ ہوں اور احکام کے عارف ہوں تو ان کی روایت مقدم ہوگی۔ "الثالث والعشرون. ان یکون رواۃ احد الحدیثین مع تساویہم فی الحفظ والاتقان فقہاء عارفین باعتناء الاحکام من مثمرات الالفاظ۔ فالاستر واح الی حدیث الفقہا اولیٰ۔" (ص ۱۷)

یہ چار اصول جو امام حازمیؒ نے ارشاد فرمائے ہیں ان کو زیر بحث مسئلہ پر منطبق کیجئے۔ رفع یدین کی روایات حضرت عبداللہ بن عمر. حضرت مالک بن حویرث اور حضرت وائل بن حجر رضی اللہ

عنہم سے مروی ہیں (گو ان کے الفاظ میں بھی اختلاف و اضطراب ہے) ادھر ترک رفع یدین کی احادیث حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں۔ اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عمل کی تائید ان کو حاصل ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہ ضبط و اتقان میں بھی فائق ہیں۔ طول صحبت میں بھی۔ اور تفقہ فی الدین میں بھی۔ امام ذہبی تذکرۃ الحفاظ (ج ۱ ص ۱۳ ومابعد) میں لکھتے ہیں

اِبْنُ مَسْعُوْدٍ اَلْإِمَامُ الرَّبَّانِیُّ صَاحِبُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَخَادِمُہٗ وَاَحَدُ السَّابِقِیْنَ الْاَوَّلِیْنَ وَمِنْ کِبَارِ الْبَدْرِیِّیْنَ، وَمِنْ نُبَلَاءِ الْفُقَهَاءِ وَالْمُقَرَّبِیْنَ کَانَ مِمَّنْ یَّتَحَرّٰی فِی الْاَدَاءِ وَ یُشَدِّدُ فِی الرِّوَایَةِ وَیَزْجُرُ تَلَامِذَتَہٗ عَنِ التَّهَاوُنِ فِیْ ضَبْطِ الْاَلْفَاظِ وَکَانَ یَقِلُّ مِنَ الرِّوَایَةِ لِلْحَدِیْثِ۔ وَیَتَوَرَّعُ، وَکَانَ تَلَامِذَتُہٗ لَا یُفَضِّلُوْنَ عَلَیْہِ اَحَدًا مِّنَ الصَّحَابَةِ۔ وَکَانَ مِنْ سَادَاتِ الصَّحَابَةِ وَاَوْعِیَةِ الْعِلْمِ وَاَئِمَّةِ الْهُدٰی ؕ

ترجمہ:۔ ابن مسعود. امام ربانی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیق اور خادم۔ سابقین اولین اور اکابر اہل بدر میں سے تھے، بلند پایہ فقہاء اور مقربین میں ان کا شمار تھا۔ الفاظ حدیث کے ادا کرنے میں بڑی احتیاط کرتے تھے روایت میں بڑی سختی فرماتے تھے، اپنے تلامذہ کو ضبط الفاظ میں سستی کرنے پر ڈانٹ پلاتے تھے۔ حدیث کی روایت بہت کم کرتے تھے، اور اس بارے میں خاص احتیاط ورع سے کام لیتے تھے ان کے تلامذہ ان پر کسی صحابی کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ ان کا شمار سادات صحابہ۔ خزانہ علم اور ائمہ ہدیٰ میں ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ چونکہ ضبط و اتقان طول صحبت اور فقاہت میں دوسرے حضرات سے فائق ہیں اس لئے ان کی روایت مقدم ہوگی۔ امام طحاوی نے بسند صحیح نقل کیا ہے کہ

"مغیرہ بن مقسم الضبی کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابراہیم نخعی سے حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی حدیث ذکر کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے قبل و بعد رفع یدین کیا کرتے تھے فرمانے لگے اگر حضرت وائل رضی اللہ عنہ نے ایک بار آپ کو رفع یدین کرتے دیکھا ہے تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پچاس بار ترک رفع یدین کرتے دیکھا ہے۔"

"عروہ بن مرہ کہتے ہیں کہ میں حضرموت کی مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ علقمہ

بن وائل اپنے والد حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکوع سے قبل وبعد رفع یدین کرتے تھے، میں نے ابراہیم نخعی ؒ سے اس کا ذکر کیا تو غضبناک ہو کر فرمایا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ نے دیکھا ہے؟ ابن مسعودؓ اور ان کے رفقا نے نہیں دیکھا؟

(طحاوی ص ۱۱۰ موطا امام محمد ص ۹۲، کتاب الآثار امام ابو یوسف ص ۲۱)

۸۔۔۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ رفع یدین کے باب میں جو احادیث مروی ہیں ان میں اختلاف و اضطراب ہے، لیکن حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث اضطراب سے پاک ہے نچہ ان سے رفع یدین کی ایک روایت بھی نہیں ہے، پس جو حدیث کہ اختلاف و اضطراب سے پاک ہو وہ مقدم ہوگی۔

۹۔۔۔ کسی حدیث میں یہ نہیں آتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رفع یدین کا حکم فرمایا ہو، اس کے برعکس حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ممانعت موجود ہے۔ اور جب قولی حدیث اور فعلی احادیث میں اختلاف ہو تو قولی احادیث مقدم ہوتی ہے۔

۱۰۔۔۔ جن احادیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رفع یدین کرتے تھے، ان میں سے کسی صحیح حدیث میں یہ ذکر نہیں کہ آپ کا یہ عمل مدۃ العمر رہا۔ اور نہ کسی حدیث میں یہی بیان کیا گیا ہے کہ آپ کی آخری نماز رفع یدین کے ساتھ ہوئی تھی۔ جب تک ان دو باتوں میں سے ایک بات ثابت نہ ہو رفع یدین کا سنت دائمہ مستمرہ ہونا ثابت نہیں اس کے مقابلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ترک رفع یدین احادیث صحیحہ سے ثابت ہے۔ پھر رفع یدین کی ممانعت بھی موجود ہے۔ اور حضرات خلفائے راشدین اور اکابر صحابہؓ کا عمل بھی ترک رفع الیدین پر ثابت ہے ان تمام امور سے معلوم ہوتا ہے کہ رفع الیدین آپ کی سنت دائمہ نہیں بلکہ سنت متروکہ ہے۔ واللہ اعلم۔

دو شبہات کا ازالہ

آخر میں دو غلط فہمیوں کا ازالہ ضروری ہے۔ جن کی طرف سوال میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اول :۔ ایک یہ کہ رفع الیدین میں اختلاف جواز یا عدم جواز کا نہیں، بلکہ اولیٰ اور غیر اولیٰ کا ہے، جیسا کہ حافظ ابن قیم ؒ کی عبارت اس سے پہلے نقل کر چکا ہوں اس لئے حنفیہ کے نزدیک رفع الیدین سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ ان کے نزدیک یہ عمل سنت متروکہ ہونے کی وجہ سے خلاف

اولیٰ ہے۔

دوم :۔ یہ کہ سوال میں جو ذکر کیا گیا کہ رفع الیدین کے باب میں پچاس سے زائد صحابہ روایت کرتے ہیں یہ محض مبالغہ ہے، پچاس صحابہ کی روایت کا حوالہ محدثین نے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع الیدین کے لئے دیا ہے چنانچہ علامہ شوکانیؒ (نیل الاوطار ص ۱۸۴ ج ۲) میں لکھتے ہیں

"وَجَمَعَ الْعِرَاقِیُّ عَدَدَ مَنْ رَوٰی رَفْعَ الْیَدَیْنِ فِیْ اِبْتِدَاءِ الصَّلٰوۃِ فَبَلَغُوْا خَمْسِیْنَ صَحَابِیًّا مِنْھُمُ الْعَشَرَۃُ الْمَشْھُوْدُ لَھُمْ بِالْجَنَّۃِ"

ترجمہ :۔ علامہ عراقیؒ نے ان حضرات کا شمار کیا ہے جن سے ابتدائے نماز میں رفع یدین کی احادیث مروی ہیں۔ چنانچہ ان کی تعداد پچاس صحابہؓ تک پہنچی ہے۔ جن میں حضرات عشرہ مبشرہ بھی شامل ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچاس صحابہؓ سے تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین کی احادیث مروی ہیں جو با جماع امت مستحب ہے۔ اور جس سے حنفیہ کو بھی اختلاف نہیں۔ جس مسئلہ میں اختلاف ہے وہ رکوع سے پہلے اور رکوع کے بعد رفع الیدین ہے۔ اس میں پچاس صحابہؓ کی روایات تو کجا، ایک صحابی کی بھی ایسی روایت نہیں جو صحیح بھی ہو۔ اور اختلاف و معارضہ سے خالی بھی ہو، اس لئے اس متنازع فیہ مسئلہ پر پچاس صحابہ کی روایات کا حوالہ دینا محض مغالطہ ہے دراصل اس مسئلہ میں اصل حقائق کے بجائے مبالغہ آرائی سے زیادہ کام لیا گیا ہے۔ ان مبالغات کی دو دلچسپ مثالیں پیش کرتا ہوں۔

امام بخاریؒ نے رسالہ جزء رفع الیدین میں حضرت حسن بصریؒ کا قول نقل کیا ہے۔

کَانَ اَصْحَابُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَرْفَعُوْنَ اَیْدِیَھُمْ فِی الصَّلٰوۃِ۔

ترجمہ :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ نماز میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔

امام بصریؒ کے اس قول کو نقل کر کے امام بخاریؒ لکھتے ہیں۔

وَلَمْ یَسْتَثْنِ اَحَدًا وَلَا ثَبَتَ عَنْ اَحَدٍ مِّنَ الصَّحَابَۃِ اَنَّہٗ لَمْ یَرْفَعْ یَدَیْہِ (بحوالہ نصب الرایہ صفحہ ۴۱۷ ج ۱)

ترجمہ :۔ امام حسن بصریؒ نے کسی کو مستثنیٰ نہیں کیا۔ اور نہ کسی صحابی سے یہ ثابت ہے کہ اس نے رفع یدین نہ کیا ہو۔

لیجئے حضرت حسن بصریؒ کے اس قول سے امام بخاریؒ نے ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرامؓ

سے رفع یدین ثابت کر دیا اور اس کے مقابلہ وہ تمام روایات صحیحہ غلط قرار پائیں جن میں صحابہ کرامؓ کا رفع یدین نہ کرنا ثابت ہے۔

اس سے قطع نظر کہ حسن بصریؒ کا یہ قول کیسی سند سے امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ اول تو اس میں صرف رفع یدین کا ذکر ہے۔ متنازعہ فیہ رفع یدین کا ذکر نہیں۔ پھر اگر دو چار صحابہؓ سے بھی رفع الیدین ثابت ہو تو امام حسن بصریؒ کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ صحابہ کرامؓ سے رفع یدین بھی ثابت ہے لیکن امام بخاریؒ نے امام حسن بصریؒ کے قول کا جو مفہوم بیان فرمایا ہے اس سے مبالغہ آرائی اپنی آخری حد کو پہنچ گئی۔ اور مزے کی بات یہ کہ حسن بصریؒ جن کا سماع حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی محدثین تسلیم نہیں کرتے، ان کا قول یہاں تمام صحابہ کرامؓ کے حق میں حجت مان لیا گیا۔ اور ان کے مقابلہ میں اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کے تصریحات مسترد کر دی گئیں۔ رفع الیدین کے متنازعہ فیہ مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے جن حضرات نے کاوشیں فرمائی ہیں ان میں سے اکثر و بیشتر نے اسی قسم کے مبالغوں میں سے کام چلایا ہے۔

اس کی دوسری مثال شیخ مجدالدین فیروز آبادی صاحب قاموس کی عبارت ہے وہ "سفر السعادۃ" میں لکھتے ہیں۔

دریں سہ موضع برداشتن دست ثابت شدہ، واز کثرت رواۃ ایں معنی بمتواترہ ماندہ است۔ چہار صد خبر واثر دریں باب صحیح شدہ۔ و عشرہ مبشرہ روایت کردہ اند کہ لایزال عمل آنحضرت بریں کیفیت بود تا ازیں جہاں رحلت کرد ــــــ	ان تین مواضع میں رفع یدین ثابت ہے۔ اور راویوں کی کثرت کی وجہ سے متواتر کے مشابہ ہے۔ چنانچہ اس مسئلہ میں چار سو صحیح حدیثیں مرفوع و موقوف ثابت ہیں۔ اس کو عشرہ مبشرہ نے روایت کیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اسی کیفیت پر رہے یہاں تک کہ اس عالم سے رحلت فرما گئے۔ اور رفع الیدین کے خلاف کوئی روایت بھی ثابت نہیں۔
(شرح سفر السعادۃ ص ۶۴)	

فن مبالغہ آرائی کا کمال دیکھئے کہ شیخ فیروز آبادی نے ایک ہی سانس میں کتنی باتیں کہہ ڈالیں۔

۱ــــ "ان تین مواضع میں رفع یدین ثابت ہے۔" حالانکہ پورے ذخیرہ حدیث میں ایک روایت بھی ایسی نہیں جو صحیح بھی ہو اور سالم عن المعارضہ بھی ہو۔

۲ــــ "رفع یدین پر چار سو صحیح حدیثیں ہیں" ۔ حالانکہ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ کو ان کی شرط کے

مطابق صرف دو حدیثیں مل سکیں، وہ بھی شدید الاضطراب ہیں اور محدثین کی اصطلاح میں ایسی مضطرب روایات کو صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

۳۔۔۔ چار سو حدیثوں کے باوجود مسئلہ شیخ فیروز آبادیؒ کے نزدیک پھر بھی متواتر نہیں بلکہ "متواتر کے مشابہ" خدا جانے کہ ان کے نزدیک کسی مسئلہ کے متواتر ہونے کے لئے کتنے "چار سو" کی ضرورت ہوگی۔

۴۔۔۔ "رفع یدین عشرہ مبشرہ کی روایت سے ثابت ہے۔ حالانکہ عشرہ مبشرہ میں سے کسی ایک سے بھی صحیح سند سے ثابت نہیں۔ اس کے مقابلہ میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم سے۔ جو عشرہ مبشرہ کے سرخیل میں ترک رفع یدین صحیح اسانید سے ثابت ہے۔ افسوس ہے کہ شیخ فیروز آبادیؒ کی عشر مبشرہ سے مروی روایات کا سراغ امام بخاریؒ و امام مسلمؒ کو نہ ملا۔ ورنہ یہ روایتیں صحیحین کی زینت ضرور بنتیں۔

۵۔۔۔ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رہتے دم تک رفع یدین کرتے رہے"۔ غالباً شیخ کے پیش نظر ابن عمر رضی اللہ عنہ سے منسوب کردہ وہ روایات ہے جس کو امام بیہقیؒ نے سنن میں ذکر کیا ہے۔

فَمَازَالَتْ تِلْكَ صَلٰوتُهٗ حَتّٰى لَقِىَ اللّٰهَ تَعَالٰى (نصب الرایہ صفحہ ۴۱۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ پس ہمیشہ رہی آپؐ کی یہی نماز۔ یہاں تک کہ جا ملے اللہ تعالیٰ سے۔

مگر یہ روایات موضوع ہے۔ اس کے دو راوی کذاب ہیں (حاشیہ نصب الرایہ) عجیب بات یہ ہے کہ امام بیہقیؒ اور حافظ ابن حجرؒ ایسے اکابر بھی نہ صرف اس روایت پر خاموشی سے گزر گئے بلکہ اس کو رفع دین کے دلائل میں ذکر کر جاتے ہیں اس سے ان حضرات کی اس مسئلہ میں بے بسی واضح ہے۔

۶۔۔۔ شیخ فیروز آبادیؒ فرماتے ہیں کہ۔ "ترک رفع یدین کی کوئی حدیث ثابت نہیں"۔ حالانکہ اکابر محدثین سے صحیح روایات اوپر نقل ہو چکی ہیں۔

رفع الیدین کے مسئلہ میں بے جا غلو اور مبالغوں سے کام نہ لیا جائے۔ تو خلاصہ یہ ہے کہ روایات و آثار دونوں جانب مروی ہیں، امام شافعیؒ و احمدؒ اور ان کے متبعین تین مواضع میں رفع الیدین کو راجح سمجھتے ہیں۔ اور امام ابو حنیفہؒ و مالکؒ۔۔۔ جن کا زمانہ اول الذکر حضرات سے قدیم ہے۔۔۔ ترک رفع یدین کو راجح سمجھتے ہیں۔ اور امت کا بیشتر تعامل اسی پر رہا ہے۔ چنانچہ صدر اول میں اسلام کے دو مرکزی شہروں مدینہ اور کوفہ میں ترک ہی پر عمل تھا۔ مکہ مکرمہ میں حضرت

عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں رفع یدین کا رواج ہوا۔ جن کا شمار صغار صحابہ میں ہے۔ ورنہ صحابہؓ و تابعینؒ کی اکثریت ترک رفع یدین پر عامل تھی۔ صحابہؓ و تابعینؒ کے بعد ائمہ مجتہدین کا زمانہ آتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں احناف اور مالکیہ ——— جو امت کے دو تہائی حصہ ہیں ——— ترک رفع یدین ہی پر عامل چلے آتے ہیں۔ اس لئے روایت و درایت اور توارث و تعامل کے لحاظ سے ترک رفع یدین ہی قوی اور راجح ہے۔ واللہ الموفق لکل خیر و سعادۃ۔

سوال ہفتم: سجدہ سہو کا طریقہ

س ۷:۔ "سجدہ سہو جو عام رائج ہے داہنی جانب ایک سلام پھیر کر دو سجدے کرنا یہ کس دلیل پر بنیاد ہے؟ جب کہ متفق علیہ کی احادیث سے صاف اور واضح ثبوت ملتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز میں سہو ہونے پر اس وقت سجدہ سہو کیا جب نماز اپنے آخری مرحلہ سے گزر رہی تھی یعنی قریب سلام پھیرنے کے تھے جب آپ نے دو سجدے کئے اب تحقیق طلب امر یہ ہے کہ ایک سلام پھیرنے (تشہد کے بعد) اور پھر دوبارہ تشہد و درود پڑھنے کا کیا ثبوت ہے؟"

ج ۷:۔ اس سلسلہ میں چند امور لائق توجہ ہیں۔

اول: ۔ سجدہ سہو کے بارے میں متفق علیہ روایات صرف سلام سے پہلے سجدہ سہو کرنے کی نہیں بلکہ اس سلسلہ میں بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے سجدہ سہو سلام سے پہلے کیا۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے جو صحاح ستہ میں ہے۔ اور سوال میں اسی کا حوالہ دیا گیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن بحینہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر کی نماز میں تشہد کئے بغیر تیسری رکعت کے لئے کھڑے ہو گئے اور نماز پوری کر کے سلام سے قبل سجدہ سہو کیا۔

(بخاری ص ۱۶۳ ج ۱، مسلم ص ۲۱۱ ج ۱، ابو داؤد ص ۱۴۸، ج ۱، نسائی ص ۱۸۱ و ۱۸۶ ج ۱، ترمذی ص ۵۱، ج ۱ ابن ماجہ ۸۵)

دوسری قسم ان احادیث کی ہے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ نے سلام کے بعد سجدہ سہو کیا چنانچہ:۔

۱ــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھیں، عرض کیا گیا کہ کیا نماز میں اضافہ ہو گیا فرمایا کیسا؟ کیا بات ہوئی؟ عرض کیا گیا آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں پس آپ نے سلام کے بعد دو سجدے کئے۔

(بخاری ص ۱۶۳ ج ۱، مسلم ص ۲۱۳ ج ۱، نسائی ص ۱۸۵ ج ۱، ابو داؤد ص ۱۴۶ ج ۱، ترمذی ص ۵۲ ج ۱، ابن ماجہ ص ۸۵)

۲ــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عصر کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا ــــــ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقی ماندہ نماز پوری کی۔ پھر بیٹھ کر سلام کے بعد دو سجدے کئے

(بخاری ص ۱۶۴ ج ۱، مسلم ص ۲۱۳ ج ۱، ابو داؤد ص ۱۴۴ ج ۱، نسائی ص ۱۸۲ ج ۱، ترمذی ص ۵۲ ج ۱، ابن ماجہ ص ۸۶)

۳ــــ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نماز پڑھائی تو دو رکعتوں پر تشہد کئے بغیر اٹھ گئے ــــــ جب نماز پوری کر کے سلام پھیرا تو دو سجدے کئے۔ اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

(ابو داؤد ص ۱۴۸ ج ۱، ترمذی ص ۴۸ ج ۱، ابن ابی شیبہ ص ۳۶ ج ۲)

۴ــــ حضرت عبید اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا ــــــ پھر دو رکعتیں اور پڑھیں، پھر سلام پھیرا پھر سجدہ سہو کیا

(ابن ماجہ ص ۸۶)

تیسری قسم کی احادیث وہ ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دو سلام کئے۔ ایک سجدہ سہو سے پہلے اور ایک بعد، چنانچہ۔

۱ــــ حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا ــــــ پھر آپ نے ایک اور رکعت پڑھی۔ پھر سلام پھیرا، پھر دو سجدے کئے۔ پھر سلام پھیرا

(صحیح مسلم ص ۲۱۴ ج ۱، ابو داؤد ص ۱۴۶ ج ۱، نسائی ص ۱۹۵ ج ۱، ابن ماجہ ص ۸۶، ابن ابی شیبہ ص ۲۷ ج ۲)

۲ــــ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہر یا عصر میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا ــــــ پھر دو رکعتیں اور پڑھیں اور سلام پھیرا پھر سجدہ سہو کیا پھر سلام پھیرا (ابن ماجہ ص ۸۶)

۳ــــ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ دو رکعتوں پر قعدہ کئے بغیر کھڑے ہو گئے ــــــ جب نماز پوری ہوئی تو سلام پھیرا، اور سجدہ سہو کیا، اور پھر سلام پھیرا پھر فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا ہی کیا تھا

(ترمذی ص ۸۴ ج ۱ و قال وہذا حدیث حسن صحیح ـــــ ابن ابی شیبہ ص ۳۴ ج ۲)

۴ ـــــ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھول کر دو رکعت پر سلام پھیر دیا ـــــ پھر دو رکعتیں اور پڑھیں ۔ پھر سلام پھیرا ۔ پھر سجدہ سہو کیا پھر سلام پھیرا ۔ (ابن ابی شیبہ ص ۳۸ ج ۲)

۵ ـــــ طحاوی ص ۲۵٦ ، مسند احمد ص ۴۲۹ ج ۱ ، سنن بیہقی ص ۳۴۵ ج ۱ میں بروایت ابو عبیدہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی موقوف حدیث ہے ۔

فَاِنَّهٗ يُسَلِّمُ ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ ثُمَّ يُسَلِّمُ (حاشیہ نصب الرایہ ص ۱۷۰ ج ۲)

ترجمہ :۔ سجدہ سہو کا طریقہ یہ ہے کہ سلام پھر لے پھر سجدہ سہو کرے ۔ پھر سلام پھیرے ۔

دوم :۔ ان مختلف احادیث کے درمیان توفیق و تطبیق یا ترجیح کے مسئلہ میں ائمہ اجتہاد کا اختلاف ہے چنانچہ امام ترمذیؒ نے اس مسئلہ میں پانچ قول نقل کئے ہیں :

۱ ـــــ امام شافعیؒ سلام سے پہلے سجدہ سہو کے قائل ہیں ۔

۲ ـــــ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ سجدہ سہو نماز میں زیادتی کی وجہ سے ہو تو سلام کے بعد ہوگا اور اگر نماز میں کمی رہ جانے کی وجہ سے ہو تو سلام سے قبل ہوگا ۔

۳ ـــــ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ سہو کی جو صورتیں منقول ہیں ان پر اسی طرح عمل کیا جائے گا ۔ چنانچہ :

الف :۔ اگر بھول سے پہلا قعدہ چھوٹ جائے تو سجدہ سہو سلام سے پہلے ہوگا ۔ جیسا کہ حضرت ابن بحینہؓ کی حدیث میں ہے ۔

ب :۔ اگر ظہر کی پانچ رکعتیں پڑھ لیں تو سجدہ سہو سلام کے بعد ہوگا ۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے ۔

ج :۔ اگر ظہر یا عصر کی دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا تو سجدہ سہو سلام کے بعد ہوگا ۔ جیسا کہ حضرت ابو ہریرہ اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے ۔

د :۔ اور جن صورتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی حکم منقول نہیں وہاں سجدہ سہو سلام سے پہلے ہوگا ۔

۴ ـــــ امام اسحاق بن راہویہؒ کا یہ قول امام احمدؒ کے موافق ہے ۔ البتہ آخری شق میں انہیں اختلاف ہے ۔ اور وہ فرماتے ہیں کہ جن صورتوں کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول نہیں وہاں زیادتی کی صورت میں سجدہ سہو سلام کے بعد اور کمی کی صورت میں سلام سے پہلے ہوگا ۔

۵۔۔۔۔ امام سفیان ثوری اور بعض اہل کوفہ کے نزدیک ہر صورت میں سجدہ سہو سلام کے بعد ہو گا۔ یہی امام ابو حنیفہ کا قول ہے۔

سوم:۔ مذاہب اربعہ اس پر متفق ہیں کہ سجدہ سہو قبل از سلام اور بعد از سلام دونوں طرح جائز ہے، اختلاف صرف افضلیت میں ہے چنانچہ ہدایہ میں ہے۔

وَهٰذَا الْخِلَافُ فِي الْأَوْلَوِيَّةِ۔

ترجمہ:۔ یہ اختلاف صرف اولویت میں ہے۔

امام نووی شرح مسلم ص ۲۱۰ ج ۱ میں فرماتے ہیں۔

وَلَا خِلَافَ بَيْنَ هٰؤُلَاءِ الْمُخْتَلِفِيْنَ وَغَيْرِهِمْ مِنَ الْعُلَمَاءِ اَنَّهٗ لَوْ سَجَدَ قَبْلَ السَّلَامِ اَوْ بَعْدَهٗ لِلزِّيَادَةِ اَوْ لِلنَّقْصِ، اَنَّهٗ يُجْزِيْهِ، وَلَا يَفْسُدُ صَلٰوتُهٗ وَاِنَّمَا اخْتِلَافُهُمْ فِي الْاَفْضَلِ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ۔

ان اختلاف کرنے والے حضرات اور دیگر علما کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر کسی نے سجدہ سہو سلام سے پہلے کر لیا یا بعد میں کر لیا۔ خواہ زیادتی کی صورت میں ہو یا نقصان کی صورت میں۔ تو سجدہ سہو بہر صورت صحیح ہے۔ اختلاف ہے تو اس میں ہے کہ افضل کونسی صورت ہے۔

چہارم:۔ ائمہ احناف نے سلام کے بعد سجدہ سہو کے طریقہ کو چند وجوہ سے راجح قرار دیا ہے۔

ایک یہ کہ اس طریقہ سے تمام احادیث جمع ہو جاتی ہیں اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہتا۔ چنانچہ جن احادیث میں دو سلاموں کا ذکر آتا ہے وہ بھی اس طریقہ کی تائید کرتی ہیں۔

دوسری وجہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل سے بھی یہی طریقہ راجح معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ بیشتر متفق علیہ احادیث اس مضمون کی ہیں کہ آپ نے سجدہ سہو سلام کے بعد کیا۔

اور اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات حسب ذیل ہیں۔

۱۔۔۔۔ صحیح بخاری ۵۸ ج ۱، ابو داؤد ص ۱۴۶ ج ۱، نسائی ص ۱۸۴ ج ۱، میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اِذَا شَكَّ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلٰوتِهٖ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ، فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ، ثُمَّ لِيُسَلِّمْ ثُمَّ لِيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ۔

ترجمہ:۔ جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز میں شک ہو جائے تو سوچ کر درست پہلو اختیار کر لے اس کے مطابق اپنی نماز پوری کرے پھر سلام پھیرے پھر سجدہ سہو کرے۔

۲ــــ ابو داؤد ص ۱۴۹ ج ۱. ابن ماجہ ص ۸۷. مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۳ ج ۲. مسند ابو داؤد طیالسی ص ۱۳۴ اور مسند امام احمد ص ۲۸۰ ج ۵ میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا.

ترجمہ:۔ ہر سہو کے لئے دو سجدے ہیں سلام کے بعد۔

۳ــــ ابو داؤد ص ۱۴۸ ج ۱. میں حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ شَكَّ فِي صَلٰوتِهٖ فَلْيَسْجُدْ سَجْدَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ۔

ترجمہ:۔ جس شخص کو اپنی نماز میں شک ہو جائے اسے چاہئے کہ سلام کے بعد دو سجدے کرلے۔

تیسری وجہ ترجیح یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کا عمل بھی اسی کے مطابق تھا۔ چنانچہ امام طحاویؒ نے صحیح اسانید سے حضرت عمر، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت مغیرہ بن شعبہ، حضرت عمران بن حصین، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت انس بن مالک، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز (رضی اللہ عنہم) کے آثار نقل کئے ہیں کہ وہ سلام کے بعد سجدہ سہو کرتے تھے۔

اور امام ابو داؤد حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

وَفَعَلَ سَعْدُ بْنُ اَبِيْ وَقَّاصٍ مِثْلَ مَا فَعَلَ الْمُغِيْرَةُ، وَعِمْرَانُ بْنُ حُصَيْنٍ وَالضَّحَّاكُ بْنُ قَيْسٍ، وَمُعَاوِيَةُ بْنُ اَبِيْ سُفْيَانَ وَابْنُ عَبَّاسٍ، وَاَفْتٰى بِذٰلِكَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِيْزِ (صفحہ ۱۴۸ ج ۱)

ترجمہ:۔ جس طرح حضرت مغیرہؓ نے کیا۔ اسی طرح سعد بن ابی وقاص، عمران بن حصین، ضحاک بن قیس، معاویہ بن ابی سفیان اور ابن عباس (رضی اللہ عنہم) نے کیا، اور عمر بن عبدالعزیزؒ نے اسی پر فتویٰ دیا۔

امام حازمیؒ نے کتاب الناسخ والمنسوخ میں صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت سعد بن ابی وقاص، اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم کے اور تابعین میں سے حسن بصریؒ، ابراہیم نخعیؒ، عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰؒ کے اسمائے گرامی ذکر کئے ہیں (نصب الرایہ ص ۱۷۰ ج ۲)

پنجم:۔ چونکہ سجدہ سہو کو نماز سے تعلق ہے۔ اس لئے ائمہ احناف کے نزدیک نماز کو ختم کرنے کے لئے سجدہ سہو کے بعد دوبارہ تشہد پڑھ کر سلام پھیرنا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل احادیث وارد ہیں۔

۱ــــ اوپر صحیح بخاری ص ۵۸ ج ۱ وغیرہ کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث

گزر چکی ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سلام کے بعد سجدہ سہو کرنے کا حکم فرمایا۔
امام طحاوی نے شرح معانی الآثار ص ۲۵۲ ج ۱ میں اسی حدیث میں بسند صحیح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

ثُمَّ لِيُسَلِّمْ، ثُمَّ لِيَسْجُدْ سَجْدَتَيِ السَّهْوِ وَيَتَشَهَّدْ وَيُسَلِّمْ۔

ترجمہ:۔ پھر سلام پھیرے۔ پھر سجدہ سہو کرے اور تشہد پڑھ کر سلام پھیرے۔

۲۔۔ ابو داؤد ص ۱۴۹ ج ۱، اور ترمذی ص ۵۲ ج ۲، میں حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:۔

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَّى بِهِمْ۔ فَسَهَا، فَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ تَشَهَّدَ ثُمَّ سَلَّمَ۔

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی جس میں آپؐ کو سہو ہو گیا تو آپؐ نے سجدہ سہو کیا پھر تشہد پڑھا پھر سلام پھیرا۔

اوپر حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی حدیث صحیح مسلم وغیرہ کے حوالے سے گزر چکی ہے جس میں دو مرتبہ سلام پھیرنے کا ذکر تھا۔ حضرت عمران رضی اللہ عنہ کی ان دونوں روایتوں کو جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تشہد پڑھ کر سلام پھیرا۔ پھر سجدہ سہو کیا۔ پھر تشہد پڑھا، اور پھر آخری سلام پھیرا۔

۳۔۔ ابو داؤد ص ۱۴۷ ج ۱ میں ابو عبیدہ سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إِذَا كُنْتَ فِي صَلٰوةٍ فَشَكَكْتَ فِي ثَلَاثٍ أَوْ أَرْبَعٍ۔ وَأَكْبَرُ ظَنِّكَ عَلَى أَرْبَعٍ۔ تَشَهَّدْتَ ثُمَّ سَجَدْتَ سَجْدَتَيْنِ وَأَنْتَ جَالِسٌ قَبْلَ أَنْ تُسَلِّمَ، ثُمَّ تَشَهَّدْتَ أَيْضًا ثُمَّ تُسَلِّمُ۔

ترجمہ:۔ جب تم نماز میں ہو پس تمہیں اس میں شک ہو جائے کہ تین رکعتیں پڑھی ہیں یا چار؟ اور زیادہ خیال چار کا ہو تو تشہد کے بعد سجدہ سہو کر لو، آخری سلام سے پہلے پھر دوبارہ تشہد پڑھو، اور پھر سلام پھیر دو۔

امام ابو داؤدؒ اس حدیث کو نقل کر کے فرماتے ہیں کہ متعدد حضرات (جن کے نام انہوں نے ذکر کئے ہیں) اس حدیث کو مرفوعاً نقل نہیں کرتے۔

۴ــــ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۱ ج ۲ میں ابو عبیدہ (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے صاحبزادہ) اور ابراہیم نخعیؒ کی روایت سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ سجدہ سہو کے بعد تشہد ہے۔

سوال ہشتم: مسائل وتر

س ۸: "وتر کی نماز میں دو رکعات پر تشہد پڑھنے کے لئے بیٹھنا اور آخری یعنی تیسری رکعت میں فاتحہ اور سورت کی تلاوت کے بعد اللہ اکبر کہہ کر دونوں ہاتھ کانوں تک اٹھانا اور پھر نیت باندھ کر قنوت پڑھنا کس دلیل سے ثابت ہے واضح فرمائیں جب کہ حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے تین، پانچ یا سات رکعات وتر پڑھے تو تشہد کے لئے دو رکعات پر نہ بیٹھے۔ بلکہ آخری رکعت پر ہی صرف بیٹھتے تھے۔ ان ہی سے ایک رکعت وتر بھی ثابت ہے اسی ضمن میں وضاحت مطلوب ہے کہ قنوت دونوں ہاتھ دعا کی طرح اٹھا کر پڑھیں یا ہاتھ باندھ کر پڑھیں۔ احادیث نبوی سے کوئی ثبوت دے کر آگاہ فرمائیں۔

ج: یہ سوال وتر سے متعلق چند مسائل پر مشتمل ہے۔

۱ــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تین ہی رکعتیں پڑھتے تھے۔ یا ایک، پانچ، سات، بھی؟

۲ــــ وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ بھی فرماتے تھے یا نہیں۔

۳ــــ قنوت وتر کے لئے تکبیر اور رفع یدین؟

۴ــــ قنوت وتر ہاتھ اٹھا کر پڑھی جائے یا باندھ کرے؟

ان مسائل کو ترتیب وار لکھتا ہوں۔ واللہ الموفق

پہلا مسئلہ: وتر کی رکعات:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک وتر کی تین رکعات کا تھا۔ ایک رکعت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ اور جن روایات میں پانچ، سات یا نو رکعتوں کا ذکر ہے۔ ان میں بھی وتر کی تین ہی رکعتیں ہوتی تھیں۔ راوی نے ماقبل یا مابعد کی رکعات کو ان کے ساتھ ملا کر مجموعہ کو "وتر کے لفظ سے تعبیر کر دیا۔

تین رکعت کے معمول کا ثبوت مندرجہ ذیل احادیث سے ہوتا ہے۔

۱۔ عَنْ اَبِیْ سَلَمَۃَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّہٗ سَاَلَ عَائِشَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھَا کَیْفَ کَانَ صَلٰوۃُ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِیْ رَمَضَانَ؟ قَالَتْ مَاکَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَزِیْدُ فِیْ رَمَضَانَ وَلَا فِیْ غَیْرِہٖ عَلٰی اِحْدٰی عَشَرَۃَ رَکْعَۃً یُصَلِّیْ اَرْبَعًا فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِھِنَّ وَطُوْلِھِنَّ۔ ثُمَّ یُصَلِّیْ اَرْبَعًا فَلَا تَسْئَلْ عَنْ حُسْنِھِنَّ وَطُوْلِھِنَّ ثُمَّ یُصَلِّیْ ثَلَاثًا۔ (صحیح بخاری صـ۱۵۴ ج ۱، صحیح مسلم صـ۲۵۴ ج ۱، نسائی صـ۲۴۸ ج ۱، ابوداؤد صـ۱۸۹ ج ۱، مسند احمد صـ۳۶ ج ۶)

ترجمہ:۔ ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ لی عنہا سے دریافت کیا کہ رمضان مبارک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کیسی ہوتی تھی؟ انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ پہلے چار رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ پہلے چار رکعتیں پڑھتے پس کچھ نہ پوچھو وہ کتنی حسین اور طویل ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعتیں اور پڑھتے۔ پس کچھ نہ پوچھو کہ وہ کتنی حسین اور طویل ہوتی تھیں پھر تین رکعتیں (وتر کی) پڑھتے تھے۔

۲۔ عَنْ سَعْدِ بْنِ ھِشَامٍ اَنَّ عَائِشَۃَ حَدَّثَتْہٗ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ لَا یُسَلِّمُ فِیْ رَکْعَتَیِ الْوِتْرِ۔ (نسائی صـ۲۴۸ ج ۱، مؤطا امام محمدؒ صفحہ ۱۵۱)

ترجمہ:۔ سعد بن ہشام کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے انہیں بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

۳۔۔۔ امام حاکم نے مستدرک ص ۳۰۴ ج ۱ میں سعد بن ہشام کی روایت کو ان الفاظ سے نقل کیا ہے۔

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا یُسَلِّمُ فِی الرَّکْعَتَیْنِ الْاُوْلَیَیْنِ مِنَ الْوِتْرِ۔

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی پہلی دو رکعتوں میں سلام نہیں پھیرتے تھے۔

امام حاکم اس کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ھٰذَا حَدِیْثٌ صَحِیْحٌ عَلٰی شَرْطِ الشَّیْخَیْنِ وَلَمْ یُخَرِّجَاہُ (صفحہ مذکور)

ترجمہ:۔ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔

علامہ ذہبی تلخیص مستدرک میں حاکم کی تصحیح کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عَلٰی شَرْطِهِمَا

ترجمہ:۔ یہ حدیث صحیحین کی شرط پر ہے۔

۴۔ امام حاکم نے سعد بن ہشام کی یہی روایت ایک اور سند سے نقل فرمائی ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ، لَا يُسَلِّمُ اِلَّا فِيْ آخِرِهِنَّ وَهٰذَا وِتْرُ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ۔ وَعَنْهُ اَخَذَهُ اَهْلُ الْمَدِيْنَةِ۔

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ اور صرف ان کے آخر میں سلام پھیرتے تھے۔ اور امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی اسی طرح وتر پڑھتے تھے۔ اور انہی سے اہل مدینہ نے اخذ کیا۔

۵۔ مسند احمد ص ۱۵۶ ج ۶ میں سعد بن ہشام کی روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا صَلَّى الْعِشَاءَ دَخَلَ الْمَنْزِلَ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ۔ ثُمَّ صَلّٰى بَعْدَهُمَا رَكْعَتَيْنِ اَطْوَلَ مِنْهُمَا۔ ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ، لَا يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ، يَرْكَعُ وَهُوَ جَالِسٌ وَيَسْجُدُ وَهُوَ جَالِسٌ۔

۶۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِيْ قَيْسٍ قَالَ سَاَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا بِكَمْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ قَالَتْ بِاَرْبَعٍ وَّثَلَاثٍ، وَّسِتٍّ وَّثَلَاثٍ، وَثَمَانٍ وَّثَلٰثٍ وَلَمْ يَكُنْ يُوْتِرُ بِاَكْثَرَ مِنْ ثَلٰثَ عَشَرَةَ وَلَا اَنْقَصَ مِنْ سَبْعٍ۔ (ابوداؤد ص ۱۹۳ ج ۱، طحاوی ص ۱۳۹ ج ۱)

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز عشا سے فارغ ہوتے تو گھر میں تشریف لاتے۔ پھر دو رکعتیں پڑھتے۔ پھر ان کے بعد دو رکعتیں ان سے طویل پڑھتے۔ پھر تین وتر پڑھتے۔ ان کے بعد درمیان فصل نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد آپ بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے۔ جن میں بیٹھ کر رکوع و سجود کرتے۔

عبداللہ بن ابی قیس کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی

اللہ علیہ وسلم کتنی رکعتوں کے ساتھ وتر پڑھا کرتے تھے. فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتر پڑھا کرتا تھے چار اور تین کے ساتھ. چھ اور تین کے ساتھ اور آٹھ اور تین کے ساتھ۔ آپؐ کی وتر کی رکعتیں تیرہ سے زیادہ اور سات سے کم نہیں ہوتی تھیں۔

یہاں وتر سے مراد مجموعی طور پر نماز تہجد ہے۔ تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں۔ اور باقی تہجد کی۔

۷۔ عَنْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ بْنِ جُرَيْجٍ قَالَ سَأَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا بِاَيِّ شَيْءٍ كَانَ يُوْتِرُ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ يَقْرَأُ فِي الْأُوْلٰى بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى وَفِي الثَّانِيَةِ بِقُلْ يَا اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ وَفِي الثَّالِثَةِ بِقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَالْمُعَوِّذَتَيْنِ۔ قَالَ اَبُوْ عِيْسٰى هٰذَا حَدِيْثٌ حَسَنٌ غَرِيْبٌ۔

ترجمہ ۷: عبدالعزیز بن جریج کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کن سورتوں کے ساتھ وتر پڑھتے تھے۔ فرمایا. پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلی۔ دوسری میں قل یاایھا الکفرون اور تیسری میں قل ھواللہ احد اور معوذتین پڑھا کرتے تھے۔
امام ترمذیؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن غریب ہے۔

۸۔ عَنْ عَمْرَةَ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهَا۔ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ۔ يَقْرَأُ فِي الرَّكْعَةِ الْأُوْلٰى بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى۔ وَفِي الثَّالِثَةِ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ وَقُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ، هٰذَا حَدِيْثٌ صَحِيْحٌ عَلٰى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ وَلَمْ يُخَرِّجَاهُ۔ وَقَالَ الذَّهَبِيُّ رُوَاتُهُ ثِقَاتٌ عَنْهُ وَهُوَ عَلٰى شَرْطِ (خ.م (مستدرک حاکم صـ۳۰۵ ج ۱)

۹۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَاسْتَنَّ ثُمَّ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ نَامَ ثُمَّ قَامَ فَاسْتَنَّ ثُمَّ تَوَضَّأَ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ حَتّٰى صَلّٰى سِتًّا ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ وَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ۔ (صحیح مسلم صـ۲۶۱ ج ۱، نسائی صـ۲۴۹ ج ۱، واللفظ لہٗ)

۱۰۔ عَنْ يَحْيَى بْنِ الْجَزَّارِ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ كَانَ

رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ مِنَ اللَّيْلِ ثَمَانِ رَكْعَاتٍ وَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ وَيُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (نسائی ص۲۴۹ ج ۱، واللفظ لہ طحاوی ص ۱۴۰ ج ۱)

۱۱۔ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ يَقْرَأُ فِي الْأُوْلٰى سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلٰى، وَفِي الثَّانِيَةِ قُلْ يٰاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ وَفِي الثَّالِثَةِ قُلْ هُوَ اللهُ اَحَدٌ۔

ترجمہ: ۹ عمرۃ بنت عبدالرحمن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ۔ دوسری رکعت میں قل یاایہا الکافرون۔ تیسری میں قل ہو اللہ احد قل اعوذ برب الفلق۔ قل اعوذ برب الناس پڑھا کرتے تھے۔
امام حاکم فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے ...... علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ اس کے راوی ثقہ ہیں اور یہ بخاری و مسلم کی شرط پر ہے۔

۹ محمد بن علی بن عبداللہ بن عباس اپنے والد سے اور وہ اپنے والد عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اٹھے۔ پس مسواک کی۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر سو گئے۔ پھر اٹھے۔ مسواک کی پھر وضو کیا پھر دو رکعتیں پڑھیں۔ یہاں تک کہ چھ رکعتیں پڑھیں۔ پھر تین وتر پڑھے۔ پھر دو رکعتیں پڑھیں۔

۱۰ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات میں آٹھ رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور وتر کی تین رکعتیں پڑھتے تھے اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

۱۱ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ۔ دوسری میں قل یاایہا الکفرون۔ اور تیسری میں قل ہو اللہ احد پڑھا کرتے تھے۔

(سنن دارمی ص ۳۱۱ ج ۱، طبع ملتان حدیث نمبر ۱۵۹۷، ترمذی ص ۶۱ ج ۱، نسائی ص ۲۴۹ ج ۱، ابن ماجہ ص ۸۳، طحاوی ص ۱۴۰، ابن ابی شیبہ ص ۲۹۹ ج ۱، محلی ابن حزم ص ۵۱ ج ۲)

نصب الرایہ ص ۱۱۹ ج ۲ میں ہے کہ امام نوویؒ نے (خلاصہ" میں اس کو باسناد صحیح کہا ہے۔
وتر کی تین رکعتوں میں تین سورتیں پڑھنے کی احادیث حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہما کے علاوہ مندرجہ ذیل صحابہ کرامؓ سے بھی مروی ہیں۔

۱۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابزیؓ
(نسائی ۲۵۱ ج ۱. طحاوی ص ۱۴۳ ج ۱. ابن ابی شیبہ ص ۲۹۸ ج ۲. عبدالرزاق ص ۲۳ ج ۲)
۲۔ حضرت ابی بن کعبؓ : (نسائی ص ۲۴۸ ج ۱. ابن ابی شیبہ ص ۳۰۰ ج ۲)
۳۔ حضرت علیؓ (ترمذی ص ۶۱ ج ۱. عبدالرزاق ص ۳۴ ج ۳. طحاوی ۱۴۲ ج ۱)
۴۔ حضرت عبداللہ بن ابی اوفیؓ (مجمع الزوائد ص ۲۴۱ ج ۲)
۵۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ "
۶۔ حضرت نعمان بن بشیرؓ "
۷۔ حضرت ابو ہریرہؓ "
۸۔ ابن عمرؓ "
۹۔ عمران بن حصینؓ
(طحاوی ابن ابی شیبہ ص ۲۹۸ ج ۲. مجمع الزوائد ص ۲۴۱ ج ۲. کنز العمال ص ۱۹۶ ج ۱)
۱۰۔ ابو خثیمہؓ عن ابیہ معاویہ بن خدیج رضی اللہ عنہ۔ (مجمع الزوائد ص ۲۴۱ ج ۲)
معارف السنن (ص ۲۲۲ ج ۴ و ۲۲۶ ج ۴) میں حضرت جابر اور حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہما کا بھی حوالہ دیا ہے۔

۱۲۔ عَنْ عَامِرِ الشَّعْبِيِّ قَالَ سَأَلْتُ ابْنَ عُمَرَ وَابْنَ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَيْفَ كَانَ صَلٰوةُ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِاللَّيْلِ فَقَالَا ثَلٰثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً۔ ثَمَانٍ وَيُوْتِرُ بِثَلَاثٍ۔ وَرَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْفَجْرِ (طحاوی صفحہ ۱۳۶ ج ۱)

۱۳۔ عَنْ ثَابِتِ الْبُنَانِيِّ قَالَ قَالَ لِيْ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ يَا ثَابِتُ خُذْ عَنِّيْ فَاِنَّكَ لَنْ تَاْخُذَ عَنْ اَحَدٍ اَوْثَقَ مِنِّيْ، اِنِّيْ اَخَذْتُهٗ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَاَخَذَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ جِبْرِيْلَ وَاَخَذَ جِبْرِيْلُ عَنِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ۔ قَالَ ثُمَّ صَلّٰى بِيَ الْعِشَاءَ ثُمَّ صَلّٰى سِتَّ رَكْعَاتٍ يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ يُسَلِّمُ فِيْ اٰخِرِهِنَّ رَوَاهُ الرُّوْيَانِيُّ وَابْنُ عَسَاكِرَ وَرِجَالُهٗ ثِقَاتٌ (کنز العمال صـ ۱۹۶ ج ۴)

۱۴۔ اَخْبَرَنَا اَبُوْحَنِیْفَةَ، حَدَّثَنَا اَبُوْجَعْفَرٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ مَا بَيْنَ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ اِلٰى صَلٰوةِ الصُّبْحِ ثَلٰثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً ثَمَانِ رَكْعَاتٍ تَطَوُّعًا. وَثَلٰثَ رَكْعَاتِ الْوِتْرِ وَرَكْعَتَيِ الْفَجْرِ (مؤطا امام محمدؒ صہ ۱۴۹)

ترجمہ ۱۲: امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رات کی نماز کا کیا معمول تھا؟ دونوں نے فرمایا کہ تیرہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ اٹھ تہجد کی تین وتر کی۔ اور دو رکعتیں صبح صادق کے بعد۔

نمبر۱۳ حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ اے ثابت! مجھ سے سیکھ لو۔ تم مجھ سے زیادہ قابل اعتماد آدمی سے حاصل نہیں کر سکو گے۔ میں نے اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے۔ اور جبریل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے۔ پھر انہوں نے میرے ساتھ عشاء کی نماز پڑھی۔ پھر چھ رکعتیں پڑھیں۔ پھر تین وتر پڑھ کر ان کے آخر میں سلام پھیرا۔

نمبر۱۴ امام ابو حنیفہؒ امام محمد باقرؒ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز عشاء اور نماز فجر کے مابین تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ آٹھ نفل تین رکعات وتر اور دو رکعت سنت فجر۔

ان احادیث سے مندرجہ ذیل امور معلوم ہوئے۔

الف:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک تین وتر کا تھا۔

ب:۔ یہ تینوں رکعتیں ایک ہی سلام سے پڑھی جاتی تھیں۔

ج:۔ ان تین رکعتوں میں خاص خاص سورتوں کی تلاوت کا معمول تھا۔

• اب اس سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات بھی ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُوْتِرُوْا بِثَلَاثٍ وَاَوْتِرُوْا بِخَمْسٍ اَوْ سَبْعٍ وَلَا تَشَبَّهُوْا بِصَلٰوةِ الْمَغْرِبِ (طحاوی صہ ۱۴۳ ج ۱، دارقطنی صہ ۱۷۱) وَقَالَ رِجَالُهٗ ثِقَاتٌ۔ مستدرک حاکم صہ ۳۰۴ ج ۱، وَقَالَ صَحِيْحٌ عَلٰى شَرْطِ الشَّيْخَيْنِ)

۲۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَسَلَّمَ قَالَ صَلٰوۃُ الْمَغْرِبِ وِتْرُ النَّهَارِ فَاَوْتِرُوْا صَلٰوۃَ اللَّيْلِ۔

(عبدالرزاق ص۲۸ ج ۳)

وَلِاَحْمَدَ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ صَلٰوۃُ الْمَغْرِبِ اَوْتَرَتْ صَلٰوۃَ النَّهَارِ فَاَوْتِرُوْا صَلٰوۃَ اللَّيْلِ۔

قَالَ الْعِرَاقِیُ سَنَدُهٗ صَحِيْحٌ

۳۔ عَنْ عَائِشَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهَا۔ قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوِتْرُ ثَلَاثٌ كَثَلَاثِ الْمَغْرِبِ۔

ترجمہ:۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صرف تین رکعت وتر نہ پڑھا کرو بلکہ پانچ یا سات رکعت پڑھا کرو اور نماز مغرب کے ساتھ مشابہت نہ کرو۔

ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نماز مغرب دن کے وتر ہیں۔ پس رات کی نماز کو وتر بنایا کرو۔

مسند احمد کی روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ نماز مغرب نے دن کی نمازوں کو وتر بنا دیا۔ پس رات کی نماز کو بھی وتر بنایا کرو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا وتر کی تین رکعتیں ہیں جیسے نماز مغرب کی تین رکعتیں ہیں۔

۴۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وِتْرُ اللَّيْلِ ثَلٰثٌ كَوِتْرِ النَّهَارِ صَلٰوۃِ الْمَغْرِبِ (رواہ الدارقطنی نصب الرایہ صفحہ ۱۱۹ ج ۲)

"اِنَّ اللّٰهَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا رات کے وتر کی تین رکعتیں ہیں جیسے کہ دن کے وتر کی یعنی نماز مغرب کی۔ ۱؎

۱؎ ان دونوں روایتوں کے مرفوع ہونے میں محدثین کو کلام ہے۔ لیکن اول تو ان کا مضمون اوپر کی صحیح احادیث سے موید ہے۔ پھر متعدد طرق کی وجہ سے یہ دونوں حدیثیں حسن ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت عائشہؓ اور ابن مسعودؓ کے ارشادات صحیح سند سے ثابت ہیں (جیسا کے آگے آئے گا) اور یہ بات محض رائے اور قیاس سے نہیں کہی جا سکتی۔ اس لئے موقوف احادیث بھی مرفوع کے حکم میں ہیں۔

ان ارشادات سے معلوم ہوا کہ شارع علیہ السلام کی نظر میں وتر کی ٹھیک اسی طرح تین رکعتیں ہیں جس طرح نماز مغرب کی۔ نماز مغرب کی تین رکعتیں اس لئے مشروع کی گئیں تاکہ اس کے ذریعہ دن کی تمام نمازیں وتر (طاق) ہو جائیں۔ "ان اللہ وتر یحب الوتر"۔ ٹھیک اسی طرح وتر کی تین رکعتیں مشروع کی گئیں تاکہ ان کے ذریعہ رات کی نماز وتر (طاق) بن جائے۔ اسی لئے شارع علیہ السلام نے صرف تین وتر پر اکتفا کو پسند نہیں فرمایا، بلکہ وتر سے پہلے کم از کم دو یا چار رکعات نفل پڑھنے کا حکم فرمایا، تاکہ نماز وتر اور نماز مغرب کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ کیونکہ نماز مغرب سے پہلے نوافل نہیں پڑھے جاتے۔ خلاصہ یہ کہ رکعات کی تعداد میں نماز وتر نماز مغرب کے مشابہ ہے، اس لئے دونوں کے درمیان فرق و امتیاز کی یہ صورت تجویز فرمائی گئی کہ مغرب سے پہلے نوافل نہیں۔ اور وتر سے پہلے کم از کم دو چار نوافل ضرور ہونے چاہئیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معمول مبارک اور آپ کے ارشادات کے بعد اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اس مسئلہ میں صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم) کا تعامل کیا تھا۔

۱۔ عَنْ مِسْوَرِ بْنِ مَخْرَمَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ دَفَنَّا اَبَابَكْرٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ لَيْلَةً فَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اِنِّي لَمْ اُوتِرْ فَقَامَ فَصَفَفْنَا وَرَاءَهُ۔ فَصَلّٰى بِنَا ثَلَاثَ رَكَعَاتٍ لَمْ يُسَلِّمْ اِلَّا فِيْ آخِرِهِنَّ (طحاوی ص ۱۴۳ ج ۱، ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۹۳ ج ۱، عبدالرزاق صفحہ ۲۰ ج ۳)

ترجمہ:۔ حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم رات کے وقت حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے دفن سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں نے ابھی وتر نہیں پڑھے۔ پس وہ وتر کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو ہم نے بھی ان کے پیچھے صف باندھ لی۔ پس آپ نے تین رکعتیں پڑھائیں جن میں صرف تیسری رکعت پر سلام پھیرا۔

ظاہر ہے کہ اس موقع پر اکابر صحابہ موجود تھے جنہوں نے اس عمل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اقتدا فرمائی ان اکابر کے عمل سے معلوم ہوا کہ وتر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک ایک سلام سے تین رکعت کا تھا۔

۲۔ اوپر مستدرک حاکم ص ۳۰۴ ج ۱ کے حوالے سے سعد بن ہشام کی روایت گزر چکی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تیسری رکعت پر سلام پھیرا کرتے تھے۔ اس روایت کے آخر میں تھا۔

وَهٰذَا وِتْرُ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ۔

۳۔ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ مَا اُحِبُّ اَنِّيْ تَرَكْتُ الْوِتْرَ بِثَلَاثٍ وَاَنَّ لِيْ حُمْرَ النَّعَمِ

(مؤطا امام محمد صفحہ ۱۵۰)

۴۔ عَنِ الْحَسَنِ: قِيْلَ لَهٗ كَانَ ابْنُ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يُسَلِّمُ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِنَ الْوِتْرِ، فَقَالَ كَانَ عُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَفْقَهَ مِنْهُ كَانَ يَنْهَضُ فِي الثَّانِيَةِ بِالتَّكْبِيْرِ (مستدرک حاکم صفحہ ۳۰۴ ج ۱)

۵۔ عَنْ مَكْحُوْلٍ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ اَوْتَرَ بِثَلَاثِ رَكَعَاتٍ لَمْ يَفْصِلْ بَيْنَهُنَّ بِسَلَامٍ۔ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۹۴ ج ۲)

۶۔ عَنْ زَاذَانَ اَبِيْ عِمْرَانَ عَلِيًّا كَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ كَانَ يَفْعَلُ ذَالِكَ۔ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۹۵ ج ۲)

۷۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ اَلْوِتْرُ ثَلَاثٌ كَوِتْرِ النَّهَارِ صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ۔

۸۔ عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَهْوَنُ مَا يَكُوْنُ الْوِتْرُ ثَلَاثُ رَكَعَاتٍ (مؤطا امام محمد صفحہ ۱۵۰)

۹۔ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ قَالَ مَا اَجْزَاَتْ رَكْعَةٌ وَّاحِدَةٌ قَطُّ (مؤطا امام محمد صفحہ ۱۵۰)

۱۰۔ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ مُسْلِمٍ قَالَ: سَاَلْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا مِنَ الْوِتْرِ، فَقَالَ اَتَعْرِفُ وِتْرَ النَّهَارِ؟ فَقُلْتُ نَعَمْ صَلٰوةُ الْمَغْرِبِ، قَالَ صَدَقْتَ وَاَحْسَنْتَ۔ (طحاوی صفحہ ۱۳۶ ج ۱ باسناد صحیح)

۱۱۔ عَنْ اَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ الْوِتْرُ ثَلٰثُ رَكَعَاتٍ وَكَانَ يُوْتِرُ بِثَلٰثِ رَكَعَاتٍ۔ (طحاوی صفحہ ۱۴۳ ج ۱ ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۹۳، صفحہ ۲۹۴ وقال الحافظ

فی الدِّرَایَۃِ صفحہ ۱۱۵ اسناد صحیح)

۱۲۔ عَنْ اَبِیْ مَنْصُوْرٍ قَالَ سَاَلْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا عَنِ الْوِتْرِ فَقَالَ ثَلٰثٌ (طحاوی صفحہ ۱۴۱ ج ۱)

۱۳۔ عَنْ عَطَاءٍ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا اَلْوِتْرُ کَصَلٰوۃِ الْمَغْرِبِ (مؤطا امام محمد صفحہ ۱۵۰)

۱۴۔ عَنْ اَبِیْ یَحْیٰی قَالَ سَمَرَ الْمِسْوَرُ بْنُ مَخْرَمَۃَ وَابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا حَتّٰی طَلَعَتِ الْحَمْرَاءُ ثُمَّ نَامَ ابْنُ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللہُ عَنْہُمَا فَلَمْ یَسْتَیْقِظْ اِلَّا بِاَصْوَاتِ اَہْلِ الزَّوْرَاءِ فَقَالَ لِاَصْحَابِہٖ اَتَرَوْنِیْ اُدْرِکُ اُصَلِّیْ ثَلَاثًا یُرِیْدُ الْوِتْرَ وَرَکْعَتَیِ الْفَجْرِ وَصَلٰوۃَ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ؟ فَقَالُوْا نَعَمْ، وَھٰذَا فِیْ آخِرِ وَقْتِ الْفَجْرِ

(طحاوی صفحہ ۱۴۱ ج ۱)

ترجمہ:۔ اور وتر میں یہی طریقہ تھا امیر المومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا۔

۳۔۔۔ حضرت ابراہیم نخعی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ میں تین رکعات وتر کو چھوڑنا پسند نہیں کرتا خواہ اس کے بدلے میں مجھے سرخ اونٹ بھی مل جائیں۔

۴۔۔۔ حضرت حسن بصریؒ سے کہا گیا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما وتر کی دو رکعتوں پر سلام پھیر دیا کرتے تھے۔ فرمایا ان کے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے زیادہ فقیہ تھے۔ وہ دوسری رکعت پر سلام پھیرے بغیر تکبیر کہہ کر اٹھ جایا کرتے تھے۔

۵۔۔۔ حضرت مکحولؒ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ وہ تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ ان کے درمیان سلام کے ساتھ فصل نہیں کرتے تھے۔

۶۔۔۔ زاذان ابو عمر کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی یہی کیا کرتے تھے۔

(ابن ابی شیبہ ص ۲۹۵ ج ۲)

۷۔۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جیسا کہ دن کے وتر یعنی نماز مغرب کی تین رکعتیں ہیں۔

(موطا امام محمد ص ۱۵۰، طحاوی ۱۴۳ ج ۱، عبد الرزاق ص ۱۹ ج ۳، وقال الہیثمی فی الزوائد ص ۲۴۲ ج ۲، اخرجہ.

الطبرانی فی الکبیر در جالہ صحیح)

۸۔ حضرت علقمہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ہمیں بتایا کہ وتر کی کم سے کم تین رکعتیں ہیں۔ (موطاامام محمد ص ۱۵۰)

۹۔ حضرت ابراہیم نخعی " حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت کبھی کافی نہیں ہو سکتی۔ (موطاامام محمد ص ۱۵۰)

۱۰۔ عقبہ بن مسلم کہتے ہیں میں نے ابن عمر رضی اللہ عنہما سے وتر کے بارے میں دریافت کیا (کہ اس کی کتنی رکعتیں ہیں) تو فرمایا کہ تم دن کے وتر کو جانتے ہو؟ میں نے کہا جی ہاں! نماز مغرب۔ فرمایا تم نے ٹھیک کہا اور بہت اچھا جواب دیا (بس اتنی ہی رکعتیں رات کے وتر کی ہیں)۔

۱۱۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہوتی ہیں۔ اور وہ تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔

۱۲۔ ابو منصور کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے وتر کے بارے میں دریافت کیا تو فرمایا تین رکعتیں۔

۱۳۔ حضرت عطا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر (تعداد رکعات میں) نماز مغرب کی طرح ہے۔

۱۴۔ ابو یحییٰ کہتے ہیں کہ حضرت مسور بن مخرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما رات میں گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ سرخ ستارہ طلوع ہو گیا۔ پھر ابن عباس رضی اللہ عنہما سو گئے۔ پھر ان کی آنکھ اس وقت کھلی جب اہل زوراء کی آوازیں آنے لگیں۔ تو اپنے رفقاء سے فرمایا کہ کیا خیال ہے۔ میں سورج طلوع ہونے سے پہلے تین وتر۔ دو رکعتیں سنت فجر کی اور نماز صبح پڑھ سکوں گا؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں! اور یہ فجر کا آخری وقت تھا۔ (طحاوی ص ۱۴۱ ج ۱)

امام طحاوی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ اگر ابن عباس رضی اللہ عنہما کے نزدیک تین رکعت سے کم وتر جائز ہوتے تو ناممکن تھا کہ ایسے تنگ وقت میں، جب کہ نماز فجر کے قضا ہونے کا اندیشہ تھا۔ تین ہی وتر پڑھتے"۔

۱۵۔ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ جُبَيْرٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ الْوِتْرُ سَبْعٌ. اَوْ خَمْسٌ. وَالثَّلَاثُ بُتَيْرَاءُ. وَاِنِّيْ لَاَكْرَهُ بُتَيْرَاً۔ (طحاوی صفحہ ۱۴۱ ج ۱، عبدالرزاق صفحہ ۲۲ ج ۳)

۱۶۔ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ عَائِشَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهَا، كَانَ

الْوِتْرُ سَبْعًا وَخَمْسًا وَالثَّلٰثُ بُتَيْرَاءُ۔ (طحاوی صفحہ ۱۳۹ ج ۱ ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۹۴ ج ۲)

ترجمہ: ۱۵: سعید بن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر کی پانچ یا سات رکعتیں ہونی چاہئیں۔ تین رکعتیں تو دم بریدہ ہیں۔ اور میں دم بریدہ کو پسند نہیں کرتا ۱۶: سعید بن مسیب حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ وتر تو سات اور پانچ تھے۔ تین رکعتیں تو دم بریدہ ہیں۔

دونوں حضرات کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ وتر کی اصل رکعتیں تو تین ہی ہیں۔ مگر یہ اچھی بات نہیں کہ آدمی خالی وتر پڑھ کر فارغ ہو جائے۔ اس سے پہلے دو چار رکعتیں نفل کی نہ پڑھے۔

۱۷۔ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ كَانَ اُبَيُّ بْنُ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يُوتِرُ بِثَلَاثٍ لَا يُسَلِّمُ اِلَّا فِي الثَّالِثَةِ مِثْلَ الْمَغْرِبِ (عبدالرزاق صفحہ ۲۶ ج ۳)

۱۸۔ عَنْ اَبِيْ غَالِبٍ اَنَّ اَبَا اُمَامَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ يُوتِرُ بِثَلَاثٍ۔ (طحاوی صفحہ ۱۴۲ ج ۱ ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۹۴ ج ۲)

۱۹۔ عَنْ اَبِيْ خَالِدَةَ قَالَ سَاَلْتُ اَبَا الْعَالِيَةِ عَنِ الْوِتْرِ فَقَالَ عَلَّمَنَا اَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَوْ عَلَّمُوْنَا اَنَّ الْوِتْرَ مِثْلُ صَلٰوةِ الْمَغْرِبِ غَيْرَ اَنَّا نَقْرَاُ فِي الثَّالِثَةِ۔ فَهٰذَا وِتْرُ اللَّيْلِ وَهٰذَا وِتْرُ النَّهَارِ۔ (طحاوی صفحہ ۱۴۳ ج ۱)

۱۷۔ ترجمہ:۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ تین وتر پڑھا کرتے تھے، دوسری رکعت پر سلام نہیں پھیرتے تھے بلکہ نماز مغرب کی طرح صرف تیسری رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔

۱۸۔ ابو غالب کہتے ہیں کہ حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ تین وتر پڑھا کرتے تھے۔

۱۹۔ ابو خالدہ کہتے ہیں کہ میں نے ابو العالیہؒ سے وتر کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے ہمیں تعلیم دی ہے کہ وتر کی نماز مغرب کی نماز کی طرح پڑھی جاتی ہے۔ ماسوا اس کے کہ ہم اس کی تیسری رکعت میں بھی قرات کرتے ہیں۔ پس یہ رات کا وتر ہے اور مغرب کی نماز دن کا وتر ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک نماز مغرب اور نماز وتر کے درمیان کیفیت ادا میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں تھا کہ مغرب کی تیسری رکعت میں قرات ضروری نہیں اور وتر میں ضروری ہے۔

۲۰۔ عَنِ الْقَاسِمِ قَالَ رَاَیْنَا اُنَاسًا مُنْذُ اَدْرَکْنَا یُوْتِرُوْنَ بِثَلَاثٍ وَاِنَّ کُلًّا لَوَاسِعٌ وَاَرْجُوْ اَنْ لَا یَکُوْنَ بِشَیْءٍ مِنْهُ بَاْسٌ

(صحیح بخاری صفحہ ۱۳۵ ج ۱)

۲۰۔ ترجمہ:۔ قاسم بن محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے لوگوں کو تین ہی وتر پڑھتے دیکھا ہے۔ ویسے سب طرح گنجائش ہے۔ اور مجھے توقع ہے کہ کسی چیز میں بھی کوئی حرج نہیں ہو گا۔

مطلب یہ کہ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہ کو تین ہی وتر پڑھتے دیکھا ہے۔ چونکہ ان کے زمانہ میں بعض حضرات اپنے اجتہاد سے ایک رکعت کے جواز کا بھی فتویٰ دینے لگے تھے۔ اس لئے اختلاف اجتہاد کی بنا پر فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کی اصل سنت تو تین ہی وتر ہے ہاں! جو لوگ ایک رکعت کے جواز کا فتویٰ دیتے ہیں ان کا قول چونکہ اجتہاد پر مبنی ہے اس لئے مواخذہ ان سے بھی نہیں ہو گا۔

۲۱۔ عَنْ عَلْقَمَةَ قَالَ الْوِتْرُ ثَلَاثٌ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۹۴ ج ۲)

۲۲۔ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ وَکَانَ یُقَالُ لَا وِتْرَ اَقَلُّ مِنْ ثَلَاثٍ (ایضاً)

۲۳۔ عَنْ اَبِیْ اِسْحَاقَ قَالَ کَانَ اَصْحَابُ عَلِیٍّ وَاَصْحَابُ عَبْدِ اللّٰهِ لَا یُسَلِّمُوْنَ فِیْ رَکْعَتَیِ الْوِتْرِ۔ (ایضاً صفحہ ۲۹۵)

۲۴۔ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ السَّبْعَةِ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیِّبِ۔ وَعُرْوَةَ بْنِ الزُّبَیْرِ۔ وَالْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ۔ وَاَبِیْ بَکْرِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ۔ وَخَارِجَةَ بْنِ زَیْدٍ۔ وَعُبَیْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ۔ وَسُلَیْمَانَ بْنِ یَسَارٍ۔ فِیْ مَشْیَخَةٍ سِوَاهُمْ اَهْلُ فِقْهٍ وَصَلَاحٍ وَفَضْلٍ۔ وَرُبَمَا اخْتَلَفُوْا فِیْ شَیْءٍ فَاُخِذَ بِقَوْلِ اَکْثَرِهِمْ وَاَفْضَلِهِمْ رَاْیًا فَکَانَ مِمَّا وَعَیْتُ عَنْهُمْ عَلٰی هٰذِهِ الصِّفَةِ اَنَّ الْوِتْرَ ثَلٰثٌ لَا یُسَلِّمُ اِلَّا فِیْ آخِرِهِنَّ۔ (طحاوی صفحہ ۱۴۵ ج ۱)

۲۵۔ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ قَالَ اَثْبَتَ عُمَرُ بْنُ عَبْدِ الْعَزِیْزِ الْوِتْرَ بِقَوْلِ الْفُقَهَاءِ ثَلَاثًا لَا یُسَلِّمُ اِلَّا فِیْ آخِرِهِنَّ۔ (طحاوی صفحہ ۱۴۵ ج ۱)

۲۶۔ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ اَجْمَعَ الْمُسْلِمُوْنَ اَنَّ الْوِتْرَ ثَلَاثٌ لَا یُسَلِّمُ اِلَّا فِیْ آخِرِهِنَّ۔ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۹۴ ج ۲)

۲۱۔۔۔ ترجمہ:۔ حضرت علقمہ" کا ارشاد ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں۔
۲۲۔۔۔ حضرت ابراہیم نخعی" فرماتے ہیں کہ (صحابہ" کے زمانے میں) کہا جاتا تھا کہ تین سے کم وتر نہیں ہوتے۔
۲۳۔۔۔ ابو اسحاق" فرماتے ہیں کہ حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کے اصحاب وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے۔
۲۴۔۔۔ ابو الزناد کہتے ہیں کہ میں نے مدینہ کے سات فقہاء یعنی سعید بن مسیّب، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، ابو بکر بن عبدالرحمٰن، خارجہ بن زید، عبیداللہ بن عبداللہ، سلیمان بن یسار کا زمانہ اور ان کے علاوہ ایسے مشائخ کا زمانہ پایا ہے، جو علم و فضل اور صلاح و تقویٰ میں ممتاز تھے۔ کبھی ان حضرات کا کسی مسئلہ میں اختلاف ہو جاتا تو ان میں سے اکثر و افضل کے قول پر عمل کیا جاتا تھا۔ ان حضرات سے اسی شان کے ساتھ جو مسئلہ میں نے محفوظ کیا وہ یہ تھا کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔
۲۵۔۔۔ ابو الزناد فرماتے ہیں کہ خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز" نے فقہاء کے قول کے مطابق فیصلہ کیا تھا کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔
۲۶۔۔۔ حسن بصری" ارشاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے صرف آخر میں سلام پھیرا جاتا ہے۔

صحابہ کرام" کے آثار، مدینہ طیبہ کے فقہاء سبعہ اور دیگر اکابر تابعین" کے فتویٰ اور خلیفہ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز" کے فیصلے سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کرام" تک اور صحابہ کرام" سے تابعین" عظام" تک تین وتر کی تعلیم، توارث و تعامل کے ساتھ چلی آتی تھی۔ اسی کو امام حسن بصری" "مسلمانوں کے اجماع" سے تعبیر فرما رہے ہیں۔

دوم:۔ یہ کہ بعض روایات کے پیش نظر بعض حضرات صحابہ" و تابعین" ایک رکعت وتر کے بھی قائل تھے۔ ان حضرات فقہاء نے ان روایات کی تحقیق و تفتیش کے بعد فتویٰ دیا (اور ان کے فتویٰ پر حضرت عمر بن عبدالعزیز" نے فیصلہ فرمایا) کہ احادیث طیبہ جمہور صحابہ" کے تعامل کے پیش نظر تین وتر کا قول ہی جادہ مستقیمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے اقوال و آراء مرجوح اور شاذ ہیں۔

مخالف روایات پر ایک نظر

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مبارک اور حضرات صحابہ و تابعین کا تعامل و توارث

معلوم ہو جانے کے بعد ان روایات کی تشریح بھی ضروری ہے جن کی طرف سوال میں یہ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے۔

"حضرت عائشہؓ سے ثابت ہے کہ حضورؐ نے تین پانچ یا سات رکعات وتر پڑھے تو تشہد کے لئے دو رکعات پر نہ بیٹھتے تھے۔ ان ہی سے ایک رکعت وتر بھی ثابت ہے"

اس قسم کی روایات حضرت عائشہ صدیقہؓ۔ حضرت ام سلمہ۔ حضرت ابن عباس۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں، ذیل میں ہر روایت کی تشریح کی جاتی ہے۔

حدیث عائشہؓ

حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ارضاع کو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے "اعلم اهل الارض بوتر رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم۔" فرمایا ہے۔ یعنی روئے زمین پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی سب سے زیادہ عالم۔ (صحیح مسلم ۲۵۶ ج ۱) وتر کے بارے میں حضرت عائشہؓ کی حدیث ان سے متعدد راویوں نے مختلف طرق اور مختلف الفاظ سے نقل کی ہے، بعض حضرات نے ان مختلف الفاظ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی مختلف صورتیں قرار دیا ہے۔ حالانکہ اگر تمام طرق کو جمع کیا جائے تو قدر مشترک یہ نکلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی تین رکعتیں دو قعدوں اور ایک سلام کے ساتھ پڑھتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کی حدیث کی طرق پر غور کیا جاتا ہے۔

روایت سعد بن ہشام

صحیح مسلم ص ۲۵۶ ج ۱ میں سعد بن ہشام انصاری کی روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے عرض کیا۔

اَنْبِئِیْنِیْ عَنْ وِتْرِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَتْ كُنَّا نُعِدُّ لَهُ سِوَاكَهُ وَطَهُوْرَهُ. فَيَبْعَثُهُ اللّٰهُ مَا شَاءَ اَنْ يَبْعَثَهُ مِنَ اللَّيْلِ. فَيَتَسَوَّكُ وَيَتَوَضَّأُ وَيُصَلِّيْ تِسْعَ رَكَعَاتٍ لَا يَجْلِسُ فِيْهَا اِلَّا فِي الثَّامِنَةِ فَيَذْكُرُ اللّٰهَ وَيَحْمَدُهُ وَيَدْعُوْهُ ثُمَّ يَنْهَضُ وَلَا يُسَلِّمُ ثُمَّ يَقُوْمُ فَيُصَلِّي التَّاسِعَةَ ثُمَّ يَقْعُدُ فَيَذْكُرُ اللّٰهَ وَيَحْمَدُهُ

وَيَدْعُوْهُ ثُمَّ يُسَلِّمُ تَسْلِيْمًا يُسْمِعُنَا ثُمَّ يُصَلِّيْ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ مَا يُسَلِّمُ وَهُوَ قَاعِدٌ۔ فَتِلْكَ إِحْدٰى عَشْرَةَ رَكْعَةً يَا بُنَيَّ فَلَمَّا أَسَنَّ نَبِيُّ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَخَذَهُ اللَّحْمُ أَوْتَرَ بِسَبْعٍ وَصَنَعَ فِي الرَّكْعَتَيْنِ مِثْلَ صَنِيْعِهِ فِي الْأَوَّلِ فَتِلْكَ تِسْعٌ يَا بُنَيَّ۔

ترجمہ:۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کے بارے میں بتایئے! فرمایا ہم آپ کے لئے مسواک اور پانی تیار کر رکھتے تھے۔ رات کے کسی حصہ میں اللہ تعالیٰ آپ کو بیدار کرتے تو آپ مسواک کرتے۔ وضو کرتے اور نو رکعتیں پڑھتے۔ ان میں صرف آٹھویں رکعت پر بیٹھتے۔ پس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔ حمد و ثنا کرتے۔ دعائیں مانگتے۔ پھر سلام پھیرے بغیر اٹھ جاتے۔ پھر نویں رکعتیں پر بیٹھتے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے۔ حمد و ثنا کرتے۔ دعا کرتے۔ پھر اس طرح سلام پھیرتے کہ ہمیں سن جاتا۔ پھر سلام کے بعد دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے۔ پس یہ کل گیارہ رکعتیں ہوئیں۔ پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سن رسیدہ ہو گئے اور بدن بھاری ہو گیا تو سات رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔ اور دو رکعتیں اسی طرح پڑھتے تھے۔ جس طرح پہلے پڑھا کرتے تھے۔ پس یہ کل نو رکعتیں ہوئیں۔

اس روایت سے بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ پہلے زمانے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی نو رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور صرف آٹھویں رکعت پر قعدہ فرماتے تھے اور نویں رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔ اور آخری زمانے میں سات وتر پڑھتے تھے۔ ان میں چھٹی رکعت پر بغیر سلام قعدہ کرتے اور ساتویں پر سلام پھیرتے تھے۔

حالانکہ ٹھیک یہی حدیث اسی سند سے نسائی ص ۲۴۸ ج ۱، موطا امام محمد ص ۱۵۱، طحاوی ص ۱۷۳ ج ۱، محلی ابن حزم ص ۴۸ ج ۲، ابن ابی شیبہ ص ۲۹۵ ج ۲، مستدرک حاکم ص ۳۰۴ ج ۱، دار قطنی ص ۱۷۵ ج ۱، بیہقی ص ۳۱ ج ۳ میں بایں الفاظ ہے۔

كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُسَلِّمُ فِيْ رَكْعَتَيِ الْوِتْرِ

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی دو رکعتوں پر سلام نہیں پھیرتے تھے۔

اور مستدرک حاکم ۳۰۴ ج ۱ میں یہی حدیث ان الفاظ سے ہے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ لَا يُسَلِّمُ إِلَّا فِيْ آخِرِهِنَّ۔

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے۔ اور صرف ان کے آخر میں سلام پھیرا کرتے تھے۔

اور مسند احمد (۱۵۶ج ۶) میں سعد بن ہشام کی یہی حدیث ان الفاظ میں ہے۔

إِنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا صَلَّى الْعِشَآءَ دَخَلَ الْمَنْزِلَ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ۔ ثُمَّ صَلَّى بَعْدَهُمَا رَكْعَتَيْنِ أَطْوَلَ مِنْهُمَا۔ ثُمَّ أَوْتَرَ بِثَلَاثٍ لَا يَفْصِلُ بَيْنَهُنَّ ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ وَهُوَ جَالِسٌ۔

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب نماز عشاء سے فارغ ہو کر گھر میں تشریف لاتے تو پہلے دو رکعتیں پڑھتے۔ پھر دو رکعتیں ان سے طویل پڑھتے۔ پھر تین رکعتیں پڑھتے تھے۔ ایسے طور پر کہ ان کے درمیان سلام کا فصل نہیں کرتے تھے۔ پھر بیٹھ کر دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

یہ ایک ہی راوی کی روایت کے مختلف الفاظ ہیں۔ ان تمام طرق والفاظ کو جمع کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ۔

الف:۔ سعد بن ہشام کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کل گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے جن میں وتر اور وتر کے بعد کے دو نفل بھی شامل تھے۔

ب:۔ ہر دو رکعت پر قعدہ کرتے تھے۔

ج:۔ ان میں تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں۔

د:۔ وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ کرتے تھے مگر سلام نہیں پھیرتے تھے۔

ہ:۔ وتر کے بعد بیٹھ کر دو نفل پڑھتے تھے۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ صحیح مسلم میں سعد بن ہشام کی روایت میں جن نو رکعتوں کا ذکر ہے ان میں چھ رکعتیں تہجد کے نوافل تھے۔ اور تین رکعتیں وتر کی۔ مگر روایت میں وتر سے ماقبل ومابعد کے نوافل کو ملا کر ذکر کر دیا گیا جس سے اشکال پیدا ہوا۔ چونکہ ان کا سوال صلوٰۃ اللیل کے بارے میں نہیں بلکہ وتر کے بارے میں تھا۔ اس لئے جواب میں حضرت ام المؤمنین ؓ نے صلوٰۃ اللیل کی رکعات کو تو اجمالاً بیان فرمایا۔ اور ان رکعات میں سے جو رکعات وتر کی تھیں ان کی تفصیل بیان فرمائی کہ آٹھویں رکعت پر جو وتر کی دوسری رکعت تھی۔ قعدہ فرماتے تھے۔ مگر سلام نہیں پھیرتے تھے اور نویں رکعت پر جو وتر کی تیسری رکعت تھی۔ سلام پھیرتے تھے ــــ اسی مضمون کو سعد بن ہشام کی دوسری روایات میں بیان فرمایا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔ پس صحیح مسلم کی روایت میں حضرت ام المومنین کا یہ ارشاد کہ:۔

"نو رکعتیں پڑھتے تھے۔ ان میں نہیں بیٹھتے تھے مگر آٹھویں میں۔ پس ذکر وحمد

اور دعا کے بعد اٹھ جاتے تھے۔ اور سلام نہیں پھیرتے تھے۔ بلکہ نویں رکعت پڑھ کر سلام پھیرتے تھے۔ "

اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان آٹھ رکعتوں میں قعدہ ہوتا ہی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی کی احادیث کے خلاف ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ آٹھویں رکعت پر بغیر سلام کے جو قعدہ فرماتے تھے۔ پہلی رکعتوں میں ایسا قعدہ نہیں فرماتے تھے۔ بلکہ ماقبل کی رکعتوں میں ہر دوگانہ پر سلام پھیرتے تھے۔ مگر چونکہ ساتویں اور آٹھویں رکعت کو نویں رکعت کے ساتھ ملاکر تین وتر پڑھنا مقصود ہوتا تھا اس لئے آٹھویں رکعت پر قعدہ سلام نہیں کرتے تھے۔ بلکہ قعدہ کرنے کے بعد سلام پھیرے بغیر اٹھ جاتے تھے۔ اس تقریر کے بعد سعد بن ہشام کی روایت متفق ہو جاتی ہیں۔ اور ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں رہتا۔ اور ایک ہی راوی کی روایت ایک ہی سند سے مختلف الفاظ میں مروی ہو تو اس کو متعدد واقعات پر محمول کر کے یہ سمجھ لینا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی ایسا کرتے ہوں گے اور کبھی ایسا کرتے ہوں گے۔

صحیح طرز فکر نہیں ہے کیونکہ یہ ایک ہی واقعہ کی مختلف تعبیرات ہیں ایک ہی واقعہ کو جب نقل کرنے والے مختلف الفاظ اور مختلف انداز میں نقل کریں تو وہ متعدد واقعات نہیں بن جاتے۔

روایت عروہ عن عائشہؓ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وتر کی نماز نقل کرنے والوں میں سے ایک ان کے خواہرزادہ حضرت عروہ بن زبیرؓ ہیں حضرت عائشہؓ سے ان کی روایت بھی مختلف الفاظ سے مروی ہے۔ ایک روایت میں ہے

يُصَلِّي بِاللَّيْلِ إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً يُوتِرُ مِنْهَا بِوَاحِدَةٍ فَإِذَا فَرَغَ مِنْهَا اضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْأَيْمَنِ حَتّٰى يَأْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ فَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ خَفِيفَتَيْنِ (صحیح مسلم صفحہ ۲۵۴ ج ۱)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ ان میں سے ایک رکعت سے وتر کیا کرتے تھے۔ اس سے فارغ ہوتے تو داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے یہاں تک مؤذن آپؐ کے پاس آتا۔ تو دو

ہلکی پھلکی رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ دوسری روایت میں ہے۔

يُصَلِّي فِيْمَا اَنْ يَفْرُغَ مِنْ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ اِلَى الْفَجْرِ اِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً۔ يُسَلِّمُ بَيْنَ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ وَيُوْتِرُ بِوَاحِدَةٍ فَاِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُ مِنْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَجَاءَهُ وَتَبَيَّنَ لَهُ الْفَجْرُ —— قَامَ فَرَكَعَ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ ثُمَّ اِضْطَجَعَ عَلٰى شِقِّهِ الْاَيْمَنِ حَتّٰى يَاْتِيَهُ الْمُؤَذِّنُ لِلْاِقَامَةِ۔ (صحیح مسلم صفحہ ۲۵۴ جلد ۱)

ترجمہ:۔ آپؐ نماز عشاء سے فارغ ہونے سے لے کر فجر تک گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ ہر دو رکعت کے درمیان سلام پھیرتے اور ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھتے۔ پھر جب مؤذن اذان فجر سے فارغ ہو کر آپ کے پاس آتا۔ اور صبح روشن ہو جاتی تو دو ہلکی سی رکعتیں پڑھتے۔ پھر داہنی کروٹ پر لیٹ جاتے۔ یہاں تک کہ مؤذن اقامت کے لئے آپؐ کے پاس آتا۔

تیسری روایت میں ہے:۔

كَانَ يُصَلِّي بِاللَّيْلِ ثَلٰثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً ثُمَّ يُصَلِّي اِذَا سَمِعَ النِّدَاءَ رَكْعَتَيْنِ خَفِيْفَتَيْنِ۔ (طحاوی صفحہ ۱۳۸ ج ۱)

ترجمہ:۔ رات میں تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ پھر جب فجر کی اذان سنتے تو دو ہلکی سی رکعتیں پڑھتے۔

چوتھی روایت میں ہے۔

يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ ثَلٰثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً يُوْتِرُ مِنْ ذٰلِكَ بِخَمْسٍ وَلَا يَجْلِسُ فِيْ شَيْءٍ اِلَّا فِيْ آخِرِهَا۔ (صحیح مسلم صفحہ ۲۵۴ ج ۱)

ترجمہ:۔ رات میں تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ ان میں سے پانچ کے ساتھ وتر پڑھتے۔ اور ان پانچ میں نہیں بیٹھتے تھے مگر ان کے آخر میں۔

اور پانچویں روایت میں ہے۔

كَانَ يُصَلِّي ثَلَاثَ عَشْرَةَ رَكْعَةً بِرَكْعَتَيِ الْفَجْرِ۔ (صحیح مسلم صفحہ ۲۵۴ ج ۱)

اَلْوِتْرُ ثَلَاثٌ لَا يُفْصَلُ بَيْنَهُنَّ بِسَلَامٍ۔

ترجمہ:۔ آپ سنت فجر سمیت تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔

حضرت عروہؒ کی ان روایات میں بظاہر تعارض نظر آتا ہے۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری احادیث سے بھی متعارض نظر آتی ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک نہ یہ روایات متعارض ہیں۔ اور نہ متعدد واقعات پر محمول ہیں۔ بلکہ ایک ہی واقعہ کے مختلف تعبیرات ہیں۔

چنانچہ جس روایت میں فرمایا گیا ہے کہ گیارہ رکعتیں پڑھتے تھے۔ اور ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔ اور ایک رکعت سے وتر کیا کرتے تھے۔ اس میں دو حکم الگ الگ ذکر کئے گئے ہیں۔ ایک ہر دو رکعت پر بیٹھنا۔ اور دوسرے ایک رکعت کو ماقبل کے دوگانہ کے ساتھ ملا کر وتر بنانا۔ پہلا حکم وتر سے قبل کی آٹھ رکعتوں سے متعلق ہے اور دوسرا حکم وتر کی تین رکعات سے متعلق ہے، پس روایت کا یہ مطلب نہیں کہ وتر کی تنہا ایک رکعت پڑھتے تھے۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ گیارہویں رکعت کو ماقبل کے دوگانہ سے ملا کر وتر بناتے تھے۔ اگر کسی شخص نے ایک وتر کا نظریہ پہلے سے ذہن میں نہ جما رکھا ہو تو ہم نے اس روایت کا جو مطلب بیان کیا وہ روایت کے سیاق و سباق سے بالکل واضح ہے۔ جس پر دو صاف اور صریح قرینے موجود ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی متواتر روایات میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے۔ اور خود عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول پہلے گزر چکا ہے کہ صرف تین رکعت وتر نہیں ہونے چاہئیں۔ بلکہ اس سے قبل دو یا چار رکعتیں ضرور پڑھنی چاہئیں۔ الغرض جب حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعدد حضرات کی صحیح روایات موجود ہیں کہ آپ تین وتر پڑھا کرتے تھے تو حضرت عروہ کی روایت کو بھی اسی پر محمول کرنا لازم ہوگا۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ خود حضرت عروہؒ کا فتویٰ فقہائے سبعہ کے فتویٰ میں گزر چکا ہے۔

اَلْوِتْرُ ثَلَاثٌ لَا يُفْصَلُ بَيْنَهُنَّ بِسَلَامٍ۔

ترجمہ:۔ وتر کی تین رکعتیں ہیں جن کے درمیان سلام کے ساتھ فصل نہیں کیا جاتا۔

اب اگر ان کی روایت "یوتر بواحدۃ" کا مطلب یہ ہوتا کہ تنہا ایک وتر پڑھتے تھے تو ان کا فتویٰ قطعاً یہ نہ ہوتا، پس ان کی روایت کا صحیح مطلب وہی ہوگا۔ جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باقی احادیث کے بھی مطابق ہے۔ اور خود حضرت عروہؒ کے اپنے فتویٰ کے بھی موافق ہے۔

اور جس روایت میں یہ ہے کہ "پانچ رکعت وتر پڑھتے تھے. ان کے صرف آخر میں بیٹھتے تھے" ــــ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان پانچ رکعتوں میں نہ تو قعدہ کرتے تھے۔ اور نہ سلام پھیرتے تھے۔ کیونکہ یہ مطلب خود حضرت عروہ ہی کی گزشتہ روایت کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیرتے تھے۔ اور ایک ہی راوی کی ایک ہی سند سے روایت شدہ حدیث کو الگ الگ واقعات پر محمول کرنا قطعاً غیر موزوں ہے۔ بلکہ اس کا صحیح مطلب. جو حضرت عائشہ کی احادیث اور خود حضرت عروہ کی روایت اور فتویٰ کے مطابق ہے ــــ یہ ہے کہ صلوٰۃ اللیل کی کل تیرہ رکعتیں ہوتی تھیں۔ ان میں سے چھ رکعتوں کے درمیان تو وقفہ فرماتے تھے۔ لیکن پانچ رکعتیں ایک ساتھ پڑھتے تھے، پہلے دو نفل اور پھر تین وتر۔ ان کے درمیان وقفہ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ یہ پانچ رکعتیں پڑھ کر بیٹھتے تھے۔ الغرض اس روایت میں وتر سے پہلے کی دو رکعتوں پر سلام پھیرنے کی نفی نہیں۔ نہ وتر کے پہلے قعدہ کی نفی ہے۔ بلکہ ان پانچ رکعتوں کی موالات کو بیان کرنا منظور ہے کہ ان کے درمیان وقفہ نہیں فرماتے تھے۔ بلفظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ اس روایت میں جلوس فی الصلوٰۃ کی نفی نہیں۔ بلکہ جلوس بعد السلام کی نفی ہے۔ اور اس کی نظیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے۔ کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہر و عصر اور مغرب و عشا کے جمع کرنے کو یوں تعبیر فرمایا۔

صَلَّيْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثَمَانِيًا جَمِيْعًا وَسَبْعًا جَمِيْعًا۔ (صحیح مسلم صفحہ ۲۴۶ جلد ۱)

ترجمہ:۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آٹھ رکعتیں اکٹھی اور سات رکعتیں اکٹھی پڑھی ہیں۔

اب اس کا مطلب کوئی عاقل یہ نہیں سمجھے گا کہ ظہر و عصر کی آٹھ رکعتیں اور مغرب و عشاء کی سات رکعتیں ایک ہی سلام اور ایک ہی قعدہ کے ساتھ پڑھی ہوں گی۔ بلکہ مقصود یہ ہے کہ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں میں ایسا وقفہ نہیں فرمایا جو عام طور پر ہوتا ہے۔ اسی طرح زیر بحث

روایت کا مطلب سمجھنا چاہئے کہ یہاں پانچ رکعتوں میں وقفہ جلوس کی نفی ہے۔ سلام یا قعدہ کی نفی نہیں۔

ابن ابی شیبہ ص ۲۹۱ ج ۲ میں عروہؒ کی روایت میں ہے:

كَانَ يُوْتِرُ بِرَكْعَةٍ وَكَانَ يَتَكَلَّمُ بَيْنَ الرَّكْعَتَيْنِ وَالرَّكْعَةِ.

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک رکعت کے ساتھ دو وتر پڑھتے تھے اور دو رکعتوں اور ایک رکعت کے درمیان کلام فرماتے تھے۔

اس روایت میں "یوتر برکعتہ" کا مطلب تو وہی ہے جو اوپر ذکر کر چکا ہوں۔ یعنی گیارہویں رکعت کو ماقبل کی دو رکعتوں کے ساتھ ملا کر تین وتر پڑھتے تھے۔ اور دو رکعتوں اور ایک رکعت کے درمیان جو کلام کرنے کا ذکر ہے اس سے مراد بعد کی دو رکعتیں ہیں۔ جیساکہ دیگر روایات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول مروی ہے کہ وتر کے بعد دو رکعتیں پڑھتے تھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ابو سلمہ بن عبدالرحمٰن۔ عمرۃ بنت عبدالرحمٰن۔ عبداللہ بن ابی قیس اور عبدالعزیز بن جریج بھی وتر کی حدیث نقل کرتے ہیں۔ اور ان میں تین وتر کی صراحت موجود ہے۔ اسود بن قیس مسروق بن اجدع اور یحییٰ بن جزار بھی روایت کرتے ہیں. ان کی روایات میں تین وتر کی اگرچہ صراحت نہیں لیکن ان روایات کو دوسری روایات کے ساتھ ملا کر پڑھا جائے تو تین ہی وتر نکلیں گے۔ الغرض حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ جو باتفاق اہل علم. آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی سب سے زیادہ عالم ہیں. ان کی تمام روایات کو جمع کیا جائے تو میزان تین ہی وتر نکلتی ہے۔ اور سعد بن ہشام اور عروہ بن زبیر کی جن ایک دو روایتوں سے اس کے خلاف کا وہم ہوتا ہے ان کا صحیح اوپر عرض کیا جا چکا ہے۔

یہاں اس امر پر بھی تنبیہ کرنا ضروری ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز تہجد۔ (صلوٰۃ اللیل) کی رکعات میں تو کمی بیشی ہو جاتی تھی مگر تین وتر میں کوئی تغیر نہیں ہوتا تھا۔ اس کو بھی حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا نے واضح فرمادیا ہے۔ چنانچہ سعد بن ہشام. مسروق بن اجدع اور یحییٰ بن جزار کی روایت میں کبر سنی سے پہلے اور بعد کی نماز کا فرق بیان فرمایا گیا ہے۔ مگر وتر دونوں جگہ تین ہیں اور عبداللہ بن ابی قیس کی روایت میں ہے۔

بِأَرْبَعٍ وَثَلَاثٍ. وَسِتٍّ وَثَلَاثٍ وَثَمَانٍ وَثَلَاثٍ. (ابوداؤد صفحہ ۱۹۳، ج ۱، طحاوی صفحہ ۱۳۹ ج ۱)

ترجمہ:۔ چار اور تین، چھ اور تین اور آٹھ اور تین۔
یعنی تہجد کی رکعتیں کبھی چار، کبھی چھ، اور کبھی آٹھ ہوتی تھیں۔ مگر وتر بہرصورت تین رہتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر کی رکعات میں بھی کوئی تغیر ہوتا تو ام المومنین رضی اللہ عنہا اسے بھی ضرور بیان فرماتیں۔ خصوصاً جب کہ عبداللہ بن ابی قیس کا سوال وتر کے بارے میں تھا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

سَأَلْتُ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا بِكَمْ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ۔

ترجمہ:۔ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی کتنی رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔
اگر وتر کے بارے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت مختلف ہوتی تو اس موقعہ پر ام المومنین رضی اللہ عنہا اس کا اظہار ضرور فرماتیں۔ رکعات تہجد میں کمی بیشی کو بیان کرنا اور وتر کی رکعات کو بہرصورت تین بیان کرنا اس امر کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول تین رکعات وتر تھا۔ اور اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں ہوتی تھی۔

وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ۔

حدیث ابن عباسؓ

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے ایک رات اپنی خالہ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں اسی مقصد کے لئے قیام کیا تھا کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام لیل کا مشاہدہ کریں۔ ان کی یہ روایت بھی مختلف طرق اور مختلف الفاظ میں مروی ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں۔

وَالْحَاصِلُ اَنَّ قِصَّةَ مَبِيْتِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا يَغْلِبُ عَلَى الظَّنِّ عَدَمُ تَعَدُّدِهَا ۔ فَلِهٰذَا يَنْبَغِي الْاِعْتِنَاءُ بِالْجَمْعِ بَيْنَ مُخْتَلِفِ الرِّوَايَاتِ فِيْهَا وَلَا شَكَّ اَنَّ الْاَخْذَ بِمَا اتُّفِقَ عَلَيْهِ الْاَكْثَرُ وَالْاَحْفَظُ اَوْلٰى مِمَّا خَالَفَهُمْ فِيْهِ مَنْ هُوَ دُوْنَهُمْ وَلَا سِيَّمَا اِنْ زَادَ اَوْ نَقَصَ۔ (فتح الباری صفحہ ۳۸۸ ج ۲ مطبعہ مصر)

ترجمہ:۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے کاشانہ نبوت میں رات گزارنے کا واقعہ غالب خیال یہ ہے کہ ایک ہی بار کا ہے۔ اس لئے اس سلسلہ میں جو مختلف روایات وارد ہیں ان کو جمع کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے اور کوئی شک نہیں کہ جس حصہ پر اکثر اور احفظ متفق ہوں وہ اولیٰ ہوگا۔ بہ نسبت ان راویوں کے جو ان سے فروتر ہوں۔ خصوصاً جہاں کمی یا زیادتی ہو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کے متعدد راوی تین وتر کی تصریح کرتے ہیں مثلاً:

۱۔۔۔ ابن عباسؓ کے صاحبزادے علی بن عبداللہ کی روایت میں ہے۔

ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ (صحیح مسلم صفحہ ۲۶۱ ج ۱، نسائی صفحہ ۲۴۹ ج ۱، طحاوی صفحہ ۱۴۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ پھر آپ نے تین وتر پڑھے

۲۔۔۔ یحیٰ بن الجزار کی روایت میں ہے۔

كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ ثَمَانِ رَكْعَاتٍ وَيُوْتِرُ بِثَلَاثٍ وَيُصَلِّي رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ صَلٰوةِ الْفَجْرِ (نسائی صفحہ ۲۴۹ ج ۱، طحاوی صفحہ ۱۴۰)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں آٹھ رکعتیں پڑھتے۔ تین وتر پڑھتے تھے۔ اور دو رکعتیں نماز فجر سے پہلے پڑھتے تھے۔

۳۔۔۔ کریب مولی ابن عباسؓ کی روایت میں ہے:۔

فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَكْعَتَيْنِ بَعْدَ الْعِشَاءِ ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ۔ ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ۔ ثُمَّ اَوْتَرَ بِثَلَاثٍ۔ (طحاوی صفحہ ۱۴۱ ج ۱)

ترجمہ:۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عشا کے بعد دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر دو رکعتیں۔ پھر دو رکعتیں، پھر دو رکعتیں، پھر تین وتر پڑھے۔

اور صحیحین میں کریب کی روایت سے ہے۔

فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ اَوْتَرَ۔ (بخاری صفحہ ۱۳۵ ج ۱، مسلم صفحہ ۲۶۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ پس آپ نے دو رکعتیں پڑھیں، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر دو، پھر وتر پڑھے۔

چونکہ علی بن عبداللہ۔ یحیٰ بن جزار اور خود کریب کی مذکورہ روایت میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اس رات آپ نے تین وتر پڑھے تھے۔ اس لئے صحیحین کی روایت میں جو چھ مرتبہ دو دو

رکعت کاذکر کرنے کے بعد "ثم اوتر" آتا ہے اس کا یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ آپؐ نے قبل کے دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت ملا کر تین وتر پڑھے۔ جیسا کہ اوپر عروہ عن عائشہؓ کی روایت میں اس کی تقریر گزر چکی ہے۔ خود حافظؒ نے بھی فتح الباری ص ۳۸۸ ج ۲ میں یحییٰ بن جزار کی روایت کو ناطق قرار دے کر اس کے حوالے سے صحیحین کی اس روایت میں تاویل کی ہے۔

الغرض جب ابن عباس رضی اللہ عنہما کے متعدد راوی اس پر متفق ہیں کہ آپؐ نے اس رات تین وتر پڑھے تھے۔ اور خود کریبؒ کی ایک روایت میں بھی اس کی صراحت موجود ہے تو کریبؒ کی وہ روایت جس میں دونوں احتمال نکل سکتے ہیں۔ اس کو بھی اس پر محمول کرنا لازم ہو گا کہ آپ نے ایک رکعت ماقبل کے دوگانہ سے ملا کر تین وتر پڑھے۔ اسے ایک وتر پر محمول کرنا کسی صورت میں بھی درست نہیں۔

کریبؒ کی زیر بحث روایت کے مماثل ایک روایت صحیح مسلم ص ۲۶۲ ج ۱، اور ابو داؤد ص ۱۹۳ ج ۱ میں حضرت زید بن خالد جہنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جس میں چھ مرتبہ دو دو رکعتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے۔ "ثم اوتر" جو مطلب اوپر کریبؒ کی روایت کا بیان گیا ہے وہی مفہوم اس کا بھی ہے۔ یعنی تیرھویں رکعت آپؐ نے ماقبل کے دوگانہ کے ساتھ ملا کر پڑھی۔ اور اس کا قرینہ طحاوی ص ۱۴۲ ج ۱ کی روایت ہے۔ اس میں پانچ مرتبہ دو دو رکعتوں کا ذکر کر کے فرمایا گیا ہے۔ "ثم اوتر" (پھر آپ نے وتر پڑھے) گویا طحاوی کی روایت میں آخری دو رکعتوں کو تیسری رکعت کے ساتھ ملا کر وتر میں شامل کر دیا گیا۔ اور مسلم اور ابو داؤد کی روایت میں وتر کی تین رکعتوں میں سے دو کو الگ اور ایک کو الگ ذکر کر دیا گیا، بس یہ محض تعبیر کا اختلاف ہے۔ نفس واقعہ بہر صورت ایک ہے اور وہ ہے تین وتر۔

حضرت ابن عباسؓ سے سعید بن جبیر کی روایت میں ہے۔

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوْتِرُ بِثَلَاثٍ الخ

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھا کرتے تھے۔

یہ پوری حدیث اوپر احادیث کے ضمن میں نمبر ۱۱ پر باحوالہ ذکر کر چکا ہوں۔ اور وہاں یہ بھی ذکر کر چکا ہوں کہ اس مضمون کی متواتر احادیث دس سے زائد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم سے مروی ہیں۔

اور صحیح بخاری ص ۹۷ ج ۱ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سعید بن جبیر کی روایت ہے۔

فَصَلّٰی اَرْبَعَ رَکَعَاتٍ ثُمَّ قَامَ فَجِئْتُ فَقُمْتُ عَنْ یَسَارِہٖ۔ فَجَعَلَنِیْ عَنْ یَمِیْنِہٖ فَصَلّٰی خَمْسَ رَکَعَاتٍ ثُمَّ صَلّٰی رَکْعَتَیْنِ۔

ترجمہ:۔ آپ نے چار رکعات پڑھیں پھر سو گئے پھر اٹھے۔ میں آکر آپ کی بائیں جانب کھڑا گیا۔ آپؐ نے مجھے دائیں جانب کرلیا۔ پس آپ نے پانچ رکعتیں پڑھیں پھر دو رکعتیں (سنت فجر) پڑھیں۔

اس روایت میں کوئی شخص نہیں کہے گا کہ آپ نے پہلی چار رکعتیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ پڑھی ہوں گی۔ اسی طرح آخری پانچ رکعات کے بارے میں نہیں کہا جائے گا کہ انہیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ ادا فرمایا تھا۔ بلکہ سعید بن جبیر کی گذشتہ بالا روایت کے پیش نظر ہر شخص اس کا یہی مطلب سمجھے گا کہ دو رکعتیں الگ پڑھیں اور تین رکعتیں (وتر) الگ ___ راوی کا مقصود یہ نہیں کہ ان پانچ رکعتوں میں نہ قعدہ تھا نہ سلام. بلکہ مقصود ان پانچ رکعتوں کی موالات کو بیان کرنا ہے۔ یعنی جس طرح پہلی چار رکعتیں لگاتار پڑھی تھیں ان کے درمیان وقفہ نہیں فرمایا تھا اسی طرح یہ پانچ رکعتیں بھی لگاتار بغیر وقفہ کے پڑھی تھیں۔ اور اسی مضمون کو ابو داؤد ص ۱۹۲ ج ا کی روایات میں یوں تعبیر کیا ہے۔

ثُمَّ اَوْتَرَ بِخَمْسٍ لَمْ یَجْلِسْ بَیْنَھُنَّ۔

ترجمہ:۔ پھر آپ نے وتر پڑھے پانچ رکعتوں کے ساتھ ان کے درمیان میں نہیں بیٹھے۔

مطلب یہ کہ پہلے دو رکعتیں پڑھیں۔ پھر تین وتر۔ اور ان کے درمیان وقفہ نہیں فرمایا۔ چونکہ یہ پانچ رکعتیں بغیر وقفہ کے تھیں اس لئے مجموعہ پر وتر کا اطلاق کر دیا گیا اور وتر کے ساتھ کے نوافل پر "وتر" کا اطلاق بکثرت ہوا ہے۔

خلاصہ یہ کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے قصہ کی تمام روایات کو جمع کیا جائے تو ان میں سے متعدد روایات میں تین وتر کی تصریح ہے۔ اور باقی روایات اس کے لئے محتمل ہیں۔ اس لئے ان روایات کو بھی تین ہی وتر پر محمول کیا جائے گا۔ ان کو الگ الگ واقعات پر محمول کر کے وتر کی مختلف صورتیں قرار دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ بلکہ جیسا کہ حافظؒ کے حوالے سے نقل کر چکا ہوں۔ یہ ایک ہی واقعہ کی مختلف تعبیرات ہیں اور ایک ہی واقعہ کو اگر راوی مختلف عنوانات اور مختلف تعبیرات سے بیان کریں تو اس سے کئی واقعات نہیں بن جایا کرتے اور نہ مختلف تعبیرات سے جواز وتر کی مختلف صورتیں پیدا ہو سکتی ہیں۔ خصوصاً جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا

فتویٰ اوپر نقل کر چکا ہوں صرف تین وتر پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس کے ساتھ دو چار نوافل ضرور پڑھنے چاہئیں۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک وتر کی تین ہی رکعتیں ہیں۔ اور انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی کا مشاہدہ کیا تھا۔

حدیث ام سلمہ رضی اللہ عنہا

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ عنہا سے یحییٰ بن جزار کی روایت ہے:۔

كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ إِحْدٰى عَشَرَةَ رَكْعَةً فَلَمَّا كَبُرَ وَضَعُفَ أَوْتَرَ بِسَبْعٍ (نسائی صفحہ ۲۵۱ ج ۱، ترمذی صفحہ ۶۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات کو گیارہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ مگر جب کبر سنی کی وجہ سے ضعف ہو گیا تو سات رکعتیں پڑھنے لگے۔

یہ حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث کے مطابق ہے۔ اور یحییٰ بن جزار کی حدیث میں یہ تصریح گزر چکی ہے کہ ان میں آٹھ رکعتیں نوافل کی اور تین وتر کی ہوتی تھیں۔ مگر مجموعہ صلوٰۃ اللیل کو لفظ "وتر" سے تعبیر کر دیا گیا۔ جیسا کہ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کے ذیل میں اسحاق بن ابراہیم سے اس کی تصریح نقل کی ہے۔

إِنَّمَا مَعْنَاهُ أَنَّهُ كَانَ يُصَلِّي مِنَ اللَّيْلِ ثَلَاثَ عَشَرَةَ رَكْعَةً مَعَ الْوِتْرِ فَنُسِبَتْ صَلٰوةُ اللَّيْلِ إِلَى الْوِتْرِ (ترمذی صفحہ ۶۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رات میں وتر سمیت تیرہ رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ اس لئے صلوٰۃ اللیل کی نسبت وتر کی طرف بھی کر دی گئی ہے۔

اور نسائی میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی روایت مقسم سے جو مروی ہے کہ:

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُوتِرُ بِخَمْسٍ وَسَبْعٍ لَا يَفْصِلُ بَيْنَهُمَا بِسَلَامٍ وَلَا كَلَامٍ (صفحہ ۲۴۹ ج ۱)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچ اور سات رکعات کے ساتھ وتر پڑھتے تھے۔ ان کے درمیان سلام و کلام کا فصل نہیں فرماتے تھے۔

اول تو اس کی سند مضطرب ہے۔ جیسا کہ امام نسائی نے اس کی تفصیل ذکر کی ہے کہ کبھی مقسم

اسے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں۔ کبھی ابن عباسؓ کا واسطہ ذکر کرتے ہیں۔ اور کبھی حضرت عائشہ اور حضرت میمونہ رضی اللہ عنہما سے یہ قول منسوب کرتے ہیں۔

اَلْوِتْرُ سَبْعٌ فَلَا اَقَلَّ مِنْ خَمْسٍ۔

ترجمہ:۔ وتر سات ہونے چاہئیں ورنہ پانچ سے کم نہیں۔

ایسی مضطرب روایت، متواتر روایات کے مقابلہ میں حجت نہیں ہو سکتی، بلکہ اگر اس کو صحیح کہنا ہو تو خود اس میں تاویل کی جائے گی کہ ان پانچ یا سات رکعتوں میں بلند آواز سے سلام نہیں کہتے تھے۔ نہ کسی سے گفتگو فرماتے تھے۔ آخری رکعت سے فارغ ہو کر اس قدر بلند آواز سے سلام کہتے تھے کہ گویا گھر والے جاگ پڑیں گے۔ یہ مضمون حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں صراحت سے آیا ہے اس لئے اس کو بھی اسی پر محمول کیا جائے گا۔

حدیث ابن عمرؓ

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا:

اِنَّ رَجُلًا سَأَلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنْ صَلٰوةِ اللَّيْلِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلٰوةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى. فَاِذَا خَشِيَ اَحَدُكُمُ الصُّبْحَ صَلّٰى رَكْعَةً وَّاحِدَةً تُوْتِرُ لَهٗ مَا قَدْ صَلّٰى (بخاری صفحہ ۱۳۶ ج ۱، مسلم صفحہ ۲۵۷ ج ۱)

ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے صلوٰۃ اللیل کے بارے میں دریافت کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رات کی نماز دو دو رکعت ہوتی ہے۔ پھر جب تم میں سے ایک کا صبح کا اندیشہ ہو جائے تو ایک رکعت پڑھ لے وہ اس کی پڑھی ہوئی نماز کو وتر بنا دے گی۔

اور صحیح مسلم ص ۲۵۷ ج ۱ میں روایت ابی مجلز ابن عباس و ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً مروی ہے۔

اَلْوِتْرُ رَكْعَةٌ مِّنْ آخِرِ اللَّيْلِ۔

ترجمہ:۔ وتر ایک رکعت ہے۔ رات کے آخری حصہ میں۔

صحیح مسلم کی یہ روایت مستقل حدیث نہیں بلکہ گزشتہ بالا حدیث کا اختصار ہے۔ چنانچہ ابن ماجہ ص ۸۳ پر یہ روایت یوں ہے۔

صَلٰوۃُ اللَّیۡلِ مَثۡنیٰ مَثۡنیٰ وَالۡوِتۡرُ رَکۡعَۃٌ قَبۡلَ الصُّبۡحِ۔

ترجمہ:۔ رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ اور وتر ایک رکعت ہے صبح سے پہلے۔

بعض حضرات کو خیال ہوا ہے کہ یہ حدیث ایک وتر کے جواز پر نص صریح اور برہان قاطع ہے مگر یہ خیال صحیح نہیں۔ حق تعالیٰ شانہ، حافظ ابن حجرؒ کو جزائے خیر عطا فرمائیں کہ وہ فتح الباری میں ہمیں اس کے جواب سے سبکدوش کر گئے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

وَتُعُقِّبَ بِاَنَّہٗ لَیۡسَ صَرِیۡحًا فِی الۡفَصۡلِ۔ فَیَحۡتَمِلُ اَنۡ یُّرِیۡدَ بِقَوۡلِہٖ " صَلّٰی رَکۡعَۃً وَّاحِدَۃً اَیۡ مُضَافَۃً اِلٰی رَکۡعَتَیۡنِ مِمَّا مَضٰی (فتح الباری صفحہ ۳۸۵ ج ۲)

ترجمہ:۔ یہ حدیث ایک رکعت کے الگ پڑھنے میں صریح نہیں۔ کیونکہ احتمال ہے کہ آپؐ کی مراد یہ ہو کہ گزشتہ دو رکعتوں کے ساتھ ایک اور رکعت ملا کر تین وتر پڑھے۔

شرح اس کی یہ ہے کہ وتر (طاق) ہونا آخری رکعت پر موقوف ہے، جس کے ذریعہ نمازی اپنی نماز کو وتر (طاق) بنائے گا۔ اس کے بغیر خواہ ساری رات بھی نماز پڑھتا رہے، اس کی نماز وتر نہیں بن سکتی۔ اور نہ اس کے بغیر وتر کا وجود متحقق ہو سکتا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے فرمایا گیا۔

اَلۡوِتۡرُ رَکۡعَۃٌ مِّنۡ اٰخِرِ اللَّیۡلِ۔

ترجمہ:۔ وتر ایک رکعت ہے رات کے آخری حصہ میں۔

اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ حج کے بارے میں فرمایا گیا۔

حج عرفہ کا نام ہے۔ (جامع صغیر ص ۱۵۱ ج ۱ بحوالہ سنن اربعہ و مسند احمد وغیرہ)

جس کا مطلب یہ ہے کہ وقوف عرفات کے بغیر حج کی حقیقت متحقق نہیں ہوتی۔ لیکن کوئی عاقل اس کا یہ مطلب نہیں لے گا کہ حج کی پوری حقیقت بس وقوف عرفہ ہے۔ اس کے لئے نہ احرام کی ضرورت نہ دوسرے مناسک کی۔

اس طرح "الوتر رکعتہ من آخر اللیل" کا مطلب یہ ہے کہ ماقبل کی نماز کے ساتھ جب تک ایک رکعت کو نہ ملایا جائے وتر کی حقیقت متحقق نہیں ہوگی۔ یہ مطلب نہیں کہ پوری حقیقت ہی بس ایک رکعت ہے۔ اسی کو یوں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

صَلٰوۃُ اللَّیۡلِ مَثۡنیٰ مَثۡنیٰ فَاِذَا خَشِیَ اَحَدُکُمُ الصُّبۡحَ صَلّٰی رَکۡعَۃً وَّاحِدَۃً تُوۡتِرُ لَہٗ مَا قَدۡ صَلّٰی۔

ترجمہ:۔ رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ پس جب تم میں سے کسی کو صبح طلوع کا اندیشہ لاحق ہو جائے تو ایک رکعت اور پڑھ لے جو اس کی پڑھی ہوئی نماز کو وتر بنا دے گی۔

اس کا واضح مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ دو دو رکعت پڑھتا جائے۔ جب صبح کے طلوع کا اندیشہ ہو تو آخری دوگانہ کے ساتھ ایک رکعت اور ملا لے۔ جس سے اس کی نماز وتر بن جائے گی۔ جہاں تک نماز وتر کی پوری حقیقت کا تعلق ہے وہ ابن عمر رضی اللہ عنہما ہی کی حدیث میں یوں بیان فرمائی گئی ہے۔

صَلٰوۃُ الْمَغْرِبِ وِتْرُ النَّهَارِ فَاَوْتِرُوْا صَلٰوۃَ اللَّيْلِ۔

ترجمہ:۔ مغرب کی نماز دن کے وتر ہیں۔ پس رات کی نماز کو وتر بنایا کرو۔

یہ حدیث پہلے باحوالہ گزر چکی ہے۔ اور میں وہاں بتا چکا ہوں کہ شارع علیہ السلام کے ذہن میں نماز کا وتر کا ٹھیک وہی تصور ہے جو نماز مغرب کا ہے۔

اور پھر اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث خطبہ کے دوران بر سر ممبر ارشاد فرمائی تھی۔ جیسا کہ صحیح بخاری ص ۶۸ ج ا "باب الحلق والجلوس فی المسجد" میں اس کی تصریح ہے۔ اس کے باوجود جمہور صحابہ تین سے کم وتر کے قائل نہیں تھے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کا یہ مطلب ہوتا کہ وتر کی بس ایک ہی رکعت ہوتی ہے یا ایک رکعت وتر بھی جائز ہے تو ان تمام اکابر صحابہؓ کو غلط فہمی نہیں ہو سکتی تھی، سامعین میں سے دو چار اگر مطلب نہ سمجھیں تو جائے تعجب نہیں، لیکن جماہیر صحابہ کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ انہوں نے مطلب نہیں سمجھا ہو گا یا انہیں یہ حدیث نہیں پہنچی ہو گی قطعاً صحیح نہیں اس سے اس یقین میں اضافہ ہوتا ہے کہ ارشاد نبویؐ کا منشا وہی ہے جو اکابر صحابہؓ نے سمجھا۔

اور یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ خود راوی حدیث ابن عمر رضی اللہ عنہما بھی تین ہی وتر کے قائل تھے۔ چنانچہ احادیث میں نمبر ۱۲ پر ان کی حدیث نقل کر چکا ہوں۔ اور ارشادات نبویہؐ نمبر ۲ پر بھی ان کی مرفوع روایت گزر چکی ہے۔ جسے امام مالکؒ نے مؤطا (الامر بالوتر ص ۴۴) میں موقوفاً نقل کیا ہے۔

اِنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا كَانَ يَقُوْلُ
صَلٰوۃُ الْمَغْرِبِ وِتْرُ النَّهَارِ۔

ترجمہ:۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے کہ نماز مغرب دن کے وتر ہیں۔

حدیث ابی ایوب انصاریؓ

نسائی ص ۲۴۹ ج ۱، ابو داوٗد ص ۲۰۱ ج ۱، ابن ماجہ ص ۸۴ وغیرہ میں حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْوِتْرُ حَقٌّ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ فَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّوْتِرَ بِخَمْسٍ فَلْيُوْتِرْ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّوْتِرَ بِثَلَاثٍ فَلْيَفْعَلْ وَمَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّوْتِرَ بِوَاحِدَةٍ فَلْيَفْعَلْ۔

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وتر واجب ہے ہر مسلمان پر پس جو شخص پانچ وتر پڑھنا چاہے پڑھے اور جو تین وتر پڑھنا چاہے پڑھے۔ اور جو ایک وتر پڑھنا چاہے پڑھے۔

حضرات شافعیہ اور جو حضرات ایک وتر کے جواز کے قائل ہیں سطحی نظر میں یہ روایت ان کی صریح دلیل بن سکتی تھی۔ مگر اس چند وجہ سے کلام ہے۔

اول:۔ یہ کہ اس میں کلام ہے کہ یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، یا حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے۔ حافظؒ التلخیص الحبیر ص ۱۱۳ ج ۲ میں لکھتے ہیں۔

وَصَحَّحَ اَبُوْحَاتِمٍ وَالذُّهْلِيُّ وَالدَّارَقُطْنِيُّ فِي الْعِلَلِ وَالْبَيْهَقِيُّ وَغَيْرُ وَاحِدٍ وَقْفَهٗ وَهُوَ الصَّوَابُ۔

ترجمہ:۔ ابو حاتم، ذہلی، دار قطنی ــــ علل میں بیہقی اور بہت سے حضرات نے اس کو موقوفاً صحیح کہا ہے اور یہی درست ہے۔

یعنی صحیح یہ ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا اپنا قول ہے۔ حدیث مرفوع کی حیثیت سے صحیح نہیں۔

دوم:۔ یہ کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی یہ روایت دار قطنی نے اس طرح نقل کی ہے۔

اَلْوِتْرُ حَقٌّ وَاجِبٌ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُوْتِرْ بِثَلَاثٍ۔
وَرِجَالُهٗ ثِقَاتٌ۔

ترجمہ:۔ وتر حق واجب ہے۔ پس جو چاہے تین ہی وتر پڑھ لیا کرے۔

حافظ" التلخیص الجبیر ص ۲۳ ج ۲ میں اس کو نقل کر کے فرماتے ہیں۔ ورجالہ ثقات۔ اس طرح حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی روایت میں ایک رکعت وتر کا اضافہ محل نظر ہو جاتا ہے۔
سوم:۔ اور نسائی ص ۲۴۹ ج ا کی ایک روایت میں سات اور پانچ کے عدد کے بعد یہ اضافہ ہے۔

وَمَنْ شَاءَ اَوْتَرَ بِوَاحِدَةٍ وَمَنْ شَاءَ اَوْمٰی اِیْمَاءً

ترجمہ:۔ اور جو چاہے ایک وتر پڑھ لیا کرے۔ اور جو چاہے اشارہ کر لیا کرے۔

اس روایت کو اس کے ظاہر پر محمول کیا جائے تو ایک وتر بھی حذف ہو جاتا ہے اور اشارہ پر کفایت کر لینے کا جواز نکل آتا ہے۔ اور اگر اس کا یہ مطلب ہے کہ جو شخص رکوع و سجود پر قادر نہ ہو وہ اشارہ کر لیا کرے۔ تو اسی قرینے سے ایک رکعت کا جواز بھی معذور کے لئے ہو گا کہ جو شخص تین رکعت پر قادر نہ ہو وہ ایک ہی وتر پڑھ لیا کرے، الغرض اول تو یہ حدیث مرفوع نہیں، بلکہ حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ پھر اس میں اضطراب ہے۔ بعض روایتوں میں پانچ، تین ایک کا ذکر ہے، بعض میں صرف تین کا۔ اور بعض میں اشارہ تک کی گنجائش دی گئی ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ ایک رکعت کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے۔

آخری بات

تعداد وتر کا مسئلہ، اختصار کی پوری کوشش کے باوجود طویل ہو گیا، آخر میں اتنی گزارش مزید سن لیجئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے محض ایک رکعت وتر پڑھنا ثابت نہیں حافظ" نے تلخیص میں امام رافعی" کے حوالے سے حافظ ابن الصلاح کا قول نقل کیا ہے۔

لَا نَعْلَمُ فِیْ رِوَایَاتِ الْوِتْرِ مَعَ کَثْرَتِهَا اَنَّهٗ عَلَیْهِ الصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ
اَوْتَرَ بِوَاحِدَةٍ فَحَسْبُ (صفحہ ۱۵ ج ۲)

ترجمہ:۔ وتر کی روایات کی کثرت کے باوجود ہمیں معلوم نہیں کہ کسی روایت میں یہ آتا ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی صرف ایک رکعت وتر پڑھی ہو۔

حافظ" نے ابن صلاح کے اس قول کی تردید میں ابن حبان کے حوالے سے کریب عن ابن عباس" کی اکلوتی روایت پیش کی ہے کہ:۔

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَوْتَرَ بِرَکْعَةٍ۔

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رکعت کے ساتھ وتر پڑھے۔

اپنے مذہب کی ر یت کے لئے حافظ" کی مجبوری بلاشبہ لائق رحم ہے۔ لیکن میں اوپر کریب عن ابن عباس کی روایت کے ذیل میں بتا چکا ہوں کہ کریب. حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی کاشانہ نبوت میں شب گزاری کے راوی ہیں۔ اور کریب کی تمام روایات اسی قصہ کی حکایت ہیں اس رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہی وتر پڑھے تھے۔ جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے متعدد حضرات کی صحیح روایات ص ۱۴۷ ج ۲. ص ۱۴۸۷ ج ۲ میں موجود ہیں اور خود کریب کی صحیح" ۱۶۹ ج ۲ بھی ذکر کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین ہی وتر پڑھے تھے۔ اس لئے حافظ" کی یہ اکلوتی روایت جو انہوں نے ابن حبان کے حوالے سے نقل کی ہے اسی پر محمول ہوگی کہ آپ ؐ نے ایک رکعت کو ماقبل کے دوگانہ کے ساتھ ملا کر تین وتر پڑھے۔

الغرض پورے ذخیرہ احادیث میں اس کا ثبوت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک رکعت وتر پر اکتفا فرمایا ہو۔ اور جس کسی روایت سے ایسا وہم ہوتا ہے دیگر متواتر روایات سے اس وہم کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ البتہ اس سے انکار نہیں کہ بعض صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم) ایک رکعت وتر کے بھی قائل تھے۔ بلاشبہ یہ حضرات اپنے اجتہاد کی بنا پر ماجور ہیں۔ جس طرح قریب قریب ہر فقہی باب میں بعض شاذ آراء بھی ہوتی ہیں۔ اسی طرح اسی مسئلہ میں یہ رائے بھی شاذ ہے۔ جادہ مستقیمہ وہی ہے جس پر صحابہ و تابعین (علیہم الرضوان) کی اکثریت گامزن تھی کہ وتر کی تین رکعتیں ہیں۔ اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔ تاہم مناسب ہے کہ اس سلسلہ میں مزید ایک بات عرض کر دی جائے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے تراویح کی باقاعدہ جماعت کا اہتمام شروع ہوا ہے. موطا امام مالک ص ۴۰ میں اس سلسلہ میں دو روایتیں نقل کی ہیں۔ ایک گیارہ رکعت کی اور دوسری تئیس رکعت کی۔ علامہ قسطلانی" شرح بخاری میں لکھتے ہیں۔

وَجَمَعَ الْبَیْهَقِیُّ بَیْنَهُمَا بِاَنَّهُمْ کَانُوْا یَقُوْمُوْنَ بِاِحْدٰی عَشَرَةَ ثُمَّ قَامُوْا بِعِشْرِیْنَ وَاَوْتَرُوْا بِثَلَاثٍ۔ وَقَدْ عَدُّوْا مَا وَقَعَ فِیْ زَمَنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ کَالْاِجْمَاعِ . (ارشاد الساری صفحہ ۴۲۶ ج ۳)

ترجمہ:۔ امام بیہقی" نے ان کے درمیان اس طرح تطبیق دی ہے کہ پہلے گیارہ رکعتوں کے ساتھ قیام کرتے تھے۔ پھر ـــــ بیس تراویح اور تین وتر کے ساتھ ـــــ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں صحابہ" کا جو تعامل رہا اس کو علما نے بمنزلہ اجماع کے شمار کیا ہے۔

اور حافظ موفق ابن قدامہ المغنی ص ۱۶۷ ج ۲ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان آثار کو نقل

کر کے لکھتے ہیں۔

وَعَنْ عَلِيٍّ أَنَّهُ أَمَرَ رَجُلًا يُصَلِّي فِي رَمَضَانَ عِشْرِيْنَ رَكْعَةً وَهٰذَا كَالْإِجْمَاعِ۔

ترجمہ:۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک شخص کو رمضان میں بیس تراویح پڑھانے کا حکم فرمایا، اور یہ بمنزلہ اجماع کے ہے۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے تعامل کو "کالا جماع" تصور کرتے ہوئے ائمہ اربعہ تراویح کی بیس رکعت پر متفق ہیں (اور ائمہ اربعہ کا کسی مسئلہ پر اتفاق بجائے خود اجماع کی دلیل ہے۔ جیسا کہ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے "الانصاف" میں تحریر فرمایا ہے) ہماری گزارش یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جہاں تراویح کی بیس رکعت پر "کالا جماع" ہوا۔ وہاں وتر کی تین رکعت پر بھی یہی "کالا جماع" ہوا۔ اور جو حضرات نہ صحابہ رضوان اللہ علیہم کے اجماعی تعامل کو لائق التفات سمجھتے ہیں نہ ائمہ اربعہ کے اتفاق کی قدر وقیمت کو سمجھتے ہیں۔ بلکہ تراویح کی آٹھ ہی رکعتوں کے قائل ہیں، وہ صحاح کی اس حدیث پر اعتماد کرتے ہیں جسے پہلے نقل کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معمول رمضان وغیرہ رمضان میں گیارہ رکعات کا تھا۔ آٹھ تراویح اور تین وتر ـــــ گویا وتر یہاں بھی بطور دائمی معمول کے تین ہی نکلے۔ اور یہ حضرات بھی کم از کم وتر کے مسئلہ میں تو ہمارے ساتھ متفق ہو گئے۔ فنعم الوفاق وحبذا الاتفاق ـــــ واللہ الحمد۔

دوسرا مسئلہ وتر کی دو رکعتوں پر قعدہ

وتر کی دو رکعتوں پر تشہد پڑھنے کے لئے بیٹھنا ضروری ہے۔ اور اس کی چند وجوہ ہیں۔

اول:۔ شریعت نے ہر نماز میں دو رکعت پر قعدہ لازم قرار دیا ہے۔ چنانچہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

وَكَانَ يَقُوْلُ فِي كُلِّ رَكْعَتَيْنِ التَّحِيَّةُ۔ (صحیح مسلم صفحہ ۱۹۴ ج ۱)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ ہر دو رکعت پر التحیات ہے۔

اور ترمذی ص ۵۰ ج ۱ میں حضرت فضل بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الصَّلٰوةُ مَثْنٰى مَثْنٰى تَشَهُّدٌ فِي رَكْعَتَيْنِ الحديث۔

ترجمہ:۔ نماز دو دو رکعت ہوتی ہے ہر دو رکعتوں میں تشہد ہے۔
اس مضمون کی اور بھی متعدد احادیث ہیں۔ اختصار کے پیش نظر ان کو ذکر نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ نماز میں ہر دو رکعت پر قعدہ امام احمدؒ کے نزدیک فرض امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک واجب اور امام مالکؒ و شافعیؒ کے نزدیک سنت ہے۔ مذاہب کی اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ہر دو رکعت پر قعدہ کا واجب ہونا معتدل قول ہے۔
الغرض جب شریعت نے نماز کے لئے ایک اصول اور ضابطہ مقرر کر دیا کہ اس کی ہر دو رکعت پر قعدہ ہے۔ خواہ نماز فرض ہو یا نفل. سنت ہو یا واجب. تو نماز وتر کو بھی اسی قاعدہ کے تحت رکھا جائے گا۔
دوم:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث:

صَلٰوةُ اللَّيْلِ مَثْنٰى مَثْنٰى۔

ترجمہ:۔ رات کی نماز دو دو رکعت ہوتی ہے۔
خاص صلوٰۃ اللیل اور وتر ہی کے بارے میں ارشاد فرمائی گئی ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ ارشاد نبویؐ "رات کی نماز دو دو رکعت ہے" میں دو مسئلوں پر تنبیہ فرمائی گئی ہے ایک یہ کہ نماز کا کم سے کم نصاب دو رکعت ہے اس سے کم نماز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فرائض و نوافل میں ہمیں کوئی نماز ایسی نہیں ملتی جس میں شریعت نے ایک رکعت کو جائز رکھا ہو۔ اور اسے نماز قرار دیا ہو۔ ظاہر ہے کہ وتر کی نماز بھی اسی ضابطہ کے تحت آئے گی. اور محض ایک رکعت وتر نماز نہیں کہلائے گی۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ نماز کی ہر دو رکعت پر برائے التحیات بیٹھنا ضروری ہے۔ ورنہ اس کے بغیر دو گانہ کا وجود ہی متحقق نہیں ہو سکتا چنانچہ صحیح مسلم ص ۲۵۷ ج ۱ میں اس روایت میں یہ اضافہ ہے:

قِيْلَ لِابْنِ عُمَرَ مَا مَثْنٰى مَثْنٰى؟ قَالَ اَنْ تُسَلِّمَ فِيْ كُلِّ رَكْعَتَيْنِ۔

ترجمہ:۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا گیا کہ دو دو رکعت کا کیا مطلب؟ فرمایا یہ کہ تم ہر دو رکعت پر سلام کہو۔
یہاں سلام کہنے سے مراد التحیات ہے جیسا کہ حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گزر چکا ہے کہ "ہر دو رکعت پر التحیات ہے۔" نیز طبرانی کی معجم کبیر میں حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ فِیْ کُلِّ رَکْعَتَیْنِ تَشَہُّدٌ وَتَسْلِیْمٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَعَلٰی مَنْ تَبِعَھُمْ مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ (وَفِیْہِ عَلِیُّ بْنُ زَیْدٍ وَاخْتُلِفَ فِی الْاِحْتِجَاجِ بِہٖ۔ وَقَدْ وُثِّقَ۔ مَجْمَعُ الزَّوَائِدِ صفحہ ۱۳۹ ج ۲)

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر دو رکعت پر تشہد ہے۔ اور رسولوں پر اور ان کی پیروی کرنے والے اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں پر سلام ہے۔

الغرض متعدد احادیث میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے کہ نماز کی ہر دو رکعت پر تشہد کیا جائے۔ اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث جو صلوٰۃ اللیل اور وتر ہی کے بارے میں ہے۔ اس میں بھی اسی ضابطہ کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ نماز وتر میں دو رکعت پر تشہد کو واجب نہ کہا جائے۔

سوم:۔ عائشہ رضی اللہ عنہا اور دیگر حضرات کی جن روایات میں یہ آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پانچ، سات یا نو وتر پڑھا کرتے تھے۔ ان کی تشریح پہلے گزر چکی ہے کہ ان میں صلوٰۃ اللیل اور وتر کے مجموعہ پر "وتر" کا اطلاق کر دیا گیا۔ ورنہ متواتر احادیث سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وتر تین رکعت ہوتے تھے۔ اور جیسا کہ سعد بن ہشام کی روایت میں گزر چکا ہے ان کی دو رکعتوں پر تشہد بھی پڑھا کرتے تھے مگر سلام نہیں پھیرتے تھے۔ بعینہٖ یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔

چہارم:۔ شریعت میں ایسی کوئی نماز نہیں جس میں صرف ایک رکعت کو جائز رکھا گیا ہو۔ یا جس میں کئی دوگانوں کو بغیر تشہد کے جمع کیا گیا ہو۔ جو حضرات نماز وتر میں شریعت کے اس قاعدے کو توڑتے ہیں اور راویوں کی تعبیرات سے غلط فہمی میں مبتلا ہو کر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وتر کی پانچ، سات یا نو رکعتیں ایک ہی سلام اور ایک ہی قعدے سے جائز ہیں کیا صحیح ہو گا کہ وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث۔

صَلَّیْتُ مَعَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ثَمَانِیًا جَمِیْعًا وَسَبْعًا جَمِیْعًا۔

ترجمہ:۔ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (ظہر و عصر کی) آٹھ رکعتیں اور (مغرب و عشاء) کی سات رکعتیں اکٹھی پڑھی ہیں۔

کے پیش نظر یہ فتویٰ بھی دے ڈالیں کہ ظہر و عصر کی آٹھ اور مغرب و عشاء کی سات رکعتیں ایک ہی قعدہ اور ایک ہی سلام کے ساتھ جائز ہیں، اور جو بزرگ حدیث "الوتر رکعتہ من اللیل" کو دیکھ کر یہ فتویٰ دیتے ہیں کہ وتر کی ایک رکعت بھی جائز ہے۔ کیا یہ صحیح ہو گا کہ وہ "الحج عرفہ" کی حدیث سے یہ فتویٰ بھی دیا کریں کہ صرف وقوف عرفہ سے حج ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے اور ارکان و مناسک کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر ان تعبیرات سے کسی کو یہ غلط فہمی نہیں ہوتی۔ کیونکہ ظہر و عصر اور مغرب و عشاء کی نمازوں کا ضابطہ معلوم ہے۔ اسی طرح حج کے ارکان و مناسک بھی معلوم ہیں تو اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ متواتر احادیث سے نماز وتر کا ضابطہ بھی معلوم ہے کہ اس کی تین رکعتیں ہیں۔ راویوں کی باقی تعبیرات کو اسی ضابطہ پر منطبق کیا جائے گا۔ یہ نہیں کہ ایک راوی کی تعبیر کو ایک مستقل اصول بنا کر اس کے لئے متواتر ضابطہ کو توڑ دیا جائے۔

تیسرا مسئلہ۔ قنوت وتر کے لئے تکبیر اور رفع یدین

اس مسئلہ میں چند امور قابل ذکر ہیں۔

اول: اس میں اختلاف ہوا ہے کہ قنوت صرف وتر میں پڑھی جائے یا نماز فجر میں بھی اور رکوع سے پہلے پڑھی جائے یا رکوع کے بعد؟ حنفیہ اس کے قائل ہیں کہ قنوت وتر ہمیشہ ہے اور وہ رکوع سے پہلے ہے، اور قنوت نازلہ، جو نماز فجر میں خاص حوادث کے موقع پر پڑھی جاتی ہے۔ رکوع کے بعد ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے رکوع سے قبل اور بعد قنوت پڑھنے کی جو روایات مروی ہیں، حنفیہ کے نزدیک ان کے درمیان یہی تطبیق ہے چنانچہ صحیح بخاری ص۱۳۶ ج۱ "باب القنوت قبل الرکوع وبعدہ" میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔

حَدَّثَنَا عَاصِمٌ قَالَ سَأَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ عَنِ الْقُنُوْتِ فَقَالَ كَانَتِ الْقُنُوْتُ۔ قُلْتُ قَبْلَ الرُّكُوْعِ اَوْبَعْدَهٗ، قَالَ قَبْلَهٗ قُلْتُ فَاِنَّ فُلَانًا اَخْبَرَنِيْ عَنْكَ اِنَّكَ قُلْتَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ۔ فَقَالَ كَذِبَ۔ اِنَّمَا قَنَتَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَعْدَ الرُّكُوْعِ شَهْرًا۔ الحديث۔

ترجمہ:۔ عاصم احول کہتے ہیں۔ میں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے قنوت کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے فرمایا۔ قنوت ہوتی تھی۔ میں نے کہا رکوع سے پہلے یا بعد میں؟ فرمایا رکوع سے پہلے. میں نے کہا کہ فلاں شخص نے مجھے بتایا کہ آپ فرماتے ہیں کہ رکوع کے بعد قنوت ہے۔ فرمایا. اس نے غلط کہا ہے۔ رکوع کے بعد تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک مہینہ قنوت پڑھی تھی۔

اور حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی کی دوسری روایت میں ہے۔

اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَنَتَ حَتّٰى مَاتَ. وَاَبُوْبَكْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَتّٰى مَاتَ وَعُمَرُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ حَتّٰى مَاتَ.

(رَوَاهُ الْبَزَّارُ وَرِجَالُهُ مُوَثَّقُوْنَ مَجْمَعُ الزَّوَائِدِ صفحہ ۱۳۹ جلد ۱)

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قنوت پڑھی یہاں تک کہ آپؐ کا وصال ہو گیا۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے قنوت پڑھی یہاں تک کہ ان کا وصال ہو گیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قنوت پڑھی یہاں تک کہ ان کا وصال ہو گیا۔

بظاہر اس روایت میں قنوت سے قنوت وتر مراد ہے. کیونکہ قنوت فجر پر دوام ثابت نہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت کے علاوہ متعدد احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ اس لئے مسند احمد اور بزار کی روایت کے یہ الفاظ کہ:۔

مَازَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقْنُتُ فِي الْفَجْرِ حَتّٰى فَارَقَ الدُّنْيَا.

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فجر میں قنوت پڑھتے رہے. یہاں تک کہ دنیا سے تشریف لے گئے۔

اس میں اگر "فی الفجر" کے الفاظ راوی کا سہو نہیں تو قنوت نازلہ پر محمول ہے۔ بہر حال متعدد احادیث کی بنا پر حنفیہ کی تحقیق یہ ہے کہ قنوت نازلہ جو فجر کی نماز میں (اور بعض اوقات دوسری نمازوں میں بھی) پڑھی جاتی تھی۔ وہ رکوع کے بعد ہوتی تھی اور وہ خاص حوادث کے موقع پر پڑھی جاتی تھی۔ لیکن وتر میں قنوت ہمیشہ تھی اور وہ رکوع سے پہلے ہوتی تھی۔

دوم: جو حضرات رکوع سے قبل قنوت کے قائل ہیں ان کے نزدیک قرات اور قنوت کے درمیان فصل کرنے کے لئے قنوت کے لئے تکبیر کہنا سنت ہے۔ امام طحاویؒ فرماتے ہیں۔

وَاَمَّا التَّكْبِيْرُ فِي الْقُنُوْتِ فِي الْوِتْرِ فَاِنَّهَا تَكْبِيْرَةٌ زَائِدَةٌ فِي تِلْكَ الصَّلٰوةِ وَقَدْ اَجْمَعَ الَّذِيْنَ يَقْنُتُوْنَ قَبْلَ الرُّكُوْعِ عَلَى الرَّفْعِ مَعَهَا (طحاوی صفحہ ۳۳۲ ج ۱)

ترجمہ:۔ لیکن قنوت وتر کی تکبیر اس نماز میں ایک زائد تکبیر ہے۔ اور جو حضرات قنوت قبل الرکوع کے قائل ہیں ان کا اس پر اجماع ہے کہ اس تکبیر کے ساتھ رفع یدین بھی ہوتا ہے۔

سوم: قنوت وتر الرکوع متعدد احادیث سے ثابت ہے۔

۱۔ عَنْ اُبَيِّ بْنِ كَعْبٍ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى عَنْهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُوْتِرُ بِثَلَاثِ رَكَعَاتٍ ..... وَيَقْنُتُ قَبْلَ الرُّكُوْعِ

(نسائی صفحہ ۲۴۸ ج ۱)

ترجمہ:۔ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تین رکعت وتر پڑھتے تھے ...... اور رکوع سے قبل قنوت پڑھتے تھے۔

ابن ماجہ ص ۸۴ کی روایت میں ہے۔

كَانَ يُوْتِرُ فَيَقْنُتُ قَبْلَ الرُّكُوْعِ۔

۲۔ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَنَتَ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ۔

ترجمہ:۔ آپ وتر پڑھتے تھے تو قنوت رکوع سے قبل پڑھتے تھے۔

(قَالَ الدَّارَقُطْنِيُّ وَاَبَانُ بْنُ اَبِيْ عَيَّاشٍ مَتْرُوْكٌ۔ قُلْتُ وَرَوَاهُ الْخَطِيْبُ فِيْ كِتَابِ "الْقُنُوْتِ" (مِنْ غَيْرِ طَرِيْقِ اَبَانَ بْنِ اَبِيْ عَيَّاشٍ) وَذَكَرَهُ ابْنُ الْجَوْزِيِّ فِي "التَّحْقِيْقِ" مِنْ جِهَةِ الْخَطِيْبِ وَسَكَتَ عَنْهُ۔ اِلَّا اَنَّهُ قَالَ اَحَادِيْثُنَا مُقَدَّمَةٌ۔ كَمَا فِيْ نَصْبِ الرَّايَةِ صفحہ ۱۲۴ جلد ۲۔ وَقَالَ التِّرْمِذِيُّ فِي الْعِلَلِ صفحہ ۳۳۶ ج ۲ ، وَقَدْ رَوَى غَيْرُ وَاحِدٍ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ النَّخْعِيِّ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقْنُتُ فِيْ وِتْرِهٖ قَبْلَ الرُّكُوْعِ)

٣ - عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يُوْتِرُ بِثَلَاثِ رَكْعَاتٍ وَيَجْعَلُ الْقُنُوْتَ قَبْلَ الرُّكُوْعِ۔ (قَالَ الطَّبْرَانِيُّ لَمْ يَرْوِهِ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ اِلَّا سَعِيْدُ بْنُ سَالِمٍ۔ نصب الرایہ صفحہ ۱۲۴ ج ۲)

۴ - عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ بِتُّ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ قَامَ فَاَوْتَرَ، فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَسَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى ثُمَّ رَكَعَ وَسَجَدَ ثُمَّ قَامَ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَقُلْ يَا اَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ثُمَّ رَكَعَ وَسَجَدَ وَقَامَ فَقَرَأَ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ وَقُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ثُمَّ قَنَتَ وَدَعَا قَبْلَ الرُّكُوْعِ۔ (رواہ الامام محمد فی کتاب الحجہ صفحہ ۲۰۱ ج ۱ واللفظ لہ ورواہ ابو نعیم فی الحلیہ کما فی نصب الرایہ صفحہ ۱۲۴ ج ۲)

۵ - عَنِ الْاَسْوَدِ قَالَ صَحِبْتُ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ سِتَّةَ اَشْهُرٍ فَكَانَ يَقْنُتُ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ (کتاب الحجہ صفحہ ۲۰۱ ج ۱)

٦ - عَنِ الْاَسْوَدِ اَنَّ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ كَانَ لَا يَقْنُتُ فِي شَيْءٍ مِنَ الصَّلٰوتِ اِلَّا فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ - (ابن ابی شیبہ صفحہ ۳۰۲ جلد ۲، کتاب الحجۃ امام محمدؒ صفحہ ۲۰۱ ج ۱، مجمع الزوائد صفحہ ۲۴۴ ج ۲)

٧ - عَنْ عَلْقَمَةَ اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ وَاَصْحَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَرَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ كَانُوْا يَقْنُتُوْنَ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۳۰۲ ج ۲)

۲۔۔۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کی نماز میں رکوع سے قبل قنوت پڑھا کرتے تھے۔

۳۔۔۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تین وتر پڑھا کرتے تھے اور رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے تھے۔

۴۔۔۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں ایک رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہا۔ پس آپ رات کو اٹھے پس دو رکعتیں پڑھیں پھر اٹھ کر وتر پڑھے پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد

سبح اسم ربک الاعلیٰ پڑھی۔ پھر رکوع اور سجدہ کیا۔ پھر دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ اور قل یایھا الکفرون پڑھی۔ پھر رکوع کیا اور سجدہ کیا۔ اور تیسری رکعت میں سورہ فاتحہ اور قل ھو اللہ پڑھی۔ پھر قنوت پڑھی۔ پھر رکوع کیا۔

۵۔ حضرت اسود فرماتے ہیں کہ میں چھ مہینے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صحبت میں رہا۔ وہ وتر کی نماز میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے۔

۶۔ حضرت اسود فرماتے ہیں۔ کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وتر کے سوا کسی نماز میں قنوت نہیں پڑھتے تھے۔ وتر میں رکوع سے پہلے پڑھتے تھے۔

۷۔ حضرت علقمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم وتر میں رکوع سے پہلے قنوت پڑھا کرتے تھے۔

ابن ابی شیبہؒ فرماتے ہیں: "ہذا الامر عندنا" (ص ۳۰۶ ج ۲) یعنی ہمارے نزدیک وتر میں رکوع سے قبل ہی قنوت صحیح ہے۔

چہارم: جہاں تک قنوت وتر کے لئے تکبیر اور رفع یدین کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل روایات ہیں۔

۱۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقْنُتُ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ ۔ قَالَ ثُمَّ اَرْسَلْتُ اُمِّيْ اُمَّ عَبْدٍ فَبَاتَتْ عِنْدَ نِسَائِهٖ ، فَاَخْبَرَتْنِيْ اَنَّهٗ قَنَتَ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ ۔ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۳۰۲ ج ۲)

وَفِي الْاِسْتِيْعَابِ لِابْنِ عَبْدِ الْبَرِّ اُمُّ عَبْدٍ اُمُّ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ رَوٰى عَنْهَا اِبْنُهَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْعُوْدٍ اَنَّهَا قَالَتْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَنَتَ فِي الْوِتْرِ قَبْلَ الرُّكُوْعِ وَيُعْرَفُ اَيْضًا بِهَا حَدِيْثُ اُمِّ ابْنِ مَسْعُوْدٍ يَرْوِيْهِ حَفْصُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ اَبَانَ بْنِ عَيَّاشٍ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ النَّخَعِيِّ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ اَرْسَلْتُ اُمِّيْ لَيْلَةً لِتَبِيْتَ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَتَنْظُرَ كَيْفَ يُوْتِرُ فَبَاتَتْ عِنْدَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَصَلّٰى مَاشَاءَ اللّٰهُ

اَنْ یُّصَلِّیَ حَتّٰی اِذَا کَانَ آخِرَ اللَّیْلِ وَاَرَادَ الْوِتْرَ قَرَاَ بِسَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلٰی) فِی الرَّکْعَۃِ الْاُوْلٰی وَقَرَاَ فِی الثَّانِیَۃِ (قُلْ یَا اَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ) ثُمَّ قَعَدَ ثُمَّ قَامَ وَلَمْ یَفْصِلْ بَیْنَھُمَا بِالسَّلَامِ ثُمَّ قَرَاَ (بِقُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ اَللّٰہُ الصَّمَدُ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ) حَتّٰی اِذَا فَرَغَ کَبَّرَ ثُمَّ قَنَتَ فَدَعَا بِمَا شَاءَ اللّٰہُ اَنْ یَّدْعُوْہُ ثُمَّ کَبَّرَ وَرَکَعَ ۔ (استیعاب صفحہ ۴۵۰ ج ۴/صفحہ ۴۵۱ برحاشیہ اصحابہ)

۲۔ عَنِ الْاَسْوَدِ قَالَ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ کَانَ یَرْفَعُ یَدَیْہِ اِذَا قَنَتَ فِی الْوِتْرِ۔ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۷ - ۲۸ ج ۲)

۳۔ وَفِیْ جُزْءِ رَفْعِ الْیَدَیْنِ اَنَّہٗ کَانَ یَقْرَاُ فِیْ آخِرِ رَکْعَۃٍ مِنَ الْوِتْرِ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ ثُمَّ رَفَعَ یَدَیْہِ فَیَقْنُتُ قَبْلَ الرَّکْعَۃِ

۴۔ عَنْ اَبِیْ عُثْمَانَ کَانَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یَرْفَعُ یَدَیْہِ فِی الْقُنُوْتِ (جزء رفع الیدین صفحہ ۲۸)

۵۔ مُحَمَّدٌ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْحَنِیْفَۃَ عَنْ حَمَّادٍ عَنْ اِبْرَاھِیْمَ اَنَّ الْقُنُوْتَ فِی الْوِتْرِ وَاجِبٌ فِیْ شَھْرِ رَمَضَانَ وَغَیْرِہٖ قَبْلَ الرُّکُوْعِ. وَاِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَقْنُتَ فَکَبِّرْ وَاِذَا اَرَدْتَ اَنْ تَرْکَعَ فَکَبِّرْ اَیْضًا ۔

(کتاب الآثار صفحہ ۵۷۹ ج ۱، کتاب الحجۃ صفحہ ۲۰۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وتر میں رکوع سے قبل قنوت پڑھا کرتے تھے۔ حضرت عبداللہؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے اپنی والدہ ام عبد کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر بھیجا۔ وہ امہات المومنین کے پاس رات رہیں، پھر انہوں نے مجھے بتایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکوع سے پہلے قنوت پڑھی۔

حافظ ابن عبدالبر الاستیعاب میں لکھتے ہیں۔ ام عبدؓ: عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی والدہ ہیں۔ ان سے ان کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رکوع سے پہلے قنوت پڑھتے دیکھا ہے، اور انہی کی نسبت وہ حدیث معروف ہے جسے حفص بن سلیمان ابان بن ابی عیاش سے وہ ابراہیم نخعی سے وہ علقمہ سے وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنی

والدہ کو بھیجا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں رات رہیں اور دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وتر کس طرح پڑھتے ہیں۔ چنانچہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں رات رہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رات میں۔ جتنا اللہ تعالیٰ کو منظور تھا۔ نماز پڑھی۔ جب رات کا آخری حصہ ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وتر پڑھنے کا ارادہ فرمایا تو پہلی رکعت میں سبح اسم ربک الاعلیٰ اور دوسری رکعت میں قل یاایھا الکفرون پڑھی۔ پھر قعدہ کیا۔ پھر سلام پھیرے بغیر کھڑے ہوگئے۔ پھر آپ نے تیسری رکعت میں قل ھواللہ احد پڑھی یہاں تک کہ جب اس سے فارغ ہوئے تو تکبیر کہی پھر دعائے قنوت پڑھی۔ اور جو اللہ تعالیٰ کو منظور تھا دعائیں کیں۔ پھر تکبیر کہی اور رکوع کیا۔

۲۔ حضرت اسود فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود قنوت وتر کے لئے رفع یدین کیا کرتے تھے۔

۳۔ امام بخاریؒ کے رسالہ رفع الیدین ص ۲۴ میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وتر کی آخری رکعت میں قل ھواللہ احد پڑھا کرتے تھے پھر رفع یدین کرتے۔ پس رکوع سے قبل قنوت پڑھتے۔

ابو عثمان فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ قنوت میں رفع یدین کیا کرتے تھے۔

امام محمدؒ کتاب الاثار اور کتاب الحجۃ میں امام ابو حنیفہؒ سے وہ حمادؒ سے وہ حضرات ابراہیم نخعیؒ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ وتر میں قنوت واجب ہے۔ رمضان مبارک میں بھی اور غیر رمضان میں بھی۔ اور جب تم قنوت پڑھنا چاہو تو تکبیر کہو۔ اور جب قنوت کے بعد رکوع کرنا چاہو تب بھی تکبیر کہو۔

امام محمدؒ کتاب الآثار میں اس روایت کو نقل کر کے فرماتے ہیں:

قَالَ مُحَمَّدٌ وَبِهٖ نَاْخُذُ وَيَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي التَّكْبِيْرَةِ الْاُوْلٰى قَبْلَ الْقُنُوْتِ كَمَا يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي افْتِتَاحِ الصَّلٰوةِ ثُمَّ يَضَعُهُمَا وَيَدْعُوْ وَهُوَ قَوْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ (صفحہ ۵۷۹ ج ۱)

ترجمہ۔ ہمارا عمل اسی کے مطابق ہے کہ قنوت سے پہلے کی تکبیر میں رفع یدین کرے جیسا کہ نماز کے شروع میں کیا جاتا ہے۔ پھر ہاتھوں کو رکھ لے۔ اور دعائے قنوت پڑھے یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

چوتھا مسئلہ۔ دعائے قنوت میں ہاتھ باندھنا۔

قنوت وتر میں عقلاً تین صورتیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ قنوت کے دوران ہاتھ اٹھائے رکھیں جیسا دعا میں اٹھائے جاتے ہیں۔ دوسری یہ کہ ہاتھوں کو چھوڑ دیا جائے جیسا کہ قومہ کی حالت میں ہوتا ہے۔ تیسری یہ کہ رفع یدین کے بعد ہاتھوں کو دوبارہ باندھ لیا جائے۔ جیسا کہ

قیام کی حالت میں ہوتا ہے۔ پہلی صورت احناف کے نزدیک پسندیدہ نہیں۔ اس لئے کہ شریعت نے نماز میں جتنی دعائیں رکھی ہیں کہیں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا حکم نہیں فرمایا۔ باوجودیکہ ہاتھ اٹھانا دعا کے آداب میں سے ہے۔ مگر عین نماز میں ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے کا حکم نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس کو بدعت فرماتے تھے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا قَالَ اَرَأَيْتُمْ قِيَامَكُمْ عِنْدَ فَرَاغِ الْإِمَامِ مِنَ السُّوْرَةِ۔ هٰذَا الْقُنُوْتَ۔ وَاللهِ اِنَّهٗ لَبِدْعَةٌ۔ مَا فَعَلَهٗ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَيْرَ شَهْرٍ ثُمَّ تَرَكَهٗ۔ اَرَأَيْتُمْ رَفْعَكُمْ فِي الصَّلٰوةِ وَاللهِ اِنَّهٗ لَبِدْعَةٌ۔ مَا زَادَ رَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى هٰذَا قَطُّ۔ فَرَفَعَ يَدَيْهِ حِيَالَ مَنْكِبَيْهِ۔ (رَوَاهُ الطِّبْرَانِيُّ فِي الْكَبِيْرِ وَفِيْهِ شَهْرُ بْنُ حَوْشَبٍ، ضَعَّفَهٗ اَحْمَدُ وَابْنُ مُعِيْنٍ اَبُوْ زُرْعَةَ وَاَبُوْ حَاتِمٍ وَالنَّسَائِيُّ۔ وَوَثَّقَهٗ اَيُّوْبُ وَابْنُ عَدِيٍّ۔ مَجْمَعُ الزَّوَائِدِ صفحہ ۱۳۷ ج ۲)

ترجمہ:۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا۔ دیکھو! یہ جو تم نماز فجر میں امام کے سورۃ سے فارغ ہونے کے بعد قنوت کے لئے کھڑے ہوجاتے ہو، اللہ تعالیٰ کی قسم یہ بدعت ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو ایک مہینہ سے زیادہ نہیں کیا پھر اسے ترک کر دیا ____ اور دیکھو یہ جو تم نماز میں ہاتھ اٹھا کر قنوت پڑھتے ہو۔ اللہ کی قسم یہ بدعت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم صرف کندھوں تک رفع یدین کرتے تھے۔

بظاہر اس کا مطلب یہی ہے کہ قنوت کے لئے رفع یدین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے مگر نماز کے دوران اس طرح ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا جس طرح نماز سے باہر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں یہ معمول نہیں تھا ____

رہی دوسری اور تیسری صورت۔ قنوت اگر رکوع سے پہلے پڑھی جائے جیسا کہ وتر میں پڑھی جاتی ہے تو قبل رکوع کی حالت چونکہ قیام کی حالت ہے۔ اور قیام میں ہاتھ باندھنا سنت ہے اس لئے نماز وتر میں اس کو اختیار کیا جائے گا۔ اور قنوت نازلہ چونکہ رکوع کے بعد قومہ کی حالت میں پڑھی جاتی ہے اور قومہ میں ہاتھ باندھنا سنت نہیں اس لئے قنوت ہاتھ چھوڑ کر پڑھی جائے گی۔ یہ وجہ ہے کہ احناف کے نزدیک قنوت وتر کا معمول قیام کے مطابق ہاتھ باندھ کر پڑھی جاتی ہے۔

سوال نہم: نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ:

س: ۹____ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ حدیث نبوی سے ثابت ہے یا کہ نہیں۔ اگر نہیں تو دلیل تحریر فرمادیں جب کہ حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر کوئی نماز نہیں۔

ج: ۹ یہاں چند امور قابل ذکر ہیں:

اول:۔ نماز جنازہ کو نماز کہنا مجازاً ہے۔ کیونکہ اس میں نماز کے شرائط ستر عورت اور استقبال قبلہ وغیرہ کو ضرور قرار دیا گیا ہے، ورنہ اپنی اصل کے اعتبار سے نماز نہیں، بلکہ ایک مخصوص طریقہ سے میت کے لئے دعاء و استغفار ہے۔ حافظ ابن قیمؒ زاد المعاد میں لکھتے ہیں۔

وَمَقْصُوْدُ الصَّلٰوۃِ عَلَى الْجَنَازَۃِ هُوَ الدُّعَاءُ لِلْمَيِّتِ۔ وَكَذَالِكَ حُفِظَ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَنُقِلَ عَنْهُ مَالَمْ يُنْقَلْ مِنْ قِرَاءَۃِ الْفَاتِحَۃِ وَالصَّلٰوۃِ عَلَيْهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ (صفحہ ۱۴۱ ج ۱)

ترجمہ:۔ نماز جنازہ سے مقصود میت کے لئے دعا کرنا ہے۔ اور اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنازہ کی دعائیں اس کثرت کے ساتھ نقل کی گئیں ہیں کہ فاتحہ یا درود شریف کا پڑھنا اس طرح نقل نہیں کیا گیا۔

دوم: چونکہ نماز جنازہ اپنی اصل کے اعتبار سے دعا ہے۔ اور دعا کے آداب میں سے ہے کہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کی جائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھا جائے۔ اس لئے نماز جنازہ میں بھی یہی ترتیب رکھی گئی ہے۔ کہ اس میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہوتی ہے۔ پھر درود شریف ہوتا ہے۔ اور پھر میت کے لئے دعا ہوتی ہے۔

سوم: کسی صحیح روایت سے یہ ثابت نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کا حکم دیا ہو۔ حافظ ابن قیمؒ لکھتے ہیں۔

وَيُذْكَرُ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَنَّهٗ اَمَرَ اَنْ يُّقْرَءَ عَلَى الْجَنَازَۃِ بِفَاتِحَۃِ الْكِتَابِ وَلَا يَصِحُّ اَسْنَادُهٗ (صفحہ ۱۴۱ ج ۱)

ترجمہ:۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا جاتا ہے کہ آپؐ نے نماز جنازہ میں قرات فاتحہ کا حکم فرمایا۔ مگر اس کی سند صحیح نہیں۔

چہارم: نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھنے کی سب سے صحیح حدیث وہ ہے جسے امام بخاریؒ نے "باب قرات الفاتحہ علی الجنازۃ" ص ۱۷۸ ج ۱ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے۔

عَنْ طَلْحَةَ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عَوْفٍ قَالَ صَلَّيْتُ خَلْفَ ابْنِ عَبَّاسٍ عَلٰى جَنَازَةٍ فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَقَالَ لِتَعْلَمُوْا اَنَّهَا سُنَّةٌ۔

ترجمہ:۔ طلحہؓ سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اقتدا میں جنازہ کی نماز پڑھی۔ توانہوں نے بلند آواز سے سورہ فاتحہ پڑھی۔ اور فرمایا کہ میں نے اس لئے کیا ہے تاکہ تم جان لوگ کہ یہ سنت ہے۔

اور نسائی ص ۲۸۱ ج ا میں بسند صحیح اسی روایت میں یہ الفاظ ہیں۔

فَقَرَأَ فَاتِحَةَ الْكِتَابِ وَسُوْرَةً وَجَهَرَ حَتّٰى اَسْمَعَنَا۔ فَلَمَّا فَرَغَ اَخَذْتُ بِيَدِهٖ فَسَأَلْتُهٗ فَقَالَ سُنَّةٌ وَحَقٌّ۔

ترجمہ:۔ انہوں نے سورہ فاتحہ اور ایک سورۃ ایسی بلند آواز سے پڑھی کہ ہمیں سنائی دی۔ پس جب وہ فارغ ہوئے تو میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر ان سے سوال کیا۔ توانہوں نے فرمایا کہ یہ سنت اور حق ہے۔

اس روایت میں ایک امر تو قابل غور یہ ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال سورۃ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں کیا گیا تھا۔ یا بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں؟ اگر بلند آواز سے پڑھنے کے بارے میں سوال تھا تو جواب میں سنت اور حق بھی جہر ہی کو فرمایا گیا ہو گا مگر جہر (یعنی بلند آواز سے پڑھنا) عام علماء کے نزدیک سنت نہیں۔

اگر آپ سے سوال سورہ فاتحہ پڑھنے کے بارے میں تھا تو اس سوال سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ عام طور پر عادت نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ پڑھنے کی نہیں تھی۔ چونکہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے خلاف معمول کیا اس لئے ان سے سوال کیا گیا۔ اور جواب میں جو اس کو سنت فرماد یا گیا اس کا مطلب یہ ہو گا کہ سورہ فاتحہ کا بہ نیت ثنا پڑھنا بھی جائز ہے۔ اور یہ بعینہ حنفیہ کا مذہب ہے۔

دوسرا امر یہ بھی قابل غور ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے صرف سورہ فاتحہ نہیں پڑھی بلکہ اس کے ساتھ ایک اور سورۃ بھی پڑھی، مگر نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کے ساتھ کوئی اور سورۃ پڑھنے کا کوئی بھی قائل نہیں۔ اگر اس حدیث سے حنفیہ پر ترک سنت کا الزام عائد کیا جائے تو یہی الزام اسی حدیث سے دوسروں پر عائد ہو گا ____ حالانکہ یہ حدیث حنفیہ کے خلاف نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک حمد و ثنا کے طور پر سورہ فاتحہ اور دیگر ایسی آیات جو حمد و ثنا پر مشتمل ہوں پڑھنا جائز ہے۔

پنجم:۔ یہ غلط ہے کہ حنفیہ سورۃ فاتحہ کے قائل نہیں ان کا موقف یہ ہے کہ چونکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے بعض حضرات سورہ فاتحہ پڑھتے تھے۔ اور بعض نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ فرض و واجب نہیں، البتہ حق تعالیٰ شانہ کی

حمد و ثنا کے طور پر سورہ فاتحہ پڑھ لینا بھی درست ہے۔ مگر جس طرح نماز میں قرات ہوا کرتی ہے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ یا کوئی اور سورۃ قرات کی نیت سے نہیں پڑھی جاتی۔ اس لئے کوئی روایت بھی حنفیہ کے خلاف نہیں۔ چنانچہ امام محمدؒ نے مؤطا میں یہ روایت نقل کی ہے۔

اَخْبَرَنَا مَالِكٌ حَدَّثَنَا سَعِيْدُ الْمَقْبَرِيُّ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ سَأَلَ اَبَاهُرَيْرَةَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَيْفَ يُصَلِّيْ عَلَى الْجَنَازَةِ فَقَالَ اَنَا لَعَمْرُ اللهِ اُخْبِرُكَ اَتَّبِعُهَا مِنْ اَهْلِهَا۔ فَاِذَا وُضِعَتْ كَبَّرْتُ فَحَمِدْتُ اللهَ وَصَلَّيْتُ عَلٰى نَبِيِّهٖ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ثُمَّ قُلْتُ اَللّٰهُمَّ الخ (مؤطا امام مالک صفحہ ۹)

قَالَ مُحَمَّدٌ وَبِهٰذَا نَاْخُذُ۔ لَا قِرَاْءَةَ عَلَى الْجَنَازَةِ وَهُوَ قَوْلُ اَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللهُ (مؤطا امام محمد صفحہ ۱۶۸)

ترجمہ:۔ امام مالکؒ سعید مقبری سے اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ جنازہ کی نماز کیسے پڑھی جاتی ہے انہوں نے فرمایا۔ بخدا! میں تمہیں اس کی خبر دوں گا۔ میں جنازہ کے گھر سے اس کے ساتھ ہو لیتا ہوں جب جنازہ نماز کے لئے رکھا جائے تو میں تکبیر کہہ کر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرتا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا ہوں۔ پھر یہ دعا پڑھتا ہوں۔ امام محمدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارا اس پر عمل ہے۔ جنازہ میں قرات نہیں۔ اور یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

مدونہ کبریٰ ص ۱۵۸ ج ۱/ ص ۱۵۹ میں ہے۔

قُلْتُ لِابْنِ الْقَاسِمِ اَيُّ شَيْءٍ يُقَالُ عَلَى الْمَيِّتِ فِيْ قَوْلِ مَالِكٍ۔ قَالَ اَلدُّعَاءُ لِلْمَيِّتِ قُلْتُ۔ فَهَلْ يُقْرَاُ عَلَى الْجَنَازَةِ فِيْ قَوْلِ مَالِكٍ۔ قَالَ لَا ــــ قَالَ ابْنُ وَهْبٍ عَنْ رِجَالٍ مِّنْ اَهْلِ الْعِلْمِ عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ وَعَلِيِّ بْنِ اَبِيْ طَالِبٍ۔ وَعَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ وَفُضَالَةَ بْنِ عُبَيْدٍ وَاَبِيْ هُرَيْرَةَ وَجَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ وَوَاثِلَةَ بْنِ الْاَسْقَعِ وَالْقَاسِمِ بْنِ مُحَمَّدٍ وَسَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ وَابْنِ الْمُسَيَّبِ، وَعَطَاءِ بْنِ اَبِيْ رَبَاحٍ وَ يَحْيَى بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّهُمْ لَمْ يَكُوْنُوْا يَقْرَءُوْنَ فِي الصَّلٰوةِ عَلَى الْمَيِّتِ ــــ قَالَ ابْنُ وَهْبٍ وَقَالَ مَالِكٌ لَيْسَ ذَالِكَ بِمَعْمُوْلٍ بِهٖ فِيْ بَلَدِنَا۔ اِنَّمَا هُوَ الدُّعَاءُ اَدْرَكْتُ اَهْلَ بَلَدِنَا عَلٰى ذَالِكَ۔

ترجمہ:۔ میں نے ابن قاسمؒ سے کہا امام مالکؒ کے قول میں میت پر کیا پڑھنا چاہئے؟ فرمایا. میت کے لئے دعاء میں نے کہا. کیا امام مالکؒ کے نزدیک نماز جنازہ میں قرات ہوتی ہے؟ فرمایا. نہیں۔

ابن وہب کہتے ہیں کہ بہت سے اہل علم۔ مثلاً (صحابہ کرامؓ میں سے) حضرت عمر بن خطاب۔ علی بن ابی طالب عبداللہ بن عمر۔ فضالہ بن عبید۔ ابوہریرہ۔ جابر بن عبداللہ اور واثلہ بن اسقع۔ اور تابعین میں سے) قاسم بن محمد. سالم بن عبداللہ. سعید بن مسیب. عطاء بن ابی رباح. یحییٰ بن سعید (رضی اللہ عنہم) نمازہ جنازہ میں قرات نہیں کیا کرتے تھے۔

ابن وہب کہتے ہیں کہ امام مالکؒ نے فرمایا ہمارے شہر میں اس پر عمل نہیں نماز جنازہ صرف دعا ہے۔ میں نے اپنے شہر کے اہل علم کو اسی پر پایا ہے۔

ششم:۔ "لاصلوٰۃ الابفاتحۃ الکتاب" سے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کے ضروری ہونے پر استدلال صحیح نہیں کیونکہ. جیسا کہ اوپر عرض کرچکا ہوں۔ نماز جنازہ حقیقتہً نماز ہی نہیں۔ بلکہ دعاء و استغفار ہے۔ اور پھر فاتحہ خلف الامام کی بحث میں یہ ذکر کرچکا ہوں کہ صحیح احادیث میں سورہ فاتحہ کے ساتھ مزید سورہ پڑھنے کو بھی احادیث میں ضروری قرار دیا گیا ہے جس کا نماز جنازہ میں کوئی بھی قائل نہیں۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ احادیث سے سورہ فاتحہ کا پڑھنا بھی ثابت ہے۔ مگر حمد و ثنا کے طور پر ہے۔ قرات کے طور پر نہیں۔ اور اس کے ہم بھی قائل ہیں۔

سوال، دہم تکبیرات عیدین:

س ۱۰:۔ عیدین کی نماز میں چھ تکبیریں زائد ہیں یا بارہ؟ اگر دونوں ثابت ہیں تو راویوں کی کثرت کس طرف استدلال کرتی ہے۔ اور یہ تکبیریں اول رکعت میں فاتحہ اور سورہ پڑھنے سے قبل یا بعد میں؟ اسی طرح دوسری رکعت میں سورہ پڑھنے کے بعد ہیں یا قبل؟

ج ۱۰:۔ یہاں چند امور قابل ذکر ہیں۔

اول:۔ امام مالکؒ. امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کے نزدیک عیدین میں بارہ تکبیریں ہیں۔ پہلی رکعت میں سات اور دوسری میں پانچ۔ اور دونوں میں قرات سے پہلے۔ البتہ امام مالکؒ کے نزدیک پہلی رکعت میں سات تکبیریں تکبیر تحریمہ سمیت ہیں۔ اور دوسرے حضرات کے نزدیک تکبیر تحریمہ سے زائد۔ امام ابوحنیفہؒ. امام سفیان ثوریؒ اور صاحبینؒ کے نزدیک دونوں رکعتوں میں تین تین تکبیریں زائد ہیں۔ پہلی رکعت میں قرات سے پہلے۔ اور دوسری رکعت میں قرات کے بعد۔

دوم :۔ بارہ تکبیرات کی احادیث متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہیں۔ لیکن محدثین کی رائے یہ ہے کہ اس مسئلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی روایت بھی صحت کے ساتھ ثابت نہیں۔ امام ترمذیؒ نے بارہ تکبیرات کی حدیث کثیر بن عبداللہ عمرو بن عوف عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کی ہے۔

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَبَّرَ فِی الْعِیْدَیْنِ فِی الْاُوْلٰی سَبْعًا قَبْلَ الْقِرَاءَۃِ ۔ وَفِی الثَّانِیَۃِ خَمْسًا قَبْلَ الْقِرَاءَۃِ ۔

ترجمہ :۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عیدین میں پہلی رکعت میں سات تکبیریں قرات سے پہلے اور دوسری میں پانچ تکبیریں قرات سے پہلے کہیں۔

امام ترمذیؒ اسکو نقل کر کے کہتے ہیں۔

حَدِیْثٌ حَسَنٌ وَّھُوَ اَحْسَنُ شَیْئٍ رُوِیَ فِی ھٰذَا الْبَابِ (ترمذی شریف صفحہ ۱۷۰)

ترجمہ :۔ یہ حدیث حسن ہے۔ اور اس باب میں جتنی روایات مروی ہیں ان سب سے اچھی ہے۔

یہ حدیث، جو بقول امام ترمذیؒ اس باب کی روایات میں سب سے احسن ہے، اس کا مدار کثیر بن عبداللہ پر ہے۔ اور اس کے بارے میں محدثین کی آرا یہ ہیں۔

امام احمدؒ فرماتے ہیں "لَایُسَاوِیْ شَیْئًا"۔ (یہ کسی چیز کے برابر نہیں) ابن معینؒ فرماتے ہیں۔ "حَدِیْثُہٗ لَیْسَ بِشَیْئٍ" (اس کی حدیث کوئی چیز نہیں) امام نسائیؒ اور دار قطنیؒ فرماتے ہیں۔ "مَتْرُوْکُ الْحَدِیْثِ"۔ امام ابو زرعہؒ فرماتے ہیں۔ "وَاھِی الْحَدِیْثِ"۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں "رُکْنٌ مِّنْ اَرْکَانِ الْکِذْبِ"۔ (جھوٹ کے ستونوں میں سے ایک ستون ہے) امام ابن حبانؒ فرماتے ہیں۔

"رَوٰی عَنْ اَبِیْہِ عَنْ جَدِّہٖ نُسْخَۃً مَّوْضُوْعَۃً لَایَحِلُّ ذِکْرُھَا فِی الْکِتَابِ اِلَّا عَلٰی سَبِیْلِ التَّعَجُّبِ (نصب الرایہ صفحہ ۲۱۷ ج ۲)"

ترجمہ :۔ اس نے اپنے باپ دادے کی سند سے ایک موضوع اور من گھڑت نسخہ روایت کیا ہے۔ جس کا ذکر کرنا بھی جائز نہیں۔ الا یہ کہ اظہار تعجب کے طور پر ہو۔

جب اس روایت کا جو "احسن شئی فی ہذا الباب" سمجھی گئی ہے، یہ حال ہے تو انصاف کیا جائے کہ باقی روایات کا کیا حال ہوگا۔ امام ترمذیؒ نے اس حدیث کی جو تحسین کی ہے محدثین اس سے بھی متفق نہیں شائد اس سے بہتر عبداللہ بن عبدالرحمن الطائفی کی روایت ہے۔ (عن عمرو بن شعیب

عن ابیہ عن جدہ) جسے امام ابو داؤد نے روایت کیا ہے (ص ۱۶۳) اگرچہ اس میں بھی متعدد وجوہ سے کلام ہے۔

سوم :۔ دونوں رکعتوں میں تین تکبیرات کی احادیث اگرچہ تعداد میں کم تر ہیں۔ لیکن شائد قوت وثقاہت اور تعامل صحابہؓ میں اول الذکر روایات سے فائق ہیں چنانچہ :۔

۱۔۔۔۔ امام طحاویؒ نے ابو عبدالرحمٰن قاسم کی روایت نقل کی ہے۔

حَدَّثَنِیْ بَعْضُ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ، قَالَ صَلّٰی بِنَا النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَوْمَ عِیْدٍ ۔ فَکَبَّرَ اَرْبَعًا اَرْبَعًا ۔ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَیْنَا بِوَجْہِہٖ حِیْنَ انْصَرَفَ فَقَالَ لَا تَنْسَوْا کَتَکْبِیْرِ الْجَنَازَۃِ وَاَشَارَ بِاَصَابِعِہٖ وَقَبَضَ اِبْھَامَہٗ (صفحہ ۴۰۰ ج ۲)

ترجمہ :۔ مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض صحابہ نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھائی تو چار چار تکبیریں کہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر ہماری طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ بھول نہ جانا عید کی تکبیریں جنازہ کی طرح چار ہیں۔ ہاتھ کی انگلیوں سے اشارہ فرمایا۔ اور انگوٹھا بند کر لیا۔

امام طحاوی اس حدیث کو روایت کرنے کے بعد فرماتے ہیں :۔

ھٰذَا حَدِیْثٌ حَسَنُ الْاَسْنَادِ وَعَبْدُ اللّٰہِ بْنِ یُوْسُفَ وَیَحْیٰ بْنُ حَمْزَۃَ وَالْوَضِیْنَ بْنُ عَطَاءٍ وَالْقَاسِمُ کُلُّھُمْ اَھْلُ رِوَایَۃٍ ۔ مَعْرُوْفُوْنَ بِصِحَّۃِ الرِّوَایَۃِ۔

ترجمہ :۔ اس حدیث کی سند حسن ہے۔ اس کے تمام راوی عبداللہ بن یوسف یحیٰ بن حمزہ وضین بن عطاء اور قاسم سب کے سب اہل روایت ہیں۔ اور صحت روایت کے ساتھ معروف ہیں۔

اس کے تمام راوی معروف ہیں وضین بن عطاء کو بعض حضرات نے کمزور کہا ہے مگر اکثر حضرات نے ثقہ کہا ہے۔ اور حافظؒ نے فتح الباری ص ۴۰۱ ج ۲ میں مسئلہ وتر میں اس کی ایک روایت کو "اسناد قوی" کہا ہے۔ اس لئے اس کی سند جیسا کہ امام طحاویؒ نے فرمایا حسن ہے۔

۲۔ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ ثَابِتٍ بْنِ ثَوْبَانَ عَنْ اَبِیْہِ عَنْ مَکْحُوْلٍ قَالَ اَخْبَرَنِیْ اَبُوْ عَائِشَۃَ جَلِیْسٌ لِاَبِیْ ھُرَیْرَۃَ اَنَّ سَعِیْدَ بْنَ الْعَاصِ سَاَلَ اَبَا مُوْسَی الْاَشْعَرِیَّ وَحُذَیْفَۃَ بْنَ الْیَمَانِ، کَیْفَ کَانَ

رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یُکَبِّرُ فِی الْاَضْحٰی وَالْفِطْرِ۔ فَقَالَ اَبُوْمُوْسٰی کَانَ یُکَبِّرُ اَرْبَعًا تَکْبِیْرَۃً عَلَی الْجَنَازَۃِ فَقَالَ حُذَیْفَۃُ صَدَقَ ۔ فَقَالَ اَبُوْمُوْسٰی کَذَالِکَ کُنْتُ اُکَبِّرُ فِی الْبَصْرَۃِ حَیْثُ کُنْتُ عَلَیْھِمْ وَقَالَ اَبُوْعَائِشَۃَ وَاَنَا حَاضِرٌ سَعِیْدَ بْنَ الْعَاصِ ۔ (ابوداؤد صفحہ ۱۶۳ ج ۱، طحاوی صفحہ ۴۰۰ ج ۲، مسند احمد صفحہ ۴۱۶ ج ۴)

ترجمہ:۔ عبدالرحمٰن بن بن ثوبان اپنے والد بن ثوبان سے روایت کرتے ہیں. وہ مکحول سے. انہوں نے کہا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے ہم نشین ابو عائشہ نے مجھے بتایا کہ حضرت سعید بن عاص رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہما سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عید میں کتنی تکبیریں کہا کرتے تھے۔ ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ نے فرمایا چار چار تکبیریں کہا کرتے تھے جیسا کہ جنازہ پر تکبیریں کہتے تھے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا. ٹھیک کہتے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جب میں بصرہ کا حاکم تھا تو اسی طرح تکبیریں کہا کرتا تھا ابوعائشہ کہتے ہیں کہ سعید بن عاص کے سوال کے وقت میں خود موجود تھا۔

حافظؒ نے تقریب میں عبدالرحمٰن بن ثابت ابن ثوبان کو "صدق یخطی یرمی بالقدر" اور ابو عائشہ کو "مقبول" لکھا ہے اور سعید بن عاص رضی اللہ عنہ کے سوال کا قصہ امام طحاویؒ نے ایک اور سند سے اس طرح نقل کیا ہے۔

عَنْ مَکْحُوْلٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ رَسُوْلُ حُذَیْفَۃَ وَاَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُکَبِّرُ فِی الْعِیْدَیْنِ اَرْبَعًا اَرْبَعًا سِوٰی تَکْبِیْرَۃِ الْاِفْتِتَاحِ (صفحہ ۴۰۰ ج ۲)

ترجمہ:۔ مکحول کہتے ہیں کہ مجھے حضرت حذیفہ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما کے قاصد نے بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدین میں (بشمول تکبیر رکوع کے) چار چار تکبیریں کہا کرتے تھے۔ سوائے تکبیر تحریمہ کے۔

چہارم:۔ دراصل اس باب میں ائمہ اجتہاد کا اعتماد مرفوع احادیث کی بجائے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے تعامل پر ہے جیسا کہ ابن رشدؒ نے بدایۃ المجتہد ص ۲۱۷ ج ۱ میں لکھا ہے. چنانچہ امام مالک موطا ص ۶۳ میں حضرت ابو ہریرہؓ کے عمل سے سات اور پانچ کی روایت نقل کر کے فرماتے ہیں۔ "وھوالامر عندنا" (ہمارے ہاں اسی پر عمل ہے)

اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل بھی اس باب میں مختلف ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا عمل موطا کے حوالہ سے ابھی گزرا۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس سلسلہ میں مختلف روایات مروی ہیں۔

ان میں سے روایت یہ ہے کہ وہ دونوں رکعتوں میں قرات سے پہلے بارہ تکبیریں کہا کرتے تھے، پہلی میں سات اور دوسری میں پانچ ___ چونکہ اس روایت کو خلفائے بنو عباس نے معمول بنا بنایا۔ اس لئے اس عمل کو زیادہ شہرت ہوئی۔ اور امام شافعیؒ وامام احمدؒ نے اسی روایت کو لیا۔

ان سے دوسری روایات حنیفہ کے مطابق ہیں (طحاوی ص ۴۰۱ ج ۱، عبدالرزاق ص ۲۹۴ ج ۳)

تیسری روایت میں ہے کہ وہ تیرہ تکبیریں کہتے تھے۔ پہلی میں سات قرات سے پہلے۔ اور دوسری میں چھ قرات کے بعد۔ (طحاوی ص ۴۰۱ ج ۱)

چوتھی روایت میں ہے کہ انہوں نے فرمایا جو چاہے سات تکبیریں کہے، اور جو چاہے نو، گیارہ یا تیرہ تکبیریں کہے (طحاوی ص ۴۰۱ ج ۱) حنفیہ کا عمل حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی حدیث پر ہے۔ چنانچہ ان سے مختلف طرق اسانید سے مروی ہے۔ کہ تکبیر تحریمہ کے بعد تین تکبیریں کہے۔ پھر قرات کرے۔ اور دوسری رکعت میں قرات کے بعد تین تکبیریں کہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی احادیث نصب الرایہ ص ۲۱۳ ج ۲، ص ۲۱۴، عبدالرزاق ص ۲۹۳ ج ۳، طحاوی ص ۴۰۱ ج ۲، کتاب الحجۃ علی اہل المدینہ ص ۳۰۳ ج ۱ کتاب الآثار ص ۵۳ مجمع الزوائد ص ۲۰۵ ج ۲ تفسیر ابن کثیر ص ۵۱۳ ج ۲ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تصدیق و تصویب یا موافقت منقول ہے چنانچہ:۔

۱ ___ امام طحاویؒ نے "باب التکبیر علی الجنائز" میں حضرت ابراہیم نخعیؒ کی روایت سے ایک طویل حدیث نقل کی ہے۔ کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا تکبیرات جنازہ میں اختلاف تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں کسی ایک صورت پر متفق کرنے کے لئے مشورہ فرمایا۔

فَاَجْمَعُوْا اَمْرَهُمْ عَلٰی اَنْ يَجْعَلُوْا التَّكْبِيْرَ عَلَى الْجَنَائِزِ مِثْلَ التَّكْبِيْرِ فِي الْاَضْحٰى وَالْفِطْرِ اَرْبَعَ تَكْبِيْرَاتٍ (طحاوی صفحہ ۲۳۹ ج ۱)

ترجمہ:۔ پس ان سب کا اس پر اتفاق ہوا کہ جنازہ کی تکبیریں اتنی ہوں جتنی عیدین کی نماز میں ہیں یعنی چار۔ عیدین کی پہلی رکعت میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ اور دوسری رکعت میں تکبیر رکوع کے ساتھ چار تکبیریں ہوتی ہیں ___ اس روایت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور ان کے اہل مشورہ کا عیدین

کی تکبیروں پر اتفاق ثابت ہوتا ہے۔

۲۔ عَنْ عَامِرٍ اَنَّ عُمَرَ وَعَبْدَ اللهِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمَا اِجْتَمَعَ رَأْيُهُمَا فِيْ تَكْبِيْرَاتِ الْعِيْدَيْنِ عَلٰى تِسْعِ تَكْبِيْرَاتٍ، خَمْسٌ فِي الْاُوْلٰى وَاَرْبَعٌ فِي الْاٰخِرَةِ وَيُوَالِ بَيْنَ الْقِرَاءَتَيْنِ (طحاوی صفحہ ۴۰۰ ج ۲)

ترجمہ:۔ عامر شعبی سے روایت ہے کہ حضرت عمر اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما کی رائے اس پر متفق ہوئی کہ عیدین کی تکبیرات نو ہیں۔ پانچ پہلی رکعت میں اور چار دوسری میں۔ اور دونوں رکعتوں میں قرات پے در پے ہو۔

پہلی میں بشمول تکبیر تحریمہ رکوع کے پانچ اور دوسری میں بشمول تکبیر رکوع کے چار اور قرات کے پے در پے ہونے کا مطلب یہ کہ پہلی رکعت میں قرات سے پہلے تکبیریں کہی جائیں۔ اور دوسری میں قرات کے بعد۔

۳۔۔۔ طحاوی شریف ص ۴۰۱ ج ۲، عبدالرزاق ص ۲۹۳ ج ۳، کتاب الحجۃ: امام محمد ص ۳۰۳ ج ۱، مجمع الزوائد ص ۲۰۵ ج ۲، تفسیر ابن کثیر ص ۵۱۳ ج ۳ میں حضرت حذیفہ بن الیمان اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کا حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے فتویٰ کی تصدیق فرمانا صحیح اسانید سے منقول ہے۔

۴۔۔۔ اور عبدالرزاق ص ۲۹۴ ج ۳ میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے بھی اس کے موافق منقول ہے۔

۵۔۔۔ اور عبدالرزاق ص ۲۹۵ ج ۳ میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے

۶۔۔۔ ابن ابی شیبہ میں حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی تصدیق منقول ہے۔

۷۔۔۔ طحاوی (ص ۴۰۱ ج ۱) نے حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہما کا بھی یہی عمل نقل کیا ہے۔

۸۔۔۔ امام طحاوی (ص ۴۰۱ ج ۱) نے حضرت انس بن ملک رضی اللہ عنہ سے بھی یہی نقل کیا ہے۔

۹۔۔۔ اس کے موافق حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا عمل پہلے گزر چکا ہے۔

پنجم:۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور حضرات صحابہ کرام رضوان

اللہ علیہم کا تعامل دونوں طرح ہے اس لئے ہمارے نزدیک دونوں صورتیں جائز اور حسن ہیں لیکن ہر رکعت میں تین تین تکبیروں کی صورت میں احسن اور راجح ہے۔ امام محمدؒ موطا میں فرماتے ہیں۔

قَدِ اخْتَلَفَ النَّاسُ فِی التَّکْبِیْرِ فِی الْعِیْدَیْنِ فَمَا اَخَذْتَ بِهٖ فَهُوَ حَسَنٌ۔ وَاَفْضَلُ ذَالِكَ عِنْدَنَا مَارُوِیَ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّهٗ کَانَ یُکَبِّرُ فِی کُلِّ عِیْدٍ تِسْعًا۔ خَمْسًا وَاَرْبَعًا۔ فِیْهِنَّ تَکْبِیْرُ الْاِفْتِتَاحِ وَتَکْبِیْرَتَا الرُّکُوْعِ، وَیُوَالِیْ بَیْنَ الْقِرَاءَتَیْنِ وَیُؤَخِّرُهَا فِی الْاُوْلٰی۔ وَیُقَدِّمُهَا فِی الثَّانِیَةِ۔ وَهُوَ قَوْلُ اَبِیْ حَنِیْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ (صفحہ ۱۴۱)

ترجمہ:۔ تکبیرات عیدین میں لوگوں کا اختلاف ہے جس صورت پر بھی عمل کرلو بہتر ہے۔ اور ہمارے نزدیک افضل صورت وہ ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ ہر عید میں نو تکبیریں کہتے تھے۔ پہلی میں بشمول تکبیر تحریمہ اور تکبیر رکوع کے پانچ۔ اور دوسری میں بشمول تکبیر رکوع کے چار، اور دونوں رکعتوں کی قرات میں موالات کرتے تھے۔ پہلی رکعت میں تکبیروں کے بعد قرات کرتے تھے۔ اور دوسری میں تکبیروں سے پہلے یہی امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے۔

اور ہر رکعت میں تین تکبیرات کے ـــــ افضل اور راجح ہونے کے دلائل حسب ذیل ہیں ـــــ حدیث نمبر۱ میں گزرچکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار چار تکبیر (بشمول تکبیر رکوع) کہیں اور نماز سے فارغ ہو کر فرمایا بھول نہ جانا، چار تکبیریں ہیں۔ نماز جنازہ کی طرح، اور آپ نے انگلیوں سے اشارہ فرمایا، پس یہ عمل، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل، اشارہ و استدلال اور تاکید سے ثابت ہے۔

۲ ـــــ پہلے گزرچکا ہے کہ تین تین تکبیرات کی احادیث صحت و قوت میں فائق ہیں۔

۳ ـــــ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اور اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم کا اس پر تعامل زیادہ رہا ہے۔ جب کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا تعامل مختلف رہا ہے۔ کبھی بارہ پر کبھی چھ پر ـــــ

۴ ـــــ یہ تو ظاہر ہے کہ عیدین کی زائد تکبیر عام نمازوں کی طرز کے خلاف مشروع کی گئی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ چھ تکبیروں پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا اتفاق ہے اور زائد میں اختلاف ہے۔ پس متیقن اور متفق علیہ کو لے لینا اور مختلف فیہ کو ترک کر دینا اولیٰ ہو گا۔ (واللہ اعلم)

سوال: سنت فجر۔

س نمبر۱۱۔ نماز کے لئے اقامت ہو چکی ہو تو قریب کوئی نماز نہیں ہوتی ہے۔ پھر کیوں لوگ فجر کی سنت اس وقت پڑھنے لگتے ہیں جب کہ فرض نماز شروع ہو رہی ہے۔ حدیث نبوی کی رو سے نماز نہیں ہوئی؟ رہا یہ کہ مسجد کے کسی گوشے میں پڑھ لینا تو کیا امام قرات کی آواز کانوں سے نہیں ٹکراتی؟

ج نمبر۱۱: اس مسئلہ میں جو جہتیں متعارض ہیں، جن کی وجہ سے کسی ایک جانب کے اختیار کرنے میں اشکال پیدا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں فجر کی پہلی سنتوں کی بہت ہی تاکید فرمائی ہے یہی وجہ ہے کہ فرض اور وتر نماز کے بعد با جماع امت سب سے زیادہ مؤکد سنت فجر ہے۔ دوم یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز جماعت میں شرکت کی بھی بہت تاکید فرمائی ہے۔ اب جو شخص ایسے وقت آئے کہ نماز کھڑی ہو چکی ہو، اور اس نے سنت فجر نہ پڑھی ہو، اگر وہ سنت فجر کو ترک کرتا ہے تو ان احادیث کی مخالفت لازم آتی ہے جو سنت فجر کی تاکید میں وارد ہوئی ہیں۔ اور اگر سنت فجر کے ادا کرنے میں مشغول ہوتا ہے تو شرکت جماعت کی تاکید سے متعلقہ احادیث کی مخالفت لازم آتی ہے۔ ائمہ احناف ؒ نے ان دونوں تاکیدوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اگر اس شخص کو جماعت کی کی ایک رکعت مل جانے کا اطمینان ہو تب تو دونوں فضیلتوں کو جمع کرے، پہلے مسجد کے دروازے پر سنتیں ادا کر لے۔ اور پھر جماعت میں شریک ہو جائے۔ اور اگر خیال ہو کہ سنتوں میں مشغول ہوا تو جماعت کی دونوں رکعتیں نکل جائیں گی تو جماعت میں شریک ہو جائے اور سنتیں طلوع آفتاب کے بعد پڑھے۔ کیونکہ نماز فجر کے بعد نفل پڑھنے کی احادیث متواترہ میں ممانعت آئی ہے۔ سلف کا عمل بھی اس بارے میں مختلف رہا۔ حنفیہ کی تائید میں مندرجہ ذیل آثار ہیں۔

۱۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ اَبِیْ مُوْسٰی قَالَ جَاءَنَا ابْنُ مَسْعُوْدٍ وَالْاِمَامُ یُصَلِّی الْفَجْرَ، فَصَلّٰی رَکْعَتَیْنِ اِلٰی سَارِیَۃٍ۔ وَلَمْ یَکُنْ صَلّٰی رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ (عبدالرزاق صفحہ ۴۴۴ ج ۲)

۲۔ عَنْ حَارِثَۃَ بْنِ مُضَرِّبٍ اَنَّ ابْنَ مَسْعُوْدٍ وَاَبَا مُوْسٰی خَرَجَا مِنْ عِنْدِ سَعِیْدِ بْنِ الْعَاصِ فَاُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ فَرَکَعَ (عَبْدُ اللّٰہِ) رَکْعَتَیْنِ ثُمَّ دَخَلَ مَعَ الْقَوْمِ فِی الصَّلٰوۃِ وَاَمَّا اَبُوْ مُوْسٰی فَدَخَلَ فِیْ

الصَّفِّ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۵۱ ج ۲)

۳۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ کَانَ یَقُوْلُ، نَعَمْ وَاللّٰہِ! لَئِنْ دَخَلْتُ وَالنَّاسُ فِی الصَّلٰوۃِ لَاَعْمِدَنَّ اِلٰی سَارِیَۃٍ مِّنْ سَوَارِی الْمَسْجِدِ ثُمَّ لَاَرْکَعَنَّھُمَا، ثُمَّ لَاُکْمِلَنَّھُمَا، ثُمَّ لَا اُعَجِّلُ عَنْ اِکْمَالِھِمَا۔ ثُمَّ اَمْشِیْ اِلَی النَّاسِ فَاُصَلِّیْ مَعَ النَّاسِ الصُّبْحَ (عبدالرزاق صفحہ ۴۴۳ ج ۲)

۴۔ عَنْ اَبِی الدَّرْدَاءِ قَالَ اِنِّیْ لَاَجِیْءُ اِلَی الْقَوْمِ وَھُمْ صُفُوْفٌ فِیْ صَلٰوۃِ الْفَجْرِ فَاُصَلِّی الرَّکْعَتَیْنِ ثُمَّ اَنْضَمُّ اِلَیْھِمْ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۵۱ ج ۲)

۵۔ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا اَنَّہٗ کَانَ یَدْخُلُ فِی الصَّلٰوۃِ تَارَۃً وَاُخْرٰی یُصَلِّیْھَا فِیْ جَانِبِ الْمَسْجِدِ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۵۱ ج ۲)

۶۔ عَنِ الشَّعْبِیِّ مِنْ مَسْرُوْقٍ اَنَّہٗ دَخَلَ الْمَسْجِدَ وَالْقَوْمُ فِیْ صَلٰوۃِ الْغَدَاۃِ وَلَمْ یَکُنْ صَلَّی الرَّکْعَتَیْنِ، فَصَلَّاھُمَا فِیْ نَاحِیَۃٍ ثُمَّ دَخَلَ مَعَ الْقَوْمِ فِیْ صَلَاتِھِمْ۔ (ابن ابی شیبہ صفحہ ۲۵۰ ج ۲ واللفظ لہٗ۔ عبدالرزاق صفحہ ۴۴۴ ج ۲)

۷۔ عَنِ الْحَسَنِ قَالَ اِذَا دَخَلْتَ الْمَسْجِدَ وَالْاِمَامُ فِی الصَّلٰوۃِ وَلَمْ تَکُنْ رَکَعْتَ رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ، فَصَلِّھِمَا ثُمَّ اُدْخُلْ مَعَ الْاِمَامِ (عبدالرزاق صفحہ ۴۴۵ ج ۲)

۸۔ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا دَخَلَ فِی الْمَسْجِدِ وَالْقَوْمُ فِی الصَّلٰوۃِ وَلَمْ یَکُنْ صَلّٰی رَکْعَتَیِ الْفَجْرِ، فَدَخَلَ مَعَ الْقَوْمِ فِیْ صَلٰوتِھِمْ۔ حَتّٰی اِذَا اَشْرَقَتْ لَہُ الشَّمْسُ قَضَاھَا۔ قَالَ وَکَانَ اِذَا اُقِیْمَتِ الصَّلٰوۃُ وَھُوَ فِی الطَّرِیْقِ صَلَّاھُمَا فِی الطَّرِیْقِ (عبدالرزاق صفحہ ۴۴۳ ج ۲)

ترجمہ:۔ عبداللہ بن ابو موسیٰ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما ہمارے پاس آئے جب کہ امام نماز پڑھا رہا تھا۔ پس انہوں نے ستون کی اوٹ میں دو رکعتیں پڑھیں۔ انہوں نے فجر کی سنتیں نہیں

یہاں دو نسخے ہیں ایک "لا اعجل" اور دوسرا "لا عجل"۔ میرے خیال میں یہی راجح ہے گو پہلے نسخہ کے مطابق مضمون صحیح ہے۔

پڑھی تھیں۔
۲۔۔۔ حارثہ بن مضرب ؒ کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہم کے پاس سے نکلے، اتنے میں جماعت کھڑی ہوگئی، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے دو رکعتیں پڑھیں پھر جماعت میں شریک ہوئے۔ اور حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ آتے ہی صف میں داخل ہوگئے۔
۳۔۔۔ حضرت ابو داؤد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے، کہ ہاں! اللہ کی قسم! اگر میں ایسے وقت مسجد میں داخل ہوں جب کہ لوگ جماعت میں ہوں تو میں مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون کے پیچھے جاکر سنت فجر کی دو رکعتیں ادا کروں گا اور ان کو کامل طریقہ سے ادا کروں گا۔ اور ان کو کامل کرنے میں جلد بازی سے کام نہیں لوں گا۔ پھر جاکر لوگوں کے ساتھ نماز میں شریک ہوں گا۔
۴۔۔۔ حضرت ابو داؤد رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے کہ میں لوگوں کے پاس جاتا ہوں جب کہ وہ نماز فجر میں صفیں باندھے کھڑے ہوں تو میں پہلے سنت فجر کی دو رکعتیں پڑھتا ہوں۔ پھر جماعت میں شریک ہوتا ہوں۔
۵۔۔۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کبھی آتے ہی جماعت میں داخل ہوجاتے۔ اور کبھی مسجد کے ایک گوشے میں سنتیں پڑھ لیتے۔
۶۔۔۔ امام شعبی ؒ فرماتے ہیں کہ حضرت مسروق ؒ مسجد میں داخل ہوئے جب کہ لوگ صبح کی نماز میں تھے۔ انہوں نے فجر کی سنتیں نہیں پڑھی تھیں پس ایک گوشے میں سنتیں پڑھیں پھر جماعت میں شریک ہوئے۔
۷۔۔۔ حضرت حسن بصری ؒ کا ارشاد ہے کہ جب تم مسجد میں ایسے وقت میں داخل ہو کہ امام نماز میں ہو۔ اور تم نے فجر کی سنتیں نہ پڑھی ہوں تو پہلے سنتیں پڑھو پھر امام کے ساتھ شریک ہو۔
۸۔۔۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے جب کہ نماز کھڑی ہوچکی تھی۔ اور انہوں نے سنت فجر نہیں پڑھی تھیں پس وہ جماعت میں شریک ہوگئے یہاں تک کہ سورج خوب نکل آیا۔ تو سنتیں قضا کیں۔ نافع ؒ کہتے ہیں کہ ابن عمر رضی اللہ عنہما کا معمول تھا کہ اگر راستے میں اقامت ہوجاتی تو وہ راستے ہی میں سنتیں پڑھ لیتے۔

ان آثار سے معلوم ہوا کہ ائمہ احناف نے وہی مسلک اختیار کیا ہے۔ جس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں صحابہ کرام ؓ کا عمل تھا۔ اور جسے فقیہ الامت حضرت عبداللہ بن مسعود نے

حکیم الامت حضرت ابو درداء اور شیخ الامینہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ حضرات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے بے خبر نہیں تھے۔

سوال ۱۲ :۔ تاخیر واجب پر سجدہ سہو :۔

س: احناف کے نزدیک نماز کے دوران فاتحہ اور دوسری سورۃ کے درمیان اتنا وقفہ ہو جائے کہ تین مرتبہ سبحان اللہ کہا جا سکے تو سجدہ سہو لازم آجاتا ہے اس کی کیا دلیل ہے؟

ج:۔ اس ضمن میں چند امور قابل توجہ ہیں۔

اول :۔ سجدہ سہو کی بحث میں اس طرف اشارہ کر چکا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چند موقعوں پر سجدہ سہو ثابت ہے۔ مثلاً

۱۔۔۔ آپ پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہو گئے۔ اور سجدہ سہو کیا۔

۲۔۔۔ دو رکعت پر قعدہ کئے بغیر کھڑے ہو گئے۔ اور سجدہ سہو کیا۔

۳۔۔۔ دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور سجدہ سہو کیا۔

۴۔۔۔ تین رکعتوں پر سلام پھیر دیا اور سجدہ سہو کیا۔

۵۔۔۔ شک کی صورت میں غلبہ ظن پر عمل کر کے سجدہ سہو کرنے کا حکم فرمایا۔

یہ دو چار صورتیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سجدہ سہو کی منقول ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا سجدہ سہو کا حکم صرف انہیں صورتوں میں ہے؟ یا ان کے علاوہ بھی سجدہ سہو کسی صورت میں لازم آتا ہے۔۔۔ سجدہ سہو کی بحث میں اس طرف بھی اشارہ کر چکا ہوں کہ ائمہ اربعہ اور جمہور امت کے نزدیک سجدہ سہو کا حکم صرف انہیں صورتوں کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ جہاں بھی سجدہ سہو کی موجب کوئی چیز پائی جائے وہاں سجدہ سہو واجب ہو گا۔ کسی کے نزدیک سلام سے پہلے۔ اور کسی کے نزدیک بعد۔

دوم : جب یہ بات طے ہوئی کہ سجدہ سہو اور صورتوں میں بھی واجب ہے۔ تو اب یہ سوال ہو گا کہ سجدہ سہو کا اصول کیا ہے۔ کن چیزوں کے ترک سے سجدہ سہو لازم ہو گا۔ اور کن چیزوں کے ترک سے نہیں؟ یہاں مجھے دوسرے آئمہ اجتہاد کے اصول سے بحث نہیں۔ صرف ائمہ احناف کے اصول کی وضاحت پر اکتفا کروں گا۔

ائمہ احناف نے تکبیر تحریمہ سے لے کر سلام تک نماز کے تمام افعال پر غور کر کے ان کے چار درجے مقرر کیے۔ بعض افعال کو "فرض" قرار دیا جن کے فوت ہونے سے نماز فاسد ہو جاتی ہے۔ اور بغیر اعادہ کے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی جیسے قیام، قرات رکوع و سجود، آخری قعدہ وغیرہ ــــ بعض چیزوں کو "واجب" قرار دیا یہ اگر سہواً فوت ہو جائیں تو سجدہ سہو سے ان کی تلافی ہو جاتی ہے۔ اور بعض امور کو "سنت" قرار دیا جس کے ترک کر دینے سے نماز خلاف سنت ہو گی۔ اس سے سجدہ سہو لازم نہیں آئے گا۔ بعض امور کو "مستحب" اور "مندوب" قرار دیا کہ ان کا کرنا موجب ثواب ہے۔ مگر ترک موجب عتاب نہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہو گا کہ ائمہ احناف کے نزدیک سجدہ سہو کا اصول ترک واجب ہے اور نماز کے ارکان و واجبات میں موالات بھی واجب ہے۔ اس لئے اس کے ترک سے سجدہ سہو واجب ہو گا۔

سوم:۔ اوپر احادیث طیبہ میں سجدہ سہو کی جو صورتیں مذکور ہوئی ہیں ان پر غور کرو تو ان میں یہی اصول کار فرما نظر آئے گا۔ چنانچہ قعدہ اولیٰ کے ترک کی صورت میں سجدہ سہو فرمایا۔ کیونکہ قعدہ اولیٰ واجب تھا چار رکعتوں کے بعد پانچویں رکعت کے لئے کھڑے ہو گئے تو سلام میں تاخیر ہو گئی۔ اور موالات، جو واجب تھی۔ فوت ہو گئی، اس لئے سجدہ سہو واجب ہوا۔ اسی طرح دو رکعت یا تین رکعت پر سلام پھیر دینے کی صورت میں بقیہ ارکان کی ادائیگی میں تاخیر ہو گئی۔ اور ارکان کے درمیان موالات نہ رہی۔ اس لئے سجدہ سہو واجب ہوا۔ شک کی صورت میں اس احتمال پر کہ شائد ایک رکعت زیادہ پڑھی گئی ہو۔ اور فراغ عن الصلوٰۃ میں تاخیر ہو گئی تو سجدہ سہو واجب ہوا۔

پس احادیث طیبہ ہی سے یہ اصول منقح ہو گیا کہ ترک واجب، یا تاخیر رکن یا تاخیر واجب سے سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے۔

چہارم:۔ اب صرف ایک سوال باقی رہا کہ تاخیر کا معیار کیا ہے جس سے موالات فوت ہو جاتی ہے۔ اور سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے۔ ائمہ احناف نے اس پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ رکوع و سجود نسبتاً مختصر رکن ہیں۔ جن میں تین مرتبہ تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ پس ادنیٰ رکن کی ادائیگی کے بقدر اگر کسی رکن یا واجب کے ادا کرنے میں تاخیر ہو جائے تو سجدہ سہو واجب ہو جاتا ہے۔ اور وہ ہے تین تسبیح کی مقدار۔

یہ مقدمات اگر ذہن نشین ہو گئے تو آپ کے سوال کا جواب واضح ہو جائے گا چونکہ سورہ فاتحہ

کے بعد سورۃ کا پڑھنا نماز میں واجب ہے۔ اور تین تسبیح کی مقدار اس میں تاخیر سے موالات فوت ہو جاتی ہے۔ اس لئے ائمہ احناف اس پر سجدہ سہو کا حکم کرتے ہیں۔ اور جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں یہ اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث طیبہ ہی سے لیا گیا ہے۔

سوال ۱۳: ران ستر ہے:

س: مرد کے لئے ستر عورت ناف سے گھٹنے تک بتلایا جاتا ہے اس کے لئے کن احادیث سے استدلال کیا گیا ہے جب کہ بخاری میں حضرت انسؓ نے روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (جنگ خیبر میں) اپنی ران کھولی۔ زید بن ثابت نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر (قرآن) اتارا اور آپ کی ران میری ران پر تھی وہ اتنی بھاری ہوگئی۔ میں ڈرا کہ کہیں میری ران ٹوٹ جاتی ہے۔ امام بخاری نے استدلال کیا اگر ران عورت ہوتی تو آپؐ زیدؓ کی ران پر اپنی ران نہ رکھتے۔ بخاری شریف میں انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر پر جہاد کیا۔ ہم لوگوں نے صبح کی نماز اندھیرے میں خیبر کے قریب پہنچ کر پڑھی پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سوار ہوئے اور میں ابو طلحہؓ کے پیچھے ایک ہی سواری پر بیٹھا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کی گلیوں میں اپنا جانور دوڑایا اور (دوڑنے میں) میرا گھٹنا آنحضرتؐ کی ران سے چھو جاتا تھا۔ پھر آپ نے اپنی ران سے تہ بند ہٹادی (ران کھول دی) یہاں تک کہ آپ کی سفیدی (اور چمک) دیکھنے لگا۔

ج: ۔ یہاں چند امور قابل ذکر ہیں۔

اول: ۔ بہت سی احادیث سے ثابت ہے کہ ران ستر میں داخل ہے۔

۱۔ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرٍو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا زَوَّجَ اَحَدُكُمْ اَمَتَهٗ عَبْدَهٗ اَوْ اَجِيْرَهٗ - فَلَا يَنْظُرْ اِلٰى مَادُوْنَ السُّرَّةِ وَفَوْقَ الرُّكْبَةِ، فَاِنَّ مَا تَحْتَ السُّرَّةِ اِلَى الرُّكْبَةِ عَوْرَةٌ. (دارقطنی صفحہ ۸۵ ج ۱ واللفظ لہٗ۔ وابوداؤد صفحہ ۱، مسند احمد صفحہ ۱۸۷ ج ۲ وَلَفْظُهٗ: فَاِنَّ مَا اَسْفَلَ مِنْ سُرَّتِهٖ اِلٰى رُكْبَتَيْهِ عَوْرَةٌ)

۲۔ عَنْ زُرْعَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ جَرْهَدٍ عَنْ اَبِیْهِ قَالَ كَانَ جَرْهَدُ هٰذَا مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْ اَصْحَابِ الصُّفَّةِ، قَالَ جَلَسَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَنَا وَفَخِذِیْ مُنْكَشِفَةٌ۔ فَقَالَ خَمِّرْ عَلَیْكَ۔ اَمَا عَلِمْتَ اَنَّ الْفَخِذَ عَوْرَةٌ (ابوداؤد صفحہ ۵۵۷ ج ۱، سنن دارمی صفحہ ۱۹۲ ج ۲، عبدالرزاق صفحہ ۲۷ ج ۱۱، صحیح بخاری تعلیقاً صفحہ ۵۳ جلد ۱، ترمذی صفحہ ۱۰۳ ج ۲)

۳۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمَا اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ الْفَخِذُ عَوْرَةٌ (بخاری تعلیقاً صفحہ ۵۳ ج ۱، ترمذی صفحہ ۱۰۳ ج ۲)

۴۔ عَنْ اَبِیْ اَیُّوْبَ الْاَنْصَارِیِّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَسْفَلُ السُّرَّةِ وَفَوْقَ الرُّكْبَتَیْنِ مِنَ الْعَوْرَةِ۔ (نصب الرایہ صفحہ ۲۹۷ ج ۱، مغنی ابن قدامہ صفحہ ۵۷۸ ج ۱)

۵۔ عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تُبْرِزْ فَخِذَكَ وَلَا تَنْظُرْ اِلٰى فَخِذِ حَیٍّ وَلَا مَیِّتٍ (ابوداؤد صفحہ ۴۴۳ ج ۱ و سکت علیہ فی باب ستر المیت عند غسلہ من کتاب الجنائز ثم اخرجہ فی کتاب الحمام باب "نھی عن التعری" صفحہ ۵۵۷ ج ۲، وقال "ھذا الحدیث فیہ نکارۃ"۔

۶۔ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ (عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ) جَحْشٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ مَرَّ النَّبِیُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَاَنَا مَعَهٗ عَلٰى مَعْمَرٍ وَفَخِذَاهُ مَكْشُوْفَتَانِ فَقَالَ یَا مَعْمَرُ غَطِّ عَلَیْكَ فَخِذَیْكَ، فَاِنَّ الْفَخِذَ عَوْرَةٌ۔ ذکرہ البخاری صفحہ ۵۳ ج ۱ تَعْلِیْقًا وَقَالَ الْحَافِظُ، وَصَلَهٗ اَحْمَدُ وَالْمُصَنِّفُ فِی التَّارِیْخِ وَالْحَاكِمُ فِی الْمُسْتَدْرَكِ كُلُّهُمْ مِنْ طَرِیْقِ اِسْمَاعِیْلَ بْنِ جَعْفَرٍ عَنِ الْعَلَاءِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِیْ كَثِیْرٍ مَوْلٰى مُحَمَّدِ بْنِ جَحْشٍ عَنْهُ۔ رِجَالُهٗ رِجَالُ الصَّحِیْحِ غَیْرُ اَبِیْ كَثِیْرٍ، فَقَدْ رَوٰی عَنْهُ جَمَاعَةٌ، لٰكِنْ لَمْ اَجِدْ فِیْهِ تَصْرِیْحًا بِتَعْدِیْلٍ، وَقَدْ وَقَعَ لِیْ حَدِیْثُ مُحَمَّدِ بْنِ جَحْشٍ مُسَلْسَلًا بِالْمُحَمَّدِیِّیْنَ مِنِ ابْتِدَائِهٖ اِلٰى انْتِهَائِهٖ۔

وَقَدْ اَمْلَيْتُهٗ فِى الْاَرْبَعِيْنَ الْمُتَبَايِنَةِ (فتح الباری صفحہ ۴۰۳ ج ۱)

۷۔ قَالَ الْحَافِظُ وَمَعْمَرُ الْمُشَارُ اِلَيْهِ هُوَ مَعْمَرُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ فَضْلَةَ الْقُرَشِيِّ الْعَدَوِيِّ وَقَدْ اَخْرَجَ ابْنُ قَانِعٍ هٰذَا الْحَدِيْثَ مِنْ طَرِيْقِهٖ اَيْضًا (فتح الباری صفحہ ۴۰۳ ج ۱)

۸۔ عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الرُّكْبَةُ مِنَ الْعَوْرَةِ (اَخْرَجَهُ الدَّارَقُطْنِيْ وَسَنَدُهٗ ضَعِيْفٌ كَمَا فِىْ نَصْبِ الرَّايَةِ صفحہ ۲۹۷ ج ۱)

ترجمہ:۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب تم میں سے کوئی اپنی لونڈی کا نکاح اپنے غلام یا نوکر سے کر دے تو ناف سے نیچے اور گھٹنے سے اوپر کے حصہ کو نہ دیکھے کیونکہ ناف کے نیچے سے گھٹنے تک کا حصہ ستر ہے۔

۲۔ زرعہ بن عبد الرحمٰن بن جرید اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جرید نے جو اصحاب صفہ میں سے تھے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس بیٹھے اور میری ران کھلی تھی، آپؐ نے فرمایا اپنا ستر ڈھکو۔ تجھے معلوم نہیں کہ ران ستر ہے۔

۳۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ران ستر ہے۔

۴۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ناف سے نیچے اور گھٹنوں سے اوپر کا حصہ ستر ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنی ران کھولو اور نہ کسی زندہ یا مردہ کی ران کی طرف نظر کرو۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معمر کے پاس سے گزرے، میں آپؐ کے ساتھ تھا معمر کی رانیں کھلی تھیں آپؐ نے فرمایا، معمر! اپنی رانیں ڈھکو۔ کیونکہ رانیں ستر ہیں۔

عربی:۔

۷۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں حضرت معمر رضی اللہ عنہ جن کا ذکر اوپر کی حدیث میں آیا ہے یہ معمر بن عبداللہ القرشی العدوی ہیں۔ ابن قانع نے یہ حدیث خود ان سے بھی روایت کی ہے۔

۸۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ گھٹنا ستر میں داخل ہے۔

دوم: ان احادیث میں سے بعض صحیح ہیں۔ بعض حسن اور مقبول۔ اور بعض ضعیف لیکن ایک ہی مضمون جب متعدد احادیث میں متعدد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مروی ہو تو اس کے صحیح ہونے میں کوئی تردد نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آئمہ اربعہ اور جمہور سلف و خلف رانوں کو ستر میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ابن قدامہ حنبلی المغنی ص ۵۷۸ ج ۱ میں لکھتے ہیں۔

وَالصَّالِحُ فِي الْمَذْهَبِ اَنَّهَا (اَيِ الْعَوْرَةَ) مِنَ الرَّجُلِ مَابَيْنَ السُّرَّةِ وَالرُّكْبَةِ نَصَّ عَلَيْهِ اَحْمَدُ فِي رِوَايَةِ جَمَاعَةٍ۔ وَهُوَ قَوْلُ مَالِكٍ وَالشَّافِعِيِّ وَاَبِي حَنِيْفَةَ وَاَكْثَرِ الْفُقَهَاءِ۔

ترجمہ:۔ صالح روایت ہمارے مذہب میں یہ ہے کہ مرد کا ستر ناف اور گھٹنے کے مابین ہے ایک جماعت کی روایت میں امام احمدؒ نے اس کی تصریح کی ہے۔ اور یہی امام مالکؒ امام شافعیؒ امام ابو حنیفہؒ اور اکثر فقہاء کا قول ہے۔
ابن قدامہؒ نے امام احمدؒ کی دو روایتیں ذکر کی ہیں اور "صالح فی المذہب" اسی روایت کو کہا ہے جو جمہور کے مطابق ہے۔ اسی طرح امام مالکؒ سے بھی دو روایتیں ہیں۔ لیکن معتمد علیہ روایت وہی ہے جو جمہور کے مطابق ہے۔

سوم:۔ سوال میں جس حدیث کا حوالہ دیا گیا ہے اس کی صحت میں کلام نہیں مگر یہاں چند اصول کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔
ایک یہ کہ جب ایک حدیث سے کسی شے کی حرمت ثابت ہوتی ہو اور دوسری سے اس کی اباحت مفہوم ہوتی ہے تو اہل علم کے نزدیک حرمت کو ترجیح ہوتی ہے۔ اور یہ اصول بھی خود ارشاد نبویؐ سے ثابت ہے۔

عَنِ النُّعْمَانِ بْنِ بَشِيْرٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اِسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِيْهِ۔ كَالرَّاعِيْ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشَكُ اَنْ تَرْتَعَ فِيْهِ اَلْحَدِيْث (مُتَّفَقٌ عَلَيْهِ۔ كَمَا فِي الْمِشْكٰوةِ صفحہ ۲۴۱)

ترجمہ:۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا حلال بھی واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ اور حلال و حرام کے درمیان بعض امور مشتبہ ہیں جن کو بہت سے لوگ نہیں

جانتے۔ پس جو شخص شبہات سے بچا اس نے اپنے دین کو اور اپنی عزت کو بچالیا اور جو شخص شبہ کی چیزوں میں جا پڑا وہ حرام میں مبتلا ہو جائے گا۔ جیسے کوئی چرواہا ممنوع چراگاہ کے گرد و پیش چرائے تو قریب ہے کہ چراگاہ میں بھی چرانے لگے گا۔

اس اصول کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو جن احادیث سے ران کا ستر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ وہ مقدم ہوں گی ان روایات پر جن سے اس کے خلاف کا وہم ہوتا ہے۔ غالباً امام بخاریؒ نے بھی "حدیث انس اسند و حدیث جرید احوط" "ص ۵۳ ج ۱) کہہ کر اسی اصول کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

دوسرا اصول یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل میں بظاہر تعارض نظر آئے تو قول کو ترجیح ہوگی کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات ـــــ پوری امت کے لئے قانون عام ہیں اور افعال میں خصوصیت یا عذر کا احتمال ہے چونکہ متعدد احادیث میں آپؐ نے ران کو ستر فرمایا ہے جو امت کے لئے تشریع ہے۔ اس کے مقابلہ میں خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل سے استدلال کرنا صحیح نہیں ہوگا۔

تیسرا اصول یہ کہ اگر شارع علیہ السلام کے ارشاد فرمودہ کسی اصول اور قاعدے سے کوئی خاص جزئی واقعہ بظاہر ٹکراتا ہو تو اصول اور قاعدہ کلیہ کو ترجیح ہوگی۔ اور خاص واقعہ میں کوئی تاویل کی جائے گی۔ یہ نہیں ہوگا کہ اس خاص واقعہ کو تو اصول اور قاعدہ بنالیا جائے اور شارع علیہ السلام کے ارشاد فرمودہ اصول اور قاعدہ میں ترمیم کر ڈالی جائے۔ چونکہ آپؐ نے ایک اصول عام طور پر فرمادیا ہے کہ "الفخذ عورۃ" (ران ستر میں داخل ہے) اس لئے اس اصول کو تو محکم رکھا جائے گا۔ اور حضرت انسؓ کی حدیث میں جو ایک خاص واقعہ ذکر کیا گیا ہے اس کی کوئی توجیہہ کی جائے گی۔ مثلاً ایک یہ توجیہہ ہوسکتی ہے کہ آپؐ نے قصداً رانوں کا کپڑا نہیں ہٹایا ہوگا۔ بلکہ کپڑا اوپر کرتے ہوئے اتفاقاً ران کھل گئی ہوگی۔ چنانچہ صحیح مسلم اور مسند احمد کی روایت میں "فانحسر" کا لفظ ہے۔ یعنی ران کھل گئی۔ یہ بھی احتمال ہے کہ ران کے ستر ہونے کی تشریع بعد میں ہوئی ہو۔ اس وقت تک یہ حکم نازل نہ ہوا ہو۔

ران کا ستر ہونا چونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ثابت ہے اور کسی موقع پر ران کھل جانے کی روایت راوی کی اپنی تعبیر ہے ـــــ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نہیں اور ظاہر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد، راوی کی کسی جزئی واقعہ سے متعلق تعبیر پر مقدم ہے۔

چہارم:۔ ران کے ستر ہونے پر تو، جیسا کہ اوپر معلوم ہوا۔ ائمہ اربعہ اور اکثر فقہاء کا اتفاق ہے۔ لیکن حنفیہ گھٹنے کو بھی ستر میں شمار کرتے ہیں، کیونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں (جو اگرچہ ضعیف ہے) اس کو ستر فرمایا گیا ہے۔ نیز عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہما کی حدیث "الی الرکبتہ" کے نفقہ سے اس کا شبہ ہوتا ہے۔ اس لئے حنفیہ کے نزدیک گھٹنوں کا ستر میں شمار کیا جانا مقتضائے احتیاط ہے۔ تاہم ائمہ احناف نے اختلاف روایات کے پیش نظر ستر کے تین درجے قرار دیئے ہیں۔ چنانچہ ہدایہ (کتاب الکراہیتہ فصل فی الوط والنظر واللمس) میں ہے

وَحُكْمُ الْعَوْرَةِ فِي الرُّكْبَةِ اَخَفُّ مِنْهُ فِي الْفَخِذِ۔ وَفِي الْفَخِذِ
اَخَفُّ مِنْهُ فِي السَّوْءَةِ حَتّٰى اَنَّ كَاشِفَ الرُّكْبَةِ يُنْكَرُ عَلَيْهِ بِرِفْقٍ
وَكَاشِفَ الْفَخِذِ يُعَنَّفُ عَلَيْهِ وَكَاشِفَ السَّوْءَةِ يُؤَدَّبُ اِنْ لَجَّ۔

ترجمہ:۔ ستر کا حکم گھٹنے میں اخف ہے بہ نسبت ران کے اور ران میں اخف ہے بہ نسبت اعضائے مستورہ کے۔ چنانچہ اگر کوئی گھٹنے ننگے کرے تو اس کو نرمی سے ٹوکا جائے گا (اور اگر وہ اصرار کرے تو خاموشی اختیار کی جائے گی) اور اگر کوئی شخص ران ننگی کرے تو اس کو سختی سے روکا جائے گا (لیکن اگر وہ اصرار کرے تو اس پر دست درازی نہیں کی جائے گی) اور اگر کوئی شخص اعضائے مستورہ کو برہنہ کرے اور سمجھانے پر بھی باز نہ آئے تو اس کی گوشمالی کی جائے گی۔

اس سے ائمہ احناف کی دقیقہ رسی واضح ہو جاتی ہے کہ ایک طرف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے ان کے عشق و محبت کا یہ عالم ہے کہ آپؐ کے کسی ارشاد کو بھی خواہ ضعیف سند سے ہی منقول ہو وہ مہمل چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اور دوسری طرف ان کی حقیقت پسندی و مرتبہ شناسی کا یہ حال ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو چیز جس درجہ میں منقول ہو اسے وہی مقام و مرتبہ دیتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ احادیث نبویہ کی جمع و تطبیق اور ان کی درجہ بندی کا جو کام ائمہ احناف نے کیا ہے اس کی مثال نہیں۔ کتاب و سنت کے سمندر کی اسی غواصی کا نام تفقہ فی الدین ہے جس کے بارے میں امام شافعیؒ فرمایا کرتے تھے۔

مَنْ اَرَادَ الْفِقْهَ فَهُوَ عِيَالٌ عَلٰى اَبِيْ حَنِيْفَةَ رَحِمَهُ اللّٰهُ۔

ترجمہ:۔ جو شخص تفقہ فی الدین کا ارادہ رکھتا ہو وہ امام ابو حنیفہؒ کا دست نگر ہے۔

نوٹ:۔ دو سوال اسی نوعیت کے جناب محمد صادق صاحب میٹھادر کراچی کے موصول ہوئے۔ بعض احباب کی رائے ہوئی کہ ان کا جواب بھی انہی تیرہ سوالوں کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔ لہٰذا

سوال نمبر ۱۴ اور نمبر ۱۵ میں یہ دونوں سوال جواب درج کئے جاتے ہیں

سوال ۱۴. خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد کا حکم:

س:۔ ہمارے ہاں خطبہ کے احکام میں بتلایا جاتا ہے کہ جب امام خطبہ کے لئے ممبر پر بیٹھ جائے تو اس وقت نہ ہی نماز پڑھی جائے اور نہ ہی کلام کیا جائے حتیٰ کہ زبان سے کسی کو منع بھی نہ کیا جائے بلکہ دعا و درود بھی دل میں ہی کہہ لیا جائے زبان نہ ہلے لیکن احادیث کے حوالے سے یہ بات ثابت کی جاتی ہے کہ اگر کوئی ایسے موقع پر مسجد میں حاضر ہو کہ امام خطبہ پڑھ رہا ہو تو ہلکی دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھنا چاہئے اور اس سلسلہ میں مسلم ابن ماجہ ابو داؤد کے حوالے سے سلیک غطفانیؓ کا واقعہ نقل کیا جاتا ہے کہ خطبہ کے دوران جب وہ مسجد میں آئے اور بغیر دو رکعت پڑھے بیٹھ گئے تو آپؐ نے دریافت فرمایا کہ دو رکعت پڑھ کر بیٹھے ہو تو ان کے نفی کے جواب پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اٹھو اور دو رکعت ادا کر کے بیٹھو پھر لوگوں سے فرمایا کہ جو بھی ایسے وقت حاضر ہو وہ ہلکی دو رکعتیں پڑھ کر بیٹھے۔ مزید اس کی تفصیل میں کہا جاتا ہے کہ مروان بن حکم کے زمانہ میں فرمان شاہی تھا کہ جب بادشاہ خطبہ پڑھ رہے ہوں تو کوئی دو رکعت نماز نہ پڑھے اور علت شان شاہی کی تحقیر بتلائی گی لیکن حضرت ابو سعید خدریؓ ایسے موقع پر پہنچتے ہیں اور دو رکعت ادا فرماتے ہیں اور جبراً ان کی یہ نماز تڑوانے کی بھی پراہ نہیں فرماتے ہیں کہ سنت رسولؐ کسی بادشاہ کے قانون پر قربان نہیں کی جاسکتی بلکہ تمام قوانین سلطنت ایک سنت پر بائیں پاؤں تلے روندے جاسکتے ہیں اس واقعہ کے لئے حوالہ ترمذی شریف کا دیا جاتا ہے۔ اور خطبہ کے دوران آنے والا دو رکعت نہ پڑھے اسے مروانی بدعت کہا جاتا ہے اور ان کے متعلق یہ بھی بتلایا جاتا ہے کہ اس بادشاہ نے عید کے خطبہ کو بھی نماز سے پہلے کر دیا تھا۔ مندرجہ بالا تفصیل کے پیش نظر حدیث سے تطابق کی صورت کیا ہوگی۔ ہمارے ہاں تو جیسے اور افعال خطبہ کے دوران منع ہیں ایسے ہی نماز کو بھی منع کیا جاتا ہے۔ یہاں نماز کا حکم دیا جارہا ہے۔ اس حدیث کی روشنی میں نماز کی اجازت ہمارے ہاں بھی ہے یا نہیں؟ نفی کی صورت میں ہمارے دلائل اور اس حدیث کا جواب کیا ہے؟ اس حدیث میں جن دو رکعتوں کا ذکر ہے اس سے تو

تحیۃ المسجد سمجھ میں آتی ہے جو کہ شاید وجوب کا درجہ نہیں رکھتی یہاں تاکید سے سنت موکدہ سمجھ میں آتی ہے۔ اگر تحیۃ المسجد (ان دو رکعتوں کی) حیثیت سنت موکدہ کی ہے تو چار سنت قبل الجمعہ کی اجازت ہونی چاہئے جو کہ سنت موکدہ ہی ہے۔ اس ضمن میں ایک سوال ذہن میں یہ بھی اٹھتا ہے کہ جو شخص عین خطبہ کے دوران آئے اسے وضو بھی کرنا ہوتا ہے اس کے وضو کے عمل سے ثواب لغو ہو جائے گا یا نہیں؟

ج:۔ حضرات خلفائے راشدینؓ اور جمہور صحابہؓ و تابعینؒ کے نزدیک خطبہ کے دوران صلوٰۃ و کلام ممنوع ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہؒ امام مالکؒ اور اکثر فقہائے امت اسی کے قائل ہیں۔ اور قرآن و سنت کی روشنی میں یہی مسلک راجح اور صواب ہے۔ اس کے برعکس بعض صحابہؓ و تابعینؒ خطبہ کی حالت میں بھی تحیۃ المسجد کے قائل تھے۔ امام شافعیؒ۔ امام احمد بن حنبلؒ اور مابعد کے بیشتر محدثینؒ نے اسی مسلک کو اختیار کیا ہے۔ تاہم ان حضرات کے نزدیک بھی تحیۃ المسجد کے استحسان یا جواز کی شرط یہ ہے کہ خطبہ آخری مراحل میں نہ ہو۔ کہ تحیۃ المسجد میں مشغول ہونے کی صورت میں جماعت شروع ہو جانے کا اندیشہ ہو, ایسی حالت میں ان کے نزدیک بھی تحیۃ المسجد میں مشغول ہونا ممنوع ہے۔

جو حضرات خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد کے جواز یا استحسان کے قائل ہیں ان کا استدلال حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہے, جو سوال میں ذکر کی گئی ہے, اس پر گفتگو کرنے سے پہلے مناسب ہو گا کہ جمہور امت نے جو مسلک اختیار کیا ہے کہ خطبہ کے دوران نماز اور کلام ممنوع ہے اس کے دلائل معلوم کر لئے جائیں۔

قرآن کریم: حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (الاعراف: ۲۰۴)

ترجمہ:۔ اور جب قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو, امید ہے کہ تم پر رحمت ہو (بیان القرآن)

فاتحہ خلف الامام کی بحث میں شیخ ابن تیمیہؒ کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں کہ یہ آیت نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے چنانچہ وہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں:

"اور سلف سے استفاضہ و شہرت کے ساتھ منقول ہے کہ یہ آیت قراۃ فی الصلوٰۃ

کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور بعض کا قول ہے کہ خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور امام احمدؒ نے اس پرا جماع ذکر کیا ہے کہ یہ نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی"۔ (طبع قدیم ص ۱۴۳ ج ۱، جدید ص ۲۶۹ ج ۲۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"امام احمدؒ نے اس پر لوگوں کا اجماع ذکر کیا ہے کہ یہ آیت نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی۔" (ص ۴۱۲ ج ۱ ص ۳۱۲ ج ۲۳)

پس جب یہ آیت کریمہ نماز اور خطبہ دونوں سے متعلق ہے۔ اور امام احمدؒ اس پر لوگوں کا اجماع نقل کرتے ہیں تو قرآن کی نص قطعی سے خطبہ کا استماع اور اس کے لئے خاموش رہنا واجب ہوا، اور ہر ایسا قول و فعل ممنوع ٹھہرا جو استماع و انصات کے منافی ہو۔ راز اس کا یہ ہے کہ خطبہ چونکہ قرآنی آیات پر مشتمل ہوتا ہے اس لئے پورے خطبہ کو "الذکر" فرما کر اس کے استماع کو واجب فرمایا گیا ہے۔ اور پھر خطیب کی حیثیت چونکہ خدائی نمائندہ کی ہوتی ہے۔ جو لوگوں کو احکام خداوندی سنا رہا ہے۔ اس لئے حاضرین کو گوش بر آواز رہنے کا حکم دے کر ہر ایسی حرکت کو ممنوع قرار دیا گیا جو خطبہ کی سماعت میں مخل ہو۔ اور جو شخص اس موقع پر استماع کے منافی حرکت کرے اس کو لغو کا مرتکب اور جمعہ میں اس کی حاضری کو باطل و بے کار اور ثواب سے محروم فرمایا کیونکہ خطبہ میں دو طرفہ عمل ہے۔ خطیب کی طرف سے اسماع یعنی احکام خداوندی کا سنانا، اور حاضرین کی طرف سے استماع یعنی سننا اور خاموش رہنا۔ پس حاضرین میں سے جو شخص فریضہ استماع سے سرتابی کرتا ہے وہ گویا خطیب اور خطبہ کا استخفاف کر رہا ہے کہ خطیب اس کو احکام خداوندی سنا رہا ہے۔ مگر یہ آمادہ سماعت نہیں۔ بلکہ کسی دوسرے شغل میں مصروف ہے شائد اسی بنا پر حدیث ابن عباسؓ میں ایسے شخص کو گدھے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ (مشکوۃ ص ۱۲۳ ج ۱)

اس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ خطبہ جمعہ کی حیثیت محض وعظ و تذکیر کی نہیں بلکہ اس میں ایک گونہ نماز کی شان پائی جاتی ہے۔ شائد یہی حکمت ہے کہ خطبہ کو صحت جمعہ کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے۔ اور شائد اسی سے بعض سلف نے یہ سمجھا ہے کہ جس شخص سے خطبہ فوت ہو جائے اس کا جمعہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اسے ظہر کی چار رکعتیں پڑھنی ہوں گی، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے

اَلْخُطْبَةُ مَوْضِعُ الرَّكْعَتَيْنِ مَنْ فَاتَتْهُ الْخُطْبَةُ صَلّٰى اَرْبَعًا۔ (مصنف عبدالرزاق ص ۲۳ ج ۴ ۰ ابن ابی شیبہ صفحہ ۱۲۸ ج ۲)

ترجمہ:۔ جمعہ کا خطبہ دو رکعت کے قائم مقام ہے۔ جس سے خطبہ فوت ہو جائے وہ چار رکعتیں پڑھے۔

اور طاؤس ’’مجاہد‘‘ اور عطاؒ (’’تابعین‘‘) سے نقل کیا ہے:

فَمَنْ لَمْ يُدْرِكِ الْخُطْبَةَ صَلَّى أَرْبَعًا (عبدالرزاق صفحہ ۲۳۸، ابن ابی شیبہ صفحہ ۱۲۸)

ترجمہ:۔ جس نے خطبہ نہیں پایا وہ چار رکعتیں پڑھے۔

اگرچہ جمہور امت کے نزدیک ایسے شخص کو جمعہ کی دو ہی رکعتیں پڑھنی ہوں گی۔ لیکن ان آثار سے خطبہ جمعہ کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔

الغرض آیت موصوفہ میں خطبہ جمعہ کے استماع کو لازم قرار دیا گیا ہے۔ لہٰذا خطبہ کے دوران صلوٰۃ و کلام، جو استماع کے منافی ہیں۔ اس آیت کریمہ کی رو سے ممنوع ہوں گے۔

احادیث نبویہ ؐ . اور یہی مضمون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث میں مذکور ہے چنانچہ:

۱۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے:

لَا يَغْتَسِلُ رَجُلٌ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَيَتَطَهَّرُ مَا اسْتَطَاعَ مِنْ طُهْرٍ وَ يَدَّهِنُ مِنْ دُهْنِهِ وَيَمَسُّ مِنْ طِيبِ بَيْتِهِ ثُمَّ يَخْرُجُ فَلَا يُفَرِّقُ بَيْنَ اثْنَيْنِ ثُمَّ يُصَلِّي مَا كُتِبَ لَهُ ثُمَّ يُنْصِتُ إِذَا تَكَلَّمَ الْإِمَامُ۔ إِلَّا غُفِرَ لَهُ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجُمُعَةِ الْأُخْرَىٰ (صحیح بخاری صفحہ ۱۲۱ ج ۱، صفحہ ۱۲۴)

ترجمہ:۔ جو شخص جمعہ کے دن غسل کرے اور خوب صفائی کرے۔ تیل لگائے اور گھر میں خوشبو ہو تو وہ لگائے پھر جمعہ کے لئے نکلے تو دو آدمیوں کے درمیان نہ بیٹھے، پھر جتنی نماز اس کے لئے مقدر ہے پڑھے۔ پھر جب امام خطبہ شروع کرے تو خاموش رہے۔ تو ایسے شخص کے اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

۲۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے یہ الفاظ مروی ہیں۔

فَصَلَّى مَا قُدِّرَ لَهُ ثُمَّ أَنْصَتَ حَتَّى يَفْرُغَ مِنْ خُطْبَتِهِ (صفحہ ۲۸۳)

ترجمہ:۔ پھر جتنی نماز اس کے لئے مقدر تھی پڑھی، پھر خاموش رہا یہاں تک امام خطبہ سے فارغ ہو گیا۔ الخ

۳۔ حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے اسی مضمون کی حدیث مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

ثُمَّ خَرَجَ إِلَى الْمَسْجِدِ فَيَرْكَعُ إِنْ بَدَا لَهُ وَلَمْ يُؤْذِ أَحَدًا، ثُمَّ أَنْصَتَ حَتَّى يُصَلِّيَ (رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر ورجالہ ثقات مجمع الزوائد صفحہ ۱۷۱ ج ۲)

ترجمہ:۔ پھر مسجد کی طرف نکلا، پس نماز پڑھتا رہا جس قدر جی چاہا۔ اور کسی کو ایذا نہیں دی پھر نماز جمعہ ختم ہونے تک خاموش رہا۔

۴۔ اور حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے:

وَرَكَعَ مَا قُضِيَ لَهُ ثُمَّ انْتَظَرَ حَتّٰى يَنْصَرِفَ الْإِمَامُ۔ (رواہ احمد و الطبرانی فی الکبیر عن حرب بن قیس عن ابی الدرداء۔ وحرب لم یسمع من ابی الدرداء صفحہ ۱۷۱ ج ۲)

ترجمہ:۔ اور جس قدر نماز مقدر تھی پڑھی، پھر امام کے فارغ ہونے تک خاموش رہا۔

۵۔ اور حضرت ابو سعید خدری اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

ثُمَّ صَلّٰى مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَهُ ثُمَّ أَنْصَتَ إِذَا خَرَجَ الْإِمَامُ (ابوداؤد صفحہ ۵۰ ج ۱، واللفظ لہ طحاوی صفحہ ۱۸۰ ج ۱)

ترجمہ:۔ پھر نماز پڑھی جو اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے مقدر فرمائی تھی۔ پھر خاموش رہا۔ جب امام خطبہ کے لئے نکل آیا۔

ان احادیث طیبہ میں دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کی حد خطبہ سے پہلے تک ارشاد فرمائی ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص خطبہ شروع ہونے کے بعد نماز پڑھتا ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مقرر کردہ حد سے تجاوز کرتا ہے

دوم: یہ کہ ان احادیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز اور سکوت کو متقابل ذکر فرمایا ہے، خطبہ سے پہلے نماز اور خطبہ کے دوران انصات یعنی خاموش رہنا۔ جس سے واضح ہوتا ہے کہ خطبہ کے دوران نماز پڑھنا سکوت کے منافی ہے۔ چونکہ سکوت اس حالت میں واجب ہے لہذا نماز اور کلام دونوں ممنوع ہوں گے۔

۶۔ صحاح ستہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی مشہور حدیث ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی۔ پانچویں اور چھٹی گھڑی میں آنے والوں کے درجات کو علی الترتیب بیان کرتے ہوئے فرمایا:

فَإِذَا خَرَجَ الْإِمَامُ طَوَوْا صُحُفَهُمْ وَيَسْتَمِعُوْنَ الذِّكْرَ۔ (صحیح البخاری صفحہ ۱۲۷ جلد ۱، صحیح مسلم صفحہ ۲۸۳ ج ۱، نسائی صفحہ ۲۰۵ ج ۱، ترمذی صفحہ ۶۶ ج ۱)

ترجمہ:۔ پھر جب امام خطبہ کے لئے نکل آتا ہے تو فرشتے اپنے صحیفے لپیٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اور ذکر کے سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

اسی مضمون کی حدیث حضرت ابو امامہؓ سے بھی مروی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

حَتّٰی اِذَا خَرَجَ الْاِمَامُ رُفِعَتِ الصُّحُفُ (رواہ احمد والطبرانی فی الکبیر بنحوہ ورجال احمد ثقات مجمع الزوائد صفحہ ۱۷۷ ج ۲)

ترجمہ:۔ یہاں تک کہ جب امام نکل آئے تو صحیفے اٹھالئے جاتے ہیں۔

۷۔ نیز اسی مضمون کی حدیث حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

فَاِذَا اَذَّنَ الْمُؤَذِّنُوْنَ وَجَلَسَ الْاِمَامُ عَلَی الْمِنْبَرِ طُوِیَتِ الصُّحُفُ وَدَخَلُوا الْمَسْجِدَ یَسْتَمِعُوْنَ الذِّکْرَ (رواہ احمد ورجالہ ثقات، زوائد صفحہ ۱۷۷ ج ۲)

ترجمہ:۔ پس جب اذان شروع ہوتی ہے۔ اور امام ممبر پر بیٹھ جاتا ہے تو صحیفے لپیٹ دیئے جاتے ہیں اور فرشتے مسجد میں آکر ذکر سننے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

امام کے نکل آنے کے بعد فرشتوں کا نامہ اعمال لپیٹ کر ذکر سننے میں مشغول ہو جانا اس امر کی دلیل ہے کہ خطبہ کی حالت، ذکر سننے کے سوا، تمام اعمال کی بندش کا وقت ہے۔ اس وقت استماع کے سوا کسی عمل خیر کی گنجائش نہیں، نہ نماز کی، نہ کلام کی۔ اور یہ مضمون متعدد احادیث میں صاف صاف آیا ہے، چنانچہ:

۸۔ مسند احمد (ج ۵ ص ۷۵) میں حضرت نبیشہ ہذلی رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

اِنَّ الْمُسْلِمَ اِذَا اغْتَسَلَ یَوْمَ الْجُمُعَةِ ثُمَّ اَقْبَلَ اِلَی الْمَسْجِدِ، لَا یُؤْذِیْ اَحَدًا، فَاِنْ لَّمْ یَجِدِ الْاِمَامَ خَرَجَ صَلّٰی مَا بَدَا لَهٗ - وَاِنْ وَجَدَ الْاِمَامَ قَدْ خَرَجَ جَلَسَ فَاسْتَمَعَ وَاَنْصَتَ حَتّٰی یَقْضِیَ الْاِمَامُ جُمُعَتَهٗ، وَكَلَامَهٗ الخ (رَوَاهُ اَحْمَدُ، وَرِجَالُهٗ رِجَالُ الصَّحِیْحِ، خَلَا شَیْخِ اَحْمَدَ، وَهُوَ ثِقَةٌ۔ زوائد صفحہ ۱۷۱ ج ۲)

ترجمہ:۔ مسلمان جب جمعہ کے دن غسل کر کے مسجد کی طرف چلے، کسی کو ایذا نہ دے۔ پھر اگر دیکھے کہ امام ابھی نکلا نہیں تو جتنی چاہے نماز پڑھتا رہے۔ اور اگر دیکھے کہ امام نکل آیا ہے تو بیٹھ جائے سننے لگے، اور خاموش رہے یہاں تک کہ امام خطبہ و نماز سے فارغ ہو جائے۔

۹۔۔۔اور طبرانی کی معجم کبیر میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مروی ہے:

اِذَا دَخَلَ اَحَدُکُمُ الْمَسْجِدَ وَالْاِمَامُ عَلَی الْمِنْبَرِ فَلَا صَلٰوۃَ وَلَا کَلَامَ حَتّٰی یَفْرُغَ الْاِمَامُ (وَفِیْہِ اَیُّوْبُ بْنُ نَہِیْکٍ، وَھُوَ مَتْرُوْکٌ ضَعَّفَہٗ جَمَاعَۃٌ وَذَکَرَہُ ابْنُ حِبَّانَ فِی الثِّقَاتِ وَقَالَ یُخْطِئُ (زوائد صفحہ ۱۸۴ ج ۲)

ترجمہ:۔ جب تم سے کوئی شخص مسجد میں اس وقت داخل ہو جب کہ امام ممبر پر ہو تو نماز کلام نہیں جب تک امام فارغ نہ ہو جائے۔

اس روایت کا ایک راوی اگر مختلف فیہ ہے۔ جیسا کہ علامہ ہثیمی ؒ نے ابن حبان ؒ سے اس کی توثیق کی نقل کی ہے۔ لیکن اس میں ٹھیک وہی مضمون ہے جو قرآن کریم اور صحیح احادیث میں اوپر آچکا ہے۔

علاوہ ازیں متعدد بلکہ متواتر احادیث میں یہ مضمون وارد ہے کہ خطبہ کی حالت میں کلام کی اجازت نہیں، اور یہ کہ جو شخص خطبہ کے دوران کسی کو خاموش کرنے کے لئے "انصت یا صہ" (خاموش!) کا لفظ کہہ دے اس کا بھی جمعہ باطل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ امر بالمعروف بشرط قدرت واجب ہے۔ پس جب کسی ایسے واجب میں مشغول ہونا، جو استماع وانصات کے منافی ہو، اس وقت جائز نہیں۔ تو تحیۃ المسجد میں مشغول ہونا، بدرجہ اولیٰ ناجائز ہو گا، کیونکہ اس کا درجہ ایک تو مستحب کا ہے۔ دوسرے یہ "خاموش!" کہنے سے بڑھ کر مخل استماع ہے۔۔۔۔اس کی مثال ایسی ہے کہ قرآن کریم نے والدین کو "اف" کہنے سے منع کیا ہے اس سے اہل عقل نے بدلالت النص یہ سمجھا کہ جب "اف" کہنا جائز نہیں تو مار پیٹ جو قباحت میں اس سے بڑھ کر ہے بدرجہ اولیٰ ناجائز ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران "صہ" کہنے کی اجازت نہیں دی۔ بلکہ اس دو حرفی لفظ کو بھی لغو اور جمعہ کا باطل کنندہ فرمایا ہے تو نماز جو اس سے بڑھ کر مخل استماع ہے وہ بدلالۃ النص اس سے بڑھ کر ناجائز ہوگی۔

سلف صالحین کا تعامل۔ قرآن وحدیث کے نصوص کے بعد اس مسئلہ میں حضرات صحابہ ؓ و تابعین ؒ کے تعامل پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

۱۔۔۔موطا امام مالک میں بروایت زہری حضرت ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

اِنَّهُمْ كَانُوْا فِيْ زَمَنِ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ يُصَلُّوْنَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ حَتّٰى يَخْرُجَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ، فَاِذَا خَرَجَ عُمَرُ، وَجَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ۔ وَاَذَّنَ الْمُؤَذِّنُوْنَ قَالَ ثَعْلَبَةُ جَلَسْنَا نَتَحَدَّثُ۔ فَاِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُوْنَ وَقَامَ عُمَرُ يَخْطُبُ اَنْصَتْنَا۔ فَلَمْ يَتَكَلَّمْ مِنَّا اَحَدٌ۔ قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَخُرُوْجُ الْاِمَامِ يَقْطَعُ الصَّلٰوةَ وَكَلَامُهُ يَقْطَعُ الْكَلَامَ۔ (مؤطا امام مالک صفحہ ۳۶، مؤطا امام محمد صفحہ ۱۳۸)

ترجمہ:۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں لوگ جمعہ کے دن نماز پڑھتے رہتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لاتے۔ پس جب حضرت عمرؓ تشریف لا کر ممبر پر بیٹھ جاتے اور مؤذن اذان کہتے تو ہم بیٹھے بیٹھے بات کر لیا کرتے تھے۔ پھر جب مؤذن خاموش ہو جاتے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ کے لئے کھڑے ہو جاتے تو ہم خاموش ہو جاتے۔ پس ہم سے کوئی شخص کلام نہ کرتا، ابن شہابؒ فرماتے ہیں پس امام کا نکلنا نماز کو اور اس کا کلام کرنا گفتگو کو بند کر دیتا ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ میں ثعلبہ بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

اَدْرَكْتُ عُمَرَ وَعُثْمَانَ فَكَانَ الْاِمَامُ اِذَا خَرَجَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ تَرَكْنَا الصَّلٰوةَ (صفحہ ۱۱۱ ج ۲)

ترجمہ:۔ میں نے حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کا زمانہ پایا پس جب امام جمعہ کے دن خطبہ کے لئے نکل آتا تو ہم نماز چھوڑ دیتے تھے۔

۲۔ نصب الرایہ (۲۔ ۲۰۴) میں مسند اسحاق بن راہویہ سے حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

كُنَّا نُصَلِّيْ فِيْ زَمَنِ عُمَرَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ فَاِذَا خَرَجَ عُمَرُ وَجَلَسَ عَلَى الْمِنْبَرِ قَطَعْنَا الصَّلٰوةَ۔ وَكُنَّا نَتَحَدَّثُ وَيُحَدِّثُوْنَا، وَرُبَّمَا نَسْاَلُ الرَّجُلَ الَّذِيْ يَلِيْهِ عَنْ سُوْقِهٖ وَمَعَاشِهٖ فَاِذَا سَكَتَ الْمُؤَذِّنُ خَطَبَ وَلَمْ يَتَكَلَّمْ اَحَدٌ حَتّٰى يَفْرَغَ مِنْ خُطْبَتِهٖ۔

ترجمہ:۔ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جمعہ کے دن نماز پڑھتے تھے۔ پھر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لا کر ممبر پر رونق افروز ہوتے تو ہم نماز بند کر دیتے تھے۔ اور لوگ آپس میں بات چیت کر لیا کرتے

تھے۔ اور کبھی ایک شخص اپنے قریب کے شخص سے اس کے بازار اور معاش کا حال احوال بھی پوچھ لیتا پھر جب موذن خاموش ہو جاتا حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ شروع کرتے۔ اور ان کے خطبہ سے فارغ ہونے تک ہم میں سے کوئی شخص بات نہ کرتا۔

حافظؒ "درایہ" میں فرماتے ہیں: اسنادہ جید۔ (حاشیہ نصب الرایہ ص ۲۰۴ ج ۲)

۳۔۔۔ نیز موطا میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ عموماً اپنے خطبہ میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔

اِذَا قَامَ الْاِمَامُ فَاسْتَمِعُوْا وَاَنْصِتُوْا فَاِنَّ لِلْمُنْصِتِ الَّذِیْ لَایَسْمَعُ مِنَ الْخُطْبَۃِ مِثْلَ مَا لِلسَّامِعِ الْمُنْصِتِ۔ (موطا امام محمد صفحہ ۱۳۸)

ترجمہ:۔ جب امام کھڑا ہو جائے تو اس کی طرف کان لگاؤ، اور خاموش رہا کرو، کیونکہ جو شخص خاموش رہے خواہ اسے خطبہ نہ سنتا ہو اس کو بھی اتنا ہی اجر ملتا ہے جتنا کہ خاموش رہ کر سننے والے کو۔

۴۔۔۔ مصنف عبدالرزاق میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے کہ جمعہ میں تین قسم کے لوگ شریک ہوتے ہیں ایک وہ شخص جو جمعہ میں سکون۔ وقار اور خاموشی کے ساتھ حاضر ہوا، یہ تو ایسا شخص ہے کہ اس کے جمعہ سے جمعہ تک کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں (راوی کہتا ہے کہ میرا خیال ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا تھا۔ اور تین دن مزید۔۔۔ دوسرا وہ شخص جو جمعہ میں شریک ہو کر لغو کا مرتکب ہو اس کا حصہ بس یہی لغو ہے، (مطلب یہ کہ نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق ہے)

وَرَجُلٌ صَلّٰی بَعْدَ خُرُوْجِ الْاِمَامِ فَلَیْسَتْ بِسُنَّۃٍ۔ اِنْ شَاءَ اَعْطَاہُ وَاِنْ شَاءَ مَنَعَہٗ۔ (صفحہ ۲۱۰ ج ۳)

ترجمہ:۔ اور تیسرا وہ شخص جس نے امام کے نکلنے کے بعد نماز پڑھی۔ پس اس کی یہ نماز سنت کے مطابق نہیں، اب اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو اس کو (ثواب) دے۔ اور چاہے تو نہ دے۔

۵۔۔۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ خطبہ کے دوران آدمی نماز پڑھ سکتا ہے؟ فرمایا، اگر سبھی پڑھنے لگیں تو کیا یہ ٹھیک ہوگا؟ (ایضاً ص ۲۴۵)

۶۔۔۔ ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ وہ امام کے آنے سے پہلے نماز پڑھتے تھے۔ امام کے آنے کا وقت ہوتا تو نماز نہیں پڑھتے تھے بلکہ بیٹھ جاتے تھے (ایضاً ص ۲۱۰)

۷۔۔۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت علی۔ حضرت ابن عمر اور حضرت ابن عباس رضی اللہ

عنہم سے نقل کیا ہے:

اَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْرَهُوْنَ الصَّلٰوةَ وَالْكَلَامَ بَعْدَ خُرُوْجِ الْإِمَامِ (صفحہ ۱۱۱ ج ۲)

ترجمہ:۔ یہ حضرات امام کے نکلنے کے بعد صلوٰۃ و کلام کو مکروہ سمجھتے تھے۔

۸۔۔۔ امام طحاویؒ نے حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

اَلصَّلٰوةُ، وَالْإِمَامُ عَلَى الْمِنْبَرِ مَعْصِيَةٌ۔ (طحاوی صفحہ ۱۸۱ ج ۱)

ترجمہ:۔ جب امام ممبر پر ہو اس وقت نماز پڑھنا گناہ ہے۔

۹۔۔۔ اور حضرت ثعلبہ بن ابی مالک رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

جُلُوْسُ الْإِمَامِ عَلَى الْمِنْبَرِ يَقْطَعُ الصَّلٰوةَ وَكَلَامُهٗ يَقْطَعُ الْكَلَامَ۔

ترجمہ:۔ امام کا ممبر پر بیٹھنا نماز کو اور اس کا کلام کرنا گفتگو کو بند کر دیتا ہے۔ (حوالہ مذکور)

۱۰۔۔۔ معارف السنن ص ۳۶۸ ج ۴ میں قاضی عیاضؒ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خطبہ کے دوران نماز پڑھنے سے منع فرمایا کرتے تھے۔

۱۱۔۔۔ مصنف عبد الرزاق میں سید التابعین حضرت سعید بن مسیب رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے:

خُرُوْجُ الْإِمَامِ يَقْطَعُ الصَّلٰوةَ، وَكَلَامُهٗ يَقْطَعُ الْكَلَامَ (عبد الرزاق صفحہ ۲۰۸ ج ۳)

ترجمہ:۔ امام کا نکلنا نماز کو اور اس کا کلام کرنا گفتگو بند کر دیتا ہے۔

۱۲۔۔۔ مصنف عبد الرزاق ص ۲۴۵ ج ۳، اور ابن ابی شیبہ ص ۱۱۱ ج ۲ میں قاضی شریحؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ خطبہ کے دوران نماز کے قائل نہیں تھے۔

۱۳۔۔۔ مصنف عبد الرزاق (ص ۲۴۵ ج ۳، ص ۲۴۶) میں قتادہؒ اور عطاؒ سے یہی نقل ہے۔

۱۴۔۔۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں ابن سیرینؒ، عروہؒ بن زبیر اور زہریؒ سے ممانعت نقل کی ہے۔

سلیک غطفانیؓ کا واقعہ:۔ سوال میں حضرت سلیک غطفانی رضی اللہ عنہ کے جس واقعہ کا حوالہ دیا گیا ہے اس کے بارے میں چند امور پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

۱۔۔۔ یہ تو اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن کریم نے خطبہ کے استماع و انصات کو فرض قرار دیا ہے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متواتر ارشادات میں بھی اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ خلفائے راشدین اور جمہور صحابہ و تابعین (رضوان اللہ علیہم اجمعین) قرآن و سنت کے انہی نصوص کے پیش نظر خطبہ کے دوران صلوٰۃ و کلام کے قائل نہیں تھے۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ سلیک غطفانیؓ کا واقعہ ان کے علم میں تھا۔ کیونکہ ہمیں تو اس واقعہ کا علم روایات کے ذریعہ ہوا۔ مگر یہ اکابر اس واقعہ کے عینی

شلہد تھے۔ یہ واقعہ جمعہ کے اجتماع عام میں پیش آیا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیک ؓ سے جو کچھ ارشاد فرمایا، بر سر ممبر ارشاد فرمایا تھا۔ اس لئے یہ تاویل تو ممکن نہیں کہ ان حضرات کو اس واقعہ کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا علم نہیں ہو گا۔

اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات دیدہ و دانستہ بغیر کسی معقول وجہ کے حدیث نبوی ؐ کو ترک کر دیں۔ اور نص نبوی ؐ کے خلاف کے قائل ہو جائیں۔ کیونکہ اگر اس احتمال کو تسلیم کر لیا جائے تو حضرات خلفائے راشدین ؓ اور جمہور صحابہ ؓ و تابعین ؒ کے دین و دیانت پر ہی سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ یہ احتمال کسی رافضی ذہن میں تو آ سکتا ہے، مگر صحیح العقیدہ مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا

اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اکابر ہم لوگوں سے بڑھ کر متبع سنت اور حسنات کے حریص تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیک ؓ کو جو حکم فرمایا اگر یہ سب کے لئے عام ہوتا تو ناممکن تھا کہ تمام صحابہ کرام خصوصاً حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اس حکم پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ اور اس کار ثواب سے نہ صرف خود محروم رہا کرتے۔ بلکہ دوسروں کو بھی منع کیا کرتے۔

۲ــــ مندرجہ بالا حقائق بالکل صاف اور بدیہی ہیں۔ جن سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان اکابر نے جو اس حدیث پر عمل نہیں فرمایا تو اس کی کوئی معقول اور صحیح وجہ ہو گی ــــ رہا یہ سوال کہ وہ وجہ کیا ہے؟ اس کا جواب صرف ہمارے ذمہ نہیں بلکہ ان تمام لوگوں کے ذمہ ہے جو صحابہ کرام اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حق و صداقت کے علمبردار سمجھتے ہیں۔ اور جن کا ذہن رفض کے شائبہ سے پاک ہے۔ اگر کسی حدیث کی مخالفت کا الزام امام اعظم ابو حنیفہ ؒ پر ہو تو اس کی جواب دہی تو مان لیجئے کہ صرف حنفیہ ہی کا فرض ہے۔ لیکن خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تو صرف حنفیوں کے نہیں، اگر کسی حدیث کی مخالفت کا الزام خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم پر آتا ہے تو اس کی جواب دہی ہر مسلمان کا فرض ہے۔

اور یہیں سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جانی چاہئے کہ خبر واحد کی اہمیت زیادہ ہے یا خلفائے راشدین ؓ اور حضرات صحابہ ؓ کے تعامل کی؟ یعنی جب خلفائے راشدین ؓ اور عام صحابہ ؓ کا تعامل کسی خبر واحد کے خلاف ہو (جیسا کہ ہمارے زیر بحث مسئلہ میں) تو خبر واحد کو واجب العمل قرار دے کر ان اکابر کو مورد الزام ٹھہرایا جائے گا؟ یا یہ کہ ان اکابر کے تعامل کی روشنی میں خود خبر واحد کو لائق تاویل تصور کیا جائے گا۔ پہلا راستہ رفض و بدعت کی طرف جاتا ہے۔ اور دوسرا "ما انا علیہ واصحابی" کی طرف۔ اب ہر شخص کو اختیار ہے کہ ان دونوں میں سے جونسا راستہ چاہے

اختیار کرلے۔

۳۔ ان اکابر نے سلیک غطفانیؓ کی روایت کو جو معمول بہا نہیں سمجھا ہمارے نزدیک اس کی بلا تکلف دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حضرات جانتے تھے کہ سلیکؓ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو رکعتیں پڑھنے کا جو حکم فرمایا ہے، یہ عام حکم نہیں بلکہ یہ صرف انہی کے لئے ایک خصوصی واستثنائی حکم ہے،

دوم یہ کہ ان حضرات کو معلوم تھا کہ اس واقعہ کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران صلوٰۃ و کلام سے ممانعت فرمائی ہے، اس لئے اب اس کا جواز باقی نہیں رہا۔

۴۔ پہلی توجیہہ، یعنی کہ اس واقعہ کو خصوصیت پر محمول کیا جائے۔ اس کے قرائن مندرجہ ذیل ہیں۔

الف: خصوصیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کو متعدد ایسے واقعات پیش آئے کہ ان کی حاضری خطبہ کے دوران ہوئی مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دوگانہ ادا کرنے کا حکم نہیں فرمایا:

مثلاً:

۱۔ صحیح بخاری ص ۱۲۷ ج ۱ (باب الاستسقاء فی المسجد الجامع) میں ان صاحب کا واقعہ مذکور ہے جنہوں نے خطبہ کے دوران آتے ہی بارش کی دعا کی درخواست کی تھی، آپؐ نے اسے دو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

۲۔ پھر اسی روایت میں اس شخص کے آئندہ جمعہ آنے کا ذکر ہے، اس موقعہ پر بھی آپؐ نے یہ حکم نہیں فرمایا۔

۳۔ ابو داؤد (ص ۱۵۶ ج ۱ (باب الامام یکلم الرجل فی خطبتہ) میں مذکور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ کے دوران فرمایا۔ "بیٹھ جاؤ" حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ابھی مسجد کے دروازے سے باہر تھے کہ ارشاد گرامی سن کر وہیں بیٹھ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر مبارک ان پر پڑی تو ان سے فرمایا: "ابن مسعود! اندر آجاؤ" ۔ مگر ان کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا۔

۴۔ ابو داؤد ص ۱۵۹ ج ۱ اور نسائی ص ۲۰۷ ج ۱ میں اس شخص کا واقعہ مذکور ہے جو خطبہ کے دوران لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا آرہا تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا: "اجلس فقد اذیت" ۔ "بیٹھ جا! تونے ایذا دی ہے۔" اور اسے دو رکعتوں کا حکم نہیں فرمایا۔

ب: روایات اس پر متفق ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیکؓ کے بیٹھ جانے کے بعد انہیں دو رکعتیں پڑھنے کا حکم فرمایا تھا۔ حالانکہ بیٹھ جانے کے بعد تحیۃ المسجد ساقط

ہو جاتا ہے۔ اور جو شخص مسجد میں بیٹھا ہو اس کے لئے خطبہ کے دوران نوافل پڑھنا کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں ہے۔ پس اگر یہ خصوص واستثنائی حکم نہ ہوتا تو ان کے بیٹھ جانے کے بعد (اور وہ بھی خطبہ کے دوران) انہیں نوافل پڑھنے کا حکم نہ دیا جاتا۔

ج: پھر روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ابھی ممبر پر تشریف فرما ہوئے تھے کہ سلیکؓ آکر بیٹھ گئے. گویا ان سے گفتگو خطبہ کے دوران نہیں، بلکہ خطبہ شروع ہونے سے پہلے ہوئی۔ چنانچہ صحیح مسلم ص ۲۸۷ ج ۱ میں ہے:

جَاءَ سُلَيْكُ الْغَطَفَانِيُّ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَرَسُوْلُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدًا عَلَى الْمِنْبَرِ، فَقَعَدَ سُلَيْكُ قَبْلَ اَنْ يُّصَلِّيَ. الخ

ترجمہ:۔ سلیک غطفانیؓ جمعہ کے دن اس وقت آئے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ممبر پر بیٹھے تھے. پس سلیکؓ نماز پڑھنے سے پہلے بیٹھ گئے۔

امام نسائیؒ نے سنن کبریٰ میں اس روایت پر یہ باب باندھا ہے۔ "باب الصلوٰۃ قبل الخطبہ" (خطبہ سے پہلے نماز کا بیان) نصب الرایہ ص ۲۰۴ ج ۲

نیز یہ بھی آتا ہے کہ سلیکؓ جب تک دوگانہ سے فارغ نہیں ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ شروع نہیں فرمایا. چنانچہ دار قطنی ص ۱۶۹ کی روایت میں ہے:

فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُمْ فَارْكَعْ رَكْعَتَيْنِ۔ وَاَمْسَكَ عَنْ خُطْبَتِهٖ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ صَلٰوتِهٖ۔

ترجمہ:۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اٹھو! دو رکعتیں پڑھو. اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ سے رکے رہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی نماز سے فارغ ہو لئے۔

امام دار قطنیؒ اس روایت کو مسند اور مرسل دونوں طرح روایت کر کے لکھتے ہیں کہ مرسل صحیح ہے مرسل روایت جب صحیح ہو تو عام اہل علم کے نزدیک حجت ہے۔ اور اگر اس کے طرق متعدد ہوں یا اس کی مؤید کوئی اور روایت موجود ہو تو تمام اہل علم کے نزدیک حجت ہے۔ یہاں یہی آخری صورت ہے۔ چنانچہ امام دار قطنیؒ نے ایک اور روایت بھی (بطریق ابو معشر عن محمد بن قیس) اس کی مؤید نقل کی ہے۔ یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں بھی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ اَمَرَهٗ اَنْ يُّصَلِّيَ رَكْعَتَيْنِ اَمْسَكَ عَنِ الْخُطْبَةِ حَتّٰى فَرَغَ مِنْ رَكْعَتَيْهِ. ثُمَّ عَادَ اِلٰى خُطْبَتِهٖ (ابن ابی شیبہ

ترجمہ:۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سلیکؓ کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم فرمایا تو خطبہ سے رک گئے۔

یہاں تک کہ جب وہ اپنی دو رکعتوں سے فارغ ہوئے. تب آپؐ نے خطبہ کی طرف رجوع فرمایا۔

اس روایت کے راوی کو دار قطنیؒ نے ضعیف کہا ہے مگر یہ روایت اوپر کی مرسل صحیح کو مزید تائید فراہم کرتی ہے۔

نیز یہ بھی آتا ہے کہ حضرت سلیکؓ چونکہ بہت ہی خستہ اور قابل رحم حالت میں آئے تھے۔ اس لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انہیں صدقہ دینے کی ترغیب دلائی۔ چنانچہ حاضرین نے اپنے کپڑے اتار کر پیش کئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے دو کپڑے ان کو مرحمت فرمائے۔ (نسائی ص ۲۰۸ ج ۱)

غالباً اس سے فارغ ہوکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ شروع فرمایا ہوگا جس کا تذکرہ اوپر دار قطنی اور ابن ابی شیبہ کی روایت میں آیا ہے۔

پس یہ تمام امور جو اس واقعہ میں پیش آئے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا سلیکؓ کے دوگانہ ادا کرنے تک خطبہ روک دینا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو چندے کی ترغیب دینا۔ اور صحابہ کرامؓ کا کپڑے اتار اتار کر پیش کرنا, یہ خطبہ کے عام معمول کے خلاف ہیں۔ اور انہیں خصوصیت ہی پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

لیکن اگر اس کے باوجود کسی کو اصرار ہو کہ یہ سلیکؓ کی خصوصیت نہیں! بلکہ خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد پڑھنا ہر شخص کے لئے عام سنت ہے۔ تو ہمیں یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اگر خطبہ کے دوران دو رکعتیں پڑھنا حضرت سلیکؓ کی سنت ہے تو ایسے شخص کے لئے خطیب کا خطبہ کو روک دینا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے ــــــ لہٰذا خطیب کا فرض ہے کہ تحیۃ المسجد پڑھنے والوں کی رعایت فرماتے ہوئے خطبہ روک کر سنت نبوی پر عمل کیا کریں, یہ تو نہیں ہونا چاہئے کہ مقتدی تو سنت سلیکؓ پر عمل کریں۔ اور خطیب صاحب پر سنت نبویؐ کی پابندی لازم نہ ہو۔ اور ہاں! حضرت سلیکؓ کی سنت پر بھی جب پورا عمل ہوگا کہ پہلے مسجد میں آکر بیٹھ جایا کریں, پھر خطیب صاحب ان کو دوگانہ ادا کرنے کا حکم کریں۔ پھر ان کے دوگانہ ادا کرنے کے دوران خطبہ روکے رکھیں۔ پھر حاضرین سے ان کے لئے چندہ بھی کیا کریں۔ تب دوبارہ خطبہ شر[وع] ہوا کرے۔

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ حضرت سلیکؓ نے بھی دوگانہ عین خطبہ کے دوران ادا نہیں فرما[یا] تھا, کیونکہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی خاطر خطبہ روک دیا۔ تو یہ دوران خطبہ کی حالت نہ رہی۔ علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر دوسرے کو قیاس نہیں کیا جاسکتا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بلانے پر عین نماز کی حالت میں لبیک کہنا واجب ہے۔

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی مصلحت کی بناپر حضرت سلیکؓ کو دو رکعتیں پڑھنے کا حکم فرمایا تو مین حالت خطبہ میں بھی انہیں تعمیل ارشاد لازم تھی۔ اور اس وقت ان سے استماع کی فرضیت ساقط تھی۔ لیکن دوسروں کے لئے جائز نہ ہوگا کہ فرض استماع کو چھوڑ کر نفل میں مشغول ہو جائیں۔

د:۔ خصوصیت کی ایک دلیل یہ ہے کہ صحیح ابن حبان کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلیکؓ سے فرمایا:

اِرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ وَلَا تَعُودَنَّ لِمِثْلِ هٰذَا۔ (موارد الظمآن صفحہ ۱۵۰، نصب الرایہ صفحہ ۲۰۲ ج ۱)

ترجمہ:۔ دو رکعتیں پڑھو۔ اور آئندہ ایسا ہرگز نہ کرنا

اور دارقطنی کی ایک روایت میں ہے: وَلَا تَعُدْ لِمِثْلِ هٰذَا۔

ترجمہ:۔ اور آئندہ ایسا نہ کرنا۔

جو حضرات خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد کو جائز کہتے ہیں وہ اس ارشاد کی یہ تاویل کرتے ہیں کہ اس میں آئندہ تاخیر سے آنے کی ممانعت فرمائی گئی تھی۔ کیونکہ آئندہ جمعہ وہ پھر دوگانہ پڑھے بغیر بیٹھ گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دوسرے جمعہ بھی دوگانہ پڑھنے کا حکم فرمایا تھا۔

لیکن حضرات خلفائے راشدینؓ اور جمہور صحابہؓ نے اس کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ آئندہ دوگانہ پڑھنے کی ممانعت فرمائی گئی ہے جس کا ایک قرینہ تو یہی ہے کہ یہ ممانعت دوگانہ کے ساتھ مربوط ہے، لہٰذا اسی کی ممانعت اقرب الی الفہم ہے۔ دوسرا قرینہ یہ ہے کہ حضرت سلیکؓ نے آئندہ جمعہ جو دوگانہ نہیں پڑھا وہ اسی ارشاد کی تعمیل تھی ورنہ قطعاً بعید ہے کہ وہ گزشتہ جمعہ کی تنبیہ کو بھول جاتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے دوبارہ دو رکعتیں پڑھوانا بھی کسی خصوصی مصلحت کی بناء پر ہوگا۔ ورنہ جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے آپؐ دیگر صحابہؓ سے نہیں پڑھواتے تھے۔

خلاصہ یہ کہ حضرات خلفائے راشدینؓ اور جمہور صحابہؓ و تابعینؒ نے جو سلیکؓ کی روایت کو تشریع عام نہیں سمجھا اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ متعدد قرائن اس کی خصوصیت کے موجود ہیں۔

۵۔۔۔ اور دوسری توجیہ ان اکابرؒ کی اس روایت کو معمول بہا نہ سمجھنے کی یہ ہو سکتی ہے کہ خطبہ کے دوران نماز و کلام کی ممانعت بعد میں ہوئی ہوگی۔ ہمارے سامنے تو قرآن کریم اور حدیث نبویؐ کا ذخیرہ بیک وقت پورے کا پورا موجود ہے اس لئے ہمیں تو یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کونسی آیت پہلے اتری اور کونسی بعد میں؟ کونسا ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے فرمایا تھا۔ اور کونسا بعد میں؟ نقل و روایت کی ضرورت ہے، لیکن حضرات خلفائے راشدین اور اکابر صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے لئے آیات قرآن کے نزول اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات

کی ترتیب مشاہدہ کی چیز تھی۔ وہ جانتے تھے کہ کونسی آیت کب اور کہاں نازل ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کونسا ارشاد کس موقعہ پر فرمایا تھا؟ کونسا حکم پہلے تھا کونسا بعد میں؟ الاتقان (النوع الثمانون) میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ کہ انہوں نے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

سَلُوْنِیْ۔ فَوَاللّٰہِ لَا تَسْأَلُوْنَ مِنْ شَیْئٍ اِلَّا اُخْبِرْکُمْ۔ وَسَلُوْنِیْ عَنْ کِتَابِ اللّٰہِ۔ فَوَاللّٰہِ مَا مِنْ اٰیَۃٍ اِلَّا وَاَنَا اَعْلَمُ اَللَّیْلٍ نَزَلَتْ اَمْ بِنَہَارٍ اَمْ فِیْ سَھْلٍ اَمْ فِیْ جَبَلٍ۔ (صفحہ ۱۸۷ ج ۲)

ترجمہ:۔ مجھ سے پوچھ لو! پس اللہ کی قسم! تم مجھ سے کوئی چیز نہیں پوچھو گے۔ مگر میں تم کو اس کے بارے میں خبردوں گا اور مجھ سے کتاب اللہ کے بارے میں سوال کرو۔ پس اللہ کی قسم! قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں جس کے بارے میں میں یہ نہ جانتا ہوں کہ رات میں اتری یا دن میں، میدان میں اتری یا پہاڑ پر۔

اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

وَاللّٰہِ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ غَیْرُہٗ مَا نَزَلَتْ مِنْ اٰیَۃٍ مِنْ کِتَابِ اللّٰہِ اِلَّا وَاَنَا اَعْلَمُ فِیْمَنْ نَزَلَتْ وَاَیْنَ نَزَلَتْ۔ (ایضاً)

ترجمہ:۔ اس اللہ کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ کتاب اللہ کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے بارے میں مجھے معلوم نہ ہو کہ وہ کس کے بارے میں نازل ہوئی اور کہاں نازل ہوئی۔

پس جب یہ اکابرؓ ایک روایت کے مقابلہ میں ان نصوص پر عمل فرماتے ہیں جن میں خطبہ کے دوران کلام و نماز کی ممانعت کی گئی ہے تو یہ روایت اگر خصوصیت پر محمول نہیں تو لامحالہ متروک العمل ہوگی۔

۶۔ جو حضرات حدیث سلیکؓ سے استدلال کرتے ہوئے خطبہ کے دوران تحیۃ المسجد پڑھنے پر زور دیتے ہیں انہیں اس پر غور کرنا چاہئے کہ تحیۃ المسجد عام حالات میں بھی مستحب ہے۔ اور خطبہ کا سننا فرض ہے، کیا مستحب کی خاطر فرض کو ترک کرنا جائز ہے؟ اور پھر اگر تحیۃ المسجد نہ پڑھنے کی صورت میں ایک حدیث پر عمل کرنے سے محرومی لازم آتی ہے تو فرض استماع و انصات کو چھوڑنے سے قرآن کریم۔ احادیث متواترہ اور خلفائے راشدینؓ کے متفق علیہ مسئلہ کی مخالفت لازم آتی ہے، کیا ایک حدیث کی خاطر قرآن کریم، احادیث متواترہ اور خلفائے راشدینؓ کے حکم سے انحراف جائز ہے؟

حضرت ابوسعید خدریؓ کا واقعہ:۔ سوال میں ترمذی کے حوالے سے حضرت

ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا واقعہ رنگ آمیزی کے ساتھ ذکر کر کے دوران خطبہ نماز کی ممانعت کو "مروانی بدعت" کہا گیا ہے۔ یہ تو اوپر معلوم ہو چکا کہ یہ مروانی حکم نہیں بلکہ قرآنی حکم ہے۔ اور مروانی بدعت نہیں۔ بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرات خلفائے راشدین ؓ کی سنت ہے۔ جو بات قرآن کریم، سنت متواترہ اور خلفائے راشدین ؓ کے تعامل سے ثابت ہو اسے محض اس بنا پر "مروانی بدعت" کہنا کہ مروان بھی اس کا قائل تھا۔ کیونکر صحیح ہو گا۔ شائد یہ حضرات کل خطبہ جمعہ کو بھی "مروانی بدعت" فرمادیں۔

رہا حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا دوگانہ پڑھنے پر اصرار کرنا تو اس کی دلیل میں انہوں نے وہی حضرت سلیک ؓ کا واقعہ پیش کیا ہے، اور اس سے دوگانہ کا جواز استنباط فرمایا ہے۔ جب کہ خلفائے راشدین ؓ اور اکابر صحابہ ؓ اس کے خلاف کا فتویٰ دیتے ہیں۔ اب اہل فہم انصاف فرمائیں کہ ہمیں کونسا مسلک اختیار کرنا چاہئے۔

اور اس ناکارہ کے خیال میں تو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا اس موقعہ پر اصرار کسی اور ہی بات کی غمازی کرتا ہے۔ شرح اس کی یہ ہے کہ امراء جور کے زمانے میں سلف میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تھا کہ اگر امام خطبہ میں ذکر کو چھوڑ کر غیر متعلق قسم کی باتیں کرنے لگے تو کیا اس کا استماع بھی لازم ہے؟ بعض اکابر کی رائے تھی کہ امام چونکہ ذکر سے خارج ہو گیا اور استماع صرف ذکر کا لازم ہے نہ کہ اس کی غیر متعلق باتوں کا۔ اس لئے اس وقت اس کے خطبہ کی حرمت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ مصنف عبدالرزاق ص ۲۲۶ ج ۳ میں ہے کہ حجاج بن یوسف خطبہ دے رہا تھا۔ اور امام شعبی ؒ اور ابو بردہ ؒ باتیں کر رہے تھے۔ ان سے عرض کیا گیا کہ آپ خطبہ کے دوران باتیں کر رہے تھے۔ تو فرمایا ہمیں ایسی باتوں کے لئے خاموشی کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔ اور مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۲۶ ج ۲ میں اسی نوعیت کا واقعہ حضرت ابراہیم نخعی اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما کا نقل کیا گیا ہے۔ پس کیا بعید ہے کہ حضرت ابو سعید خدری ؓ کو بھی ایسی صورت پیش آئی ہو اور انہوں نے اس وقت نماز شروع کر دی ہو۔ اس صورت میں ان کا حدیث سلیک ؓ کا حوالہ دینا بھی برمحل ہے کہ جیسے ان کے دوگانہ ادا کرتے وقت خطبہ منقطع ہو گیا تھا۔ اسی طرح میں نے بھی انقطاع خطبہ کی حالت میں دوگانہ ادا کیا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سوال ۱۵۔ گاؤں میں جمعہ:

س: ہمارے ہاں جمعہ کی شرائط میں شہر کا ہونا بھی ہے گاؤں دیہات میں جمعہ نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے مقابلے میں احادیث کے ذریعے مطلق حکم ثابت کیا جاتا ہے اور ہمیں جمعہ کی فرضیت کا منکر گردانا جاتا ہے اس ضمن میں جو احادیث پیش کی جاتی ہیں

وہ حسب ذیل ہیں۔
ابو داؤد کے حوالہ سے یہ الفاظ نقل کئے جاتے ہیں۔ "الجمعۃ حق واجب علیٰ کل مسلم فی جماعت" دار قطنی کی حدیث میں ہے۔ "من کان یومن باللہ والیوم الاخر فعلیہ الجمعۃ" آیت قرآنی سے بھی عموم ثابت کیا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلا جمعہ جو حضرت اسعد بن زرارہؓ نے پڑھایا وہ نقیع نامی ایک گاؤں ہی میں پڑھایا تھا جو مدینہ شریف کے پاس ہے۔ اور اس وقت مسلمانوں کی تعداد اس گاؤں میں صرف چالیس بیان کی جاتی ہے حوالہ کے لئے ابن ماجہ کو پیش کیا جاتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خود مدینہ شریف اس زمانے میں ایک گاؤں ہی تھا۔ اس صورت میں گاؤں کے جمعہ کے احکامات کیا ہوں گے اور ان کی احادیث کے ساتھ کیا تطبیق ہوگی؟

ج: اس سلسلہ میں چند امور پیش نظر رکھنا ضروری ہے:
۱ جمعہ کی نماز سب کے نزدیک فرض عین ہے۔ علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار (ص ۲۲۴ ج ۳) میں اس پر ائمہ اربعہ کے مذاہب کا اتفاق نقل کیا ہے۔ اور شیخ ابن ہمامؒ فتح القدیر میں لکھتے ہیں: وَاعْلَمْ اَوَّلًا اَنَّ الْجُمُعَةَ فَرِيْضَةٌ مُحْكَمَةٌ وَالْاِجْمَاعُ، يُكَفَّرُ جَاحِدُهَا۔ (صفحہ ۴۰۷ ج ۱)
ترجمہ:۔ سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ جمعہ، کتاب وسنت اور اجماع امت کی رو سے محکم فریضہ ہے۔ اور اس کی فرضیت کا منکر کافر ہے۔
اس سے معلوم ہوا کہ جمعہ کی فرضیت کا انکار کفر ہے۔ اگر کچھ لوگ حنفیہ کو "فرضیت جمعہ کا منکر" کہتے ہیں، جیسا کہ سوال میں ذکر کیا گیا ہے۔ تو اس کے سوا کیا عرض کیا جائے کہ وہ اپنی کم علمی کی وجہ سے ایک گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں۔ کیونکہ کسی مسلمان کو "کفر" کی طرف منسوب کرنا وبال عظیم ہے۔ جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ یہ کفر کہنے والے کی طرف لوٹتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس وبال سے محفوظ فرمائیں۔
۲۔ ائمہ کا جہاں اس پر اتفاق ہے کہ جمعہ فرض عین وہاں اس پر بھی اتفاق ہے کہ جمعہ کی نماز م نمازوں کی طرح نہیں بلکہ اس کی ایک خاص شان ہے اور اس کے لئے خاص شرائط ہیں ایک شرط جماعت ہے۔ اور دوسری شرط ایک خاص نوعیت کی آبادی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آبادی سے دور جنگل میں جمعہ کسی کے نزدیک بھی جائز نہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ (۲۔۳۰) میں لکھتے ہیں

وَقَدْ تَلَقَّتِ الْأُمَّةُ تَلَقِّيًا مَعْنَوِيًّا مِنْ غَيْرِ تَلَقٍّ لَفْظٍ أَنَّهُ يُشْتَرَطُ فِي الْجُمُعَةِ الْجَمَاعَةُ وَنَوْعٌ مِنَ التَّمَدُّنِ۔
وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَخُلَفَاؤُهُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَالْأَئِمَّةُ الْمُجْتَهِدُونَ رَحِمَهُمُ اللّٰهُ تَعَالَى يُجَمِّعُونَ فِي الْبُلْدَانِ وَلَا يُؤَاخِذُونَ أَهْلَ الْبَدْوِ۔ بَلْ وَلَا يُقَامُ فِي عَهْدِهِمْ فِي الْبَدْوِ۔ فَفَهِمُوا مِنْ ذَالِكَ قَرْنًا بَعْدَ قَرْنٍ وَعَصْرًا بَعْدَ عَصْرٍ أَنَّهُ يُشْتَرَطُ لَهَا الْجَمَاعَةُ وَالتَّمَدُّنُ۔

ترجمہ:۔ امت نے تواتر معنوی سے جو چیز پائی ہے (اگرچہ لفظی تواتر نہ ہو) کہ جمعہ کے لئے جماعت اور ایک خاص نوعیت کی شہریت کا ہونا شرط ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم، آپؐ کے خلفاء رضی اللہ عنہم اور ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ شہروں میں جمعہ قائم فرماتے تھے بادیہ نشینوں کو اس کا مکلف نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے دور میں دیہات میں جمعہ ادا نہیں کیا جاتا تھا۔ پس امت نے اس سے قرناً بعد قرن اور نسلاً بعد نسل یہی سمجھا کہ جمعہ کے لئے جماعت اور شہریت شرط ہے۔

یہ "خاص نوعیت کی شہریت" جو صحت جمعہ کے لئے شرط ہے۔ اس کی تشریح میں اختلاف و اجتہاد کی گنجائش ہے۔ لیکن شاہ صاحبؒ کے بقول یہ اصول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم سے ثابت اور ائمہ مجتہدینؒ کے درمیان متفق علیہ ہے کہ جمعہ ہر جگہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہر جگہ کے لوگوں کے ذمہ فرض ہے۔

۳:۔ یہاں دو مسئلے الگ الگ ہیں۔ ایک یہ کہ وجوب جمعہ کے کیا شرائط ہیں؟ یعنی جمعہ کس شخص پر فرض ہے اور کس پر فرض نہیں؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جمعہ کے صحیح ہونے کے کیا شرائط ہیں؟

ان دونوں مسئلوں میں فرق یہ ہے کہ جس شخص پر جمعہ فرض نہیں (مثلاً بیمار۔ مسافر۔ غلام، عورت) اگر وہ جمعہ ادا کرے تو اس کا جمعہ صحیح ہوگا، اور فرض وقت اس سے ساقط ہو جائے گا، لیکن اگر جمعہ کے صحیح ہونے کی شرط نہ پائی جائے تو جمعہ ادا ہی نہیں ہوگا۔ اور جس شخص نے جمعہ کے صحیح ہونے کی شرط کو ملحوظ نہ رکھا ہو اس کے ذمہ ظہر کی نماز فرض رہے گی۔ گویا وہ بزعم خود جمعہ پڑھنے کے باوجود فرض وقت کا تارک ہوگا۔ حجۃ اللہ کی عبارت سے معلوم ہوا کہ باجماع امت "خاص نوعیت کی شہریت" وجوب جمعہ کے لئے بھی شرط ہے۔ اور صحت جمعہ کے لئے بھی۔ پس اہل بادیہ پر بالاتفاق جمعہ فرض بھی نہیں۔ اور بادیہ میں جمعہ پڑھنا بالاتفاق صحیح بھی نہیں۔

حضرت شاہ صاحب مسویٰ مصفی (شرح موطا) میں لکھتے ہیں:

اِتَّفَقُوا عَلٰی اَنْ لَا جُمُعَۃَ فِی الْعَوَالِیْ وَاَنَّہٗ یُشْتَرَطُ لَہَا الْجَمَاعَۃُ (صفحہ ۱۵۵ ج ۱)

ترجمہ:۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عوالی میں جمعہ جائز نہیں۔ اور یہ کہ اس کے لئے جماعت شرط ہے۔

۴۔ حنفیہ کے نزدیک جمعہ یا تو شہر میں ہوتا ہے یا "قریہ کبیرۃ" میں جس کی حیثیت قصبہ کی ہو، اور شہر اور قصبہ کے گرد و پیش کی وہ زمین جو اس کی ضروریات کے لئے ہو اسے "فنائے مصر" کہا جاتا ہے۔ چونکہ وہ بھی شہر اور قصبہ کے ساتھ ملحق ہے۔ اس لئے اس میں بھی جمعہ جائز ہے۔ شہروں اور قصبوں کے علاوہ چھوٹے دیہات میں جمعہ جائز نہیں۔

حنفیہ کا یہ مسلک بھی (دیگر مسائل کی طرح) قرآن و سنت سے ثابت اور حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سنت کے عین مطابق ہے۔

قرآن کریم:۔ سورہ جمعہ میں حق تعالیٰ شانہ کا ارشاد ہے:

یَا اَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

ترجمہ:۔ اے ایمان والو جب جمعہ کے روز نماز (جمعہ) کے لئے اذان کہی جایا کرے تو تم اللہ کی یاد (یعنی نماز و خطبہ) کی طرف (فوراً) چل پڑا کرو اور خرید و فروخت (اور اسی طرح دوسرے مشاغل جو چلنے سے مانع ہوں) چھوڑ دیا کرو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے اگر تم کو کچھ سمجھ ہو (ترجمہ حضرت تھانویؒ)

جمعہ کی اذان سن کر تمام کاروبار چھوڑ دینا واجب ہے۔ مگر آیت کریمہ میں خرید و فروخت چھوڑنے کا حکم فرمایا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ جمعہ ہر جگہ نہیں ہوتا۔ بلکہ وہاں ہوتا ہے جہاں کے لوگ عموماً تجارت و سوداگری اور خرید و فروخت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور جہاں چھوٹی بڑی روزمرہ کی ضروریات خرید و فروخت کے لئے مہیا رہتی ہیں، شہروں اور دیہاتوں میں یہی فرق ہے کہ شہروں میں تجارت ہوتی ہے دیہات میں نہیں۔ پس جمعہ وہاں ہوگا جہاں تجارتی مراکز ہوں۔ اور وہ شہر ہیں نہ کہ دیہات ۔۔۔۔

سنت نبویؐ: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت مطہرہ سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دور نبویؐ میں جمعہ صرف شہروں میں ہوتا تھا۔ دیہاتی آبادیوں میں نہیں۔ چنانچہ:

۱۔ جمعہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے قبل فرض ہو چکا تھا۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے مدینہ طیبہ میں شروع بھی ہو چکا تھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں جمعہ نہیں ادا فرما سکے جیسا کہ علامہ شوکانیؒ نے نیل الاوطار (ص ۱۳۱ ج ۳) میں ۔۔۔ حافظ ابن قیمؒ نے زاد المعاد (ص ۹۹ ج ۱) میں اور حافظ سیوطیؒ نے "الاتقان" (۱۔ ۳۶ النوع الثانی عشر) میں اس کی تصریح کی ہے۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبا میں پیر کے دن (۱۲

ربیع الاول کو) تشریف لائے اور دس روز سے زیادہ قیام فرمایا (فلبث بضع عشرة لیلة۔ صحیح بخاری ص ۵۵۵ ج ۱) صحیح بخاری کی ایک روایت میں چودہ دن قیام کی تصریح ہے۔ (ص ۵۶۱ ج ۱) اور ایک نسخہ میں چوبیس دن کا ذکر ہے (ص ۶۱ ج ۱) اگر چودہ دن ہی لئے جائیں تب بھی ظاہر ہے کہ کم از کم دو جمعے ضرور آئے ہوں گے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں جمعہ قائم نہیں فرمایا۔ نہ اہل قبا کو جمعہ پڑھنے کا حکم فرمایا۔ بلکہ مدینہ طیبہ پہنچ کر جمعہ کا آغاز فرمایا۔ اس سے واضح ہے کہ چھوٹی بستی میں جمعہ نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ دو سالہ دور نبویؐ میں قبا میں جمعہ نہیں ہوا۔

۲۔۔۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حج اکبر بالا جماع جمعہ کو ہوا تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان عرفات میں جمعہ نہیں پڑھا۔ اور نہ اہل مکہ کو وہاں جمعہ پڑھنے کا حکم فرمایا۔ اس سے واضح ہے کہ ہر جگہ جمعہ صحیح نہیں بلکہ اس کے لئے خاص قسم کی آبادی شرط ہے۔

۳۔۔۔ صحیح بخاری ص ۱۲۳ ج ۱ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

كَانَ النَّاسُ يَتَنَابُوْنَ الْجُمُعَةَ مِنْ مَنَازِلِهِمْ وَالْعَوَالِيْ۔

ترجمہ لوگ اپنی اپنی جگہوں سے اور عوالی سے جمعہ کے لئے باری باری آتے تھے۔

اہل قبا کے جمعہ کے لئے باری باری مدینہ طیبہ آنے سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ اہل قبا پر جمعہ فرض نہیں تھا۔ ورنہ وہ باری باری نہ آیا کرتے۔ بلکہ سب کے سب آتے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ فتح الباری میں اس حدیث کے تحت لکھتے ہیں:

> قرطبی نے کہا کہ اس حدیث میں رد ہے کوفیوں پر کہ وہ شہر سے باہر کے لوگوں پر جمعہ فرض قرار نہیں دیتے۔۔۔۔ لیکن قرطبی کی یہ بات محل نظر ہے کیونکہ اگر جمعہ اہل عوالی پر فرض ہوتا تو وہ باری باری نہ آیا کرتے بلکہ سب کے سب آیا کرتے۔"
>
> (فتح الباری ص ۳۰۹ ج ۲)

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ عوالی میں جمعہ نہیں ہوتا ورنہ باقی حضرات وہاں جمعہ پڑھا کرتے۔

۴ صحیح بخاری ص ۱۲۲ ج ۱ میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ مسجد نبویؐ کے بعد سب سے پہلا خطبہ جواثا میں عبدالقیس کی مسجد میں ہوا بحرین کے علاقہ میں۔

وفد عبدالقیس کی آمد ۶ھ یا ۸ھ میں ہوئی تھی۔ اس وقت اسلام مدینہ طیبہ سے دور دراز علاقوں میں پھیل چکا تھا۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہیں جمعہ قائم کرنے کا حکم نہیں فرمایا اور جواثا قدیم سے تجارتی مرکز اور قلعہ تھا۔ جیسا کہ جاہلیت کے اشعار اور اہل بصیرت کی تصریحات سے ثابت ہے۔ اس لئے ابو داؤد کی روایت میں اس کو قریہ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن کریم میں مکہ مکرمہ کو قریہ کہا گیا ہے۔

۵ نسائی ص ۲۳۵ ج ۱. ابو داؤد ص ۱۵۳ ج ۱. دارمی ص ۳۱۶ ج ۱ (طبع جدید) میں زید بن ارقمؓ سے. ابو داؤد ص ۱۵۳ ج ۱ وغیرہ میں ابو ہریرہؓ سے ابن ماجہ ص ۹۴ اور مجمع الزوائد ص ۱۹۵ ج ۲ میں ابن عمر سے اور مشکل الآثار طحاوی ص ۵۶ ج ۲ میں ذکوان سے (رضی اللہ عنہم) روایت ہے۔ سب کا مشترک مضمون یہ ہے کہ ایک بار جمعہ کو عید ہوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز عید کے بعد فرمایا کہ "ہم تو جمعہ پڑھیں گے۔ جو چاہے ہمارے ساتھ جمعہ پڑھے اور جو چاہے واپس اپنے گھر لوٹ جائے"۔ مراد اس سے اہل عوالی کو اجازت دینا تھا کیونکہ جمعہ ان پر فرض نہیں تھا۔ جیسا کہ امام طحاویؒ نے مشکل الآثار ص ۵۲ ج ۲ میں فرمایا ہے۔ اور مصنف عبدالرزاق ص ۳۰۴ ج ۳ میں مرسل ابن جریج سے اس کی تصریح آئی ہے:

فَاَذِنَ لِلْاَنْصَارِ فِی الرُّجُوْعِ اِلَی الْعَوَالِیْ وَتَرْكِ الْجُمُعَةِ فَلَمْ يَزَلِ الْاَمْرُ عَلٰی ذَالِكَ بَعْدُ۔

ترجمہ:۔ پس آپؐ نے انصار کو عوالی لوٹ جانے اور جمعہ چھوڑ دینے کی اجازت مرحمت فرمائی اور پھر ہمیشہ اسی پر تعامل رہا۔

ان تمام احادیث سے ثابت ہے کہ دور نبویؐ میں جمعہ صرف شہروں میں ہوتا تھا۔ دیہات میں کبھی جمعہ نہیں ہوا۔

سلف صالحین کا تعامل:۔ ۱۔ صحیح بخاری ص ۸۳۵ ج ۲ موطا امام مالک ص ۶۳ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے خطبہ عیدین میں فرمایا۔ "آج تمہارے دو عیدیں جمع ہو گئی ہیں۔ اہل عوالی میں سے جو شخص جمعہ پڑھنا چاہتا ہے وہ جمعہ کا انتظار کرے۔ اور جو واپس جانا چاہتا ہے اس کو واپسی کی اجازت ہے۔" امام محمد موطا ص ۱۲۹ میں فرماتے ہیں: "حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اہل عوالی کو اس لئے اجازت دی کہ وہ شہر کے لوگ نہیں تھے"۔ اور حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے مسوی شرح فارسی موطا میں اس حدیث پر یہ باب باندھا ہے۔ "عوالی میں جمعہ جائز نہیں۔ اور اہل عوالی میں سے جو لوگ شہر میں ہیں ان کو وقت جمعہ سے پہلے واپس جانے کی اجازت ہے"۔ اس حدیث کے ذیل میں لکھتے ہیں: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ارشاد کا ماخذ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی عمل ہے کہ آپ نے بادیہ نشینوں کو کبھی اقامت جمعہ کا مکلف نہیں بنایا۔ (ص ۱۵۴ ج ۱ ص ۱۵۵)

۲ مصنف عبدالرزاق ص ۱۶۸ ج ۳ اور مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۰۱ ج ۱ (واللفظ لہ) میں بسند صحیح حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

لَاجُمُعَةَ وَلَاتَشْرِيْقَ وَلَاصَلٰوةَ فِطْرٍ وَلَا اَضْحٰى اِلَّا فِيْ مِصْرٍ جَامِعٍ اَوْمَدِيْنَةٍ عَظِيْمَةٍ۔

ترجمہ:۔ جمعہ۔ تشریق۔ عید الفطر۔ عید الضحیٰ۔ شہر یا بڑے قصبہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔

۳۔۔۔ مصنف عبد الرزاق ص ۱۶۸ ج ۳ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ وہ بصرہ. کوفہ. مدینہ. بحرین. شام. الجزیرہ. جیسے شہروں کو شہر شمار کرتے تھے۔

۴۔۔۔ مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۰۱ ج ۲ میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا ہے

لَيْسَ عَلٰى اَهْلِ الْقُرٰى جُمُعَةٌ اِنَّمَا الْجُمَعُ عَلٰى اَهْلِ الْاَمْصَارِ مِثْلَ الْمَدَائِنِ۔

ترجمہ:۔ بستی والوں پر جمعہ نہیں۔ جمعہ شہر والوں پر ہے۔ جیسے شہر مدائن۔

۵ صحیح بخاری ص ۱۲۳ ج ۱ میں ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ بصرہ سے چھ میل زاویہ میں قیام پذیر تھے کبھی جمعہ کے لئے بصرہ تشریف لاتے کبھی نہیں۔

۶ صحیح بخاری ص ۱۲۳ ج ۱ میں حضرت عطا کا قول نقل کیا ہے کہ جمعہ "قریہ جامعہ" میں ہوتا ہے۔ اور مصنف عبد الرزاق ص ۱۶۸ ج ۳ میں ہے کہ قریہ جامعہ وہ ہے جس میں امیر ہو۔ قاضی ہو. جیسے جدہ اور طائف۔

علاوہ ازیں اکابر صحابہؓ و تابعینؒ کے متعدد آثار مصنف ابن ابی شیبہ ص ۱۰۱ ج ۲ اور مصنف عبد الرزاق ص ۱۶۸ ج ۳ ومابعد میں ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں مندرجہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ فرضیت جمعہ سے جیسے اور بہت سے لوگ مستثنیٰ ہیں اسی طرح اہل دیہات بھی اس کے مکلف نہیں۔ حضرت اسعد بن زرارہؓ اور ان کے رفقائے نے جہاں جمعہ پڑھا تھا وہ دیہات نہیں تھا بلکہ مدینہ طیبہ سے ملحق جگہ تھی اور شہر میں جمعہ جائز ہے۔ مسلمانوں کی تعداد خواہ کتنی ہو مگر جمعہ تو شہر میں ہوا. اور اس زمانے میں مدینہ طیبہ میں بازار کا ہونا تو صحیح بخاری ص ۵۶۱ ج ۱ میں موجود ہے لہٰذا اسے گاؤں کہنا صحیح بخاری کی مخالفت ہے۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ۔

بیس تراویح کا مسئلہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی:

آپ کے دوست نے اپنے موقف کی وضاحت کر دی ہے۔ میں اپنے موقف کی وضاحت کئے دیتا ہوں۔ ان میں کون سا موقف صحیح ہے؟ اس کا فیصلہ خود کیجئے۔

اس تحریر کو چار حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔

ا۔ تراویح عہد نبویؐ میں ۲۔ تراویح عہد فاروقی میں ۳۔ تراویح صحابہ و تابعین کے دور میں ۴۔ تراویح ائمہ اربعہؒ کے نزدیک

تراویح عہدِ نبویؐ میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد احادیث میں قیام رمضان کی ترغیب دی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔

کان رسول ﷺ یرغب فی قیام رمضان من غیر أن یأمرھم بعزیمة فیقول من قام رمضان ایمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه- فتوفی رسول اللہ ﷺ والأمر علی ذلك، ثم کان الأمر علی ذلك فی خلافة ابی بکر وصدرا من خلافة عمر[1]

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیام رمضان کی ترغیب دیتے تھے بغیر اس کے کہ قطعیت کے ساتھ حکم دیں۔ چنانچہ فرماتے تھے' جس نے ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت رکھتے ہوئے رمضان میں قیام کیا اس کے گذشتہ گناہ معاف ہو گئے۔ چنانچہ یہ معاملہ اسی حالت پر رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا۔ پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی یہی صورتحال رہی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے شروع میں بھی۔"

---

(۱) جامع الاصول ص ۴۳۹ ج ۹۔ بروایت بخاری و مسلم' ابو داؤد' ترمذی' نسائی' موطا۔

ایک اور حدیث میں ہے۔

إن الله فرض صيام رمضان وسننت لكم قيامه. فمن صامه وقامه إيمانا واحتسابا خرج من ذنوبه كيوم ولدته امه [1]

"بے شک اللہ تعالیٰ نے تم پر رمضان کا روزہ فرض کیا ہے اور میں نے تمہارے لئے اس کے قیام کو سنت قرار دیا ہے۔ پس جس نے ایمان کے جذبہ سے اور ثواب کی نیت سے اس کا صیام و قیام کیا وہ اپنے گناہوں سے ایسا نکل جائے گیا جیسا کہ جس دن اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا۔"

چند راتیں تراویح کا جماعت کے ساتھ پڑھنا بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے [2]

لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جماعت پر مداومت نہیں فرمائی اور اس اندیشہ کا اظہار فرمایا کہ کہیں تم پر فرض نہ ہو جائے اور اپنے طور پر گھروں میں پڑھنے کا حکم فرمایا۔[3]

رمضان المبارک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مجاہدہ بہت بڑھ جاتا تھا۔ خصوصاً عشرہ اخیرہ میں تو پوری رات کا قیام معمول تھا۔ ایک ضعیف روایت میں یہ بھی

---

(۱) جامع الاصول، ص ۴۴۱، ج ۹۔ بروایت نسائی۔

(۲) مثلاً: حدیث عائشہؓ جس میں تین رات کا ذکر ہے۔ پہلی رات تہائی رات تک۔ دوسری رات آدھی رات تک۔ تیسری رات سحر تک۔ (صحیح بخاری، ص ۲۶۹، ج ۱)

حدیث ابی ذرؓ: جس میں تئیسویں رات میں تہائی رات تک، پچیسویں میں آدھی رات تک اور ستائیسویں شب میں اول فجر تک قیام کا ذکر ہے۔ (جامع الاصول، ص ۱۳۰، ج ۶۔ بروایت ترمذی، ابو داؤد، نسائی)

حدیث نعمان بن بشیرؓ: اس کا مضمون بعینہ حدیث ابی ذرؓ کا ہے۔ (نسائی، ص ۲۳۸، ج ۱)

حدیث زید بن ثابتؓ: اس میں صرف ایک رات کا ذکر ہے (جامع الاصول، ص ۱۱۹، ج ۶، بروایت بخاری، مسلم، ابو داؤد، نسائی)

حدیث انسؓ: اس میں بھی صرف ایک رات کا ذکر ہے۔ (صحیح مسلم، ص ۳۵۱، ج ۱)

آیا ہے کہ آپ کی نماز میں اضافہ ہو جاتا تھا [1] تاہم کسی صحیح روایت میں یہ نہیں آتا کہ آپ نے رمضان مبارک میں جو تراویح کی جماعت کرائی اس میں کتنی رکعات پڑھائیں؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے صرف ایک رات آپ نے آٹھ رکعت اور وتر پڑھائے [2]۔ مگر اس روایت میں عیسیٰ بن جاریہ متفرد ہے۔ جو اہل حدیث کے نزدیک ضعیف و مجروح ہے۔ جرح و تعدیل کے امام یحییٰ بن معین اس کے بارے میں فرماتے ہیں "لیس بذلک" یعنی وہ قوی نہیں، نیز فرماتے ہیں "عندہ مناکیر" یعنی اس کے پاس متعدد منکر روایتیں ہیں۔ امام ابوداؤد اور امام نسائی نے اسے "منکر الحدیث" کہا ہے۔ امام نسائی نے اس کو متروک بھی بتایا ہے۔ ساجی و عقیلی نے اسے ضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں کہ اس کی حدیثیں محفوظ نہیں [3]۔

خلاصہ یہ کہ یہ راوی اس روایت میں متفرد بھی ہے۔ اور ضعیف بھی۔ اس لئے یہ روایت منکر ہے۔ اور پھر اس روایت میں صرف ایک رات کا واقعہ کا مذکور ہے۔ جب کہ یہ بھی احتمال ہے کہ آپ نے ان آٹھ رکعتوں سے پہلے یا بعد میں تنہا بھی کچھ رکعتیں پڑھی ہوں۔ جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے [4]

دوسری روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں [5] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں بیس رکعتیں اور وتر پڑھا کرتے تھے۔" مگر اس کی سند میں ابو شیبہ ابراہیم بن عثمان راوی کمزور ہے۔ اس لئے یہ روایت سند کے لحاظ سے صحیح نہیں، مگر جیسا کہ آگے معلوم ہو گا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں امت کا تعامل اسی کے مطابق ہوا۔

---

(۱) فیض القدیر شرح جامع صغیر، ص ۱۳۲، ج ۵ ۔ وفیہ عبد الباقی بن قانع، قال الدار قطنی یخطئی کثیرا ۔

(۲) موارد الظمآن، ص ۲۳۰، قیام اللیل، وزی، ص ۹۰، مجمع الزوائد، ص ۱۷۲، ج ۳، بروایت طبرانی وابو یعلی ۔

(۳) تہذیب التہذیب، ص ۲۰۷، ج ۸ ۔ میزان الاعتدال، ص ۳۱۱، ج ۲ ۔

(۴) مجمع الزوائد (۲ ۱۷۳، ج ۲) بروایت طبرانی ۔ وقال رجالہ، رجال الصحیح ۔

(۵) ص ۲۹۴، ج ۲ ۔ نیز سنن کبری بیہقی (ص ۴۹۶، ج ۲) مجمع الزوائد (ص ۱۷۲، ج ۳)

تیسری حدیث ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی ہے جس کا سوال میں حوالہ دیا گیا ہے۔ مگر اس میں تراویح کا ذکر نہیں بلکہ اس نماز کا ذکر ہے جو رمضان اور غیر رمضان میں ہمیشہ پڑھی جاتی ہے اس لئے رکعات تراویح کے تعین میں اس سے بھی مدد نہیں ملتی۔ چنانچہ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں لکھتے ہیں۔

والحاصل أن الذی دلّت علیه أحادیث الباب ویشابهها هو مشروعیة القیام فی رمضان والصلاة فیه جماعة وفُرٰدٰی فقصر الصلاة المسماة بالتراویح علی عدد معین وتخصیصها بقراءة مخصوصة لم یرد به سنة [1]

"حاصل یہ کہ اس باب کی حدیثیں اور ان کے مشابہ حدیثیں جس بات پر دلالت کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ رمضان میں قیام کرنا اور باجماعت یا اکیلے نماز پڑھنا مشروع ہے۔ پس تراویح کو کسی خاص عدد میں منحصر کر دینا اور اس میں خاص مقدار قرأت مقرر کرنا ایسی بات ہے جو سنت میں وارد نہیں ہوئی۔"

۲۔ تراویح عہدِ فاروقیؓ میں

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تراویح کی باقاعدہ جماعت کا اہتمام نہیں تھا۔ بلکہ لوگ تنہا یا چھوٹی چھوٹی جماعتوں کی شکل میں پڑھا کرتے تھے۔ سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ایک امام پر جمع کیا [2] اور یہ خلافتِ فاروقی کے دوسرے سال یعنی ۱۴ھ کا واقعہ ہے [3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں کتنی رکعتیں پڑھی جاتی تھیں؟ اس کا ذکر حضرت سائب بن یزید صحابی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، حضرت سائب سے اس حدیث کو تین

---

(۱) شوکانی: نیل الاوطار، ص ۵۳، ج ۳۔

(۲) صحیح بخاری، ص ۲۶۹، ج ۱۔ باب فضل من قام رمضان۔

(۳) تاریخ الخلفاء، ص ۱۳۱، تاریخ ابن اثیر، ص ۱۸۹، ج ۲۔

شاگرد نقل کرتے ہیں۔ ۱۔ حارث بن عبد الرحمٰن بن ابی ذباب ۲۔ یزید بن خصیفہ ۳۔ محمد بن یوسف۔

ان تینوں کی روایت کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ حارث بن عبد الرحمٰن کی روایت علامہ عینیؒ نے شرح بخاری میں حافظ ابن عبد البر کے حوالے سے نقل کی ہے:

قال ابن عبد البر: وروى الحارث بن عبد الرحمن بن ابى ذباب عن السائب بن يزيد قال كان القيام على عهد عمر بثلاث وعشرين ركعة. قال ابن عبد البر هذا محمول على أن الثلاث للوتر [1]

ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ حارث بن عبد الرحمٰن بن ابی ذباب نے حضرت سائب بن یزید سے روایت کی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں تیئس رکعتیں پڑھی جاتی تھیں۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ ان میں بیس تراویح اور تین رکعتیں وتر کی ہوتی تھیں۔

۲۔ حضرت سائب کے دوسرے راوی یزید بن خصیفہ کے تین شاگرد ہیں۔ ابن ابی ذئب، محمد بن جعفر اور امام مالکؒ۔ اور یہ تینوں بالاتفاق بیس رکعتیں روایت کرتے ہیں۔

الف۔ ابن ابی ذئب کی روایت امام بیہقیؒ کی سنن کبریٰ میں درج ذیل سند کے ساتھ مروی ہے۔

أخبرنا أبو عبد الله الحسين بن محمد بن الحسين بن فنجويه الدينورى ــــــ بالدامغان ــــــ ثنا أحمد بن محمد بن إسحاق السنّى أنبأنا عبد الله بن محمد بن عبد العزيز البغوى ثنا على بن الجعد أنبأ ابن ابى ذئب عن يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد قال كانوا يقومون على عهد عمر بن الخطاب رضي الله

---

(۱) عمدۃ القاری، ص ۱۲۷، ج ۱۱۔

عنه في شهر رمضان بعشرين ركعة. قال وكانوا
يقرءون بالمئين، وكانوا يتوكئون على عصيهم في
عهد عثمان بن عفان رضى الله عنه من شدة
القيام[1]

"یعنی ابن ابی ذئب یزید بن خصیفہ سے اور وہ حضرت سائب بن یزید سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں رمضان میں لوگ بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں شدت قیام کی وجہ سے اپنی لاٹھیوں پر ٹیک لگاتے تھے۔

اس کی سند کو امام نووی' امام عراقی اور حافظ سیوطی نے صحیح کہا ہے[2]

ب۔ محمد بن جعفر کی روایت امام بیہقیؒ کی دوسری کتاب معرفۃ السنن والاثار میں حسب ذیل سند سے مروی ہے:

أخبرنا أبو طاهر الفقيه ثنا أبو عثمان البصرى ثنا أبو
أحمد محمد بن عبد الوهاب ثنا خالد بن مخلد ثنا
محمد بن جعفر حدثنى يزيد بن خصيفة عن السائب
ابن يزيد قال كنا نقوم فى زمن عمر بن الخطاب
بعشرين ركعة والوتر[3]

"محمد بن جعفر یزید بن خصیفہ سے اور وہ سائب بن یزید رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں بیس رکعت اور وتر پڑھا کرتے تھے۔

اس کی سند کو امام نوویؒ نے خلاصہ میں' علامہ سبکیؒ نے شرح منہاج میں اور علی قاری نے شرح موطا میں صحیح کہا ہے[4]

ج۔ یزید بن خصیفہ سے امام مالکؒ کی روایت حافظؒ نے فتح الباری میں اور علامہ

---

(۱) سنن کبریٰ' ص ۴۹۶' ج ۲۔

(۲) آثار السنن' ص ۵۴' ج ۲۔ تحفتہ الاحوذی' ص ۷۵' ج ۲۔

(۳) نصب الرایہ' ص ۱۵۴' ج ۲۔

(۴) آثار السنن' ص ۵۴' ج ۲۔ تحفتہ الاحوذی' ص ۷۵' ج ۲۔

شوکانیؒ نے نیل الاوطار میں ذکر کی ہے۔ حافظؒ لکھتے ہیں۔

وروى مالك من طريق يزيد بن خصيفه عن السائب بن يزيد عشرين ركعة [1]

اور امام مالکؒ نے یزید بن خصیفہ کے طریق سے حضرت سائب بن یزید سے بیس رکعتیں نقل کی ہیں۔

اور علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں:

وفى المؤطا من طريق يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد أنها عشرين ركعة [2]

"مالك عن يزيد بن خصيفة عن السائب بن يزيد" کی سند بعینہ صحیح بخاری (ص ۳۱۲ ج ۱) پر موجود ہے لیکن یہ روایت مجھے مؤطا کے موجودہ نسخہ میں نہیں ملی۔ ممکن ہے کہ مؤطا کے کسی نسخہ میں حافظ کی نظر سے گذری ہو یا غیر مؤطا میں ہو اور علامہ شوکانی کا "فی المؤطا" کہنا سہو کی بنا پر ہو۔ فلیتفتش

۳۔ حضرت سائب کے تیسرے شاگرد محمد بن یوسف کی روایت میں ان کے شاگردوں کے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ چنانچہ

الف۔ امام مالکؒ وغیرہ کی روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُبیؓ اور تمیم داری کو گیارہ رکعتیں پڑھانے کا حکم دیا تھا۔ جیسا کہ مؤطا امام مالکؒ میں ہے [3]

ب۔ ابن اسحاق ان سے تیرہ کی روایت نقل کرتے ہیں [4]

ج۔ اور داؤد بن قیس اور دیگر حضرات ان سے اکیس رکعتیں نقل کرتے ہیں [5]

---

(۱) فتح الباری، ص ۲۵۳، ج ۴ ۔۔۔ مطبوعہ لاہور۔

(۲) نیل الاوطار، ص ۵۳، ج ۳ ۔۔۔ مطبعہ عثمانیہ مصر ۱۳۵۷ھ۔

(۳) فتح الباری، ص ۲۵۳، ج ۴۔

(۴) مصنف عبد الرزاق، ص ۲۶۰، ج ۴۔

(۵) موطا امام مالک، ص ۹۸، مطبوعہ نور محمد کراچی۔

اس تفصیل سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت سائب کے دو شاگرد حارث اور یزید بن خصیفہ اور ان کے تینوں شاگرد متفق اللفظ ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیس رکعات پر لوگوں کو جمع کیا تھا۔ محمد بن یوسف کی روایت مضطرب ہے۔ بعض ان سے گیارہ نقل کرتے ہیں۔ بعض تیرہ اور بعض اکیس۔

اصول حدیث کے قاعدے سے مضطرب حدیث حجت نہیں، لہٰذا حضرت سائبؓ کی صحیح حدیث وہی ہے جو حارث اور یزید بن خصیفہ نے نقل کی ہے۔ اور اگر محمد بن یوسف کی مضطرب اور مشکوک روایت کو کسی درجہ میں قابل لحاظ سمجھا جائے تو دونوں کے درمیان تطبیق کی وہی صورت متعین ہے جو امام بیہقیؒ نے ذکر کی ہے کہ گیارہ پر چند روز عمل رہا پھر بیس پر عمل کا استقرار ہوا۔

چنانچہ امام بیہقیؒ دونوں روایتوں کو ذکر کرنے کی بعد لکھتے ہیں:

ویمکن الجمع بین الروایتین - فإنهم کانوا یقومون باحدی عشرة ثم کانوا یقومون بعشرین ویوتر بثلاث [1]

"یعنی دونوں روایتوں میں تطبیق ممکن ہے۔ کیونکہ وہ لوگ پہلے گیارہ پڑھتے تھے۔ اس کے بعد بیس رکعات تراویح اور تین وتر پڑھنے لگے۔"

امام بیہقیؒ کا یہ ارشاد کہ عہد فاروقی میں صحابہ کا آخری عمل، جس پر استقرار ہوا، بیس تراویح تھا، جس پر متعدد شواہد و قرائن موجود ہیں۔

اول۔ امام مالکؒ، جو محمد بن یوسف سے گیارہ کی روایت نقل کرتے ہیں خود ان کا اپنا مسلک بیس یا چھتیس تراویح کا ہے۔ جیسا کہ چوتھی بحث میں آئے گا۔ اس سے واضح ہے کہ یہ روایت خود امام مالکؒ کے نزدیک بھی مختار اور پسندیدہ نہیں۔

دوم۔ ابن اسحاق جو محمد بن یوسف سے تیرہ کی روایت نقل کرتے ہیں وہ بھی بیس کی روایت کو اثبت کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ شوکانی نے بیس والی روایت کے ذیل میں ان کا قول نقل کیا کہ:

قال ابن اسحاق وهذا أثبت ما سمعت فی ذلك [2]

---

[1] سنن کبریٰ، ص ۴۹۶، ج ۲۔

[2] نیل الاوطار، ص ۵۳، ج ۳۔

"ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رکعاتِ تراویح کی تعداد کے بارے میں ' میں نے جو کچھ سنا اس میں سب سے زیادہ ثابت یہی تعداد ہے۔"

سوم ۔ یہ کہ محمد بن یوسف کی گیارہ والی روایت کی تائید میں دوسری کوئی اور روایت موجود نہیں۔ جب کہ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کی بیس والی روایت کی تائید میں دیگر متعدد روایتیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ

۱۔ یزید بن رومان کی روایت ہے کہ :

كان الناس يقومون فى زمان عمر بن الخطاب فى رمضان بثلاث وعشرين ركعة [1]

" لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تیئس رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔ (بیس تراویح اور تین وتر)

یہ روایت سند کے لحاظ سے نہایت قوی ہے مگر مرسل ہے۔ کیونکہ یزید بن رومان نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا زمانہ نہیں پایا۔ تاہم حدیث مرسل (جب کہ ثقہ اور لائق اعتماد سند سے مروی ہو) امام مالکؒ ' امام ابو حنیفہؒ ' امام احمدؒ اور جمہور علماء کے نزدیک حجت ہے۔ البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک حدیث مرسل کے حجت ہونے کے لئے یہ شرط ہے کہ اس کی تائید کسی دوسری مسند یا مرسل سے ہوئی ہو۔ چونکہ یزید بن رومان کی زیرِ بحث روایت کی تائید میں دیگر متعدد روایات موجود ہیں اس لئے یہ باتفاقِ اہلِ علم حجت ہے۔

یہ بحث تو عام مراسیل کے باب میں تھی۔ مؤطا کے مراسیل کے بارے میں اہلِ حدیث کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ سب صحیح ہیں۔ چنانچہ امام الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں :

"قال الشافعى أصح الكتب بعد كتاب الله مؤطا مالك واتفق أهل الحديث على أن جميع ما فيه صحيح على رأى مالك ومن وافقه، وأما على رأى غيره فليس فيه مرسل ولا منقطع إلا قد اتصل السند

---

[1] موطا امام مالکؒ ' ص ۹۸ ۔ مطبوعہ نور محمد کراچی ۔ سنن کبریٰ ' ص ۴۹۶ ' ج ۲ ۔ قیام اللیل ۹۱ ۔

به من طرق أخرى فلا جرم أنها صحيحة من هذا الوجه، وقد صنف فى زمان مالك مؤطات كثيرة فى تخريج أحاديثه ووصل منقطعه مثل كتاب ابن أبى ذئب وابن عيينة والثورى ومعمر [1]

"امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کتاب اللہ کے بعد اصح الکتب مؤطا امام مالکؒ ہے۔ اور اہلِ حدیث کا اس پر اتفاق ہے کہ اس میں جتنی روایتیں ہیں وہ سب امام مالکؒ اور ان کے موافقین کی رائے پر صحیح ہیں اور دوسروں کی رائے پر اس میں کوئی مرسل اور منقطع روایت ایسی نہیں کہ دوسرے طریقوں سے اس کی سند متصل نہ ہو۔ پس اس لحاظ سے وہ سب کی سب صحیح ہیں اور امام مالکؒ کے زمانہ میں مؤطا کی حدیثوں کی تخریج کے لئے اور اس کے منقطع کو متصل ثابت کرنے کے لئے بہت سے مؤطا تصنیف ہوئے۔ جیسے ابن ابی ذئب، ابن عیینہ، ثوری اور معمر کی کتابیں۔"

اور پھر بیس رکعات پر اصل استدلال تو حضرت سائب بن یزید کی روایت سے ہے جس کے "صحیح" ہونے کی تصریح گذر چکی ہے اور یزید بن رومان کی روایت بطور تائید ذکر کی گئی ہے۔

۲۔ یحیٰ بن سعید انصاری کی روایت ہے کہ:

أن عمر بن الخطاب أمر رجلًا أن يصلى بهم عشرين ركعة [2]

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو بیس رکعتیں پڑھائے"

یہ روایت بھی سنداً قوی مگر مرسل ہے۔

۳۔ عبد العزیز بن رفیع کی روایت ہے:

كان أبى بن كعب يصلى بالناس فى رمضان بالمدينة عشرين ركعة ويوتر بثلاث [3]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۳۳، ج ۱۔ مطبوعہ منیریہ۔
[2] مصنف ابن ابی شیبہ، ص ۳۹۳، ج ۲۔
[3] حوالہ بالا۔

"حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ لوگوں کو مدینہ میں رمضان میں بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھایا کرتے تھے۔"

یہ روایت بھی مرسل ہے۔

۴۔ محمد بن کعب قرظی کی روایت ہے کہ:

کان الناس یصلون فی زمان عمر بن الخطاب فی رمضان عشرین ركعة يطيلون فيها القراءة ويوترون بثلاث [1]

"لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان مبارک میں بیس رکعتیں پڑھتے تھے۔ ان میں طویل قرات کرتے تھے اور تین وتر پڑھتے تھے۔"

یہ روایت بھی مرسل ہے اور قیام اللیل میں اس کی سند نہیں ذکر کی گئی۔

۵۔ کنز العمال میں خود حضرت ابن بن کعب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ:

أن عمر بن الخطاب أمره أن يصلى بالليل فی رمضان، فقال أن الناس يصومون النهار ولا يحسنون أن يقرأوا، فلو قراءت عليهم بالليل. فقال يا أمير المؤمنين هذا شیء لم يكن فقال قد علمت ولكنه حسن. فصلى بهم عشرين ركعة [2]

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو حکم دیا کہ وہ رمضان میں لوگوں کو رات کے وقت نماز پڑھایا کریں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ لوگ دن کو روزہ رکھتے ہیں مگر خوب اچھا پڑھنا نہیں جانتے۔ پس کاش! تم رات میں ان کو قرآن سناتے۔ اُبیؓ نے عرض کیا یا امیر المومنین! یہ ایک ایسی چیز ہے جو پہلے نہیں ہوئی۔ فرمایا یہ تو مجھے معلوم ہے لیکن یہ اچھی چیز ہے۔ چنانچہ ابیؓ نے لوگوں کو بیس رکعتیں پڑھائیں۔ (ابن منیع)"

کنز العمال میں یہ روایت ابن منیع کے حوالے سے ذکر کی گئی ہے اس کی سند کا حال معلوم نہیں۔ بہرحال اگر ضعیف بھی ہو تو تائید کے لئے کار آمد ہے۔

---

[1] قیام اللیل، ص ۹۱۔

[2] کنز العمال، طبع جدید بیروت، ص ۴۰۹، ج ۸، حدیث ۲۳۴۷۱۔

چہارم۔ مندرجہ بالا روایات کی روشنی میں اہلِ علم اس کے قائل ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو بیس رکعات پر جمع کیا۔ اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ان سے موافقت کی۔ اس لئے یہ بمنزلہ اجماع کے تھا۔ یہاں چند اکابر کے ارشادات ذکر کئے جاتے ہیں۔

امام ترمذی لکھتے ہیں :

واختلف أهل العلم في قيام رمضان فرأى بعضهم أن يصلى إحدى وأربعين ركعة مع الوتر وهو قول أهل المدينة والعمل على هذا عندهم بالمدينة وأكثر أهل العلم على ما روى عن علي وعمر وغيرهما من أصحاب النبي ﷺ عشرين ركعة وهو قول سفيان وابن المبارك والشافعي وقال الشافعي وهكذا أدركت ببلدنا بمكة يصلون عشرين ركعة [1]

" تراویح میں اہلِ علم کا اختلاف ہے ' بعض وتر سمیت اکتالیس رکعت کے قائل ہیں۔ اہل مدینہ کا یہی قول ہے اور ان کے یہاں مدینہ طیبہ میں اسی پر عمل ہے اور اکثر اہلِ علم بیس رکعت کے قائل ہیں جو حضرت علی ' حضرت عمر اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مروی ہیں۔ سفیان ثوریؒ ' عبد اللہ بن مبارکؒ اور شافعیؒ کا یہی قول ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شہر مکہ مکرمہ میں لوگوں کو بیس رکعت پڑھتے ہی پایا ہے۔

۲۔ علامہ زرقانی مالکی شرح مؤطا میں ابو الولید سلیمان بن خلف القرطبی الباجی المالکی (م ۴۹۴) سے نقل کرتے ہیں :

قال الباجي فأمرهم أولا بتطويل القرأة لأنه أفضل ثم ضعف الناس فأمرهم بثلاث وعشرين فخفف من طول القرأة واستدرك بعض الفضيلة بزيادة الركعات [2]

---

[1] سنن ترمذی ' ص ۹۹ ' ج ۱۔

[2] شرح زرقانی علی المؤطا ' ص ۲۳۹ ' ج ۱۔

"باجی کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے پہلے ان کو تطویل قرات کا حکم دیا تھا کہ وہ افضل ہے۔ پھر لوگوں کا ضعف محسوس کیا تو تیئیس رکعات کا حکم دیا۔ چنانچہ طولِ قرات میں کمی کی اور رکعات کے اضافہ سے فضیلت کی کچھ تلافی کی۔"
آگے لکھتے ہیں۔

قال الباجی وکان الأمر علی ذلك الی یوم الحرة فثقل علیهم القیام فنقصوا من القراءة وزادوا الرکعات فجعلت ستا وثلاثین غیر الشفع والوتر [1]

" باجی کہتے ہیں کہ یوم حرہ تک بیس رکعات کا دستور رہا۔ پھر ان پر قیام بھاری ہوا تو قرات میں کمی کر کے رکعات میں مزید اضافہ کر دیا گیا اور وتر کے علاوہ چھتیس رکعات ہو گئیں۔"

۳۔ علامہ زرقانی نے یہی بات حافظ ابن عبد البر (۳۶۸ھ۔ ۴۶۳) اور ابو مروان عبد الملک ابن حبیب القرطبی المالکی (م ۲۳۷) سے نقل کی ہے [2]

۴۔ حافظ موفق الدین ابن قدامہ المقدسی الحنبلی (م ۶۳۰ھ) المغنی میں لکھتے ہیں:

ولنا أن عمر رضی الله عنه لما جمع الناس علی أبی بن کعب کان یصلی لهم عشرین رکعة

" ہماری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب لوگوں کو اُبی بن کعبؓ پر جمع کیا تو وہ ان کو بیس رکعتیں پڑھاتے تھے۔"

اس سلسلہ کی روایات نیز حضرت علیؓ کا اثر ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

وهذا کالإجماع "اور یہ بمنزلہ اجماع صحابہؓ کے ہے۔"

پھر اہل مدینہ کے ۳۶ کے تعامل کو ذکر کر کے لکھتے ہیں:

ثم لو ثبت أن أهل المدینة کلهم فعلوه لکان مافعله عمر واجمع علیه الصحابة فی عصره أولی بالاتباع.

قال بعض أهل العلم: إنما فعل هذا أهل المدینة لأنهم

---

[1] زرقانی شرح موطا ص ۲۳۹ ج ۱ - [2] ایضاً

أرادوا مساواة أهل مكة. فإن أهل مكة يطوفون سبعا بين كل ترويحتين، فجعل أهل المدينة مكان كل سبع أربع ركعات. وما كان عليه أصحاب رسول الله ﷺ أولى وأحق ۱؎

"پھر اگر یہ ثابت ہو کہ اہل مدینہ سب چھتیس رکعتیں پڑھتے تھے تب بھی جو کام حضرت عمرؓ نے کیا اور جس پر ان کے دور میں صحابہؓ نے اجماع کیا اس کی پیروی اَولیٰ ہو گی۔"

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ اہل مدینہ کا مقصود اس عمل سے اہلِ مکہ کی برابری کرنا تھا۔ کیونکہ اہلِ مکہ دو ترویحوں کے درمیان طواف کیا کرتے تھے اہلِ مدینہ نے طواف کی جگہ دو ترویحوں کے درمیان چار رکعتیں مقرر کر لیں۔ بہرحال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا جو معمول تھا وہی اَولیٰ اور حق ہے۔"

۵۔ امام محی الدین نووی (م ۶۷۶ھ) شرح مہذب میں لکھتے ہیں:

واحتج أصحابنا بما رواه البيهقي وغيره بالأسناد الصحيح عن السائب بن يزيد الصحابي رضي الله عنه قال كانوا يقومون على عهد عمر بن الخطاب رضي الله عنه في شهر رمضان بعشرين ركعة. الحديث ۲؎

"ہمارے اصحاب نے اس حدیث سے دلیل پکڑی ہے جو امام بیہقیؒ اور دیگر حضرات نے حضرت سائب بن یزید صحابی رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح روایت کی ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں رمضان مبارک میں بیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے۔"

آگے یزید بن رومان کی روایت ذکر کر کے امام بیہقیؒ کی تطبیق ذکر کی ہے اور

۱؎ ابن قدامہ: المغنی مع الشرح الکبیر' ص ۷۹۹' ج ۱۔

۲؎ المجموع شرح مہذب ص ۳۲' ج ۴۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا اثر ذکر کر کے اہل مدینہ کے فعل کی وہی توجیہ کی ہے جو ابن قدامہ کی عبارت میں گذر چکی ہے۔

۶۔ علامہ شہاب الدین احمد بن محمد قسطلانی شافعیؒ (م ۹۲۳ھ) شرح بخاری میں لکھتے ہیں:

وجمع البيهقي بينهما بأنهم كانوا يقومون بإحدى عشرة ثم قاموا بعشرين وأوتروا بثلاث وقد عدوا ما وقع فی زمن عمر رضی الله عنه كالإجماع [1]

"اور امام بیہقیؒ نے ان دونوں روایتوں کو اس طرح جمع کیا ہے کہ وہ پہلے گیارہ پڑھتے تھے پھر بیس تراویح اور تین وتر پڑھنے لگے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جو معمول جاری ہوا اسے علماء نے بمنزلہ اجماع کے شمار کیا ہے۔"

۷۔ علامہ شیخ منصور بن یونس بہوتی حنبلی (م ۱۰۴۶ھ) "کشف القناع عن متن الاقناع" میں لکھتے ہیں:

وهی عشرون ركعة لما روى مالك عن يزيد بن رومان قال كان الناس يقومون فی زمن عمر فی رمضان بثلاث وعشرين ركعة .... وهذا فی مظنة الشهرة بحضرة الصحابة فكان إجماعا [2]

"تراویح بیس رکعت ہیں، چنانچہ امام مالکؒ نے یزید بن رومان سے روایت کیا ہے کہ لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں رمضان میں تیئیس رکعتیں پڑھا کرتے تھے اور حضرت عمر کا صحابہؓ کی موجودگی میں بیس کا حکم دینا عام شہرت کا موقع تھا اس لئے یہ اجماع ہوا۔"

۸۔ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ "حجۃ اللہ البالغہ" میں لکھتے ہیں:

وزادت الصحابة ومن بعدهم فی قيام رمضان ثلاثة أشياء:

---

[1] ارشاد الساری، ص ۲۲۶، ج ۳۔

[2] کشف القناع عن متن الاقناع ص ۳۹۳، ج ۱۔

الاجتماع له فى مساجدهم، وذلك لأنه يفيد التيسير على خاصتهم وعامتهم، وأداؤه فى أول الليل مع القول بأن صلاة آخر الليل مشهودة، وهى أفضل كما نبه عمر رضى الله عنه لهذا التيسير الذى أشرنا إليه، وعدده عشرون ركعة [1]

"اور صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد کے حضرات نے قیامِ رمضان میں تین چیزوں کا اضافہ کیا۔ (۱) اس کے لئے مساجد میں جمع ہونا کیونکہ اس سے عام وخاص کو آسانی حاصل ہوتی ہے (۲) اول شب میں ادا کرنا۔ باوجود اس بات کے قائل ہونے کے آخر شب کی نماز میں فرشتوں کی حاضری ہوتی ہے اور وہ افضل ہے جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر متنبہ فرمایا، مگر اول شب کا اختیار کرنا بھی اسی آسانی کے لئے تھا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا (۳) بیس رکعات کی تعداد۔"

۳۔ تراویح عہد صحابہؓ و تابعینؒ میں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس تراویح کا معمول شروع ہوا تو بعد میں بھی کم از کم بیس کا معمول رہا۔ بعض صحابہ و تابعین سے زائد کی روایات تو مروی ہیں لیکن کسی سے صرف آٹھ کی روایت نہیں۔

۱۔ حضرت سائبؓ کی روایت اوپر گذر چکی ہے جس میں انہوں نے عہد فاروقیؓ میں بیس کا معمول ذکر کرتے ہوئے اسی سیاق میں عہد عثمانیؓ کا ذکر کیا ہے۔

۲۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ، جن کا وصال عہد عثمانیؓ کے اواخر میں ہوا ہے وہ بھی بیس پڑھا کرتے تھے۔ [2]

۳۔ ——— عن أبى عبد الرحمن السلمى عن على رضى الله عنه أنه دعا القراء فى رمضان فأمر منهم رجلاً يصلى بالناس عشرين ركعة وكان على يوتر بهم. [3]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۸، ج ۲۔

[2] قیام اللیل، ص ۹۱۔

[3] سنن کبریٰ بیہقی، ص ۴۹۵، ج ۲۔

"ابو عبد الرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رمضان میں قاریوں کو بلایا۔ پس ان میں ایک شخص کو حکم دیا کہ بیس رکعتیں پڑھایا کریں اور وتر حضرت علیؓ خود پڑھایا کرتے تھے۔"

اس کی سند میں حماد بن شعیب پر محدثین نے کلام کیا ہے، لیکن اس کے متعدد شواہد موجود ہیں۔ ابو عبد الرحمٰن سلمی کی یہ روایت شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ نے منہاج السنۃ میں ذکر کی ہے اور اس سے استدلال کیا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جاری کردہ تراویح کو اپنے دور خلافت میں باقی رکھا[1] ___ حافظ ذہبیؒ نے المنتقی مختصر منہاج السنۃ[2] میں حافظ ابن تیمیہؒ کے اس استدلال کو بلا نکیر ذکر کیا ہے، اس سے واضح ہے کہ ان دونوں کے نزدیک حضرت علیؓ کے عہد میں بیس رکعات تراویح کا معمول جاری تھا۔

۴ ___ عن عمرو بن قيس عن أبى الحسناء أن عليا أمر رجلا يصلى بهم فى رمضان عشرين ركعة[3]

"عمرو بن قیس ابو الحسناء سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو رمضان میں بیس رکعتیں پڑھایا کرے۔"

۵ ___ عن أبى سعد البقال عن أبى الحسناء أن على ابن أبى طالب رضى الله عنه أمر رجلا أن يصلى بالناس خمس ترويحات عشرين ركعة وفى هذا الأسناد ضعف[4]

"ابو سعد بقال ابوالحسناء سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو حکم دیا کہ لوگوں کو پانچ ترویحے یعنی بیس رکعتیں پڑھایا کرے۔ امام بیہقیؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند میں ضعف ہے۔"

---

[1] منہاج السنۃ ص ۲۲۴، ج ۴۔

[2] المنتقی، ص ۵۴۲۔

[3] مصنف ابن ابی شیبہ ص ۳۹۳ ج ۲۔

[4] سنن کبریٰ بیہقی: ۴۹۵، ج ۲۔

علامہ ابن الترکمانی "الجوہر النقی" میں لکھتے ہیں کہ ظاہر تر یہ ہے کہ اس سند کا ضعف ابو سعد بقال کی وجہ سے ہے جو متکلم فیہ راوی ہے لیکن مصنف ابن ابی شیبہ کی روایت میں (جو اوپر ذکر کی گئی ہے) اس کا متابع موجود ہے جس سے اس کے ضعف کی تلافی ہو جاتی ہے [۱]

۶ ــــــ عن شتير بن شكل وكان من أصحاب علي رضي الله عنه أنه كان يؤمهم في شهر رمضان بعشرين ركعة ويوتر بثلاث [۲]

شتیر بن شکل، جو حضرت علیؓ کے اصحاب میں سے تھے۔ رمضان مبارک میں لوگوں کو بیس رکعت تراویح اور تین وتر پڑھایا کرتے تھے۔

امام بیہقیؒ نے اس اثر کو نقل کر کے کہا ہے "وفي ذلك قوة" (اور اس میں قوت ہے) پھر اس کی تائید میں انہوں نے ابو عبد الرحمٰن سلمی کا اثر ذکر کیا ہے جو اوپر گذر چکا ہے۔

۷ ــــــ عن أبي الخصيب قال كان يؤمنا سويد بن غفلة في رمضان فيصلي خمس ترويحات عشرين ركعة [۳] قال النيموي وإسناده حسن [۴]

ابوالخصیب کہتے ہیں کہ سوید بن غفلہ ہمیں رمضان میں نماز پڑھاتے تھے۔ پس پانچ ترویحے بیس رکعتیں پڑھتے تھے۔ علامہ نیمویؒ فرماتے ہیں کہ اس کی سند حسن ہے۔

حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ کا شمار کبار تابعین میں ہے، انہوں نے زمانہ جاہلیت پایا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں اسلام لائے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی کیونکہ مدینہ طیبہ اس دن پہنچے جس دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین ہوئی، اس لئے صحابیت کے شرف سے مشرف نہ ہو سکے

---

[۱] ذیل سنن کبریٰ: ۴۹۵، ج ۲۔

[۲] سنن کبریٰ، ص ۴۹۶، ج ۲ ـــــ قیام اللیل، ص ۹۱۔

[۳] سنن کبریٰ، ص ۴۹۵، ج ۲۔

[۴] آثار السنن، ص ۵۵، ج ۲۔

بعد میں کوفہ میں رہائش اختیار کی۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے خاص اصحاب میں تھے۔ ۸۰ ھ میں ایک سو تیس برس کی عمر میں انتقال ہوا۔

۸ ---- عن الحارث أنه كان يؤم الناس فی رمضان بالليل بعشرين ركعة ويوتر بثلاث ويقنت قبل الركوع [۱]

"حارث رمضان میں لوگوں کو بیس تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے اور رکوع سے قبل قنوت پڑھتے تھے۔"

۹۔ قیام اللیل میں عبد الرحمن بن ابی بکرہ۔ سعید بن الحسن اور عمران العبدی سے نقل کیا ہے کہ وہ بیس راتیں بیس تراویح پڑھایا کرتے تھی اور آخری عشرہ میں ایک ترویحہ کا اضافہ کردیتے تھے۔[۲]

حارث، عبد الرحمن بن ابی بکرہ [۳] (م ۹۶ھ) اور سعید بن ابی الحسن (م ۱۰۸ھ) تینوں حضرت علیؓ کے شاگرد ہیں۔

۱۰۔ ابو البختری بھی بیس تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے [۴]

۱۱۔ علی بن ربیعہ جو حضرت علیؓ کے اصحاب میں تھے۔ بیس تراویح اور تین وتر پڑھاتے تھے۔[۵]

۱۲۔ ابن ابی ملیکہ (م ۱۱۷ھ) بھی بیس تراویح پڑھاتے تھے۔[۶]

۱۳۔ حضرت عطا (م ۱۱۴ھ) فرماتے ہیں کہ میں نے لوگوں کو وتر سمیت تیئس رکعتیں پڑھتے ہوئے پایا ہے۔[۷]

۱۴۔ مؤطا امام مالکؒ میں عبد الرحمن ہرمز الاعرج (م ۱۱۷ھ) کی روایت ہے کہ میں نے لوگوں کو اس حالت میں پایا ہے کہ وہ رمضان میں کفار پر لعنت کرتے تھے اور قاری

---

[۱] مصنف ابن ابی شیبہ ۳۹۳، ج ۲۔ [۲] قیام اللیل، ص ۹۲۔

[۳] قیام اللیل میں "ابی بکرہ" کی جگہ "ابی بکر" طباعت کی غلطی ہے۔

[۴] مصنف ابن ابی شیبہ، ص ۳۹۳، ج ۲۔

[۵] مصنف ابن ابی شیبہ، ص ۳۹۳، ج ۲۔

[۶] ایضاً (۷) ایضاً۔

آٹھ رکعتوں میں سورہ بقرہ ختم کرتا تھا۔ اگر وہ بارہ رکعتوں میں سورہ بقرہ ختم کرتا تو لوگ یہ محسوس کرتے کہ اس نے قرات میں تخفیف کی ہے[۱] اس روایت سے مقصود تو تراویح میں طوالِ قرات کا بیان کرنا ہے لیکن روایت کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف آٹھ رکعت پر اکتفا نہیں کیا جاتا تھا۔

خلاصہ یہ کہ جب سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تراویح کی باقاعدہ جماعت جاری کی ہمیشہ بیس یا زائد تراویح پڑھی جاتی تھی۔ البتہ ایام حرہ (۶۳ھ) کے قریب اہل مدینہ نے ہر ترویحہ کے درمیان چار رکعتوں کا اضافہ کرلیا' اس لئے وہ وتر سمیت اکتالیس رکعتیں پڑھتے تھے اور بعض دیگر تابعین بھی عشرۂ اخیرہ میں اضافہ کرلیتے تھے۔ بحرحال صحابہؓ و تابعین کے دور میں آٹھ تراویح کا کوئی گھٹیا سے گھٹیا ثبوت نہیں ملتا۔ اس لئے جن حضرات نے یہ فرمایا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بیس تراویح پر صحابہ کا اجماع ہوگیا تھا ان کا یہ ارشاد مبنی بر حقیقت ہے۔ کیونکہ حضرات سلف اس تعداد پر اضافہ کے تو قائل تھے مگر اس میں کمی کا قول کسی سے منقول نہیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس بات پر سلف کا اجماع تھا کہ تراویح کی تعداد کم سے کم بیس رکعات ہے۔

۴۔ تراویح ائمہ اربعہ کے نزدیک

امام ابو حنیفہ' امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کے نزدیک تراویح کی بیس رکعتیں ہیں۔ امام مالکؒ سے اس سلسلہ میں دو روایتیں منقول ہیں ایک بیس کی اور دوسری چھتیس کی۔ لیکن مالکی مذہب کے متون میں بیس ہی کی روایت کو اختیار کیا گیا ہے۔ فقہ حنفی کے حوالے دینے کی ضرورت نہیں۔ دوسرے مذاہب کی مستند کتابوں کے حوالے پیش کئے جاتے ہیں۔

فقہ مالکی: قاضی ابوالولید ابن رشد مالکی (م ۵۹۵) بدایۃ المجتہد میں لکھتے ہیں:

واختلفوا فی المختار من عدد الرکعات التی یقوم بها الناس فی رمضان، فاختار مالك فی أحد قولیه وأبو حنیفة والشافعی وأحمد وداود القیام بعشرین رکعة

---

[۱] مؤطا امام مالکؒ، ص ۹۹۔

سوى الوتر. وذكر ابن القاسم عن مالك أنه كان
يستحسن ستا وثلاثين ركعة والوتر ثلاثه [1]

"رمضان میں کتنی رکعات پڑھنا مختار ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالکؒ نے ایک قول میں اور امام ابو حنیفہؒ ' شافعیؒ ' احمدؒ اور داؤدؒ نے وتر کے علاوہ بیس رکعات کو اختیار کیا ہے۔ اور ابن قاسم نے امام مالکؒ سے نقل کیا ہے کہ وہ تین وتر اور چھتیس رکعات تراویح کو پسند فرماتے تھے۔"

مختصر خلیل کے شارح علامہ شیخ احمد الدردیر المالکی (م ۱۲۰۱ھ) لکھتے ہیں:

وهى (ثلاث وعشرون) ركعة بالشفع والوتر كما كان
عليه العمل([2] (ثم جعلت) فى زمن عمر بن عبد
العزيز (ستا وثلاثين) بغير الشفع والوتر لكن الذى
جرى عليه العمل سلفا وخلفا الأول [3]

"اور تراویح ' وتر سمیت تئیس رکعتیں ہیں جیساکہ اسی کے مطابق (صحابہؓ و تابعینؒ کا) عمل تھا۔ پھر حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں وتر کے علاوہ چھتیس کر دی گئیں۔ لیکن جس تعداد پر سلف و خلف کا عمل ہمیشہ جاری رہا وہ اول ہے۔ (یعنی اور بیس تراویح اور تین وتر)

فقہ شافعیؒ : امام محی الدین نووی (۶۷۶) **المجموع** شرح مہذب میں لکھتے ہیں :

(فرع) فى مذاهب العلماء فى عدد ركعات التراويح:
مذهبنا أنها عشرون ركعة بعشر تسليمات غير الوتر
وذلك خمس ترويحات والترويحة أربع ركعات
بتسليمتين هذا مذهبنا وبه قال أبو حنيفة وأصحابه

---

[1] بدایۃ المجتہد ' ص ۱۶۶ ' ج ۱ ۔

[2] قولہ کما کان علیہ العمل ۔ ای عمل الصحابۃ والتابعین ۔ حاشیۃ الدسوقی علی الشرح الکبیر للدردیر ۔

[3] شرح الکبیر للدردیر مع حاشیۃ الدسوقی ص ۳۱۵ ' ج ۱ ۔

وأحمد وداود وغيرهم ونقله القاضي عياض عن
جمهور العلماء - وحكى أن الأسود بن يزيد كان يقوم
بأربعين ركعة ويوتر بسبع وقال مالك التراويح تسع
ترويحات وهي ستة وثلاثون ركعة غير الوتر [1]

"رکعات تراویح کی تعداد میں علماء کے مذاہب کا بیان ۔ ہمارا مذہب یہ ہے کہ تراویح بیس رکعتیں ہیں۔ دس سلاموں کے ساتھ۔ علاوہ وتر کے۔ یہ پانچ ترویحے ہوئے۔ ایک ترویحہ چار رکعات کا دو سلاموں کے ساتھ۔ امام ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحاب ' امام احمدؒ اور امام داؤدؒ وغیرہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ اور قاضی عیاضؒ نے اسے جمہور علماء سے نقل کیا ہے۔ نقل کیا گیا ہے کہ اسود بن یزید چالیس تراویح اور سات وتر پڑھا کرتے تھے اور امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ تراویح نو ترویحے ہیں اور یہ وتر کے علاوہ چھتیس رکعتیں ہوئیں۔

فقہ حنبلی: حافظ ابن قدامہ المقدسی الحنبلی(م ۶۳۰ھ) المغنی میں لکھتے ہیں:

والمختار عند أبي عبد الله رحمه الله فيها عشرون ركعة
وبهذا قال الثوري وأبو حنيفة والشافعي، وقال مالك
ستة وثلاثون [2]

امام احمدؒ کے نزدیک تراویح میں بیس رکعتیں مختار ہیں۔ امام ثوریؒ ' ابو حنیفہؒ اور شافعیؒ بھی اسی کے قائل ہیں اور امام مالکؒ چھتیس کے قائل ہیں۔

خاتمہ بحث۔ چند ضروری فوائد

مسک الختام کے طور پر چند فوائد گوش گذار کرنا چاہوں تا کہ بیس تراویح کی اہمیت ذہن نشین ہو سکے۔

---

[1] مجموع شرح مہذب ' ص ۳۲ ' ج ۴۔

[2] مغنی ابن قدامہ ' ص ۷۹۸ ' ۷۹۹ ' ج ۱۔ مع الشرح الکبیر۔

ا۔ بیس تراویح سُنّتِ مؤکدہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اکابر صحابہؓ کی موجودگی میں بیس تراویح جاری کرنا۔ صحابہؓ کرام کا اس پر نکیر نہ کرنا اور عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک شرقاً و غرباً بیس تراویح کا مسلسل زیرِ تعامل رہنا اس امر کی دلیل ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ دین میں داخل ہے۔

(اللہ تعالیٰ خلفائے راشدین کے لئے ان کے اس دین کو قرار و تمکین بخشیں گے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے پسند فرمایا لیا ہے) الاختیار شرح المختار میں ہے:

روى أسد بن عمرو عن أبى يوسف قال سألت أبا حيفة رحمه الله عن التراويح وما فعله عمر رضى الله عنه فقال التراويح سنة مؤكدة ولم يتخرصه عمر من تلقاء نفسه ولم يكن فيه مبتدعا ولم يأمر به إلا عن أصل لديه وعهد من رسول الله ﷺ ولقد سن عمر هذا وجمع الناس على أبى بن كعب فصلاها جماعة والصحابة متوافرون منهم عثمان وعلى وابن مسعود والعباس وابنه وطلحة والزبير ومعاذ وأبى وغيرهم من المهاجرين والأنصار رضي الله عنهم أجمعين وما رد عليه واحد منهم بل ساعدوه ووافقوه وامروا بذلك [1]

"اسد بن عمرو امام ابو یوسفؒ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام ابو حنیفہؒ رحمہ اللہ سے تراویح اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فعل کے بارے میں

---

[1] الاختیار لتعلیل المختار، ص ۶۸، ج ۱، للشیخ الامام ابی الفضل مجد الدین عبد اللہ بن محمود الموصلی الحنفی۔ (م: ۶۸۳ھ)

سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ تراویح سنت مؤکدہ ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنی طرف سے اختراع نہیں کیا نہ وہ کوئی بدعت ایجاد کرنے والے تھے۔ انہوں نے جو حکم دیا وہ کسی اصل کی بناء پر تھا جو ان کے پاس موجود تھی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی عہد پر مبنی تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سنت جاری کی اور لوگوں کو ابی بن کعب پر جمع کیا' پس انہوں نے تراویح کی جماعت کرائی' اس وقت صحابہ کرامؓ کثیر تعداد میں موجود تھے۔ حضرت عثمان' علی' ابن مسعود' عباس' ابن عباس' طلحہ' زبیر' معاذ' ابی اور دیگر مہاجرین و انصار رضی اللہ عنہم اجمعین سب موجود تھے مگر ایک نے بھی اس کو رد نہیں کیا بلکہ سب نے حضرت عمرؓ سے موافقت کی اور اس کا حکم دیا۔

۲۔ خلفائے راشدین کی جاری کردہ سنت کے بارے میں وصیت نبوی

اوپر معلوم ہو چکا کہ بیس تراویح تین خلفاء راشدین کی سنت ہے اور سنت خلفائے راشدین کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

إنه من يعش منكم بعدى فسيرى اختلافا كثيرا فعليكم بسنتى وسنة الخلفاء الراشدين المهديين تمسكوا بها وعضوا عليها بالنواجذ وإياكم ومحدثات الأمور فإن كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة (رواه أحمد وأبو داود والترمذى وابن ماجه)[1]

"جو شخص تم میں سے میرے بعد جیتا رہا وہ بہت سے اختلاف دیکھے گا۔ پس میری سنت کو اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت کو لازم پکڑو اسے مضبوط تھام لو اور دانتوں سے مضبوط پکڑ لو اور نئی نئی باتوں سے احتراز کرو۔ کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔"

اس حدیث پاک سے سنت خلفائے راشدین کی پیروی کی تاکید معلوم ہوتی ہے اور یہ کہ اس کی مخالفت بدعت و گمراہی ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ ص ۳۰' ج ۱۔

۳۔ ائمہ اربعہ کے مذاہب سے خروج جائز نہیں

اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ ائمہ اربعہ کم سے کم بیس تراویح کے قائل ہیں۔ ائمہ اربعہ کے مذہب کا اتباع سوادِ اعظم کا اتباع ہے اور مذاہب اربعہ سے خروج سوادِ اعظم سے خروج ہے۔ مسند الہند شاہ ولی اللہ محدث دہلوی "عقدالجید" میں لکھتے ہیں:

قال رسول الله ﷺ اتبعوا السواد الأعظم [1] ولما اندرست المذاهب الحقة إلا هذه الأربعة كان اتباعها اتباعا للسواد الأعظم والخروج عنها خروجا عن السواد الأعظم [1]

" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ سوادِ اعظم کی پیروی کرو۔ اور جب کہ ان مذاہبِ اربعہ کے سوا باقی مذاہب حقہ مٹ چکے ہیں تو ان کا اتباع سوادِ اعظم کا اتباع ہو گا اور ان سے خروج سوادِ اعظم سے خروج ہو گا۔"

۴۔ بیس تراویح کی حکمت

حکمائے امت نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق بیس تراویح کی حکمتیں بھی ارشاد فرمائی ہیں۔ یہاں تین اکابر کے ارشادات نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ البحرالرائق میں شیخ ابراہیم الحلبی الحنفی (م۹۵۶) سے نقل کیا ہے:

وذكر العلامة الحلبي أن الحكمة في كونها عشرين أن السنن شرعت مكملات للواجبات وهي عشرون بالوتر فكانت التراويح كذلك لتقع المساوات بين المكمِّل والمكمَّل انتهى [2]

---

[1] رواه ابن ماجة من حديث انس، كما في المشكوة، ص ۳۰ وتمامه: "فانه من شذ شذ في النار"
عقد الجيد، ص ۳۷، مطبوعہ ترکیہ۔

[2] البحر الرائق، ص ۷۲، ج ۲۔

"علامہ حلبیؒ نے ذکر کیا ہے کہ تراویح کے بیس رکعات ہونے میں حکمت یہ ہے کہ سنن فرائض و واجبات کی تکمیل کے لئے مشروع ہوئی ہیں اور فرائض پنجگانہ وتر سمیت بیس رکعات ہیں۔ لہذا تراویح بھی بیس رکعات ہوں تاکہ مکمل اور مکمل کے درمیان مساوات ہو جائے۔"

۲۔ علامہ منصور بن یونس حنبلی (م ۱۰۴۶ھ) کشف القناع میں لکھتے ہیں:

والسر فيه أن الراتبة عشر فضوعفت فى رمضان لأنه وقت جد [1]

"اور بیس تراویح میں حکمت یہ ہے کہ سنن مؤکدہ دس ہیں۔ پس رمضان میں ان کو دو چند کر دیا گیا کیونکہ وہ محنت و ریاضت کا وقت ہے۔"

۳۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اس امر کو ذکر کرتے ہوئے کہ صحابہ کرامؓ نے تراویح کی بیس رکعتیں قرار دیں ۔ اس کی حکمت یہ بیان فرماتے ہیں:

وذلك أنهم رأوا النبى ﷺ شرع للمحسنين إحدى عشرة ركعة فى جميع السنة فحكموا أنه لا ينبغى أن يكون حظ المسلم فى رمضان عند قصده الاقتحام فى لجة التشبه بالملكوت أقل من ضعفها [2]

"اور یہ اس لئے کہ انہوں نے دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محسنین کے لئے (صلوۃ اللیل کی) گیارہ رکعتیں پورے سال میں مشروع فرمائی ہیں، پس ان کا فیصلہ یہ ہوا کہ رمضان مبارک میں جب مسلمان تشبہ بالملکوت کے دریا میں غوطہ لگانے کا قصد رکھتا ہے تو اس کا حصہ سال بھر کی رکعتوں کے دوگنا سے کم نہیں ہونا چاہئے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العلمين.

---

[1] کشف القناع عن متن الاقناع، ص ۴۲۵، ج ۱۔

[2] حجۃ اللہ البالغہ، ص ۱۸، ج ۲۔